ستمبر 2014

کرن

اس شمارے کے ساتھ
کرن کتاب

رسم و رواج اور تہوار

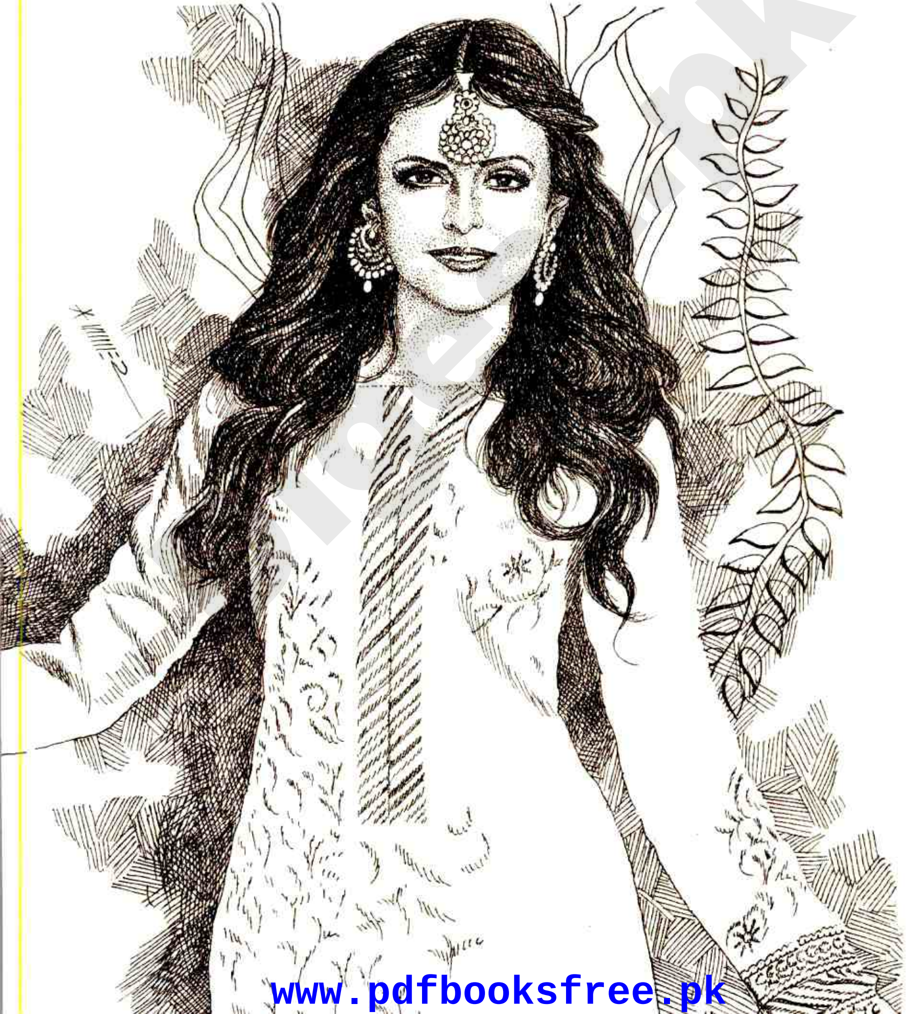
چاند نگر گروپ آف پبلیکیشنز

کرن

MEMBER
APNS
CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

بانی ——— محمود بابر فیصل
نگران ——— محمود ریاض
مدیرہ ——— نادرہ خاتون
مدیر اعلیٰ ——— عامر محمود
نائب مدیرہ ——— شعاع عمیر
ریحانہ امجد بخاری
مدیرہ خصوصی ——— امت الصبور
اشتہارات ——— خالدہ جیلانی















زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) ----- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ---- 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 6000 روپے







خط و کتابت کا پتہ

کرن

37- اردو بازار کراچی

ستمبر 2014

جلد 37 شمارہ 6

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابنِ حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

مدیرہ



ستمبر کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

6 ستمبر پاکستان کی تاریخ کا ایک ناقابل فراموش دن ہے۔ یہ وہ دن ہے جب بزدل دشمن نے رات کی تاریکی میں وطن عزیز پر اچانک حملہ کر دیا تھا۔ پاکستانی فوج کے جیالے جوانوں نے وطن کی سلامتی کے لیے شہادت کا رتبہ پایا۔ اور اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو فتح عطا فرمائی۔ سلام ان جیالوں پر جنھوں نے جام شہادت نوش کیا اور سلام ان غازیوں پر جنھوں نے وطن عزیز کو فتح کا اعزاز بخشا۔

11 ستمبر کو قائداعظم ہم سے رخصت ہوئے۔ وہ قوم کے محسن تھے۔ ان کی پوری زندگی علم و عمل سے عبارت تھی۔ قائداعظم کی بے غرضی، ایثار اور ان تھک کوششوں سے پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔ اگر ان کی بے لوث قیادت میسر نہ ہوتی تو آج پاکستان کا وجود نہ ہوتا۔ پاکستان ہماری شناخت ہے۔ وطن عزیز کو آج بھی اندرونی و بیرونی دشمنوں کا سامنا ہے۔ محسن پاکستان قائداعظم کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے یوم دفاع پر یہ عہد کریں کہ ہر طرح کے تعصبات سے بالاتر ہو کر وطن کے اندرونی و بیرونی دشمنوں کا مقابلہ کریں گے اور وطن عزیز کی حفاظت دل و جان سے کریں گے۔

اس شمارے میں،

- فصیح باری خان سے شاہین رشید کی ملاقات،
- عروۃ الوثقیٰ کہتی ہیں "میری بھی سنیے"،
- اس ماہ صدف مختار کے "مقابل ہے آئینہ"،
- "آواز کی دنیا سے" اس ماہ صارم خان سے ملاقات،
- قارئین کے پیغامات کا نیا سلسلہ "پیغام دوست"،
- نفیسہ سعید کا سلسلے وار ناول "اک ساگر ہے زندگی"،
- "شام آرزو" فرحانہ ناز ملک کا سلسلے وار ناول،
- "دل اک شہر ملال" عتیقہ ملک کا طویل مکمل ناول،
- سلمیٰ فقیر حسین کا دلچسپ ناولٹ "ہمدم دیرینہ"،
- "ملن کی ساعتیں" مصباح نوشین کا دلچسپ ناولٹ،
- "میرے دل، میرے مسافر" رفاقت جاوید کے ناولٹ کی آخری قسط،
- سمیرہ عثمان، عفیرہ مظفر، فرح طاہر، صبا جاوید اور عنبرین اعجاز کے افسانے،
- اور مستقل سلسلے،

مفت،

رسومات اور تہوار پر مشتمل کرن کتاب کرن کے ہر شمارے کے ساتھ علیحدہ سے مفت حاصل کریں۔



شب کو ظلمت میں ڈھالنے والے
دن کو سورج نکالنے والے

زندگی میں بھٹک نہیں سکتے
تیرا دامن سنبھالنے والے

تُو ہی مالک ہے تُو ہی رازق ہے
ساری دُنیا کو پالنے والے

رنج و غم سے نجات دے ہم کو
ہر مصیبت کو ٹالنے والے

تیرہ بختی کو روشنی دے دے
ہر سحر کو اُجالنے والے

بحرِ ظلمات سے رہائی دے
رات سے دن نکالنے والے

تیرا مُضطر تری پناہ میں ہے
بے کسوں کو سنبھالنے والے

مُضطر بخاری



مرا قلم ہے کہاں، آپؐ کا خیال کہاں
لکھوں میں آپؐ کے بارے مری مجال کہاں

حضورؐ آپ سے پہلے جو آئے دھرتی پر
نبی تو سب تھے مگر آپؐ کی مثال کہاں

سوال کتنا بھی مشکل ہو خیر ملتی ہے
درِ حضورؐ پہ مشکل کوئی سوال کہاں

بلندیوں سے گرائے گا کون دُنیا میں
غلام ہیں جو نبی کے انہیں زوال کہاں

فلک کی وسعتِ قلبی سے پوچھنا ہے ابھی
ترا وجود کہاں، آمنہ کا لعل کہاں

پلک جھپکنے سے پہلے ملے خدا سے نبیؐ
مقامِ مکہ کہاں، دعوتِ وصال کہاں

قرآن لکھا گیا جن کی شان میں مضطر
میں شان اُن کی لکھوں میری یہ مجال کہاں

مضطر بخاری

فصیح باری خان سے ملاقات

شاہین رشید



مجھے ایک زمانہ ہو گیا ہے صحافت کی دنیا میں کام کرتے ہوئے اور لوگوں کے انٹرویو لیتے ہوئے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ذرا سی شہرت مل جانے پر اکثر لوگوں کے جن میں خواہ فنکار ہوں یا رائٹر دماغ آسمانوں کو چھونے لگتے ہیں اور زمین پر چلنے والے انہیں بہت چھوٹے نظر آرہے ہوتے ہیں۔۔۔ مگر اس دنیا کے کچھ لوگ جتنی زیادہ شہرت حاصل کرتے جاتے ہیں اتنی زیادہ ان میں عجز و انکساری آتی جاتی ہے۔ فصیح باری خان ان میں سے ایک ہیں۔ خدا ان کے قلم میں بہت طاقت دے اور یہ لوگوں کے لیے ہمیشہ بہت اچھا لکھتے رہیں۔

★ "کیسے ہیں فصیح باری خان؟"

✳ "الحمد للہ۔"

★ "آج کل ملک سے باہر ہیں آپ۔۔۔ کہاں ہیں؟"

✳ "میں شارجہ (یو ای اے) میں ہوں اور یہاں میری بہن رہتی ہیں ان کے پاس آیا ہوا ہوں۔"

★ "ہوں۔۔۔ اچھا خوب انجوائے کر رہے ہیں اور گھوم پھر رہے ہیں؟"

✳ "ہاں انجوائے تو کر رہا ہوں اپنی بہن کے پاس رہ کر۔۔۔ اور مجھے گھومنے پھرنے کا کوئی زیادہ شوق نہیں ہے بلکہ بالکل بھی شوق نہیں ہے۔ ہاں تاریخی مقامات مجھے بہت زیادہ متاثر کرتے ہیں۔ مگر دبئی اور شارجہ میں بلڈنگز اور شاپنگ مالز کے علاوہ اور کچھ ہے ہی نہیں۔ اس لیے اپنی بہن اور ان کے بچوں کی کمپنی انجوائے کر رہا ہوں۔"

★ "باہر آکر اپنے ملک کے بارے میں کیا سوچتے ہیں؟"

✳ "اپنا ملک جیسا بھی ہے اپنا ہے۔ برائی ملک میں نہیں ہم لوگوں میں ہے کہ اس کی اہمیت کو سمجھتے ہی

نہیں ہیں۔"
★ "آج کل کیا انڈر پروڈکشن ہے؟"
✻ "آج کل مہوز کریم کے لیے ایک سیریل لکھ رہا ہوں "کتنا ستاتے ہو" اور پہلی بار میں ایک رومینٹک اور سوشل سیریل لکھ رہا ہوں۔ اللہ کرے لوگوں کو پسند آئے... اس کے بعد مومنہ درید کے لیے ایک سیریل لکھوں گا۔"
★ "قدوسی صاحب کی بیوہ میں آپ کیا پیغام ناظرین کو دینا چاہتے ہیں؟"
✻ "قدوسی صاحب اصل میں پاکستان میں راج کرنے والی آمریت کا سمبل تھا کہ ایک شخص ڈنڈے کے زور پر سب کی عقل اور سوچ پر قابض ہو جاتا ہے اور یہ آمریت لوگوں کو نفسیاتی مسائل سے دوچار کر دیتی ہے۔ قدوسی کا کردار بگڑتے ہوئے پاکستان کی تصویر تھی... یہ میرا نظریہ ہے اور اس سے آپ کا یا ناظرین کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔"
★ "حنا دل پذیر آپ کے ڈراموں کے لیے مخصوص ہو گئی ہیں۔ کیا ایسا ہی ہے؟"
✻ "حنا اگر میرے ڈراموں کے لیے مخصوص ہو گئی ہیں تو اس میں کیا برائی ہے اور مجھے یہ کہنے میں بھی کوئی عار نہیں کہ حنا کو سب سے زیادہ میری لائنوں کی سمجھ آتی ہے اور وہ اسے بہت خوب صورتی سے ادا کرتی ہیں۔"
★ "آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن ان سے اتنے سارے کردار کروانے میں پریشانی نہیں ہوتی کیا؟"
✻ "اگر پریشانی ہوتی تو شاید کبھی نہ کرواتا... لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ حنا دل پذیر آج کے دور کی سب سے بڑی فنکارہ ہیں۔ حنا جس طرح کردار کو اٹھاتی ہیں وہ حیران کن ہے۔ میرے ہی ایک کھیل "پاپڑ سے بنرا" میں حنا نے شروع میں "پاپڑ والی" اور بعد میں ایک نو دولتی بیگم کا کردار اتنی عمدگی سے کیا کہ میں خود اش اش کر اٹھا اور اسے کہتے ہیں کردار کی سمجھ اور اس لیے میں حنا کے لیے بہت لکھتا ہوں۔"
★ "آپ کے ڈائیلاگ اکثر بے باک اور ذو معنی ہوتے ہیں... مسئلہ ہوتا ہے... سینسر کا؟"
✻ "میرے ڈائیلاگ حقیقت کے قریب ہوتے ہیں اور میں انہیں بولڈ نہیں سمجھتا، میں ماحول کے



حساب سے لکھتا ہوں۔ جہاں تک سنسر کی بات ہے تو میں آپ کو بتاؤں کہ بعض اوقات معمولی باتیں بھی زد میں آجاتی ہیں اور بعض اوقات بڑی بڑی باتیں بھی زد میں نہیں آتیں.... مجھے یاد ہے کہ میرا ایک سیریل جو کچھ عرصہ قبل ہی ختم ہوا ہے ''محبت جائے بھاڑ میں'' کی پہلی قسط میں ایک سین بہت بولڈ تھا تو میرا اور میرے ڈائریکٹر کا خیال تھا کہ سنسر میں یہ سین روک لیا جائے گا۔ مگر جناب کچھ بھی نہیں ہوا اور بڑی آسانی کے ساتھ وہ سین نکل گیا۔ تو سنسر تو ہمارا اس قسم کا ہے۔''

★ ''آپ بتا رہے ہیں کہ آپ کا اگلا سیریل ایک رومینٹک سیریل ہے تو اس کے ڈائیلاگ بھی بولڈ ہی ہوں گے؟''

✻ ''میرے اگلے سیریل کا مزاج میرے دیگر آن ایر ہو جانے والی سیریلز سے الگ ہو گا۔ اس لیے اس کے مکالمے آپ کو الگ انداز میں لکھے ہوئے محسوس ہوں گے، دراصل ڈائیلاگ آپ کے منہ سے نہیں بلکہ کردار کے منہ سے نکل رہے ہوتے ہیں۔''

★ ''فصیح آپ کے لکھنے کا انداز سب سے منفرد ہے۔ اس فیلڈ میں کس سے متاثر ہیں؟''

✻ ''انسان ہر دور میں کسی نہ کسی سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔ ہمیشہ کوئی کسی کا آئیڈیل نہیں رہ سکتا.... تو جب میں چھوٹا تھا تو مجھے اشتیاق احمد کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ تھوڑا بڑا ہوا شعور آیا تو مجھے ''منٹو صاحب'' کو پڑھ کر بہت مزا آتا تھا۔ پھر مجھے راجندر سنگھ بیدی نے بہت متاثر کیا۔ غلام عباس کی کہانیاں مجھے اچھی لگتی تھیں۔ حمید کاشمیری، یونس جاوید، منو بھائی اور انتظار حسین، اشفاق احمد نے بھی مجھے متاثر کیا اور کردار نگاری میں مجھے بانو قدسیہ بہت متاثر کرتی تھیں۔''

★ ''کم عمری سے ادب پڑھنا، سمجھنا اور متاثر ہونا.... سب قدرتی تھا یا گھر کا ماحول ایسا تھا؟''

✻ ''گھر کا ماحول تھا اور اس میں بھی میری نانی کا ہاتھ ہے.... میری نانی کو ادب سے بہت لگاؤ تھا تو میں جب گھر میں کتابیں دیکھتا تھا اور اپنی نانی کو پڑھتے ہوئے دیکھتا تھا تو مجھے بہت شوق ہوا اور پھر اپنی عمر کے حساب سے میں نے بھی پڑھنا شروع کیا تو مجھے اچھا لگا اور پھر عادت بنتی گئی۔''

★ ''انسان جب اتنا کچھ پڑھے تو کسی ایک رائٹر سے ضرور متاثر ہوتا ہے اور ان کا رنگ آجاتا ہے.... تو آپ میں آیا کسی کا رنگ؟''

✻ ''نہیں میں سب سے متاثر ضرور ہوا، مگر نہ میں نے کبھی کسی کو کاپی کیا اور نہ ہی مجھ میں کسی کا رنگ آیا.... الحمد للہ تحریر میں میرا اپنا انداز، اپنا نظریہ ہے اور اسی لیے میری تحریریں پسند کی جاتی ہیں۔''

★ ''جن رائٹرز کو آپ نے پڑھا وہ بھی عام لوگوں پر ہی لکھا کرتے تھے اور آپ بھی زیادہ تر لوئر یا مڈل کلاس کے لوگوں پر ہی لکھتے ہیں.... کیا ایسا نہیں ہے؟''

✻ ''بالکل ایسا ہے.... کیونکہ میں نے اپنے اردگرد لوئر اور مڈل کلاس کے لوگوں کو ہی دیکھا ہے۔ ان کو ہی مسائل میں گھرے ہوئے دیکھا ہے ایک اچھا رائٹر وہ ہی ہوتا ہے جو سچائی کو منظر عام پر لائے اور میں بنیادی طور پر اپنے آپ کو ایک عام انسان سمجھتا ہوں 90 فیصد لوگ اسی کلاس سے تعلق رکھتے ہیں۔ میں انہی کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہوں تو ظاہر ہے کہ ان کے لیے لکھوں گا۔''

★ ''کبھی خیال آیا کہ ''اپر کلاس'' کے لیے بھی کچھ لکھ دوں؟''

✻ ''نہیں کیونکہ ڈرائنگ روم ڈرامہ یا اپر کلاس کے لیے ڈرامہ لکھنے والے بہت لوگ ہیں اور ان کے لیے لکھنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ لیکن میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ جو رائٹر اپر کلاس کے لیے لکھ رہے ہیں ان میں بہت کم رائٹر ایسے ہیں جو ''اپر کلاس'' کے لوگوں کی صحیح عکاسی کر رہے ہوں گے۔ خوب صورت لڑکے لڑکیاں، خوب صورت گھر یہ عکاس نہیں ہیں اپر کلاس کے۔ آپ دیکھیں کہ بظاہر ہر چیز خوب صورت ہو گی مگر کہانی بے جان ہو گی۔ جبکہ ان کے

اندر بھی بہت سے مسائل ہوتے ہیں۔"

★ "آپ اپنی تحریروں سے مطمئن ہیں؟"

⁂ "جی میں جو کچھ لکھ رہا ہوں میں اس سے مطمئن ہوں۔ کیونکہ میں ان لوگوں کے درمیان اٹھتا بیٹھتا ہوں جو اس آبادی کے 90 فیصد ہیں مجھے ان کے لیے لکھنا اور بات کرنا اچھا لگتا ہے۔ ایسے تجربات جو کتابیں پڑھ کر بھی حاصل نہیں کیے جاسکتے... وہ تجربات ان کے چہروں اور رویوں سے نظر آتے ہیں۔"

★ "آپ جو کچھ لکھتے ہیں وہی اسکرین کی زینت بنتا ہے یا کچھ ردوبدل بھی ہوتا ہے؟"

⁂ "میں آپ کو بتاؤں کہ میں وہ واحد رائٹر ہوں جس کی چینل والوں سے یہ ڈیل ہوتی ہے کہ میں جو اسکرپٹ لکھوں گا اس میں ردوبدل نہیں ہوگا اور نہ ہی کچھ بولیں گے۔ کیونکہ میں کچھ معاملات میں بہت سخت ہوں اور بالکل بھی کمپرومائز نہیں کرتا۔"

★ "معاوضہ بھی اپنی مرضی کا لیتے ہیں؟"

⁂ "جی بالکل اور اللہ کا شکر ہے کہ مجھے بہت اچھا معاوضہ ملتا ہے میں کم کام کرتا ہوں مگر معاوضہ اچھا لیتا ہوں۔ میرا ایمان ہے کہ بہت سارا برا کام کرکے بہت سا پیسہ کمانے سے بہتر ہے کہ بندہ کم کام کرے مگر اچھا کرے۔ سچ بتاؤں کہ بہت سے لوگ تو مجھے افورڈ بھی نہیں کرسکتے اور جو افورڈ کرسکتے ہیں میں انہی کے لیے کام کرتا ہوں۔"

★ "اپنی مرضی سے لکھتے ہیں یا فرمائشی پروگرام چلتا ہے؟"

⁂ "نہیں نہیں کوئی فرمائشی پروگرام نہیں چلتا... جب مطمئن ہوتا ہوں، جب موڈ ہوتا ہے تب ہی لکھتا دوں۔"

★ "کسی بھی ڈرامے کی بنیادی وجہ کیا ہوتی ہے؟"

⁂ "اچھا اسکرپٹ مضبوط کہانی... اس پر اگر اچھے اداکار مل جائیں تو ڈرامے کو چار چاند لگ جاتے ہیں اور اچھے ڈائریکٹر کا ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ مگر زیادہ ضروری جیسا کہ میں نے کہا اچھا اسکرپٹ ہے۔"

★ "پڑوسی ملک کے ڈراموں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

⁂ "سچ بتاؤں۔ مجھے کبھی شوق نہیں رہا۔ پڑوسی ملک کے ڈرامے دیکھنے کا اور ویسے بھی میں ان کے ڈراموں کو اپنے ڈراموں سے بہت پیچھے دیکھتا ہوں اب پڑوسی ملک کے ڈراموں کا سحر ٹوٹنا شروع ہوگیا ہے اور لوگ ایک بار پھر اپنے ڈراموں کی طرف لوٹ آئے ہیں۔ اس کے لیے میں یہ مثال دوں گا کہ برائی لوگوں کو ہمیشہ متاثر کرتی ہے کیونکہ برائی میں کشش ہوتی ہے اور آپ کو یہ بھی بتاؤں کہ اچھے لٹریچر سے زیادہ برا لٹریچر پڑھا جاتا ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ برائی ہمیشہ اچھائی پہ حاوی رہتی ہے ایک وقت آتا ہے کہ اچھائی اپنا اثر دکھاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ لوگ اپنے ڈراموں کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔"

★ "آپ کی تحریریں فنکاروں کو بھی شہرت کی بلندیوں پہ پہنچا دیتی ہیں۔ فنکار آپ کی قدر کرتے ہیں؟"

⁂ "بے چارے رائٹر کو تو کوئی پوچھتا ہی نہیں ہے اچھے اچھے کرداروں پر بھی رائٹر کو کریڈٹ نہیں دیا جاتا، فنکاروں کو شہرت ملتی ہے، اپنے کالر کھڑے کر رہے ہوتے ہیں مگر جب پوچھو کہ تحریر کس کی تھی تو بغلیں جھانکنے لگتے ہیں۔ قدر کیا کریں گے۔ چند ہی فنکار ہیں حنا دل پذیر جیسے جو قدر کرتی ہیں اور رائٹر کو ہی کریڈٹ دیتے ہیں... ہمارے فنکار تو پہلے پیسوں کی بات کرتے ہیں پھر کچھ اور۔"

★ "حنا دل پذیر آپ کی پسندیدہ فنکارہ ہیں... ڈائریکٹر میں کس کا نام لیں گے؟"

⁂ "مظہر معین کا... مظہر سے میری کیمسٹری بہت ملتی ہے۔ ہماری دوستی بہت پرانی ہے اور مظہر معین میں یہ خوبی ہے کہ وہ باریک سے باریک چیز پر بھی نظر رکھتا ہے اداکاروں کو پرکھنے کا اسے خاص سلیقہ ہے اور سیریل اور ٹیلی فلمز میں اچھے اداکاروں کا ہونا بہت ضروری ہے، کیونکہ میرے جو مکالمے ہوتے ہیں انہیں وہی فنکار ادا کرسکتا ہے جو کردار کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔"

★ "آپ کے لیے کہا جاتا ہے کہ آپ نے اپنا ایک گروپ بنایا ہوا ہے کہ بس لینا ہے تو اس کو لینا ہے؟"

٭ "آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں..... لیکن ایسا نہیں ہے کہ صرف ایک ہی گروپ ہوتا ہے۔ چند اداکار ہیں جو ہر ڈرامے میں موجود ہوتے ہیں۔ باقی دیگر نئے لوگ بھی ہوتے ہیں مگر ہم انہی کو لیتے ہیں جو ڈرامے کی جزئیات کو سمجھتے ہیں اس لیے بہت سوچ بچار کے بعد اداکاروں کو منتخب کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ ایک برا اداکار اچھے جملے کی ادائیگی اس طرح کرتا ہے کہ جملے کا سارا تاثر ہی ختم ہو جاتا ہے۔"

★ "اللہ تعالیٰ نے آپ کو لکھنے کی جو صلاحیت دی ہے کیا اسے دوسروں میں منتقل کیا جا سکتا ہے؟"

٭ "نہیں بالکل نہیں یہ تو یا ورثے میں ملتی ہے یا انسان پیدائشی ہوتا ہے یہ کوئی موٹر مکینک یا ویلڈنگ کا کام تو نہیں ہے کہ سکھا دیا۔ آپ کی بات پر ہی بتاؤں کہ بہت سے نوجوان کہتے ہیں کہ پلیز آپ ہمیں اپنا شاگرد بنالیں..... مگر یہ ممکن نہیں ہے۔"

★ "آپ کے ڈرامے کی ایک اور خصوصیت بھی بہت متاثر کرتی ہے کہ جس کلاس کا ڈرامہ ہوتا ہے لوکیشن بھی اسی کلاس کی ہوتی ہے..... مشکل ہوتی ہے۔"

٭ "بالکل ہوتی ہے..... اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ اپر کلاس پہ ڈرامہ لکھنا اور ڈرامہ بنانا بہت آسان ہوتا ہے کیونکہ وہ تو سجے سجائے گھروں میں اے سی چلا کر شوٹنگ کرتے ہیں، جبکہ مجھے اپنے سیریل کے لیے لوکیشنز ڈھونڈنی پڑتی ہے اور میں جن لوکیشنز پہ کام کرتا ہوں وہ مشکل ترین لوکیشنز ہوتی ہیں اور میرے سیریل کے فنکار بھی مجھ سے بہت تعاون کرتے ہیں۔ ٹیم ورک ہو تو سیریل کی کامیابی لازمی ہوتی ہے۔"

★ "جب آپ اسکرپٹ ڈیپارٹمنٹ میں تھے تو مروت کا مظاہرہ کرتے تھے یا میرٹ کو مدنظر رکھتے تھے؟"

٭ "ہمیشہ میرٹ کو مدنظر رکھا۔ میرے پاس کئی پرانے اور سینئر رائٹرز کے اسکرپٹ آتے تھے مگر میں دیکھتا تھا کہ ان کے ڈرامے آج کے دور سے میچ نہیں کرتے تھے، ان کی کہانی میں ربط نہیں ہوتا تھا پھر سین لمبے لمبے ہوتے تھے اور لمبے لمبے سین آج کل کے دور میں کوئی برداشت نہیں کر سکتا۔ انہیں نئی سوچ اور نئے دور کو مدنظر رکھ کر ڈرامہ لکھنا چاہیے۔ ہماری پرانی نسل میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جن میں کسی کو راستہ دینے یا دکھانے یا گلے لگا کر حوصلہ افزائی کرنے کی عادت نہیں ہے بس اپنی پرانی یادوں کے ساتھ جی رہے ہیں۔"

★ "آپ ڈائریکٹ ڈرامے کی دنیا میں آئے یا پہلے کسی اور فیلڈ میں کام کیا آپ نے؟"

٭ "ڈائریکٹ ڈرامے کی سائیڈ نہیں آیا..... پہلے تو میں نے میگزین شو ٹائپ کے پروگرام کیے۔"

★ "پہلا ڈرامہ کس کے ساتھ کیا آپ نے کیونکہ یہ بھی بڑا رسک ہوتا ہے کسی ڈائریکٹر کے لیے؟"

٭ "جی بالکل پہلا ڈرامہ جو آن ایئر گیا وہ "جادو" تھا جسے یاسر نواز نے ڈائریکٹ کیا تھا۔ جب عاطف حسین اس فیلڈ میں آئے تو انہوں نے بھی میرا ہی ڈرامہ کیا۔ مظہر معین اس فیلڈ میں آئے تو انہوں نے بھی میرا ہی ڈرامہ ڈائریکٹ کیا۔ احمد کامران نے بھی میرے ہی ڈرامہ سے ڈائریکشن کا آغاز کیا۔"

★ "تو پھر آپ خوش قسمت ہیں یا ڈائریکٹر؟"

٭ قہقہہ..... "اس کا فیصلہ تو لوگ ہی کر سکتے ہیں لیکن میرے خیال سے دونوں ہی ہیں۔ یوں کہیے کہ آپ جس کے ساتھ آئے یا جو آپ کے ساتھ آیا دونوں کے ستارے ملے اور کامیابی دونوں کے حصے میں آئی۔"

★ "خیر..... اب آپ سے کچھ نجی سوال، مگر پہلے یہ بتائیے کہ آپ کی پہلی تحریر کس عمر میں شائع ہوئی تھی؟"

٭ "آٹھ سال کی عمر میں افسانہ لکھا تھا "کوے کا راز" اور اس کو پڑھ کر لوگ حیران تھے کہ کیا یہ ایک آٹھ سال کے بچے نے لکھا ہے۔"

★ "اب بتائیے کہ کب کہاں پیدا ہوئے وغیرہ وغیرہ۔"



٭ ”میں 18 مارچ 1971ء میں کراچی میں پیدا ہوا اور میں نے اردو ادب میں ماسٹرز کیا ہے۔“

★ ”آپ کی کم عمری میں شادی ہوئی جو کامیاب نہ ہو سکی۔ پھر دوبارہ شادی کیوں نہیں کی اور ناکامی کی وجہ؟“

٭ ”پہلی شادی میں نہ میں میچور تھا نہ وہ۔ اس لیے ناکام ہو گئی اور دوسری شادی اس لیے نہیں کی کہ میرے لیے ایک ہی تجربہ کافی ہے۔ ویسے بھی میں کام میں اتنا مصروف رہتا ہوں کہ اگر شادی کروں گا تو اسے ٹائم نہیں دے پاؤں گا۔“

★ ”مزاج کے کیسے ہیں؟“

٭ ”مزاج کا تو میں بہت ہی زیادہ نرم ہوں اور تب ہی ہر کوئی ایموشنل بلیک میل کر لیتا ہے۔ غصہ بہت ہی کم آتا ہے۔“

★ ”کھانے پینے میں کیا پسند ہے؟“

٭ ”کھانے میں مجھے مچھلی، کریلے، سرسوں کا ساگ اور مکئی کی روٹی بہت پسند ہے۔“

★ ”فارغ اوقات کے مشاغل؟“

٭ ”جم ضرور جاتا ہوں اور میوزک سنتا ہوں کیونکہ میوزک سے مجھے سکون ملتا ہے۔“

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے فصیح باری خان سے اجازت چاہی کہ جنہوں نے شارجہ (دبئی) سے ہمیں انٹرویو دیا۔



میری بھی سنیے

عروۃ الوثقیٰ

شاہین رشید



1 "پورا نام؟"
"عروۃ الوثقیٰ۔"
2 "مطلب؟"
"ایمان کی مضبوط گرفت۔"
3 "مختصر نام؟"
"صرف عروہ۔"
4 "محبت سے بلاتے ہیں؟"
"ممی بلاتی ہیں پری کے نام سے۔"
5 "کب دنیا میں آئی؟"
"2 جولائی 1991ء کو۔"
6 "ستارہ؟"
"دکینسر۔"
7 "تعلیمی ڈگریاں؟"
"ایک ہی ہے۔ گریجویٹ ہوں۔"
8 "فیملی ممبرز؟"
"5۔۔۔ والدین میں ماورا اور ایک بھائی۔"
9 "شادی؟"
"جب اوپر والے کا حکم ہو جائے گا۔"
10 "ٹی وی میں آمد؟"
"اپنی صلاحیتوں سے آئی ہوں۔ چھوٹی تھی تو تھیٹر میں کام کیا پھر میرے کام کو دیکھ کر جی چینل والوں نے بلایا۔ اس وقت اسلام آباد میں تھی اسی چینل کے لیے کراچی آئی تو وی جے کی آفر آ گئی پھر ڈراموں کی۔"
11 "پہلی پہچان؟"
"بہ حیثیت وی جے کے ہی پہچان ملی۔"
12 "ڈرامہ جس نے عروج دیا؟"
"میری لاڈلی' جس پر تو لائن ہی لگ گئی۔"
13 "چھوٹی عمر کی کمائی؟"
"10 ہزار تھی۔۔۔ اتنا تو لوگ ایک دم سے پڑھ لکھ کر بھی نہیں کماتے۔۔۔ اور میں نے یہ 10 ہزار تھیٹر سے کمائے جب میں کافی چھوٹی تھی۔"
14 "دریا' سمندر' چاندنی رات ڈر لگتا ہے؟"
"بالکل بھی نہیں بلکہ اچھا لگتا ہے سمندر کو دیکھ کر توانرجی ملتی ہے اور پھر چاندنی رات ہو تو کیا ہی کہنے۔ آئیڈیل وقت ہو گا میرے لیے۔"
15 "میری طاقت؟"
"میری فیملی' میری بہن' میرا بھائی' میری ماں۔"
16 "مجھے دکھ ہوتا ہے؟"
"جب لوگ میرے خلوص کا غلط مطلب لیتے ہیں اور جب مجھے محبت کا جواب محبت سے نہیں ملتا۔"

17 "لوگوں کے کن رویوں پہ حیران ہوتی ہوں؟"
"میں حیران ہوتی ہوں اس بات پر کہ لوگ اپنے جیسے لوگوں کو آگے کیوں نہیں بڑھنے دیتے' کیوں ایک دوسرے کی جڑیں کاٹتے ہیں' کیا انہیں اندازہ نہیں کہ رزق دینے والا تو خدا ہے۔"

18 "پسندیدہ تہوار؟"
"رمضان المبارک اور عید کے تہوار....."

19 "اپنے آپ میں کیا کمی محسوس کرتی ہوں؟"
"کچھ نہیں اللہ نے ایک مکمل شخصیت بنائی ہے میری۔"

والٹ بھی رکھتی ہوں کیونکہ کچھ خریدوں یا نہ خریدوں میرے پاس پیسے وافر ہونے چاہئیں۔"

23 "مجھے شوق ہے؟"
"شاپنگ کا..... شاپنگ کرنا اور گھر والوں کے لیے چیزیں خریدنا مجھے بہت پسند ہے۔"

24 "کہاں مشکل پیش آتی ہے؟"
"جہاں کہیں مجھے جھوٹ بولنا پڑے۔ کیونکہ جھوٹ بولنا میرے لیے مشکل ترین کام ہے۔ مگر کبھی کبھی مجبوری میں بولنا پڑتا ہے۔"

25 "کیا ایجاد نہ ہوتا تو زندگی ادھوری ہوتی؟"



20 "فراخ دل ہوں؟"
"بہت زیادہ..... خاص طور پر غریبوں کے لیے تو دل بہت کھلا ہے۔ راہ چلتے فقیروں کو بھی اچھا خاصا نواز دیتی ہوں..... روک نہیں سکتی اپنے آپ کو۔"

21 "گھر میں کہاں سکون ملتا ہے؟"
"گھر میں ہی تو سکون ملتا ہے..... ہر جگہ ہر کونے میں۔"

22 "بیگ میں کیا کیا چیزیں رکھتی ہوں؟"
"کیا کیا چیزیں نہیں رکھتی..... فون' ہیڈ فون' گلاسز اور پرفیوم ان کے بغیر تو میں رہ ہی نہیں سکتی اور چھوٹا

"میرے خیال سے ٹیلی وژن اور موبائل فون..... یہ تو اب زندگی کا لازمی جزبن گیا ہے۔"

26 "عروج پا کر کیا سوچتی ہوں؟"
"اس قابل تو نہ تھی اللہ نے کتنا کرم کر دیا ہے..... کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں بھی کوئی خاص شخصیت بن جاؤں گی۔"

27 "ایک دعا جو ہر وقت لبوں پہ رہتی ہے؟"
"گھر والوں کو صحت و تندرستی کے ساتھ سلامت رکھنا اور مجھے جو عزت و شہرت دی ہے اسے برقرار رکھنا۔"

28 "شوبز میں کیا برائی ہے؟"

"فی الحال تو کوئی برائی نہیں ہے برائی تب ہی پیدا ہوتی ہے جب آپ موقعہ دیتے ہو۔"

29 "لڑکوں کا گھورنا کیسا لگتا ہے؟"

"بہت برا میں تو صاف کہہ دیتی ہوں کہ بھائی مسئلہ کیا ہے بس پھر وہ آنکھیں نیچی کرلیتا ہے.....ہاہاہا..... شاید بھائی کا لفظ پسند نہیں۔"

30 "لوگ پوچھتے ہیں؟"

"کیا محبت ایک بار ہوتی ہے.... تو میں سوچتی ہوں کہ یہ محبت کیا ہوتی ہے اور کیسے ہو جاتی ہے... ابھی تک تو محبت نامی چیز کو نہیں جانتی۔"

31 "موبائل نمبر چینج کرتی ہوں؟"

"نہیں ایک ہی بار۔ چینج کیا تھا۔ پھر نہیں کیا کیونکہ لوگوں کو پریشانی ہوتی ہے۔"

32 "کس انڈین اسٹار سے شکل ملتی ہے؟"

"لوگ کہتے ہیں کہ کرینہ کپور سے میری شکل ملتی ہے، مگر مجھے نہیں لگتا کہ ایسا ہو گا۔ دور نزدیک بھلا کہاں ملتی ہے میری شکل اس سے۔"

33 "مجھے بری لگتی ہیں وہ لڑکیاں؟"

"جو کہتی ہیں کہ ہمیں تو انڈا ابالنا بھی نہیں آتا۔" یہ کوئی فخر کی بات نہیں ہے، بلکہ بے عزتی والی بات ہے لڑکیوں کو سب کچھ آنا چاہیے۔

34 "میں خود کیسی ہوں گھریلو امور میں؟"

"بہت ہوشیار..... ہر کام کرلیتی ہوں اور مجھے گھر کے کام کرنا اور کھانا پکانا بہت اچھا لگتا ہے۔"

35 "فلم کے لیے میری خواہش ہے کہ؟"

"صرف ہالی ووڈ کی فلموں میں کام کروں۔"

36 "ایک کردار جو کرنا چاہتی ہوں؟"

"ایک "الہڑ مٹیار" کا جو انتہائی بھولی بھالی ہو، جو میک اپ اور نت نئے فیشن سے ناواقف ہو۔ مگر ہو شوخ و چنچل۔"

37 "میں تنگ آگئی ہوں؟"

"اپنی روٹین لائف سے کہ کتنے بجے اٹھنا ہے اور کتنے بجے کیا کرنا ہے زندگی نہ ہوئی گھڑی کی سوئیاں ہو گئیں۔"

38 "میرا دل چاہتا ہے کہ؟"

"کہ میں ایک عام انسان کی طرح زندگی گزاروں..... میں شہرت پا کر اللہ کی ناشکری نہیں کر رہی لیکن گھر سے نکلو یا شاپنگ سینٹر میں نکلو تو مشکل ہوتی ہے۔ اپنی زندگی اپنی نہیں لگتی۔"

39 "میری ایک عادت جو لوگوں کو بری لگتی ہے؟"

"کہ میں اپنی غلطی پر بلکہ ذرا سی غلطی پر بھی سوری کرلیتی ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہر وقت سوری کی عادت کو ترک کرو۔"

40 "ایک شوق جو پورا کرنا چاہتی ہوں؟"

"مجھے گانے کا بہت شوق ہے اور میں اچھا گاتی بھی ہوں۔ بس تھوڑا سا سیکھ کر اپنے اس شوق کو منظر عام پر لانا چاہتی ہوں۔"

41 "بہت جذباتی ہو جاتی ہوں؟"

"جب مما کہتی ہیں کہ بس اب تمہاری شادی ہو جانی چاہیے۔ سوچتی ہوں، پھر میں اپنی ماں کو کتنا مس کروں گی اور پتا نہیں میری شادی شدہ لائف کیسی ہو گی۔"

42 "ملک میں کیا تبدیلی بہت ضروری ہے؟"

"بجلی... یہ بحال ہو جائے تو بہت سے مسائل حل ہو جائیں ملک سے باہر جائیں تو وہاں ایسا کوئی پرابلم نہیں ہوتا۔"

43 "میں اکثر سوچتی ہوں کہ؟"

"کیا ہمارا ملک بھی کبھی ترقی کرے گا کیا ہم بھی اسے کبھی خوشحال دیکھیں گے۔ کیا ہمیں بھی کبھی بنیادی سہولتیں ملیں گی۔"

44 "دھوکا کون دیتا ہے؟"

"ارے دھوکے باز تو کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ بس احتیاط کریں کہ کسی کو اپنے قریب نہ کریں کہ وہ آپ کے ہر راز سے واقف ہو جائے اور پھر جب دھوکا دے تو آپ کو تکلیف ہو۔"

45 "میری شخصیت کا پہلا تاثر؟"

"شاید میں غصے والی ہوں۔ حالانکہ ایسا کچھ نہیں ہے شاید میری شکل ہی ایسی ہے۔"

46 "بھروسے کے قابل کون ہوتا ہے؟"

"یہ اپنے پر بھی منحصر ہے کہ ہم دوسروں کے ساتھ کیسے ہیں اور سامنے والے پر بھی منحصر ہے کہ وہ کیسا انسان ہے۔"

47 "دوسروں میں کیا بات نوٹ کرتی ہوں؟"

"وہ کتنا عاجزی و انکساری والا ہے۔ اس کی طبیعت میں کتنی نرمی اور کتنی گرمی ہے۔"

48 "کون سا دن اچھا لگتا ہے؟"

"چھٹی کا دن۔"

49 "چھٹی کا دن کیسے گزارتی ہوں؟"

"چھٹی خواہ اتوار کی ہو یا کسی بھی دن کی سو کر ہی گزارتی ہوں۔ کیونکہ کوئی کام تو ہوتا نہیں ہے۔"

50 "مجھ میں عام لوگوں میں کیا فرق ہے؟"

"یہی کہ میں ہجوم میں بھی اپنے آپ کو اکیلا محسوس کرتی ہوں۔ کیونکہ شاید میں دوسرے لوگوں سے ذرا مختلف مزاج کی ہوں اور میری سوچ بھی دوسروں سے کچھ الگ ہے۔"

51 "ناشتا جو شوق سے کرتی ہوں؟"

"ناشتا زیادہ شوق سے نہیں کرتی۔ بس لسی کا گلاس پی لیتی ہوں یا کوئی مزے دار سا جوس۔"

52 "ماں کے ہاتھ کی بنی ہوئی کیا چیز پسند ہے؟"

"میری ماں بہت اچھا کھانا پکاتی ہیں ان کے ہاتھ کی بنی ہوئی ہر چیز مجھے بہت پسند ہے۔ خاص طور پر لسی تو وہ بہت ہی مزے دار بناتی ہیں۔"

53 "فارغ وقت میں ڈرائنگ کرتی ہوں؟"

"میری ڈرائنگ بہت اچھی ہے اور مجھے شوق بھی ہے۔۔۔ تو بس جب کبھی کاغذ قلم ہاتھ آجائے سینریاں بناتی ہوں۔"

54 "سفر کے لیے میری پسندیدہ سواری؟"

"بیرونی ملک کے لیے ظاہر ہے ہوائی جہاز سے بہتر کوئی سواری نہیں اور لوکل کے لیے اپنی کار۔"

55 "کس ملک کی شہرت چاہتی ہوں؟"

"کسی ملک کی نہیں کہ اپنے ملک سے بہتر کوئی ملک نہیں ہے۔ یہیں اپنا جینا مرنا ہے۔"

56 "مطالعہ آج کے دور میں ضروری ہے؟"

"جی۔۔۔ بہت ضروری ہے مجھے مطالعہ کا بہت شوق ہے۔ تھوڑا کروں یا زیادہ کرتی ضرور ہوں۔"

57 "رسمیں جو پسند ہیں؟"

"شادی بیاہ کی تمام رسمیں اچھی لگتی ہیں۔ مگر یہ بھی دیکھتی ہوں کہ دوسرے کلچر میں کیا رواج ہیں۔۔۔ تو ان کے بارے میں پڑھ کر بہت مزا آتا ہے۔"

58 "ایک شخصیت جس سے ملنا چاہتی تھی؟"

"لیڈی ڈیانا۔۔۔ مگر جب ان کا انتقال ہوا۔ میں چھوٹی تھی اور پتا نہیں میری ملاقات ہوتی بھی یا نہیں۔ لیکن وہ مجھے اچھی بہت لگتی تھیں۔"

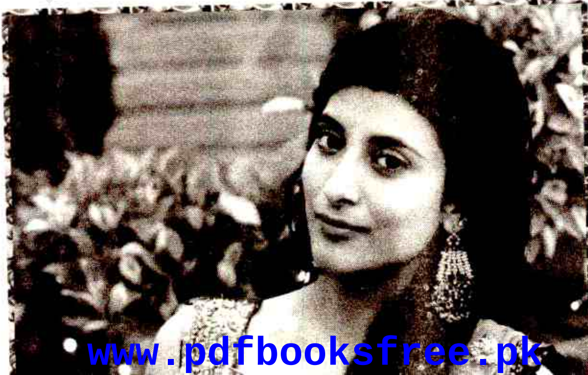
59 "کون سا دن اہتمام سے سیلبریٹ کرتی ہوں؟"

"اپنی سالگرہ کا دن۔"

60 "فیس بک اور انٹرنیٹ سے لگاؤ؟"

"اس حد تک کہ لوگوں کو اپنے بارے میں اپ ڈیٹ کرسکوں۔"

✲ ✲



آواز کی دنیا سے

صارم خان

شاہین رشید

جب اللہ تعالیٰ نے انسان کا رزق کسی جگہ سے وابستہ کردیا ہوتا ہے تو وہ بندہ خواہ اس سے کتنا ہی دور بھاگے رب نے وہیں پہنچانا ہوتا ہے۔ صارم خان کی کب خواہش تھی ریڈیو سے وابستہ ہونے کی مگر نہ صرف انہیں ریڈیو پہ بحیثیت آر جے کے پروگرام ملے بلکہ ایم بی اے کرنے کے بعد جاب بھی اسی ادارے میں ملی تو آیئے ان سے آپ کی ملاقات کرائیں۔

★ "کیسے ہیں صارم اور کیا مصروفیات ہیں؟ مطلب ایف ایم 100 کے علاوہ کیا کرتے ہیں؟"

☼ "جی اللہ کا شکر ہے.... سب ٹھیک ٹھاک ہے.... اور مصروفیات کچھ یوں ہے کہ نوکری پیشہ ہوں ایف ایم 100 میں ہی "مارکیٹنگ اینڈ سیل" سے وابستہ ہوں۔ صبح 9 سے 5 ہماری مارکیٹنگ اینڈ سیلز ہوتی ہے اور پھر 5 سے 7 ایف ایم پہ میرا شو ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مصروفیات کچھ خاص نہیں ہیں۔ کتابوں سے دلچسپی ہے ٹریولنگ سے دلچسپی ہے۔ ہر سال میرا جانا ہوتا ہے پہاڑوں کی طرف وہاں پہ کیمپنگ اور ٹریکنگ کا بھی شوق ہے.... تو اس حوالے سے کافی گھومنا پھرنا رہتا ہے۔"

★ "کن علاقوں میں زیادہ جاتے ہیں؟"

☼ "قراقرم، اسکردو اور گلگت، نانگا پربت کا بیس کیمپ ہے وہاں زیادہ جانا ہوتا ہے، بہت خوب صورت مقامات ہیں اور وہاں کافی ٹورسٹ آتے ہیں۔ وہاں آبادی نہیں ہے اور کافی لمبا کئی کئی میل چلنا پڑتا ہے کھانے پینے کا سامان لے کر نکلتے ہیں اور پھر شام ہوتے ہی کہیں پڑاؤ ڈالتے ہیں تو بہت انجوائے کرتے ہیں، بہت مزا آتا ہے۔"

★ "اپنا ملک اتنا خوب صورت ہے مگر پھر بھی لوگ ملک سے باہر جاتے ہیں گھومنے پھرنے کے لیے.... کیوں؟"

☼ "میں کہتا ہوں کہ پاکستان بہت خوب صورت ملک ہے میرے والد صاحب پی آئی اے میں جاب کرتے ہیں اور ان کے توسط سے کافی دنیا میں نے دیکھی ہے۔ لیکن پاکستان کے میں نے ابھی تک جتنے بھی علاقے دیکھے ہیں میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ پاکستان بہت خوب صورت ملک ہے۔ ہمارے پہاڑی سلسلے قراقرم اور ہندوکش پوری دنیا میں مشہور ہیں ہمالیہ سب سے بڑی پہاڑی سلسلے بھی ہیں.... اور دنیا بھر سے لوگ انہیں دیکھنے کے لیے آتے ہیں.... مگر ہمارے اپنے ملک کے لوگوں کو اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہے کہ ہم کتنی ساری نعمتوں سے مالا مال ہیں۔"

★ "ریڈیو کی طرف رجحان کیسے ہوا، کب سے ہیں اور کس طرح قدم بہ قدم آگے بڑھے؟"

☼ "جب میں زیبسٹ سے ایم بی اے کر رہا تھا تو میرے دو دوست جو میرے کلاس فیلو بھی تھے دانش انس اور سارہ سہیل، سارہ سہیل ایف ایم 100 میں پروگرام کیا کرتی تھیں جبکہ دانش اور میں تقریری مقابلوں میں حصہ لیا کرتے تھے اور اپنی یونیورسٹی کی نمائندگی کیا کرتے تھے۔ دانش کو ریڈیو پہ کام کرنے کا شوق تھا اس نے آڈیشن دیا اور کامیاب ہوگیا۔ اس طرح اس کا ریڈیو میں پروگرام کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا.... دانش نے مجھے بہت فورس کیا کہ تم بھی ریڈیو کی طرف آجاؤ.... مگر میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ایک دن اتفاق سے میں ایف ایم 100 گیا دانش سے ملنے تو اس



نے مجھے اوپر بلایا' وہاں انجینئر ندیم انصاری صاحب بیٹھے ہوئے تھے' انہوں نے مجھے کہا کہ "آپ کے پاس دس منٹ ہیں آپ تیاری کر لیں۔ آپ کا آڈیشن ہے۔" خیر زبردستی ہمارا آڈیشن کروا دیا گیا..... اور ہم سلیکٹ بھی ہو گئے..... اور جب ہمیں آفر ہوئی تو ہم نے منع کر دیا کہ نہیں جی ہم تو پڑھائی میں مصروف ہیں ہمارا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ سال ڈیڑھ سال تک آفرز کا سلسلہ چلتا رہا۔ جولائی 2007ء میں میرا پہلا شو آن ایئر ہوا "سنڈے مارننگ شو" کے نام سے اور یہ شو کراچی اور لاہور سے بیک وقت لائیو گیا تھا اور 2007ء سے لے کر 2014ء تک (اگست) میں اس ایف ایم سے وابستہ ہوں۔"

★ "جاب کے لیے کیسے منتخب ہوئے آپ؟"

"اس ایف ایم پہ کچھ ایسی صورت حال بنی کہ انہیں ایک ایسے امیدوار کی ضرورت تھی کہ جس نے مارکیٹنگ اینڈ سیلز میں ایم بی اے کیا ہوا ہے۔ چنانچہ — انتظامیہ نے ہم سے پوچھا اور ہم نے ہامی بھر لی..... اور یوں ہم اس جاب کے لیے منتخب ہو گئے۔"

★ "جب پہلا پروگرام کیا تو کیا تاثرات تھے۔ کیا رسپانس ملا اور تعریف ہی سنی ہو گی تو کیا دل چاہا کہ اسے جاری رکھوں؟"

☆ "جب پہلی بار میں نے اپنی آواز سنی تو مجھے اپنی ہی آواز بہت عجیب سی لگی تھی اور میں حیران ہوا تھا کہ یہ میری آواز ہے مجھے اپنی آواز بہت بری لگی تھی اور اب بھی اچھی تو نہیں لگتی لیکن اب بہت عادت ہو گئی ہے اپنی آواز سننے کی..... مگر مجھے کبھی بھی یہ نہیں لگتا کہ یہ میری آواز ہے۔"

★ "مارننگ شو کا مطلب مارننگ شو ہی ہوتا ہے اور عموماً" چھ یا سات بجے شروع ہوتا ہے۔ تو صبح صبح اٹھنا مشکل تو لگتا ہو گا؟"

☆ قہقہہ "واقعی صبح اٹھنا ایک مشکل کام تھا۔ اتوار کی صبح 7 بجے شو ہوا کرتا تھا اور صبح کے شو کی وجہ سے ہفتے کی پوری رات میں جاگا کرتا تھا۔ اس کی وجہ کوئی ٹینشن نہیں تھی بس اس ڈر سے کہ لائیو شو میں کہیں لیٹ نہ ہو جاؤں میں صبح چھ بجے شو کے لیے نکل جایا کرتا تھا اور پھر شو سے واپس آکر سویا کرتا تھا..... اور لمبی تان کے سوتا تھا اور جناب پھر ایک دن ہمیں کہا گیا کہ آپ شام کو شو



کریں گے۔"

★ "آپ نے تو بڑا شکر ادا کیا ہو گا؟"

☼ "بالکل جی کافی شکر ادا کیا۔ مگر کچھ عرصے کے بعد دانش اور میرا مارننگ شو شروع ہو گیا۔ وہ صبح سات سے دوپہر گیارہ بجے تک ہوتا تھا اور ہفتے کے چھ دن ہوا کرتا تھا۔ وہ زیادہ ذمہ داری کا کام تھا تو پھر وہ پروگرام بھی بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ کیا..... بس اسی اتار چڑھاؤ میں اب فائینلی شام 5 سے 7 بجے میرا شو ہوتا ہے۔ پرائم ٹائم شو ہے میرا۔"

★ "کمبائن شو کرنے کا زیادہ مزا آتا ہے، یا سنگل شو کا؟"

☼ "دونوں کا الگ اپنا مزا ہے..... سولو شو کا ایک فائدہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ آپ کا اپنا شو ہوتا ہے اور آپ اپنے حساب سے اس شو کو لے کر چلتے ہیں..... جبکہ کمبائن شو میں یہ بہت ضروری ہوتا ہے کہ آپ کی کیمسٹری اپنی ساتھی کے ساتھ میچ ہو..... کمبائن شو میں مزا زیادہ آتا ہے۔ گپ شپ بڑے مزے کی ہوتی ہے اور وقت گزرنے کا پتا بھی نہیں چلتا اور یہ بھی بتا دوں کہ کمبائن شو کو سامعین زیادہ پسند کرتے ہیں۔"

★ "آپ بتا رہے ہیں کہ دانش اور آپ نے مل کر کیا جبکہ عموماً" کمبائن شو میں ایک خاتون اور ایک صاحب ہوتے ہیں۔ تو رنگ جمتا ہے..... کسی خاتون کے ساتھ کرنے کا اتفاق ہوا؟"

☼ "بالکل ہوا ہے۔ آج کل ہمارا پروگرام جو پانچ سے سات ہوتا ہے۔ جس کا نام "بمپر ٹو بمپر" ہے وہ ہفتے میں 3 دن میں سولو کرتا ہوں اور 3 دن میرے ساتھ غزالہ کیفی کی بیٹی "سونم کیفی" ہوتی ہیں..... تو سونم کے ساتھ پروگرام کر کے مزا آتا ہے۔"

★ "کبھی ایسا ہوا کہ دیر سے پہنچے، جبکہ پروگرام شروع ہونے والا ہے؟"

☼ "کئی مرتبہ ایسا ہوا اور سات سال میں بے تحاشا ایسے مواقع آئے ہیں کہ مجھے دیر ہو جاتی ہے۔"

★ "تو غصہ نہیں آتا آپ کے باس کو کہ دیر سے

آتے ہو، چلو چھٹی کرو؟"

٭ "اس حوالے سے میں اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ یقین جانیے ایف ایم 100 مجھے اپنے گھر جیسا ہی لگتا ہے...... یہاں پہ جو محبتیں مجھے ملی ہیں جو لوگ میرے ساتھ کام کرتے ہیں جو میری ٹیم ہے جو میرے باس ہیں محمد علی خان پروڈکشن ہیڈ ہیں میرے لیے بالکل بڑے بھائی کی طرح ہیں...... یقیناً میرے اس فعل سے ان کو غصہ آتا ہوگا۔ مگر انہوں نے نہ کبھی مجھے ڈانٹا اور نہ ہی غصے کا اظہار کیا بلکہ ایک بڑے بھائی کی حیثیت سے ہمیشہ اچھا ہی سمجھایا۔"

★ "آر جے کا کام آسان ہوتا ہے یا مشکل؟"

٭ "ایک سامع کو تو بہت آسان لگ رہا ہوتا ہے سننے میں کہ ایک شخص بول رہا ہے اور پھر اس نے گانا چلا دیا اور پھر کمرشل چل گئے...... لیکن جب ہم پینل پہ بیٹھتے ہیں اسٹوڈیو میں تو ہمیں 3، 3 کمپیوٹر آپریٹ کرنے ہوتے ہیں۔ ایک کے اوپر گانے نکالتے ہیں۔ ایک پہ اشتہارات اور ایک کے اوپر SMS آ رہے ہیں تو آپ کو سب پر بیک وقت نظر رکھنی ہوتی ہے اور سب کو خاص طور پر کمرشلز کو تو اپنے وقت پر ہی چلانا ہوتا ہے۔ تو تسلسل برقرار رکھنا ایک مشکل کام ہے لیکن آہستہ آہستہ مہارت ہو ہی جاتی ہے۔ مگر پھر بھی کبھی کبھی لائیو شو میں کوئی غلطی کوئی حماقت ہو ہی جاتی ہے۔ مگر ابھی تک میرے باس نے کبھی وارننگ بھی نہیں دی۔"

★ "جب لیٹ ہوتے ہیں تو پروگرام میں کیا ہو رہا ہوتا ہے...... صرف میوزک؟"

٭ "ہاں جی میوزک چل رہا ہوتا ہے۔ ہمارے ساؤنڈ انجینئر...... گانے وغیرہ لگاتے رہتے ہیں اور اشتہارات بھی اپنے وقت پر چل رہے ہوتے ہیں اور جب ہم آجاتے ہیں تو شو سنبھال لیتے ہیں۔"

★ "حماقت کی بات کی تو لائیو شو میں لائیو کالز میں کوئی حماقت ہوئی؟"

٭ "میں اپنے شو میں لائیو کالز نہیں لیتا۔ کالز میں



صرف اہم تہوار کے موقع پر لیتا ہوں...... اور ویسے بھی میرے شو کی ٹائمنگ ایسی ہے کہ کالز زیادہ آ نہیں سکتیں۔ کیونکہ اس وقت سب کی آفس سے واپسی ہو رہی ہوتی ہے گاڑی میں سفر کے دوران تو بس میوزک ہی سننا چاہتے ہیں لوگ یا کوئی اچھی کام کی بات سننا چاہتے ہیں لوگ اور میرے شو کا فارمیٹ یا تھیم یہی ہوتا ہے کہ شوبز کے حوالے سے یا ملکی حالات کے حوالے سے یا نئی ٹیکنالوجی کے بارے میں لوگوں کو بتاؤں یا کچھ چٹ پٹی باتیں۔"

★ "کیا آر جے کے لیے یہی ضروری ہے کہ اس میں بولنے کی صلاحیت ہو یا کوئی ٹریننگ وغیرہ بھی ہوتی ہے کوئی تعلیم، کوئی کوالٹی؟"

٭ "جی پڑھا لکھا ہونا تو خیر پہلی ترجیح ہوتی ہے اور ٹریننگ بھی ہوتی ہے آڈیشن ہو جانے کے بعد ٹیلنٹ دیکھا جاتا ہے اور پھر ٹریننگ کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اور پھر یہ امیدوار پر منحصر ہے کہ وہ کتنی جلدی ہر چیز کو

سیکھتا ہے۔ میری ٹریننگ تو دو ہفتے کی ہوئی تھی۔ اور پھر مجھے لائیو شو دے دیا گیا۔"

★ "آپ آر جے بھی ہیں اور اسی FM میں جاب بھی کرتے ہیں۔ آپ کی سیلری اتنی ہے کہ مزید کام کی ضرورت پیش نہیں آتی؟"

⁂ "فل ٹائم میری جاب ہے اور آر جے کے پروگرام کرنا میری پارٹ ٹائم جاب کہہ لیں ... جتنے بھی آر جے ہیں وہ کہیں نہ کہیں ضرور کام کر رہے ہوتے ہیں۔ انہیں جو سیلری یا جو معاوضہ ملتا ہے وہ کوئی بہت اچھا نہیں ہوتا ... آر جے تو اپنا شوق پورا کرنے کے لیے پروگرام کرتے ہیں۔"

★ "ٹی وی کی طرف آپ کا رجحان ہوا؟"

⁂ "آپ کو یہ سن کر حیرانی ہوگی کہ مجھے ٹی وی پہ آنے کا کبھی بھی کوئی شوق نہیں رہا جبکہ ایکسپریس نیوز کے لیے میں نے تین سال کام کیا ہے اور نہ صرف وائس اوور کی بلکہ ایسوسی ایٹ پروڈکشن بھی کی کیمرہ بھی ہینڈل کیا ... اور ہوسٹنگ بھی کی اور میں ہوسٹنگ سے جتنا دور بھاگتا تھا اتنا ہی مجبور کر کے مجھے ٹی وی پہ ہوسٹ بنا دیا گیا ... لیکن مجھے کچھ زیادہ مزا نہیں آیا اور میں ریڈیو پہ ہی مستقل آ گیا۔ ایکسپریس نیوز میں کام کے دوران میں نے ریڈیو نہیں چھوڑا تھا اور وائس اوور یہ بھی کرتا ہوں تر کش ڈراموں میں اور کمرشلز میں بھی۔"

★ "دل نہیں چاہتا کہ اداکاری بھی کروں ... صدا کاری تو کر ہی رہا ہوں؟"

⁂ ہنستے ہوئے "اداکاری کا شوق تھا اور اب بھی ہے لیکن تھیٹر کی حد تک تھیٹر کا میں بہت بڑا فین بھی ہوں اور سیریس تھیٹر کی بات کر رہا ہوں۔ اپنا یہ شوق میں نے دوران تعلیم پورا کیا۔ اور چھوڑا اس لیے کہ ٹائم بہت دینا پڑتا ہے۔ ٹی وی کے لیے کبھی شوق نہیں رہا۔"

★ "اب چلتے چلتے اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتائیں؟"

⁂ "یوپی سے تعلق ہے ہمارے خاندان کا ... ہجرت کر کے پاکستان کے شہر کراچی آئے ... کراچی میں ہی پیدا ہوا 20 مارچ 1984ء میں۔ میں گھر کا بڑا ہوں مجھ سے چھوٹی دو بہنیں ہیں۔ والد کا بتایا کہ پی آئی اے میں ہیں اور والدہ ہاؤس وائف۔"

★ "شادی ... اور پسند سے؟"

⁂ "اب تک نہیں ہوئی ... لیکن وہ کہتے ہیں نا کہ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی ... اب میرے انکار کی سارے بہانے ختم ہو چکے ہیں اور لگتا ہے کہ بہت جلد قید کر لیا جاؤں گا ... والدہ کے ہاتھ میں یہ ڈیپارٹمنٹ ہے دیکھیں کیا ہوتا ہے ... اور والدین ہمیشہ سے یہی کہتے ہیں کہ کوئی پسند ہے تو بتا دو ... مگر سچی بات تو یہ ہے کہ اپنی پسند پر مجھے بھروسہ نہیں ہے اور اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے اپنے آپ پر بھروسہ نہیں ہے ... بلکہ اس کی دو وجوہات ہیں ایک تو یہ کہ ہر والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنی پسند سے بہولائیں نمبر دو کہ وہ تجربہ کار ہوتے ہیں اور اپنی اولاد کے لیے بہتر سوچ سکتے ہیں۔"

★ "مزاجا" کیسے ہیں؟"

⁂ "میں ہنس مکھ بھی ہوں۔ نرم بھی ہوں اور غصہ بہت کم آتا ہے اور کم سے کم میرے پاس بیٹھ کر لوگ بور نہیں ہوتے۔ میری دوستیاں بھی جلدی ہو جاتی ہیں۔"

★ "کھانے پینے میں کیا پسند ہے اور آپ کو بھی شوق ہے کوکنگ کا؟"

⁂ "اپنی اماں کے ہاتھ کا سب کچھ ہی پسند ہے۔ دال چاول کا بے حد شوقین ہوں۔ اچار ہو تو کیا بات ہے اور مجھے کوئی شوق نہیں ہے کوکنگ کا اچھا کھانا کھانے کا شوق ہے ویسے آملیٹ اور چائے اچھی بنا لیتا ہوں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے صارم خان سے اجازت چاہی۔



تنہائی کا دکھ گہرا ہوتا ہے۔ سرمائی طویل راتیں ہوں یا پیلی دھوپ بھری اداس دوپہریں، بے نیازانہ چلتے چلتے لمحہ بھر کے لیے کوئی دیکھا بھالا منظر نظروں کے سامنے آتا ہے اور یادوں کے بہت سے در وا کر جاتا ہے۔ یادوں کے تہ خانے میں حنوط وہ لمحات جو اثاثہ کل ہوتے ہیں۔ انہیں کھول کر بیٹھو تو خوبصورت چمکتی یادیں، اذیت دیتی یادیں، لبوں کو مسکراہٹ بخشنے والی یادیں اس وقت کیسے رنگ جماتی ہیں، یہ وہی جانتے ہیں جو حساس دل رکھتے ہیں۔

جانے والے واپس لوٹنے کے لیے نہیں جاتے، لیکن کبھی کبھی دل سے ہوک سی اٹھتی ہے کہ۔

بچھڑے ہوئے لوگوں کو صدا دے اے دل
تیری آواز پہ شاید کوئی مڑ کر دیکھے

اور پھر صرف ایک صدا ہی دینا تو ہماری دسترس میں ہوتا ہے۔ پلٹنے کا اختیار تو بہرحال مسافر کو ہی ہے اور کبھی یوں بھی ہوا ہے کہ جانے والے منتظر رہتے ہیں کہ

بچھڑے ہوئے یاروں کی صدا کیوں نہیں آتی
اب روزن زنداں سے ہوا کیوں نہیں آتی
اے موسم خوشبو کی طرح روٹھنے والے
پیغام ترا لے کے صبا کیوں نہیں آتی

کبھی یادوں کی پٹاری کھولو تو کیسی رنگ برنگی یادیں جگنوؤں کی طرح آنکھوں کو خیرہ کرتی ادھر ادھر بکھر جاتی ہیں۔ کچھ یادیں تحریر کی صورت میں ہمارے پاس محفوظ ہوتی ہیں۔ جب ہی تو شاعر نے ”حسینوں کے خطوط اور تصویر بتاں“ کو زندگی کا سرمایہ قرار دیا ہے۔ ”پیغام دوست“ کے عنوان سے ہم آپ کی ان یادوں کے سلسلے کو جگہ دے رہے ہیں۔ وہ دوست احباب، پیارے اور دشمن جاں جو آپ سے دور ہیں اور آپ چاہتے ہیں کہ انہیں کوئی پیغام دیں، اس کے لیے آپ قلم کا سہارا لیں اور ہمیں ارسال کر دیں۔ ہم اسے شائع کر کے اس کی خوشبو سے قارئین کے ذہنوں کو بھی معطر کریں گے اور کیا خبر کہ ”کوئی“ آپ کی صدا کا منتظر ہو۔

پیغامِ دوست

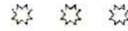
ادارہ

رابعہ یاسین کا پیغام
اپنے ملک پاکستان کے نام

لوگو!
دیس پکارے آج
گھر آنگن کو سجانا ہوگا
ماتھے سورج، آنکھوں تارے
پوروں دیپ جلانا ہوگا
اجیالوں کو آنا ہوگا

اپنی دھوپ اور اپنی چھاؤں
اپنے کھیت اور اپنے گاؤں
اپنے بل پر آپ اٹھو تو
بنجر بھی کھلیان
پکارے اپنا پاکستان
نا یہ مانگے راکھ انگارے
نا یہ آکاش کے تارے
نا یہ بپھری موجیں چاہے

ناویران کنارے
نایہ مانگے خون کی برکھا
ناجیون اندھیارے
امن کا ٹھنڈا سایہ مانگے
جینے کے ارمان
پکارے اپنا پاکستان



صبیحہ کا پیغام
لاہور میں مقیم اپنی دوست نصرت کے نام

پیاری نصرت تم جہاں کہیں بھی ہو، مجھ سے رابطہ کرو، تمہارا نمبر مجھ سے گم ہو گیا ہے، بہت ساری باتیں ہیں جو تم سے کرنی ہیں، پلیز جلدی سے رابطہ کرو اور یہ نظم تمہارے نام۔

تیرے بغیر یہ موسموں کے خوش گوار دن
اداس ہیں
فضا میں دکھ رچا ہوا ہے
ہوا کوئی اداس گیت گنگنا رہی ہے
پھول کے لبوں پہ پیاس ہے
ایسا لگتا ہے
ہوا کی آنکھیں روتے روتے خشک ہو گئی ہوں
صبا کے دونوں ہاتھ خالی ہیں
سانس لینا کس قدر محال ہے
میرے دریچوں میں
گلابی دھوپ روز جھانکتی ہے
مگر اب آنکھوں میں
وہ جگمگاہٹیں نہیں
جو تیرے وقت میں زمیں
کے صبیح ماتھے پر سورجوں کی
کہکشاں سجانے آتی تھیں
اور اب.....
دور، دور تک
وصال ابر کی کچھ خبر نہیں

لینا کا پیغام
کراچی میں مقیم اپنی دوست دانیہ کے نام

آج تک کسی نے مجھ سے صحیح سے بات نہیں کی پر تم نے میری ہر بات توجہ سے سنی اور میری سب سے اچھی دوست بنی ہو۔ تمہارا بہت بہت شکریہ، تم ہر کسی سے میرے لیے لڑنے کو تیار ہو جاتی ہو۔
تمہارا ساتھ ہو تو سارے موسم اچھے لگتے ہیں
وگرنہ بے مزا ہیں پھول، خوشبو اور برساتیں

طوبیٰ کا پیغام
کراچی میں مقیم اپنی دوست کشف کے نام

ہماری کیوٹ، جنگلی، ڈیری ملک کھانے والی لڑاکا دوست اپنی ان تمام خامیوں کے باوجود تم ہماری کلاس کا اہم حصہ ہو۔ جب بھی تم کو ہماری ضرورت پڑے گی، ہم حاضر ہیں۔ مگر جب ہم کو تمہاری ضرورت پڑے گی تو تمہاری کوئی گارنٹی نہیں۔

کرن کا پیغام لندن سے اپنی بہن ہیا کے نام

سالگرہ مبارک
دعا ہے یہ
کہ تیری زندگی میں خوشیاں رقص کریں
تیرے من آنگن میں پھول کھلیں
غم تیرے قریب نہ آسکیں
کامیابی اور کامرانی کے بے شمار لمحے تیری زندگی میں آتے رہیں
تیری ہنسی، تیری آنکھوں کی روشنی ہمیشہ قائم رہے

افشاں شریف کا پیغام
بہاول پور میں مقیم اپنی کزن حنا فرحان کے نام

حنا تم کو اور فرحان کو بیٹے کی پیدائش پر میری اور تمام گھر والوں کی طرف سے بہت بہت مبارک ہو۔ ایشان افروز نام رکھا سب کو پسند آیا۔ فرحان اب جلدی سے مٹھائی کھلاؤ، ارے ہاں ایشان کے دادا، دادی اور نانا، نانی کو بھی ہم سب کی طرف سے بہت بہت مبارک ہو۔

صدف مختار

ادارہ

☆ "آپ کا پورا نام' گھر والے پیار سے کیا کہتے ہیں؟"

○ "صدف مختار" پیار کے نام بے شمار ہیں۔ ابو 'منی' گڑیا' چوچو لائبہ' امی جی ویسے تو منو کہتی ہیں' مگر جب کام کروانا ہو تب "منی' بیٹا" کہتی ہیں۔ ننھیال و ددھیال والے علیحدہ نک نیم سے پکارتے ہیں۔"

☆ "کبھی آپ نے آئینے سے یا آئینے نے آپ سے کچھ کہا؟"

○ "نہیں جی۔"

☆ "آپ کی سب سے قیمتی ملکیت؟"

○ "میری امی جی' میری خالہ اقراء خانم کی محبت' میری دوستوں رمشا اور شیبا وغیرہ کے کارڈ یا پھر اپنی سسٹر مریم مختار کے ساتھ گزارا ہوا وہ وقت جب وہ بھلوال سے واپس آجاتی ہے اور صبا کے مہذب گالیوں سے مزین خطوط۔"

☆ "اپنے آپ کو بیان کریں؟"

○ "بہت مشکل سوال ہے' خیر دوسروں کی رائے لکھ رہی ہوں۔ پہلا تیر مریم نے چلایا ہے۔ انتہائی سگھڑ ہو۔ تین بجے انڈا بنانے بیٹھو گی تو پانچ بجے ملے گا۔ وہ بھی انتہائی بدمزا۔ ہاں تمہاری فیورٹ کک سعدیہ اقبال جیسی کوکنگ کرتی ہوں۔ خبردار میری خالہ کا نام بھی لیا تو تم مر کے بھی ان جیسی بہترین کوکنگ نہیں کرسکتیں۔ (ہائے اتنی بے عزتی) بمطابق امی جی اچھے اخلاق کی ہو' مگر چھوٹی چھوٹی باتوں پر منہ پھلا لیتی ہو۔ دوست شیبا کہتی ہے منافق نہیں ہو۔ مس عذرا بشیر صاحبہ کہتی ہیں' پراعتماد ہو' مگر سچی بتاؤں بہت زیادہ ڈھیٹ اور کام چور ہوں' جب کبھی اسکول کا کام نہیں کیا ہوتا' کاپی گھر رکھ جاتی ہوں۔"

☆ "گھر آپ کی نظر میں؟"

○ "ایک مضبوط پناہ گاہ بشرطیکہ گھر کو گھر ہی رہنے دیا جائے۔ "قید خانہ" نہ بنایا جائے۔"

☆ "اپنی کامیابیوں میں کسے حصہ دار ٹھہراتی ہیں؟"

○ "اپنی امی جی کو کہ جن کے حوصلے ہمت اور محنت کی وجہ سے میں یہاں ہوں۔ پھر اپنی ٹیچرز مقدس طاہرہ صاحبہ اور عذرا بشیر صاحبہ کو۔ اس کے بعد اپنی نانو مہراں کو کہ جو ہم سے بہت زیادہ پیار کرتی ہیں اور حقیقتاً" نانو بن کر دکھایا ہے۔ میری پیاری اور دنیا کی سب سے اچھی نانو۔"

☆ "برکھا رت کیسے انجوائے کرتی ہیں؟"

○ "کوئی خاص طریقہ نہیں یا پھر سچی بات ہے انجوائے کرتی ہی نہیں ہوں۔"

☆ "آپ اپنے گزرے کل' آج اور آنے والے کل کو ایک لفظ میں کیسے واضح کریں گی؟"

○ "توکل' جدوجہد۔"

☆ "آپ بہت اچھا محسوس کرتی ہیں جب؟"

○ "جب اپنی "بے حد حسین" خالہ ام کلثوم یا رمشا سے بات کرتی ہوں۔ نانو کے گھر جاتی ہوں اور میری خالہ اقراء خانم ہر دفعہ پیار سے میری پیشانی چومتی ہیں۔ خصوصاً" اس دفعہ جب ایٹ میں میرے اچھے مارکس آئے اور میری گریس فل ٹیلنٹڈ خالہ زاہدہ خانم نے گفٹ دیا تو بہت اچھا لگا۔ جب میری بے حد بلند حوصلے والی خالہ سعدیہ اقبال اپنی خوب صورت آواز میں منی بیٹا کہہ کر پکارتی ہیں۔"

☆ "آپ جو ہیں' وہ نہ ہوتی تو کیا ہوتیں؟"

○ "فی الحال تو نائنتھ کی طالبہ ہوں۔ اگر نہ ہوتی تو خدا ہی جانتا ہے کیا ہوتی۔"

☆ "مطالعہ کی اہمیت آپ کے لیے؟"

○ "بہت زیادہ' بہت ہی زیادہ۔"

☆ "کوئی عجیب خواہش' خواب؟"

○ "ایک فوجی بن کر شہادت کی موت پاؤں اور میرا

کزن جو مجھے بہت پیارا ہے۔ میرا بہت اچھا بھائی ہے ' وہ میرا سگا بھائی بن جائے۔"

☆ "آپ کے نزدیک دولت کی اہمیت؟"

○ "صرف اتنی کہ ضروریات زندگی پوری ہو جائیں اور دوسروں کا محتاج نہ ہونا پڑے۔"

☆ "میرا فخر؟"

○ "میری امی جی! میری دوست رمشا عظمت اور میری کتابیں سب سے بڑھ کر میرا پاکستان۔"

☆ "کیا آپ بھول جاتی ہیں اور معاف کر دیتی ہیں؟"

پلٹ کر آنکھ نم کرنا ہمیں ہرگز نہیں آتا
گزری باتوں کا غم کرنا ہمیں ہرگز نہیں آتا

محبت ہو تو بے حد ہو جو نفرت ہو تو بے پایاں
کوئی بھی کام کرنا ہمیں ہرگز نہیں آتا

معاف تو ہر کسی کو اور ضرور کر دیتی ہوں ' مگر بھول نہیں سکتی ' لیکن اس انسان سے پھر کم ہی بات کرتی ہوں ' اگر آپ۔۔۔

یاد ماضی عذاب ہے یا رب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

○ "والی بات سمجھ رہے ہیں تو ایسی کوئی بات نہیں جناب۔"

☆ "آپ کو کیا چیز متاثر کرتی ہے؟"

○ "زندگی کے گزرے پندرہ سالوں میں بہت کم چیزیں یا لوگ ہیں جن سے میں متاثر ہوئی ہوں۔ خصوصاً" اپنی چھوٹی سی خالہ اقراء سے بہت متاثر ہوں۔ سوچتی ہوں کہ کیا کوئی انسان اتنی چھوٹی سی عمر میں ایک بہترین انسان ــــ ہو سکتا ہے۔ ان کی اللہ سے محبت ' خوش اخلاقی ' کشادہ دلی اور دوسروں کے بڑے سے بڑے عیب چھپا دینے کی عادتیں مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔" بلاشبہ اقراء خانم ایک بہترین انسان بہترین بیٹی اور بہترین خالہ ہیں اور ثمینہ اکرم صاحبہ کی گہرائی میں لفظ بہ لفظ تلخ اور حقیقی تحریریں متاثر کن ہیں۔

☆ "کامیابی کیا ہے آپ کے لیے؟"

○ "آگے بڑھنے کی سیڑھی ' خوشی کا ذریعہ اور صلہ۔"

☆ "متاثر کن کتاب ' مصنف ' مووی؟"

○ "نہج البلاغہ ' بانو قدسیہ ' کوئی خاص نہیں۔"

☆ "آپ کی طاقت ' کمزوری؟"

○ "اچھی کتابیں ' خوب صورت مناظر اور میری چچی ساجدہ اور خالہ سعدیہ اقبال کی بہترین کوکنگ بھوک نہ ہو تب بھی کھا لیتی ہوں۔ میرا خدا ' میری امی جی کی محبت اور میری کتابیں۔"

☆ "آپ خوش گوار لمحات کیسے گزارتی ہیں؟"

○ "عام سے انداز میں جس طرح سب گزارتے ہیں۔"

☆ "آپ مقابلے کو انجوائے کرتی ہیں یا خوف زدہ ہو جاتی ہیں؟"

○ "مقابلے کو بہت زیادہ انجوائے کرتی ہوں ' ڈرتی بالکل بھی نہیں ہوں ' بہت مزا آتا ہے۔ ہار بھی جاؤں تو مقابل کو مبارک باد دیتی ہوں اور اپنی خامیوں کو درست کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ ہار جاتی ہوں تو بھی ہار تسلیم نہیں کرتی کیونکہ۔۔۔"

کبھی ہار کے بھی مسکراؤ بات تو تب ہے
ہر بار جیت کے مسکرانا کمال تھوڑی ہے

اور یہ کمال میں نے اپنی ٹیلنٹڈ خالہ ادیبہ صدف (بریو گرل) سے سیکھا ہے۔

☆ "آپ کی خامی اور خوبی جو آپ کو مطمئن یا مایوس کرتی ہے؟"

○ "مجھے بہت زیادہ سوالات پوچھنے کی عادت ہے ' سب اس سے بہت تنگ ہیں۔ سوائے میری پیوٹی کوئن خالہ (ام کلثوم) کے۔ کیونکہ انہیں چپ رہنے کی عادت ہے اور مجھے بولنے کی تو وہ ایک بہترین سامع ہیں ہو سکتا ہے۔ وہ بھی زچ ہو جاتی ہوں۔ مگر مجھے نہیں لگتا۔ خیر سب اس عادت کو خامی کہتے ہیں۔ سوائے میرے۔"

☆ "کوئی شخصیت یا کسی کی حاصل کی ہوئی کامیابی جس نے آپ کو حسد میں مبتلا کیا ہو؟"

○ "شکر الحمد للہ ایسی کوئی بات نہیں' حسد محسوس نہیں کرتی' البتہ رشک کہہ سکتے ہیں۔ "راشد منہاس" پر جو چھوٹی سی ایج میں شہادت پا گئے ہیں۔"

☆ "کوئی ایسی شخصیت جو آج بھی آپ کو اداس کردیتی ہے؟"

○ "پروین شاکر کی زندگی کے بارے میں جب بھی سوچتی ہوں بہت دکھ و تکلیف ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ بچوں کی سی مسکراہٹ رکھنے والی خوب صورت لڑکی انیلا خالہ۔"

☆ "آپ کی پسندیدہ شخصیت؟"

"حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم' حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ' بانو قدسیہ اور مونس الٰہی۔"

☆ "کیا آپ نے زندگی میں وہ سب پالیا جو آپ پانا چاہتی تھیں؟"

○ "جی شکر الحمد للہ اپنے پروردگار کا جس نے بن مانگے بے انتہا رحمتیں اور آسانیاں عطا فرمائیں اور جہاں تک بات ہے میرے پانے کی تو ابھی پندرہ سال کی عمر میں تو ابتدا ہے۔ بھلا وہ سب کہاں پایا ہوگا جو پانا چاہتی ہوں۔"

☆ "کوئی واقعہ جو آپ کو شرمندہ کردیتا ہے؟"

○ "ایک دفعہ آٹھویں میں ہماری نئی ٹیچر آئی تھیں۔ انہوں نے اسلامیات کا کام دیا اور کہا بچوں گھر سے خوشخط لکھ کر لانا۔ اتفاق سے اسی دن میچ تھا۔ تو میچ بھی دیکھتی رہی اور کام بھی لکھا۔ دوسرے دن ٹیچر نے کام چیک کرنا شروع کیا تو میں نے غور سے اپنا لکھا کام دیکھا۔ کافی گندہ لکھا تھا' سوچا دوبارہ سے لکھ لوں' لیکن اتنے میں میری باری آچکی تھی۔ کاپی مس کے سامنے ٹیبل پر رکھی' مس چند منٹ تک چیک کرتی رہیں' پھر میری طرف دیکھ کر کہتی ہیں۔

"شاباش بیٹا! آپ نے ایسے کام لکھا ہے' جیسے ڈاکٹر دوائی لکھ کر دیتا ہے۔" سب لڑکیاں ہنسنے لگیں۔ مجھے خود بھی ہنسی آگئی اور میں نے کہا کہ مس آئندہ خوشخط لکھ کر لاؤں گی۔ مس کہتی ہیں۔ بیٹا خدارا ایسا خوشخط لکھ کر مت لانا' ورنہ میں بے ہوش ہوجاؤں گی۔

جب یہ واقعہ یاد آتا ہے تو شرمندگی بھی ہوتی ہے اور ہنسی بھی آتی ہے۔



عیدالاضحیٰ کی آمد آمد ہے۔ لہٰذا اکتوبر کا شمارہ عید نمبر ہوگا۔ اس شمارے میں حسب روایت قارئین سے سروے بھی شامل ہوگا۔ سروے کے سوالات یہ ہیں۔

سوالات

1۔ عیدالاضحیٰ کا تہوار ہمیں ایثار و قربانی کی یاد دلاتا ہے۔ آپ نے زندگی میں کبھی ایسا ایثار کیا یا قربانی دی جو آپ کے خیال میں بارگاہ الٰہی میں بے حد پسندیدہ ہوگا اور اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دے گا۔

2۔ عیدالاضحیٰ پر گوشت کے پکوان تو بہت بنتے ہیں۔ کوئی ایسی خاص ڈش جو گوشت کی نہیں ہو اور اس عید پہ آپ سے فرمائش کی جاتی ہو۔

3۔ گوشت کا ذائقہ برقرار رکھنے اور اسے زیادہ عرصے محفوظ رکھنے کے لیے خاص ٹوٹکے جو آپ استعمال کرتی ہیں۔

4۔ قربانی کے جانور سے متعلق کوئی خاص واقعہ جو آج بھی آپ کے لبوں پر مسکراہٹ لے آتا ہے۔

ان سوالات کے جوابات اور اپنی تصویر (اگر دینا چاہیں) ہمیں جلد از جلد ارسال کردیں۔ تاکہ عید نمبر میں شامل اشاعت ہوسکیں۔

نفیسہ سعید

ایسا کب ہے زندگی

ملک صاحب اپنے گھر والوں کو بے خبر رکھ کر اپنے کم سن بیٹے ایشال کا نکاح کر دیتے ہیں جبکہ ایشال کی دلچسپی اپنی کزن عریشہ میں ہے۔

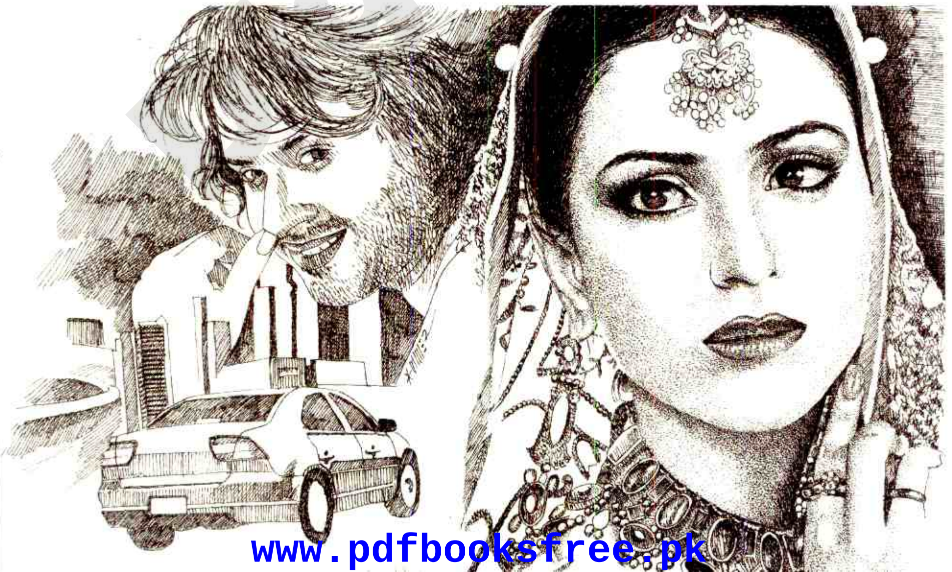
حبیبہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے حیدر آباد سے کراچی آئی ہے۔ شاہ زین کے والد نے اسے اپنے آفس میں اپائنٹ کر لیا شاہ زین حبیبہ میں دلچسپی لینے لگا۔

فرہاد تین بھائی ہیں۔ فرہاد کے دونوں بھائی معاشی طور پر مستحکم ہیں اور دونوں اپنی بیوی بچوں کی ضروریات کو دل کھول کر پورا کرتے ہیں جبکہ فرہاد اپنی بیوی زینب اور بچیوں کی ضروریات پوری کرنے میں بے حد کنجوسی سے کام لیتا ہے، جو زینب کو بالکل پسند نہیں۔

فرہاد کے بڑے بھائی کی بیوی فضہ زینب کی خوب صورتی سے حسد کرتی ہیں اور آئے دن اس حسد کا اظہار کرتی رہتی ہیں۔

(اب آگے پڑھیے)

۳
تیسری قسط





"یاد رکھو بیٹا انسان کو زندگی میں اتنا ہی ملتا ہے جتنا اس کے نصیب میں لکھا جاچکا ہو نہ اس سے رتی بھر کم اور نہ ہی زیادہ۔"

اماں جی نے اپنی تسبیح کے دانے آہستہ آہستہ گراتے ہوئے زینب کو سمجھایا جو ان کے سامنے شکایات کی ایک پوٹلی کھولے بیٹھی تھی۔

"اچھا تو پھر انسان کو کوشش کرنے کا حکم کیوں دیا گیا جو کچھ نصیب میں لکھا گیا ہے تو بنا کوشش کیے بھی مل جانا ہے۔"

وہ اماں جی کی بات سے اختلاف کرتے ہوئے بولی۔

"کیا بات ہے بیٹا کیوں اس قدر ناراض ہو تم نے تو کبھی بھی زندگی میں اس طرح بحث نہ کی جیسے آج کر رہی ہو۔"

اماں جی نے حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا وہ زینب کی دلی کیفیت ابھی تک سمجھ ہی نہ پائی تھیں۔

"اماں جی انسان جب جب محنت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے نوازتا ہے اسے وہ سب عطا کرتا ہے، جو وہ چاہتا ہے پھر وہ اللہ ہی کے دیے ہوئے میں سے دوسروں پر خرچ کرتے ہوئے اتنا بخیل کیوں ہو جاتا ہے کیوں نہیں احساس کرتا ان لوگوں کا جو اس کے زیر کفیل ہیں۔ اماں جی کیا ہمارے مذہب نے کنجوسی اور بخل سے بچنے کا حکم نہیں دیا۔ کیا اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ مال سب سے بہترین نہیں ہے، جو اپنے اہل و عیال پر خرچ کیا جائے؟ اور پھر بھی جو شخص ایسا نہ کرے اللہ کے حکم سے روگردانی کرے اللہ کے نزدیک اس کے لیے کیا حکم ہے؟ آپ مجھے وہ بتائیں۔"

وہ نروٹھے انداز میں اماں جی کی جانب تکتے ہوئے بولی۔ اماں جی کی تو سمجھ میں بھی نہ آیا کہ اسے کیا جواب دیں جس سے وہ مطمئن ہو سکے اسی لیے بنا کچھ کہے خاموشی سے تسبیح کے دانے گراتی رہیں۔

"آپ جانتی ہیں کل دوپہر فضہ بھابھی لدی پھندی میرے گھر آئیں۔"

یہاں تک کہہ کر وہ رک گئی اور ایک نظر اماں جی کے چہرے پر ڈالی جو تسبیح والا ہاتھ روکے اسی کی جانب ہمہ تن گوش تھیں۔

"ڈھیروں ڈھیر اپنے سوٹ کے کپڑے، جو بنا کہے مجھے دکھاتی چلی گئیں اور پھر پتا ہے، مجھ سے کیا کہتی ہیں؟"

اس نے ایک بار پھر رک کر اماں جی کی جانب سوالیہ انداز میں دیکھا جو اس کے غصہ کی ایسی کیفیت سے کسی قدر آشنا ہو چکی تھیں۔

"تم بتاؤ گی تو پتا چلے گا نا بیٹا کہ اس نے ایسا کیا کہا۔ جس نے تم جیسی میری صابر و شاکر بچی کی قوت برداشت کو ریزہ ریزہ کر دیا۔"

"پوچھنے لگیں کوئی اچھا سا ٹیلر تو بتاؤ' میرا ٹیلر آج کل بیمار ہے اور مجھے ان کپڑوں کو جلدی سلائی کروانا ہے اس لیے سوچا تمہارے ٹیلر کو دے دوں' حالانکہ اچھی طرح جانتی ہیں 'میں اپنے سالانہ بننے والے چار یا پانچ جوڑے خود گھر میں سلائی کرتی ہوں۔"

زینب کے لہجہ کے دکھ نے اماں جی کے دل کو بھی دکھی کر دیا۔

"دیکھو بیٹا ہر انسان اپنی حیثیت اور ظرف کے مطابق خرچ کرتا ہے اسفند اور صمد کو اللہ تعالیٰ نے خوب نواز رکھا ہے، جس کا مظاہرہ ان کی بیگمات ہمہ وقت کرتی نظر آتی ہیں جہاں تک فرہاد کا تعلق ہے وہ حیثیت اور مرتبہ کے لحاظ سے اپنے دونوں بھائیوں سے کم تر ہے' ہر وقت اللہ کا شکر ادا کیا کرو اپنی چھت کے نیچے اچھا کھا کر سوتی ہو گھر

اور گھر والا اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ بہترین نعمتوں میں سے ایک ہیں جس پر اپنے رب کریم کا جس قدر شکر ادا کیا جائے کم ہے آج اس نے اتنا دیا کل اور بھی دے گا اس کی رحمت سے کبھی مایوس مت ہو اور ہر دم یہ دعا کرو اللہ تمہارا سہاگ سلامت رکھے یاد رکھنا عورت کے پاس کتنا بھی روپیہ پیسہ کیوں نہ ہو اسے وہ تحفظ کوئی نہیں دیتا جو ایک مرد دیتا ہے یہ معمولی معمولی آسائشوں کو دیکھ کر اپنا دل برا مت کیا کرو میری بچی۔"

وہ اسے دھیرے دھیرے سمجھاتے ہوئے بولیں جواباً" زینب نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر ان کی جانب دیکھا۔

"اماں آپ تو اچھی طرح جانتی ہیں فرہاد کی آمدنی بھی ٹھیک ٹھاک ہے اللہ نے ہمیں بہت نوازا ہے اس کا لاکھ لاکھ شکر ہے اور میں تو کبھی اس سے کوئی گلہ کرتی بھی نہیں ہوں' گلہ تو مجھے فرہاد سے ہے، جو اپنے روپے میں سے صرف اور صرف میری ذات پر خرچ ہونے والی رقم کو فضول خرچی سمجھتا ہے اپنی بھابھیوں کا ہر وقت تیار رہنا اسے خوب بھاتا ہے مگر جب میری ذات پر خرچ کرنے کی باری آتی ہے تو ہمیشہ سلیقہ شعاری اور کم خرچ کا درس دیتا ہے۔"

"تم اپنے ماہانہ خرچ کے پیسوں میں سے بچت کرنے کی عادت ڈالو۔"

سب کچھ جانتے ہوئے بھی اماں جی اسے مشورہ دے بیٹھیں جسے سن کر وہ یک دم پوری جان سے جل اٹھی۔

"کون سے خرچے کے پیسے؟ آپ تو ایسے مشورہ دے رہی ہیں جیسے کچھ جانتی ہی نہ ہوں۔"

وہ خفگی سے کہتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا بیٹا ناراض مت ہو اب جب فرہاد تمہیں لینے آئے گا میں اسے سمجھاؤں گی کہ اپنی حیثیت کے حساب سے تمہیں ایک لگا بندھا خرچہ دیا کرے جو تمہارا حق اور اس کا فرض ہے بالکل اسی طرح جیسے اس کے دونوں بھائی اور میرے دونوں بیٹے دیتے ہیں اپنی اپنی بساط کے مطابق' وہ بھی اپنا فرض ادا کرنے کی عادت ڈالے اور یہ ہی ہمارے اسلام کا بھی حکم ہے۔"

"رہنے دیں آپ' انہوں نے وہ ہی پرانا جواب دینا ہے کہ میں ضرورت کی ہر چیز خرید کر گھر لے آتا ہوں سردی' گرمی' عید شب برات پر کپڑے بھی بنا دیتا ہوں پھر کس بات کا خرچہ۔"

فرہاد کی باتیں دہراتے ہوئے وہ پاؤں میں چپل ڈال کر اندر کی جانب چل دی اماں جی اس کی پشت پر نگاہیں جمائے اسے دیکھتی رہیں۔

"اماں جی کھانے میں کیا بنے گا۔" وہ اس کی جانب دیکھنے میں اس قدر محو تھیں کہ اپنی بہو کی کچن سے آتی آواز سن کر یک دم چونک اٹھیں۔

"زینب آئی ہے اس سے پوچھو جو اس کا دل کھانے کو چاہے وہ ہی بنالو۔"

اپنی بیٹی کی محبت ان کے لہجہ میں گندھی ہوئی تھی' غزالہ ان کا جواب سن کر اندر زینب کے کمرے کی جانب بڑھ گئی جبکہ اماں جی نے اپنی تسبیح ختم کر کے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

"اے اللہ میری بچی کو شکر ادا کرنے والوں میں شامل کر۔"

زینب کے حق میں اس سے بہتر دعا ان کے نزدیک کوئی اور نہ تھی۔



"یہ ایشال کب تک واپس آرہا ہے۔" انہوں نے دل ہی دل میں حساب لگایا اس کا آخری سمسٹر ختم ہوئے تقریباً" ایک ماہ سے زیادہ وقت ہو چلا تھا اب تک تو اسے آجانا چاہیے تھا۔

"شاید ابھی تو نہیں......" ملک صاحب نے ایک نظر اپنے بالکل سامنے بیٹھی اپنی نصف بہتر ڈالی جو بڑی نزاکت سے گھونٹ گھونٹ جوس حلق سے نیچے اتار رہی تھیں۔

"دراصل ابھی وہ انٹرن شپ کر رہا ہے پھر وہ اور عریشہ اسکاٹ لینڈ گھومنے کے لیے جائیں گے اس کے بعد ان کی واپسی ہوگی اب دیکھو کتنا ٹائم لگتا ہے۔"

نہایت لاپرواہی سے انہوں نے ایشال کا سارا شیڈول ملک صاحب کے گوش گزار کردیا' جسے سنتے ہی وہ کچھ بے چین سے ہو اٹھے۔

"دیکھیں بیگم صاحبہ آپ بہت اچھی طرح جانتی ہیں ایشال ایک شادی شدہ مرد ہے وہ۔ رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے باعث مجھے اس کا اس طرح عریشہ کے ساتھ تن تنہا گھومنا کچھ زیادہ پسند نہیں اور پھر مجھے یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح سب کچھ جانتے بوجھتے آپ اور آپ کے بھائی صاحب نے ان دونوں کو اس طرح دیار غیر میں آزادانہ گھومنے پھرنے کی اجازت دے دی۔"

کئی سالوں سے دل میں بسی ایک بات آج ان کے لبوں تک بھی آن پہنچی "حیرت ہے آپ ابھی تک وہ پرانا اور فرسودہ قصہ نہیں بھولے۔"

انہوں نے ابرو چڑھاتے ہوئے ملک صاحب کی جانب دیکھا۔

"قصہ......" ملک صاحب نے ان کے الفاظ کو حیرت سے دہرایا۔

"آپ شاید بھول رہی ہیں وہ واقعہ کوئی قصہ کہانی نہ تھا بلکہ ایک جیتی جاگتی اٹل حقیقت تھا جس کا سب سے بڑا گواہ میں خود ہوں' کتنا بھی وقت گزر جائے زمانے کی دھول سے ایسی باتیں مٹا نہیں کرتیں نکاح ایک ٹھوس حقیقت ہے جس سے انکار کرنا آپ کے یا ایشال کے لیے ممکن نہیں ہے' بلکہ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ آپ گزرتے وقت کے ساتھ سچائی کو قبول کرنے کے قابل ہوجائیں گی اور ایشال کو بھی سمجھالیں گی مگر حیرت ہے آپ آج تک اپنی اس پرانی ضد پر اڑی ہوئی ہیں آپ کی اس سخت دلی کے باعث ہی اللہ تعالیٰ نے آپ کو بیٹی جیسی عظیم رحمت سے نہیں نوازا۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی ملک صاحب کا لہجہ تلخ ہوگیا۔

"زندگی مجھے نہیں ایشال کو گزارنی ہے اور اپنی زندگی وہ خود عریشہ کے ساتھ گزارنے کا خواہش مند ہے اگر آپ کو یقین نہ ہو تو خود اس سے پوچھ لیجیے گا اس سارے قصہ کہانی سے' میرا کوئی لینا دینا نہیں ہے اگر آپ کا بیٹا راضی ہو تو سو بسم اللہ' جسے دل چاہے بہو بنا کر اس گھر میں لے آئیں میں کون ہوتی ہوں اعتراض کرنے والی۔"

اپنی بات ختم کرکے وہ غصہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں اب مزید کوئی بات کرنا ملک صاحب کے نزدیک بالکل بے کار اور بے معنی تھا ملک صاحب کیا چاہتے ہیں انہیں اس بات سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ملک صاحب کا کوئی جواب سنے بغیر وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھیں اور کھٹا کھٹ کرتی اوپر چڑھتی چلی گئیں ملک صاحب جانتے تھے کہ اب ان کا یہ موڈ کئی دنوں تک اسی طرح آف رہنا ہے۔

کاش ایشال ایک بار فیصلہ کرنے سے پہلے میرے ساتھ چل کر اسے دیکھ لے مجھے یقین ہے اسے دیکھنے کے بعد وہ اپنے فیصلہ پر نظرثانی ضرور کرے گا مگر اس کا ملک صاحب کے ساتھ جانا ہی ایک ناممکن امر تھا یہ ملک صاحب کی ایک ایسی خواہش تھی جو بالکل لاحاصل تھی وہ جانتے تھے کہ ایشال' عریشہ کی محبت کے جنون میں بری طرح مبتلا ہے اسے اس سے ہٹ کر دنیا کی کوئی چیز نہیں بھاتی وقت نے ثابت کردیا تھا کہ کئی سال قبل کیا جانے والا ملک صاحب کا فیصلہ ایک جذباتی عمل تھا جس کا نقصان انہیں اور اس معصوم لڑکی کو ہوا تھا۔ جسے انہوں نے بنا سوچے سمجھے ایشال کے نام سے منسوب کردیا تھا۔

ملک صاحب کو لگا تاش کے سارے پتے ان کے ہاتھوں سے نکل گئے ہیں وہ اپنی جیتی ہوئی بازی ہارتے جارہے ہیں ان کی کچھ سمجھ میں نہ آیا وہ کیا کریں اس عالم پریشانی میں ایک خیال روشنی بن کر ان کے دماغ میں کوندا وہ یک دم سیدھے ہو بیٹھے ابھی ایک آخری ترپ کا پتا ان کے ہاتھوں میں باقی تھا جسے کھیلنے کا فیصلہ انہوں نے اسی دم کرلیا اس کے بعد جو ہوتا وہ اس بچی کا مقدر جسے وقت کی گردش نے بنا کسی قصور کے اپنے جال میں جکڑ رکھا تھا انہیں ایک آخری کوشش کرنی تھی اس لڑکی کو اس کا حق دلانے کی اور ملک صاحب کو اسی فیصد یقین تھا وہ اپنی اس کوشش میں ضرور کامیاب ہوں گے باقی بیس فیصد انہوں نے اپنے رب پر چھوڑ دیا۔



وہ مسلسل شاہ زین کی نگاہوں کی زد میں تھی جو اپنے سارے کام چھوڑے شیشے کے اس پار سے مسلسل اسے تک رہا تھا اور شاید اس کی اس بے خودی کا عالم حبیبہ کو بھی نہ تھا بلیک سوٹ میں اوپر کر کے بال بنائے وہ بڑی تیزی کے ساتھ کمپیوٹر پر مصروف تھی جب اسے ظہور بلانے آیا۔

''آپ کو زین صاحب اپنے آفس میں بلا رہے ہیں۔''

''اچھا تم چلو میں آتی ہوں۔'' ظہور کے جاتے ہی اس نے اپنے سامنے رکھی فائل اٹھائی یقیناً''شاہ زین نے اس سلسلے میں کوئی بات کرنی ہوگی اسی خیال کو ذہن میں رکھتے ہوئے وہ شاہ زین کے آفس میں داخل ہوئی۔

''السلام علیکم سر''

''وعلیکم السلام بیٹھ جاؤ۔''

بظاہر اس پر ایک سرسری سی نظر ڈال کر وہ اپنے سامنے رکھی فائل میں مصروف ہو گیا۔

''آپ نے مجھے بلایا تھا'' حبیبہ نے ٹیبل کے دوسرے سرے پر کھڑے کھڑے ہی سوال کیا۔

''ہاں یہ کچھ مختلف کمپنیز کے ٹینڈر ہیں انہیں ذرا چیک کرلو۔'' اس نے اپنے سامنے رکھی فائل حبیبہ کی جانب سرکادی۔

''اوکے سر'' حبیبہ فائل اٹھا کر واپس ہی پلٹی تھی کہ شاہ زین کی آواز نے اس کے بڑھتے قدم روک دیئے۔

''حبیبہ۔۔۔''

وہ اس کا نام پکار کر رک گیا حبیبہ منتظر تھی کہ وہ آگے کچھ کہے مگر وہ تو بالکل ہی خاموش تھا ایسے جیسے کچھ کہنا چاہ رہا ہو مگر کہہ نہ پائے وہ کسی الجھن کا شکار تھا جس کا اندازہ اس کے چہرے کو دیکھ کر بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔

''کافی دن ہو گئے آپ اپنے گاؤں نہیں گئیں؟''

حبیبہ نے حیرت سے اسے دیکھا یقیناً'' یہ وہ بات نہ تھی جو وہ کرنا چاہتا تھا۔

''اصل میں سرگاؤں میں میرے چچا ہوتے ہیں جو آج کل خود یہاں کراچی آئے ہوئے ہیں۔''

''اوہ اور تمہارے والدین۔'' شاید وہ صرف اور صرف حبیبہ سے بات کرنے کا خواہش مند تھا۔

''وہ یہاں نہیں ہوتے۔''

اس دفعہ حبیبہ کا جواب دینے کا انداز پہلے سے خاصا روکھا تھا جسے شاہ زین نے فوراً'' محسوس کر لیا وہ جان چکا تھا کہ اب وہ مزید کسی سوال و جواب کے موڈ میں نہیں ہے اور پھر حبیبہ کے اگلے سوال نے اس کی بات کو درست ثابت کر دیا۔

''اب میں جاؤں سر؟''

شاہ زین کے جواب کا انتظار کیے بنا ہی وہ شیشے کا دروازہ دھکیلتی باہر نکل گئی''لعنت ہے مجھ پر جو ہر بار اس لڑکی سے

ذلیل ہونے کے بعد دوبارہ اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس نے اپنے سامنے رکھی فائل زور سے ٹیبل پر پٹخی۔

"آج کے بعد مجھے دوبارہ اس سے کبھی کوئی بات نہیں کرنی خود کو جانے کیا سمجھتی ہے۔" اس نے غصہ میں خود سے وہ عہد کیا جو کبھی پورا نہ ہوتا تھا۔



"ارے آپ کب آئے۔" وہ اپنے گھر کے چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں بیٹھے سالار اور نازیہ کو دیکھ کر سچ مچ حیران رہ گئی اسے مریم نے کسی مہمان کی آمد کی اطلاع تو دی تھی مگر وہ یہ نہ جانتی تھی کہ آنے والے نازیہ اور سالار ہوں گے۔

"جب آپ نے دیکھ لیا۔"

سالار اس کی جانب بغور دیکھتے ہوئے ہنس کر بولا۔

نازیہ سے گلے ملتے ہوئے اس کے جسم سے پھوٹتی قیمتی پرفیوم کی مہک اسے شرمندہ سا کر گئی جبکہ وہ ابھی ابھی سو کر اٹھی تھی سلوٹ زدہ لباس پسینے سے شرابور وہ خجل سی ہو گئی۔

"آپ بیٹھیں میں پانی لے کر آتی ہوں۔"

وہ وہیں سے واپس پلٹنے لگی جب نازیہ نے ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

"ارے نہیں تم یہاں آؤ ہمارے ساتھ بیٹھو کوئی تکلف مت کرو ہم صرف تم سے ملنے آئے ہیں۔"

اس نے بازو سے تھام کر اسے اپنے قریب ہی بٹھا لیا اس پل فرہاد کولڈ ڈرنک ہاتھ میں تھامے اندر داخل ہوا جو اس نے ان دونوں کے سامنے رکھ دیں فرہاد کی یہ حرکت اسے کچھ عجیب سی محسوس ہوئی کیا تھا جو اتنی گرمی میں یہ دو کولڈ ڈرنک ہمارے لیے بھی لے آتا اس کا تو ویسے بھی دل چاہ رہا تھا کچھ ٹھنڈا اٹھا رپینے کو۔

"میں کولڈ ڈرنک نہیں پیتا پلیز یہ آپ لے لیں۔" سالار نے اپنی بوتل اس کی جانب بڑھائی وہ یک دم شرمندہ سی ہو گئی اسے ایسا لگا جیسے وہ زینب کے دل کی بات جان چکا ہے اس نے بوتل کو ہاتھ بھی نہ لگایا۔

"تم سوچ نہیں سکتیں تمہارے اس طرح میرے گھر آنے پر مجھے کس قدر خوشی ہوئی ہے۔" وہ نازیہ کا ہاتھ تھامے ہوئے خلوص دل سے بولی۔

"صرف اس کے آنے پر۔" سالار نے ہنستے ہوئے سوال کیا۔

"نہیں آپ دونوں کی آمد نے ہمیں دلی خوشی سے نوازا ہے۔"

فرہاد کے جواب نے اس کی مشکل کو قدرے آسان کر دیا جواباً وہ صرف مسکرا دیا اس دن زینب کو بار بار ایسا محسوس ہوا جیسے وہ مسلسل سالار کی نگاہوں کی گرفت میں ہے جتنی دیر وہ بیٹھا رہا بہانے سے اسے ہی تکتا رہا اس کے اس طرح دیکھے جانے سے زینب کچھ نروس سی ہو گئی۔

"اچھا اب ہمیں اجازت دو۔" کچھ دیر یہاں وہاں کی باتیں کرنے کے بعد نازیہ نے اس سے اجازت چاہی۔

"اور ہاں یہ تمہارے اور تمہارے بچوں کے لیے کچھ تحائف میں اور سالار اسلام آباد سے لے کر آئے ہیں امید ہے تمہیں پسند آئیں گے۔" اس نے اپنے قریب رکھے کچھ شاپرز اٹھا کر زینب کی جانب بڑھا دیے۔

"ارے ان سب کی کیا ضرورت تھی۔" وہ انہیں تھامتے ہوئے تھوڑا سا ہچکچا سی گئی۔

"تحفہ تحائف ضرورت کے لیے نہیں دیے جاتے بلکہ یہ تو محبت کے اظہار کا ایک خوبصورت طریقہ ہے۔" نازیہ نے بڑی محبت سے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا۔

''اور ہاں فرہاد بھائی اب آپ نے جلد ہی اسے اور بچوں کو لے کر میرے گھر آنا ہے۔''
باہر نکلتے نکلتے وہ فرہاد کو تاکید کرنا نہ بھولی جبکہ سالار خاموشی سے پہلے ہی باہر نکل چکا تھا' ان کے جاتے ہی زینب نے جلدی جلدی سب کچھ کھول کر دیکھا دو قیمتی کپڑے کے زنانہ سوٹ' ایک پرفیوم' ہینڈ بیگ' مریم اور جگنو کی ایک ایک فراک اس کے علاوہ ایک شاپر میں اسلام آباد کی مشہور بیکری کا کافی سارا سامان تھا ان تمام تحائف کو دیکھتے ہوئے اسے یک دم یاسمین آپا یاد آگئیں جو ہمیشہ ان کے مقابلے میں اسفند اور صمد کے بچوں پر زیادہ خرچ کرتیں کیونکہ انہیں وہاں سے واپسی کی امید زیادہ ہوتی شاید ان کے نزدیک تحائف کا تبادلہ بھی ایک کاروبار تھا وہ ہمیشہ دوسری طرف سے زیادہ بہتر ملنے کی امید میں خرچ کیا کرتیں جبکہ یہاں نازیہ کو علم تھا کہ اس کے دیے گئے قیمتی تحائف کا بدلہ وہ کبھی نہیں دے سکتی ان تحائف نے اس کے دل میں نازیہ کی قدر کئی گنا بڑھا دی فرہاد نے بھی ایک ایک چیز کو اچھی طرح ہاتھ میں لے کر دیکھا ان بیش قیمت تحائف نے اسے کچھ پریشان سا کر دیا اس سے رہا نہ گیا اور وہ بول ہی پڑا۔
''وہ جو اتنا سب کچھ تمہیں دے گئے اب بھلا بتاؤ تم جو ان کے گھر ملنے جاؤ گی تو کیا لے کر جاؤ گی اصل میں تمہیں یہ سب لینا ہی نہیں چاہیے تھا۔''
وہ ہر شخص کو اس کسوٹی میں پرکھنے کا عادی تھا جس میں اس کے بہن بھائی اس سے ملا کرتے تھے۔
''آپ پریشان مت ہوں وہ میری حیثیت جانتے ہوئے مجھے یہ سب دے کر گئے ہیں جس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ انہیں مجھ سے واپسی کی کوئی امید یا ضرورت نہیں ہے۔''
سب سامان سمیٹ کر اس نے واپس ڈالا اور تمام شاپنگ بیگز اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گئی اسے فرہاد کا جواب سننے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔



اس دفعہ خالہ کی دکھائی گئی لڑکی رابعہ اور فائزہ دونوں کو بہت پسند آئی کئی سالوں بعد اس لڑکی کے رنگ و روپ کو دیکھ کر اسے اپنے پرانے گھر کے سامنے رہنے والی استانی جی کی بیٹی یاد آگئی جس کا نام اسے کئی بار سوچنے پر بھی یاد نہ آیا البتہ یہ ضرور یاد تھا کہ کس طرح اس کا معصوم حسن سارے محلے میں مشہور تھا کبھی کبھی تو وہ ایسا بھی محسوس کرتی تھی جیسے وجاہت بھی اسے پسند کرتا تھا ایسا اسے اس وقت محسوس ہوتا جب وہ اکثر اوقات اس وقت چھت پر جاتا جب سامنے والی چھت پر وہ لڑکی موجود ہوتی اور ان ہی دنوں جب اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اس لڑکی کا رشتہ وجاہت بھائی کے لیے مانگ لیا جائے اس کی شادی کا کارڈ ان کے گھر آگیا اور اس طرح اس کی خواہش زبان پر آنے سے پہلے ہی دم توڑ گئی اور اب جب وجاہت نے بیوی کے لیے صرف خوبصورت ہونا شرط قرار دیا رابعہ کے دل میں خود بخود استانی جی کی بیٹی جیسے حسن والی لڑکی کی خواہش نے ایک بار پھر سے جنم لے لیا اور آج اس لڑکی کو دیکھ کر اسے محسوس ہوا جسے اس کی خواہش بنا کہے ۔ پوری ہونے کا وقت آگیا ہے وہ دونوں بہنیں خالہ کے ساتھ بڑی خوشی خوشی گھر واپس آئیں وجاہت پہلے سے ہی رابعہ کے گھر موجود تھا یہ وقت اس کے دوپہر کے کھانے کا تھا۔
''خالہ ہمیں تو لڑکی بہت پسند آئی ہے بس اب آپ بسم اللہ کریں لڑکی والوں سے بات کر لیں اگر انہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو ہم جلد ہی شادی کرنا چاہتے ہیں۔''
رابعہ نے جلدی جلدی اپنے پروگرام سے خالہ کو آگاہ کیا وہ بہت خوش تھی اور اپنی خوشی میں اس نے خالدہ خالہ کی خاموشی کو محسوس بھی نہ کیا۔

"کیوں بھائی ٹھیک ہے نا۔" اس نے سامنے چارپائی پر بیٹھے وجاہت سے بھی تصدیق چاہی۔ جو جانے کن سوچوں میں گم تھا ویسے بھی وہ ایسا ہی تھا بہت کم بات کرنے والا نہایت کم گو سا۔

"جو تمہارا دل چاہے کرو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" وہ اپنی رضامندی کا عندیہ تو پہلے ہی دے چکا تھا۔

"بس تو خالہ پھر ہماری طرف سے تو ہاں ہے۔"

اس نے جلدی جلدی اپنے گھر کے فریج میں رکھی مٹھائی پلیٹ میں نکال کر خالہ کے آگے لا رکھی۔

"چلو اللہ کا شکر ہے تمہیں کوئی لڑکی تو پسند آئی۔" خالہ نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا مگر ابھی تک انہوں نے مٹھائی کی جانب اپنا ہاتھ نہ بڑھایا جبکہ وہ مٹھائی کی بے حد شوقین تھیں۔

"مگر بیٹا یہاں ایک مسئلہ ہے۔ جو اتنا بڑا تو نہیں مگر پھر بھی....."

خالہ کہتے کہتے رک گئیں اور وجاہت پر ایک نگاہ ڈالی۔

"اعتراض تو لڑکی والوں کو بھی کوئی نہیں ہے آخر پینتیس سال کی بیوہ کے لیے اس سے اچھا رشتہ انہیں کیا ملے گا مگر پھر بھی اپنی بیٹی کی سیکورٹی کے لیے ان کی ایک چھوٹی سی شرط ہے۔ جس پر اگر تم لوگوں کو اعتراض نہ ہو تو میں بات آگے بڑھاؤں۔"

خالہ نے سوالیہ انداز میں رابعہ کی جانب دیکھا۔

"کیسی شرط خالہ؟" رابعہ ان کی بات سن کر تھوڑا سا حیران ہوتے ہوئے بولی۔

"لڑکی کا بھائی چاہتا ہے کہ نکاح سے قبل ان کی بہن کے نام وہ مکان لکھ دیا جائے۔ جس میں وجاہت میاں رہتے ہیں اور ویسے بھی بیٹا مکان میاں یا بیوی میں سے کسی کا بھی ہو' رہنا تو دونوں نے ہی ہے نا۔" خالہ نے شرط بتانے کے ساتھ ساتھ انہیں قائل کرنے کی بھی کوشش کی۔

"یہ کیسی فضول شرط ہے۔" رابعہ کے جواب دینے سے قبل ہی وجاہت درمیان میں بول پڑا۔

اس کے ماتھے پر پڑی شکنیں اس کی ناگواری کو صاف ظاہر کر رہی تھیں۔

"ہم نے بھی اپنی دو' دو بہنیں بیاہی ہیں۔ ہم نے تو ایسی کوئی شرط نہیں رکھی۔ ویسے بھی گھر تو محبت سے بنائے جاتے ہیں۔ خالی کھڑی دیواروں کو اپنے نام کرنے کا کیا فائدہ اور خالہ ذرا پوچھنا اس کے بھائی سے۔ بہن کا رشتہ کر رہا ہے یا سودا' جو نکاح سے قبل مکان چاہیے۔"

"ارے بیٹا تم تو خوامخواہ ہی برا مان گئے۔ آخر حق مہر شرعی طور پر عورت کا حق ہے اور وہ حق مہر میں ہی مکان مانگ رہے ہیں' تاکہ ان کی بہن کا مستقبل محفوظ رہے۔ اب دیکھو بیٹا برا مت منانا' تم نے پچیس چھبیس سال کے لڑکوں کو اپنی بہنوں کے رشتے دیے تھے۔ جبکہ وہ بیالیس سال کے مرد کو بہن دے رہے ہیں اور ایک دفعہ پہلے بھی وہ سب یہ بھگتنے کے بعد ہی محتاط ہوئے ہیں۔ پہلی بار بچی کے نام کچھ بھی نہ تھا۔ سسرال والوں نے میاں کے مرتے ہی نکال باہر کیا مرنے والا اگر کچھ بیوی کے نام کر گیا ہوتا تو وہ بچی پچھلے پانچ سالوں سے ایسے نہ رل رہی ہوتی۔"

خالہ نے اپنی ہر ممکن کوشش کر ڈالی۔ وجاہت کو قائل کرنے کی۔

"تو کیا وہ جانتے ہیں کہ میں دو چار سال میں ہی مر جاؤں گا۔" وجاہت نے تیکھے انداز سے سوال کیا۔ وہ بات جو خالہ سمجھانا چاہتی تھیں وہ خوب اچھی طرح سے سمجھ گیا تھا۔

"اور فرض کرو خالہ اگر میں جلد ہی مر بھی گیا تو کون ہے۔ جو میری بیوی کو بازو سے پکڑ کر میرے گھر سے باہر کرے گا۔ میرا جو کچھ ہے میری بیوی اور بچوں کا ہی ہو گا اور یہ بات سب جانتے ہیں —— اس لیے اتنے تردد کی کیا ضرورت ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے بیٹا۔ مگر....." "بس خالہ بات کو ختم کریں۔ مجھے کسی بھی شرط کے تحت رشتہ کرنا منظور نہیں

ہے۔ آپ انہیں ہماری طرف سے انکار کردیں۔"

وہ کھانا کھانے آیا تھا۔ مگر خالہ کی باتیں سن کراس کی بھوک اڑگئی اور اس نے اپنے سامنے رکھی ٹرے ہاتھ سے سرکا کر پرے کردی۔

"ایسے لالچی لوگ جو میری موت کی صورت میں بہن کا تحفظ چاہ رہے ہیں' مجھے وہاں رشتہ ہی نہیں کرنا۔" وہ چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"بھائی کھانا تو کھالیں۔" رابعہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کا بازو تھاما۔

"نہیں آج چوہدری صاحب کے مکان کی چھت ڈلنے والی ہے اور میرا کھانا وہیں ہے۔ تم یہ برتن اٹھالو۔"

جانے یہ سچ تھا یا جھوٹ۔۔۔ مگر اب وجاہت کو روکنا بالکل بے کار تھا۔ رابعہ نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا جو فائزہ راستے سے ہی اپنے گھر چلی گئی تھی۔ ورنہ آج اس کا اور خالہ کا باقاعدہ جھگڑا ہونا لازمی تھا۔ وجاہت پاؤں میں سلیپر پہن کر بڑے بڑے ڈگ بھرتا بیرونی گیٹ سے باہر نکل گیا۔

"دیکھو بیٹا کسی بھی بات کو اس طرح اپنی انا کا مسئلہ بناؤ گے تو رشتہ کرنا مشکل ہوجائے گا اور لڑکی تو تم نے خود بھی دیکھی ہے۔ ایسی خوب صورت بچی دوبارہ ڈھونڈنے میں کئی سال لگ جائیں گے۔ اس لیے میں تو یہ ہی مشورہ دوں گی کہ اپنے بھائی کو سمجھاؤ۔ خوامخواہ جذباتی نہ ہو۔ جذبات سے رشتہ ناتے بنتے نہیں۔ بگڑتے ہیں اور مزید وقت گزر گیا تو جو آج مل رہا ہے وہ بھی نہ ملے گا۔ دو چار سال بعد بھلا کون اسے رشتہ دے گا۔ تم خود سمجھ دار ہو اپنے بھائی کو بھی سمجھاؤ۔"

وجاہت کے باہر نکلتے ہی خالہ کی زبان پھر سے چل پڑی' جانتی تھیں کہ رابعہ زیادہ بحث و مباحثہ نہیں کرتی۔

"ہونا تو خالہ وہ ہی ہے جو نصیب میں لکھا ہوتا ہے۔ بہرحال پھر بھی میں کوشش کروں گی۔"

رابعہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اب وجاہت کے انکار کو اقرار میں تبدیل کرنا خاصا مشکل امر ہے۔ پھر بھی خالہ کا دل رکھنے کے لیے وعدہ کر بیٹھی۔

"تم نے آج پکایا کیا ہے؟" رابعہ کے ہاتھ میں وجاہت کے کھانے کی ٹرے دیکھ کر خالہ سے صبر نہ ہوا۔

"آلو قیمہ۔۔۔" جواب دیتے ہی اس نے ٹرے خالہ کے سامنے رکھ دی۔

"چلو۔۔۔ وہ تو بنا کھائے چلا گیا۔ اب کھانا ضائع کیوں کیا جائے۔"

خالہ اطمینان سے برقعہ اتارتے ہوئے بولیں۔ رابعہ نے بنا کوئی جواب دیے ان کے قریب ہی ٹھنڈے پانی سے بھرا جگ بھی رکھ دیا اور خود کچن کی جانب چل دی' تاکہ اپنے لیے چائے کا ایک کپ بنا سکے۔ آج اس رشتہ کے حوالے سے اس کا دل بہت دکھا تھا۔ وہ تو پوری امید باندھے ہوئے تھی کہ آج دیکھی جانے والی لڑکی جلد ہی بھابھی بن کر اس کے بھائی کے آنگن میں اتر جائے گی۔ مگر جانے اللہ کی اس کام میں کیا بہتری تھی۔ یہ تو وہ ہی سوہنا رب جانتا ہے۔ ہم تو صرف کوشش کے پابند لوگ ہیں۔



وہ کسی الجھن کا شکار تھی۔ جس کا اندازہ اس کی مسلسل چٹخاتی انگلیوں کو دیکھ کر با آسانی لگایا جاسکتا تھا۔ فرہاد نے ناشتا ختم کرکے برتن پرے سرکا دیے اور اٹھ کھڑا ہوا۔ زینب جانتی تھی کہ اب وہ صحن کے نلکے سے ہاتھ دھو کر باہر نکل جائے گا۔ کیونکہ یہ وقت اس کے دکان پر جانے کا تھا اور پھر وہاں سے اس کی واپسی عشاء کے بعد ہوتی تھی۔ دوپہر کا کھانا وہ اپنی دکان پر ہی کھاتا تھا۔ لہٰذا یہ ہی وقت تھا جو زینب اس سے کوئی بات کرسکتی' ورنہ آج کا سارا دن بے کار جاتا۔ یہ سب سوچتے ہوئے اس نے ہمت باندھی اور فرہاد کے پیچھے ہی باہر صحن میں آگئی۔ وہ ہاتھ

دھو کر تولیہ سے صاف کر رہا تھا۔ جب اس نے پکارا۔

"فرہاد..."

اس کی آواز سن کر باہر کی طرف بڑھتے فرہاد کے قدم رک گئے۔

"خیریت..."

زینب کبھی اس طرح اس کے پیچھے نہ آتی تھی۔ اس لیے اس کی حیرت بجا تھی۔

"وہ مجھے پانچ سو روپے کی ضرورت ہے۔ اگر آپ کے پاس ہوں تو..."

اپنی انگلیاں چٹخاتی وہ رک رک کر بولی۔

"پانچ سو روپے..." فرہاد نے حیرت سے رقم دہرائی۔

"تم نے اتنے پیسوں کا کیا کرنا ہے۔" وہ جانتا تھا زینب کو اس طرح پیسے مانگنے کی عادت ہی نہیں ہے۔

"مجھے آج شام میں نازیہ کے گھر جانا ہے۔ اس لیے سوچا جانے سے پہلے سادیہ کے ساتھ قریبی مارکیٹ جا کر اس کے لیے کوئی اچھا سا گفٹ لے لوں۔ جیسے کوئی ڈیکوریشن پیس وغیرہ... کیونکہ خالی ہاتھ جانا اچھا نہیں لگتا۔"

"اچھا..." فرہاد نے جواب کے ساتھ ہی اپنی جیب سے پرس بھی نکال لیا۔ زینب حیرت سے اپنی جگہ کھڑی رہی۔ اسے امید نہ تھی کہ فرہاد اس طرح مانگنے پر اسے پانچ سو روپے دے دے گا۔ مگر اس کی یہ حیرت جلد ہی ختم ہو گئی۔ فرہاد نے پرس سے پیسے نکال کر گنے اور پھر انہیں دوبارہ واپس اندر رکھ دیا۔ اب جانے اس کے دل میں کیا خیال آیا تھا۔

"ایسا کرو تم تیار ہو جانا، میں چار بجے تک گاڑی لے کر آؤں گا۔ ہم دونوں ساتھ ہی چلتے ہیں۔ اس طرح میری بھی سالار سے ملاقات ہو جائے گی ویسے بھی پہلی بار تمہارا ان کے گھر اکیلے جانا اچھا نہیں لگتا، جہاں تک ڈیکوریشن پیس کا تعلق ہے ان کا گھر جانے کتنے قیمتی سامان سے بھرا پڑا ہے۔ وہاں ہمارا دیا ڈیکوریشن پیس کیا معنی رکھتا ہے۔ اس لیے ایسا کرتے ہیں جاتے ہوئے راستے سے کچھ پھل اور مٹھائی خرید لیں گے۔"

اس نے اپنا پرس واپس جیب میں رکھتے ہوئے ہر بات کی وضاحت کی۔

"آپ کسی کو جو تحفہ دیتے ہیں۔ وہ آپ کی اپنی حیثیت کے اعتبار سے ہوتا ہے، ضروری نہیں ہے کہ اگر وہ بہت قیمتی سامان استعمال کرتے ہیں تو ہمارا تحفہ ان کی نظر میں حقیر ہو جائے گا قیمت تحفہ کی نہیں، خلوص کی دیکھی جاتی ہے اور جو لوگ خود دوسروں سے خلوص نیت سے ملتے ہیں۔ وہ ایسے تحفوں کی قدر کرنا بھی جانتے ہیں۔"

اسے فرہاد کا اس طرح پرس واپس رکھنا بالکل بھی اچھا نہ لگا۔

"کیا تھا جو مجھے ایک پانچ سو روپے دے دیتے اور پھر راستے میں سے پھل، مٹھائی بھی لے لی جاتی۔ اس میں کوئی حرج تو نہ تھا۔" اس نے کلستے ہوئے سوچا۔

"میں چار بجے تک آجاؤں گا، تم تیار رہنا۔"

فرہاد اس کی کسی بھی بات کا جواب دیے بنا ایک بار پھر سے یاد دہانی کرواتا بیرونی گیٹ عبور کر گیا اور زینب مرے مرے قدموں کے ساتھ کچن کی طرف آگئی۔ تاکہ مریم کے لیے ناشتا تیار کرے۔ کیونکہ اس کے اسکول جانے کا ٹائم ہونے والا تھا۔ وہ اسے خود ہی اسکول چھوڑنے اور پھر چھٹی کے وقت واپس لینے جاتی تھی۔ ویسے بھی مریم کا اسکول اس کے گھر سے صرف دس منٹ کی واک پر ہی تو تھا۔



آج صبح سے ہی وہ کافی چپ چپ سی تھی۔ اسے اپنا ٹوٹا ہوا آنگن، اس میں لگا نیم کا بڑا سا پیڑ، اپنی بیمار ماں اور

سنگی ساتھی بری طرح یاد آرہے تھے۔ اپنی ماں کو یاد کر کے اس کا دل کئی بار بھر آیا۔ اسے وہ فاقے یاد آئے جو وہ اپنی ماں کے ساتھ کرتی تھی اور آج اس کے آس پاس دنیا کی ہر آسائش موجود تھی۔ اے سی جس کے بارے میں اس نے مر کر بھی نہ سوچا تھا۔ اشیائے خورد و نوش سے بھرا فریج، جس میں دنیا کی وہ تمام نعمتیں وافر مقدار میں موجود تھیں۔ جن کے لیے ترستے ہوئے اس کا بچپن گزر گیا۔ ان میں سے کئی چیزیں تو اس نے اپنے بچپن میں دیکھی بھی نہ تھیں۔ جو آج اس کے پاس موجود تھیں۔ مگر اب یہ تمام اشیا اپنی اہمیت کھو چکی تھیں۔ شاید کسی بھی چیز کی زیادتی اس کی قدر کو کم کر دیتی ہے۔ جس کا احساس ہر گزرتا دن اسے دلا رہا تھا۔

سب کچھ اس کے پاس ہوتے ہوئے بھی وہ آج بھی پہلے ہی کی طرح تہی دامن تھی۔ اس کے پاس ہمیشہ رشتوں کی کمی رہی ہے۔ پہلے صرف ایک ماں کا رشتہ تھا اور بچپن میں دیکھا ہوا باپ۔ جس پر وقت نے دھول ڈال دی تھی اور ایک بوڑھی نانی جس سے ملنے وہ کبھی کبھی اپنی ماں کے ساتھ جایا کرتی تھی اور آج صرف ایک ملک انکل اور فضل دین اس کے علاوہ ایک رشتہ اسے اور بھی یاد تھا۔

وہ آج تک اپنے گھر میں اترنے والی وہ شام نہ بھولی تھی۔ جب ایشال بلیک ٹی شرٹ میں ملبوس اس کے گھر کے ٹوٹے پھوٹے آنگن میں کھڑا تھا۔ اتنے اندھیرے میں بھی اس کے چہرے پر چھائی بے زار کن کیفیت اسے دور سے ہی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ ایشال کا صرف وہ ہی ایک آخری تصور اس کے ذہن میں تھا۔ اس دن کے بعد سے لے کر آج تک اس نے کبھی ایشال کو دوبارہ نہ دیکھا تھا۔ کئی بار اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ فضل دین سے کہہ کر اس کی ایک تازہ تصویر ہی منگوا لے۔ مگر پھر شرم و جھجک آڑے آجاتی' ہر بار جب ملک صاحب اس سے ملنے آتے وہ لاشعوری طور پر ان کے ساتھ ایشال کی آمد کی بھی منتظر ہوتی' مگر گزرے ہوئے اتنے سالوں میں وہ کبھی بھی اس سے ملنے نہ آیا۔ کبھی کبھی تو اسے ایسا لگتا جیسے وہ اس رشتہ سے خوش ہی نہ ہو اور یہ خیال اکثر ہی اسے بے چین سا کر دیتا۔

وہ جانتی تھی کہ اگر ان نامساعد حالات میں ملک انکل اس کے ساتھ نہ ہوتے تو جانے آج وہ کہاں کہاں رل رہی ہوتی۔ وہ پورے دل سے ان کی احسان مند تھی۔ مگر پھر بھی اس کے دل میں ایشال سے ملنے کی خواہش ہر وقت ہمکتی رہتی۔ یہاں تک کہ جب وہ رات میں اپنی آنکھیں بند کر کے سونے کے لیے لیٹتی تو بلیک ٹی شرٹ میں ایشال کا تصور چھم سے اس کے دماغ میں اتر آتا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اپنے دماغ سے نہ نکال پاتی۔

جلد ہی اس کے کالج میں گریجویشن کی تقریب منعقد ہونے والی تھی جس میں ملک صاحب کی آمد متوقع تھی۔ اس کا دل چاہتا اے کاش اس تقریب میں شرکت کے لیے ایشال بھی ان کے ساتھ آجائے۔ بنا جانے کہ اس کی یہ تمنا لاحاصل تھی۔ وہ ہمیشہ ایسی ہی تمنا کیا کرتی۔ حالانکہ کئی بار باتوں ہی باتوں میں فضل چاچا نے اسے بتایا تھا کہ ایشال پاکستان میں نہیں ہے۔ پھر بھی اس نے سوچ رکھا تھا کہ اگر اس بار بھی وہ ملک صاحب کے ساتھ نہ آیا تو وہ ضرور فضل دین سے اس کے بارے میں پوچھے گی وہ فضل دین اور اس کی بیوی کے ساتھ ملک صاحب کے دیے ہوئے اس فلیٹ میں ہی رہتی تھی۔ اس سے قبل اپنا اسکول کا زمانہ اس نے ہاسٹل میں گزارا اور پھر ملک صاحب نے اسے یہ فلیٹ لے دیا' تاکہ وہ زیادہ آرام اور سکون کے ساتھ رہ سکے۔ اسے حیرت ہوئی تھی کہ اتنے سالوں میں نہ صرف ایشال بلکہ آنٹی اور ایشال کا چھوٹا بھائی جس کا اس نے کبھی نام بھی نہ پوچھا تھا کوئی بھی اس سے ملنے کبھی نہ آیا۔ سوائے ملک انکل کے جو ہمیشہ ہر موقع پر اس سے ملنے آتے رہے اور اب اس کا دل چاہتا وہ ان سے ایشال کے بارے میں دریافت کرے' جانے کیوں اسے ایسا لگتا جیسے وہ سب لوگ اس کے وجود سے ہی یکسر لاعلم ہیں اور یہ ہی بات اکثر کانٹے کی طرح اس کے دل میں چبھا کرتی' مگر ایشال تو اس کے وجود سے واقف تھا۔ پھر وہ کیوں نہیں ...
آج اس بار جب ملک انکل اکیلے آئے تو میں ضرور ان سے ایشال کے بارے میں بات کروں گی۔

دل ہی دل میں فیصلہ کرتے ہوئے اس نے آنکھیں موند لیں اور جلد ہی نیند کی گہری وادیوں میں اتر گئی جہاں وہ ہر قسم کی فکروں سے مکمل طور پر آزاد تھی۔

☆ ☆ ☆

فرہاد گھر آیا تو برآمدے میں موجود بچوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے اس سے پہلے ان بچوں کو کبھی اپنے گھر نہ دیکھا تھا۔

"یہ بچے کون ہیں؟" اس نے تخت پر بیٹھی سبزی کاٹتی زینب سے سوال کیا۔

"ہمارے کرایہ داروں کے ہیں ایک سادیہ اور ایک بچی مریم کے ساتھ اس ہی کے اسکول میں پڑھتی ہے۔"

زینب نے تمام بچوں کا مکمل طور پر تعارف کروایا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر یہ سب یہاں کیا کر رہے ہیں؟" وہ ابھی تک حیران تھا۔

"مجھ سے ٹیوشن پڑھنے آئے ہیں۔"

زینب نے سبزی کاٹ کے چھلکے قریب رکھے ڈسٹ بن میں ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

"تم ٹیوشن پڑھاؤ گی؟" فرہاد نے ہنستے ہوئے سوال کیا۔

"تم نے تو خود کئی سال قبل میٹرک کیا تھا۔ اب بھلا تم ان بچوں کو کیا پڑھاؤ گی؟"

"آپ فکر نہ کریں' ان کے کورس میں ابھی بھی وہ ہی سب کچھ شامل ہے جو سالوں قبل ہم نے پڑھا تھا۔ کچھ ایسا نیا نہیں آیا جو مجھے پڑھانے میں مشکل ہو۔"

فرہاد کے مذاق کا جواب نہایت سنجیدگی سے دیتی وہ سبزی کی ٹوکری اٹھائے کچن میں آگئی۔ کریلوں کو نمک لگا کر اچھی طرح مسل کر وہیں سنک پر رکھ دیا اور فرہاد کے لیے ایک کپ چائے کا بنا کر دوبارہ برآمدے میں آگئی۔

"ویسے تمہیں کیا ضرورت ہے اس طرح لوگوں کے بچوں کو پڑھانے کی' تم تو بس اپنی بیٹی کو پڑھالو اتنا ہی کافی ہے۔"

فرہاد چائے کا کپ تھامتے ہوئے بولا۔ زینب نے کوئی جواب نہ دیا۔

"چلو اب تم سب چھٹی کرو اور کل یاد سے اسی وقت پڑھنے آجانا۔" اس نے تمام بچوں کو ایک ساتھ ہی مخاطب کیا۔

"اماں میں بھی ان کے ساتھ کھیلنے جاؤں؟" چھٹی کا سن کر سب سے زیادہ خوشی مریم کو ہوئی۔

"ہاں پر مٹی میں مت کھیلنا؟"

اتنا کہہ کر وہ کچن کی جانب چل دی۔ اس سے قبل کہ مریم تمام بچوں کو لیے گھر سے باہر نکلتی' کسی نے بیرونی گیٹ کو زور' زور سے بجایا۔ ساتھ ہی اطلاعی گھنٹی پر بھی ہاتھ رکھ دیا۔

"یہ کون آگیا؟" فرہاد فوراً کپ ٹرے میں رکھ کر باہر کی جانب لپکا۔ زینب بھی اس کے پیچھے ہی باہر آگئی۔ تاکہ پتا چلے کون آیا ہے۔ دروازہ کھولتے ہی اس کے عین سامنے سالار کھڑا تھا۔ جس کے چہرے پر اڑی ہوائیاں کسی انہونی کی اطلاع دے رہی تھیں۔

"خیریت تو ہے سالار کیا ہوا؟"

زینب کے کانوں سے فرہاد کی آواز ٹکرائی۔ سالار کا جواب سننے کے لیے وہ وہیں رک گئی۔

"فرہاد بھائی میں زینب کو لینے آیا ہوں۔ دراصل نازیہ آج صبح سیڑھیوں سے گر گئی تھی۔ اس کی حالت کافی خراب ہے۔ اس کی والدہ اسپتال پہنچ چکی ہیں۔ مگر اپنی عمر رسیدگی اور کچھ بیٹی کی پریشانی کے تحت ان سے سب کچھ سنبھالا نہیں جا رہا میری صباحت آپا سے فون پر بات ہوئی تو انہوں نے مشورہ دیا کہ میں زینب کو لے آؤں۔ اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو پلیز اسے میرے ساتھ بھیج دیں' اس طرح شاید میری پریشانی بھی کچھ کم ہو جائے۔"

وہ پوری تفصیل بتاتے ہوئے بولا۔
نازیہ پریگننٹ تھی اور اس حالت میں اس کا سیڑھیوں سے گرنا کسی قدر خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اس کا اندازہ وہ بخوبی لگا سکتی تھی۔ تین سال بعد ہونے والے اپنے اس بچے کے معاملے میں وہ ویسے بھی خاصی حساس تھی۔ یہ خیال دل میں آتے ہی زینب کا دل بھی اس کے دکھ سے بھر گیا۔
"تم اندر آؤ' میں زینب کو بھیجتا ہوں۔"
فرہاد کا اتنا کہنا ہی کافی تھا۔ وہ وہیں سے واپس پلٹ گئی' تاکہ جلدی سے تیار ہو کر سالار کے ساتھ جا سکے اور پھر صرف پندرہ منٹ بعد ہی وہ گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھی اسپتال جانے والے رستے پر رواں دواں تھی۔



وہ رات خاصا لیٹ گھر واپس آیا تھا کئی عرصہ بعد اس نے اپنے پرانے دوستوں کے ساتھ مل کر خوب آؤٹنگ کی اور اپنے کالج کی یادوں کو ایک بار پھر سے تازہ کیا۔ پہلے مال گھومنا۔ پھر مووی دیکھنا اور آخر میں ایک اچھا سا ڈنر کرنے کے بعد جب وہ گھر واپس پہنچا تو تقریباً" رات کے دو بج چکے تھے۔ کپڑے تبدیل کرکے سوتے سوتے تین بج گئے۔ اسی سبب صبح اس کی آنکھ ہی نہ کھلی اور نہ ہی اسے کسی نے جگایا اور ابھی بھی جانے وہ کتنی دیر سوتا رہتا۔ اگر اس کا موبائل نہ بج اٹھتا مسلسل بجتے موبائل کی آواز سے اس کی نیند ٹوٹ گئی۔
"ہیلو۔۔۔"
لیس کا بٹن پریس کرکے اس نے فون اپنے کان سے لگالیا۔
"تم ابھی تک سو رہے ہو؟" دوسری طرف پاپا تھے جو اس کی غنودگی بھری آواز سن کر حیران ہوتے ہوئے بولے۔
"میں رات کو کچھ دیر سے سویا تھا۔ اسی لیے آنکھ ہی نہ کھلی۔"
جواب دیتے ہوئے اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھی چھوٹی سی گھڑی پر ایک نظر ڈالی جہاں تین بج رہے تھے۔ وہ شرمندہ سا ہو گیا۔ وہ تو عام طور پر کبھی بھی اتنی دیر تک سونے کا عادی نہ تھا اور آج تو ویسے ہی پاپا نے اسے اپنے کسی کام کے سلسلے میں صبح جلد آفس آنے کی ہدایت کی تھی جو وہ بالکل ہی بھول گیا تھا۔ اب سمجھ نہ آیا۔ معذرت کس طرح کرے۔
"اوہ سوری پاپا میں بھول گیا تھا کہ۔۔۔"
"اٹس اوکے۔"
انہوں نے پوری بات سنے بغیر ہی اس کا جملہ کاٹ دیا "میں اور کریم دونوں بینک چلے گئے تھے اور وہ کام ہو بھی گیا۔ اب تم ٹینشن مت لو اور ذرا جلدی سے فریش ہو کر آفس آجاؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"
اس کے ساتھ ہی انہوں نے کال ڈسکنیکٹ کر دی اور اگلے تیس منٹ بعد ہی وہ فریش ہو کر آفس جا پہنچا۔ ہال میں داخل ہوتے ہی اس نے ایک غیر ارادی نظر حبیبہ کے ٹیبل پر ڈالی جو اس کے وجود سے یکسر خالی تھی۔ شاید وہ آج آئی ہی نہ تھی۔ مگر اس کا یہ خیال پاپا کے کمرے میں داخل ہوتے ہی غلط ثابت ہو گیا۔ وہ ان کے بالکل سامنے رکھی کرسی پر بیٹھی غالباً" کوئی ڈکٹیشن لے رہی تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ والی کرسی پر اکاؤنٹنٹ سیکشن کے ماجد صاحب بھی موجود تھے جو اپنے سامنے رکھی کسی فائل میں مصروف تھے۔ اس نے اندر داخل ہوتے ہی سب پر ایک نظر ڈالی۔
"السلام علیکم۔" اس کے مخاطب وہاں موجود تمام افراد تھے۔

"وعلیکم السلام۔" پاپا کے ساتھ ساتھ ماجد صاحب نے بھی بڑی خوشدلی سے جواب دیا' جبکہ وہ اسے یکسر نظر انداز کیے اپنے کام میں مصروف تھی۔

"آپ آج شام میں فارغ ہیں؟"

پاپا نے اپنے سامنے موجود فائل کو بند کرتے ہوئے اس سے سوال کیا تھا۔

مختصر سا جواب دے کر وہ ان کے نزدیک رکھے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"دراصل آج ہمارا ایک وفد بنگلہ دیش سے آرہا ہے' شام چھ بجے کی فلائٹ سے۔"

انہوں نے سامنے لگی دیوار گیر گھڑی پر ایک نظر ڈالتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

"میں چاہتا ہوں اس وفد کو ایرپورٹ ریسیو کرنے تم جاؤ اور چونکہ آنے والے مہمانوں میں ایک خاتون بھی شامل ہے۔ اس لیے بہتر ہوگا اپنے ساتھ حبیبہ کو لے لو۔ آفس کی گاڑی بھی تمہارے ساتھ ہوگی۔ جس میں کرم دین اور ماجد صاحب دونوں ہی موجود ہوں گے۔"

انہوں نے مکمل تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کا جی چاہا پاپا سے سوال کرے۔ کیا حبیبہ تنہا میرے ساتھ چلی جائے گی؟ مگر چاہتے ہوتے بھی وہ یہ سوال نہ کرسکا۔

"آپ نے حبیبہ سے پوچھ لیا ہے۔ انہیں میرے ساتھ جانے میں کوئی اعتراض تو نہیں۔"

کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ بول ہی پڑا۔

"اسے بھلا کیا اعتراض ہوگا؟"

پاپا نے چشمہ کے اوپر سے جھانکتے ہوئے الٹا اس سے سوال کردیا۔

"ویسے تو وہ کریم دین کے ساتھ بھی جاسکتی ہے' لیکن جب تم جارہے ہو تو میں نے بہتر سمجھا کہ اسے تمہارے ساتھ ہی بھیجوں۔"

حبیبہ بالکل خاموشی سے اپنے سامنے رکھے پیپرز سمیٹنے میں مصروف تھی۔ "اگر انہیں کوئی مسئلہ ہو تو میں کرم دین ہی کے ساتھ چلی جاتی ہوں۔"

تمام کاغذ سمیٹ کر فائل میں لگاتے ہوئے اس نے پہلی بار گفتگو میں حصہ لیا۔ دل چاہا وہ اس کے خیال سے مکمل طور پر اتفاق کرتے ہوئے اسے مشورہ دے کہ وہ کرم دین ہی کے ساتھ چلی جائے۔ مگر جانتا تھا کہ اسے یہ مشورہ دینا خود ہی کے لیے نقصان دہ ثابت ہوگا۔ جبکہ حبیبہ کو کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ وہ کسی کے ساتھ چلی جائے شاہ زین کو اس کے ساتھ سفر کرنے کا ایسا حسین موقع جانے دوبارہ کب ملتا۔ یہ ہی سوچ کر جواب میں خاموشی اختیار کرلی۔

"نہیں..... بھلا اسے کیا پرابلم ہوگا۔ تم جاؤ اس کے ساتھ۔"

اس تمام گفتگو کے دوران شاہ زین صوفے پر بیٹھا مسلسل اپنے سیل میں مصروف رہا۔ بالکل ایسے جیسے اس تمام مسئلے سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

"میرا خیال ہے کہ اب تم لوگ ذرا جلدی نکلنے کی کوشش کرو۔ اگر فلائٹ ٹائم پر آگئی تو ٹریفک کے رش کے باعث تمہیں ایرپورٹ پہنچنے میں دیر ہوجائے گی۔"

پاپا کی بات سنتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ حبیبہ کے باہر نکلتے ہی خود بھی دروازہ دھکیلتا ہوا کوریڈور میں آگیا۔

"میں ذرا اپنا ہینڈ بیگ لے لوں۔"

اس کا جواب سنے بنا وہ اپنے کیبن کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی اور جب تک وہ کوریڈور سے گزر کر بڑے ہال تک پہنچا۔ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے آگئی۔ شاہ زین آہستہ آہستہ چلتا لفٹ تک آگیا۔

"ایک ہی لفٹ میں چلیں یا آپ علیحدہ آئیں گی۔"
لفٹ کا بٹن پریس کرتے ہوئے اس نے پلٹ کر حبیبہ سے سوال کیا۔
"جب گاڑی میں ایک گھنٹہ تنہا آپ کے ساتھ سفر کر سکتی ہوں تو دو سیکنڈ لفٹ کا ساتھ برداشت کرنے میں کیا قباحت ہے۔"
اس کے سوال کا بالکل اسی کے انداز میں جواب دے کر اس نے اپنے منہ پر آئے بالوں کو ہاتھ کی مدد سے پیچھے کیا اور پھر ایئر پورٹ تک سارے راستے وہ بالکل خاموش کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ اسے مخاطب کرنے کی خواہش نے کئی بار شاہ زین کے دل میں سر اٹھایا۔ جسے اس نے بڑی مشکل سے جھٹک کر سلا دیا۔ ایئر پورٹ کی حدود میں داخل ہو کر خاموشی سے گاڑی لے جا کر پارکنگ میں کھڑی کر کے وہ باہر نکل آیا۔
"ایک بات پوچھوں سر۔۔۔" اس کے باہر نکلتے ہی جانے حبیبہ کو کیا یاد آ گیا۔
"پوچھیں۔۔۔"
وہ اپنی پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے نہایت سنجیدگی سے بولا۔ اسے حیرت تھی کہ حبیبہ کیا پوچھنا چاہ رہی ہے۔
"آپ مجھ سے ناراض ہیں؟" یہ ایسا سوال تھا۔ جس کی توقع شاہ زین کم از کم حبیبہ سے تو بالکل بھی نہیں کر سکتا تھا۔ حیرت کے باعث اس کا منہ کھلے کا کھلے رہ گیا۔
"حیرت ہے آپ بھی کسی کی ناراضی کو محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔"
وہ واقعی ہی حیران تھا۔
"کیوں کیا میرا شمار انسانوں میں نہیں ہوتا؟"
اس نے آج پہلی بار حبیبہ کو مسکراتے دیکھا۔ کسی نے سچ کہا ہے کچھ مسکراہٹیں ایسی بھی ہوتی ہیں، جن پر جان قربان کی جا سکتی ہے اور یقیناً "حبیبہ کی مسکراہٹ کا شمار بھی ان میں ہی ہوتا تھا۔
"آپ کی مسکراہٹ بے حد خوب صورت ہے۔"
اس نے تعریف کرنے میں بالکل بھی تحمل سے کام نہ لیا۔
"شکریہ۔"
اپنا ہاتھ ماتھے تک لے جا کر وہ ہنستے ہوئے بولی۔
شاہ زین کو ایسا لگا جسے اس کے آس پاس کوئی مدھر جھرنا بہہ رہا سو حبیبہ کی ہنسی اس کی مسکراہٹ سے کہیں زیادہ دلفریب تھی۔ اسے محسوس ہوا۔ وہ جیسے جیسے حبیبہ کو جان رہا ہے۔ ویسے ویسے اس کی محبت میں اور زیادہ غرق ہوتا جا رہا ہے اور شاید اس کی اس محبت کا احساس حبیبہ کو بالکل بھی نہ تھا اور یہ ہی احساس اس کے دل میں جگانے کی امید لیے وہ ایئر پورٹ لاؤنج میں داخل ہو گیا۔



"کیا بات ہے گڑیا، تم کھانا کیوں نہیں کھا رہیں؟"
وہ کب سے اپنے سامنے رکھی پلیٹ میں تھوڑے سے فرائیڈ رائس ڈالے انہیں کانٹے کی مدد سے ادھر ادھر کر رہی تھی۔ اس کا دھیان بالکل بھی کھانے کی طرف نہ تھا۔ جسے سکینہ نے محسوس تو بہت پہلے ہی کر لیا تھا۔ مگر کچھ دیر تک خاموشی سے اس کا جائزہ لینے کے بعد وہ پوچھ ہی بیٹھی۔
"بھوک نہیں۔"

اس نے پلیٹ اپنے آگے سے کھسکاتے ہوئے دھیرے سے جواب دیا۔
سکینہ سمجھ گئی' آج پھر پرانی یادوں نے اس کے دل میں ڈیرہ ڈال لیا ہے اور یقیناً "اسے اپنی ماں یاد آرہی تھی۔ جس کا اندازہ اس کے چہرے پر پھیلے تاثرات کو دیکھ کر بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔ ایسے میں ہمیشہ سکینہ بالکل خاموش ہوجایا کرتی اس وقت تک جب وہ رو کر اچھی طرح اپنے دل کی بھڑاس نہ نکال لیا کرتی اور سچ تو یہ تھا کہ سکینہ کو اس سے اس تنہا اور معصوم سی لڑکی پر دل کھول کر ترس بھی آتا۔ جس کے پاس دنیا کی ہر آسائش ہوتے ہوئے بھی شاید سکون نہ تھا۔ کبھی کبھی تو اسے اس بات پر بھی حیرت ہوتی کہ ایسی کیا مشکل تھی جو ملک صاحب نے اسے یوں اس طرح ان لوگوں کے سہارے چھوڑ رکھا تھا۔ کیوں اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے کر نہیں جاتے اور یہ سوال اس نے کئی بار فضل دین سے کیا۔ جس کا جواب وہ کبھی بھی نہ دیتا تھا اور یہ ہی اس کی اپنے مالک سے وفاداری کا ایک ثبوت بھی تھا۔ ابھی بھی اس نے بنا کوئی بات کیے خاموشی سے ٹیبل پر رکھے برتن سمیٹنے شروع کردیے۔
"آنٹی جی۔۔۔"
وہ ہمیشہ سکینہ کو اسی نام سے پکارتی۔
"جی میرا بچہ؟"
اس کی پکار کا جواب سکینہ اسی طرح اتنے ہی پیار سے دیا کرتی۔
"آپ کبھی ملک انکل کے گھر گئی ہیں۔"
ایک ایسا سوال جس کی امید سکینہ کو بالکل بھی نہ تھی۔
"نہیں۔"
مختصر سا جواب دے کر وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔
"ان کی بیگم یا فیملی کے کسی اور فرد سے کبھی ملی ہیں؟"
آج اس طرح کیے جانے والے اس کے ان سوالوں کا کیا مقصد تھا۔ فی الحال سکینہ سمجھ نہ پائی۔ "نہیں میرا بچہ کبھی بھی نہیں۔"
"اچھا۔۔۔"
اب سکینہ اپنے ہاتھ روکے منتظر کھڑی تھی کہ شاید وہ کچھ اور پوچھے گی۔ مگر دوسری طرف بالکل خاموشی تھی اور وہ کرسی پر بیٹھی چپ چاپ اپنے ہاتھوں کو تکے جارہی تھی۔ جب سکینہ نے اسے مخاطب کیا۔
وہ کبھی بھی اسے بیگم صاحبہ یا چھوٹی بی بی نہ کہتی اور نہ ہی کبھی اس کا نام لیا کرتی۔ بلکہ ہمیشہ گڑیا یا بچہ ہی کہہ کر مخاطب کیا کرتی۔
"ہاں پوچھو کیا پوچھنا ہے۔"
وہ اپنا چہرہ ہتھیلی کی کٹوری میں جماتے ہوئے بولی۔
"ملک صاحب آپ کے سگے چچا ہیں۔"
وہ سوال جو وہ اکثر فضل دین سے کیا کرتی تھی۔ آج اس سے بھی کر بیٹھی اس امید پر کہ شاید یہاں سے ہی اسے کوئی جواب مل جائے۔
"پتا نہیں۔"
وہ جانتی نہ تھی یا پھر بتانا ہی نہیں چاہتی تھی۔ سکینہ سمجھ نہ پائی۔
"سکینہ آنٹی' چاچا فضل دین کبھی ملک انکل کی فیملی سے ملے ہیں۔ مطلب ان کے بیوی' بچوں کو کبھی دیکھا ہے؟"

بات جو وہ جاننا چاہتی تھی ابھی تک اس کے لبوں تک نہ آئی تھی۔

"پہلے تو اکثر ہی جایا کرتے تھے۔ مگر جس دن سے آپ کا نکاح۔۔۔" سکینہ نے اپنی بات درمیان میں ہی چھوڑ دی۔ یک دم کمرے میں چھا جانے والی خاموشی پر اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ کمرے کے عین درمیان میں فضل چاچا کھڑے تھے۔ وہ فوراً" سے بیشتر سکینہ کی خاموشی کی وجہ جان گئی۔ وہ سمجھ گئی۔ سکینہ ضرور کوئی ایسی بات بتانا چاہتی تھی جسے بتانے سے اسے چاچا نے منع کیا تھا اور اب یقیناً" سکینہ اس موضوع پر اس سے دوبارہ بات نہ کرے گی۔ جس کا اندازہ اس وقت سکینہ کی خاموشی کو دیکھ کر بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔

"السلام علیکم چاچا۔"

فضل دین کو سلام کرتے ہی وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"وعلیکم السلام بچے' کیا ہو رہا ہے؟"

فضل دین اس کے سر پر دست شفقت پھیرتا کچن کی جانب بڑھ گیا۔ شاید وہ بازار سے آیا تھا۔ کیونکہ اس کے ہاتھ میں کافی سارے سامان کے تھیلے تھے۔ جنہیں وہ کچن میں رکھ کر دوسرے ہی پل واپس پلٹ آیا۔

"آج میں چھوٹی بی بی کی پسندیدہ مچھلی لایا ہوں' تم اسے اچھی طرح مسالا لگا کر روسٹ کر دو۔"

"پلیز چاچا آپ مجھے بی بی جی مت کہا کریں۔"

اس لفظ سے وہ ہمیشہ ہی چڑ جایا کرتی تھی۔

"اچھا بیٹا معاف کرنا' کوشش تو بہت کرتا ہوں' مگر پھر بھی دل اور زبان سے آپ کا احترام نہیں جاتا۔ ارے یاد آیا آج تو میں آپ کے لیے ڈھیروں ڈھیر انگور بھی لایا ہوں۔ جاؤ سکینہ جلدی سے باسکٹ میں ڈال کر دھو لاؤ۔"

"رہنے دیں آنٹی مجھے انگور نہیں کھانے۔"

جانے کیا ہوا' اس نے زوردار آواز سے کرسی کھینچ کر پیچھے کی' آج انگوروں نے اس کے دل میں ان پرانی یادوں کو پھر سے زندہ کر دیا۔ جن کی کسک سے اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے یہ آنسو سکینہ یا فضل دین کے سامنے بہہ کر انہیں پریشان کریں۔ اس لیے تیزی سے آگے بڑھ کر لاؤنج کا دروازہ کھولتی اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ سچ ہے انسان جیتے جی اپنے ماضی سے کبھی بھی پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ اس کا ماضی ہر پل' ہر گھڑی اور ہر دم اس کے ساتھ ساتھ ہی رہتا ہے۔ جہاں ذرا حال نے آنکھیں دکھائیں' ماضی فوراً" سے بیشتر سامنے آن کھڑا ہوتا اور وہ تو اپنے ماضی کو شاید تاحیات نہ بھول سکتی تھی۔ کمرے میں داخل ہو کر اس نے دروازے کو لاک لگا دیا۔ اب اس خالی کمرے میں وہ تھی یا اس کا ماضی جہاں ہر لمحہ اس کے ساتھ اس کی ماں کا سایہ بھی تھا آج وہ اپنے ماضی میں پوری طرح ڈوب جانا چاہتی تھی۔ خود سے وابستہ ہر یاد کو پھر سے جگانے کی خواہش لیے وہ اپنے بستر پر گر گئی۔ اس کے سامنے اس کا بچپن آن کھڑا ہوا اور وہ ماضی کی اتھاہ گہرائیوں میں گم ہوتی چلی گئی۔



"یار پلیز تم یہ گرین کلر پہن کر میرے سامنے مت آیا کرو۔"

عریشہ جیسے ہی تیار ہو کر باہر نکلی۔ اس پر نظر پڑتے ہی ایشال چیخ اٹھا۔

"کیوں کیا ہوا' اتنا خوب صورت کلر تو ہے؟"

وہ جان بوجھ کر اسے چڑاتے ہوئے شرارت سے ہنسی۔

"تم اچھی طرح جانتی ہو کہ یہ رنگ میری دکھتی رگ ہے اور میری گزری ہوئی یادوں میں اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے جتنی اس دن اس مقام پر جمع تمام لوگ۔"

عریشہ جانتی تھی کہ اس کے گرین کلر سے اس قدر نفرت کرنے کا پس منظر کیا ہے۔ مگر آج سے پہلے ایشال نے اسے اس طرح کبھی نہ ٹوکا تھا جس طرح آج۔

"ٹھیک ہے آئندہ خیال رکھوں گی کہ کم از کم تمہارے سامنے آتے ہوئے یہ رنگ نہ پہنوں۔"

اس نے مصالحت آمیز انداز میں جواب دیا۔

"تم آئندہ اس کلر کا کوئی سوٹ ہی نہ بناؤ تو زیادہ بہتر ہوگا اور ہو سکے تو یہ شرٹ چینج کر لو۔"

"فی الحال تو یہ ناممکن ہے۔ کیونکہ کلاس شروع ہونے میں صرف پندرہ منٹ رہ گئے ہیں اور اب تم جلدی سے آجاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ اس رنگ کے چکر میں ہماری آج کی مائیکرو اکنامکس کی کلاس رہ جائے اور آج تو میری پریزنٹیشن بھی ہے۔"

وہ جلدی جلدی بولتی اپنا بیگ کندھے پر ڈالے باہر کی جانب لپکی۔ ایشال اپنی سوچوں میں گم ست رفتاری سے قدم اٹھاتا اس سے خاصا پیچھے رہ گیا۔



پورے دس دن اس نے جی جان سے نازیہ کی تیمارداری کی۔ سالار اسے روزانہ صبح لے جاتا اور پھر شام میں واپس گھر چھوڑ دیتا۔ وہ اپنی بیٹیاں صبح میں سادیہ کے گھر چھوڑ دیا کرتی۔ جہاں سے واپسی میں انہیں لے لیتی۔ ویسے بھی مریم کے اسکول کی چھٹیاں تھیں۔ اس لیے بھی کوئی زیادہ مسئلہ کھڑا نہ ہوا۔ البتہ ان دس دنوں میں اسے سالار کے رویہ نے جگہ جگہ چونکایا۔ وہ جس طرح نازیہ کا خیال رکھتا۔ زینب کے لیے بالکل نیا تجربہ تھا۔ دو بار فرہاد کے بچوں کی ماں بننے پر بھی کبھی اس نے زینب کا اتنا خیال نہ رکھا جتنا سالار اپنا بچہ کھو دینے پر بھی اپنی بیوی کا رکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے آس پاس موجود کئی لوگوں کا تجزیہ کیا۔ اسے لگا دنیا کے زیادہ تر مرد سالار جیسے ہی ہوتے ہیں محبت کرنے والے اور اپنی بیوی کا ہر حال میں خیال رکھنے والے شاید فرہاد ہی ان تمام مردوں میں سے ایک الگ مرد تھا وہ دن میں کئی بار سالار اور فرہاد کا موازنہ کرتی تو اسے ہمیشہ سالار ہی کا پلڑا بھاری لگتا۔ ان دس دنوں نے زینب کی زندگی کو یکسر تبدیل کر دیا۔ زینب پہلے والی زینب نہ رہی۔ سالار کے عارضی ساتھ نے اسے خود اعتمادی بخش دی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں پہلی بار سالار کے ساتھ بیٹھ کر ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں کھانا بھی کھایا۔ اس وقت جب وہ اسے واپس گھر چھوڑنے جا رہا تھا۔ کسی فائیو اسٹار ہوٹل کو اندر سے دیکھنا بھی اس کی زندگی کا وہ خواب تھا جو شاید فرہاد کبھی بھی پورا نہ کر سکتا تھا۔ وہ تو جب رات کو دکان سے واپس آتا اتنا تھکا ہوا ہوتا کہ اس سے اس طرح کی تفریح کی امید رکھنا تقریباً" ایک ناممکن سی بات تھی بہت ہوتا تو وہ انہیں چھٹی والے دن ساحل سمندر پر لے جاتا۔ جہاں دو گھنٹہ گھومنا اور واپسی میں کسی ٹھیلے سے برگر خرید کر کھانا ہی اس کی زندگی کی بہترین تفریح تھی۔ وہ تو زندگی کے ان رنگوں سے قطعی نا آشنا تھی۔ جن سے اسے سالار نے واقف کیا۔ ایک دن واپسی میں وہ اسے بازار بھی لے گیا جہاں اس نے نازیہ کی ضرورت کی کچھ اشیا خریدنی تھیں اور ایسے میں اس نے زینب کو بھی کافی کچھ لے دیا۔ اس کے اور سالار کے درمیان جو ایک جھجک تھی ان دس دنوں میں وہ مکمل طور پر ختم ہو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا اور سالار کا چند روزہ ساتھ اب جلد ہی ختم ہونے والا ہے۔ کیونکہ نازیہ تیزی سے صحت یاب ہونے کے بعد گھر منتقل ہو گئی جہاں اس کی خدمت کے لیے ہر وقت ملازم موجود تھے اور اب فرہاد بھی اس کے اس طرح روزانہ سالار کے ساتھ جانے پر تھوڑا سا چڑنے لگا تھا۔

مریم کے اسکول کھلنے والے تھے۔ اس کی عارضی تفریح ختم ہونے والی تھی۔ مگر ان چند دنوں میں ہی وہ سالار کے وجود کی عادی سی ہو گئی تھی سوتے جاگتے، چلتے پھرتے وہ سالار کا موازنہ فرہاد سے کرتی تو اسے ہمیشہ سالار

اخلاقیات کی بلندیوں پر دکھائی دیتا اور ہر روز فرہاد اتنا ہی پستی میں پڑا نظر آتا کچھ تو فرہاد کی اپنی بیوی سے لاپروائی اور کچھ زینب کا کیا جانے والا موازنہ دونوں نے مل کر اس کے دل میں فرہاد کے خلاف کئی طرح کے منفی خیالات بھر دیے اور ان ہی خیالات نے آگے چل کر اسے اپنی زندگی کا وہ بدترین سبق دیا جسے وہ مرتے دم تک نہ بھولی۔



وجاہت کی شادی کے سلسلے میں شروع ہونے والا رابعہ کا جوش و خروش جلد ہی ماند پڑ گیا۔ آہستہ آہستہ یہ معاملہ ایسے ختم ہوا جیسے کبھی شروع ہی نہ ہوا تھا۔ خالدہ خالہ نے اس کے بعد انہیں کوئی ایسا اچھا رشتہ ہی نہ دکھایا کہ بات بنتی یا پھر شاید رابعہ کو ہی اس رشتہ کے بعد کچھ پسند نہ آیا اور جہاں تک وجاہت کا تعلق تھا وہ اس مسئلے سے روز اول کی طرح بے گانہ تھا۔ رشتہ ہونے یا نہ ہونے سے اسے کوئی فرق پڑتا نظر نہ آتا۔ بظاہر وہ پہلے ہی کی طرح اپنی تنہا زندگی سے مطمئن تھا۔ مگر جب بھی کبھی وہ رابعہ کے گھر کھانا کھانے آتا اس کا دل اپنے بھائی کی تنہائی کا سوچ سوچ کر جلتا' کڑھتا رہتا۔ اس کا بس کا نہ چلتا وہ کسی بھی طرح اپنے بھائی کا نکاح کر کے اس کا گھر آباد کر دیتی۔ اس سلسلے میں وہ کئی بار رستم اور اس کی بیوی حرا سے بھی کہہ چکی تھی۔ اپنے شوہر عمر سے بھی کہا کرتی کہ اگر کوئی اچھی لڑکی نظر میں ہو تو وجاہت بھائی کے لیے دیکھنا' مگر لاحاصل ایسا لگتا جیسے اس کے بھائی کے ہاتھ میں شادی کی لکیر ہی نہ تھی یا پھر شاید ابھی بھی اس کا وقت نہ آیا تھا۔ اس وقت تو اسے قدرت کی ستم ظریفی پر بے حد غصہ آتا جب وہ کسی ساٹھ سالہ شخص کو دوسری یا تیسری شادی کرتا دیکھتی اور سوچتی۔

''اللہ تعالیٰ نے اس کے نصیب میں دو' تین شادیاں لکھ دیں اور میرے بھائی کے لیے ایک بھی نہیں۔''

مگر شاید قدرت کے کیے جانے والے کچھ فیصلے ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جن میں انسان مکمل طور پر بے اختیار ہے۔ جیسے زندگی' موت' اولاد اور پھر شادی اور یہ بات گزرتے وقت نے بہت اچھی طرح رابعہ کو سمجھادی تھی۔



''امی جی.....''

اس نے چٹائی پر ماں کے قریب بیٹھتے ہوئے ان کا گھٹنا ہلا کر اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ جب سے اسکول سے آئی تھی۔ اس کی ماں اسی طرح اپنے سامنے مشین رکھے مسلسل سلائی کرنے میں مصروف تھی۔ شاید یہ کسی کا آرڈر تھا جو انہیں جلد مکمل کر کے دینا تھا۔ وہ کتنی دیر سے ہاتھ' منہ دھوئے' یونیفارم تبدیل کیے ان کے قریب بیٹھی اس بات کی منتظر تھی کہ کب اماں اٹھیں اور کچن سے کھانا لے کر آئیں۔ ہمیشہ اسکول سے واپسی پر وہ دونوں ماں' بیٹیاں مل کر کھانا کھاتیں' مگر آج تو وہ اس قدر مصروف تھیں کہ شاید اس کی وہاں موجودگی بھی بھلائے ہوئے تھیں۔ مشین کی مسلسل گھرر گھرر کی آواز سے تنگ آکر اس نے ان کا گھٹنا پکڑ کر ہلا دیا۔

''کیا ہوا۔''

سوئی میں دھاگا ڈالنے کے بعد انہوں نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر اپنے نہایت قریب بیٹھی اپنی بیٹی پر ایک نظر ڈالی۔ جس کے چہرے کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ وہ بھوک کی شدت سے بے حال ہے۔ انہیں فوراً" ہی اپنی کوتاہی کا احساس ہوا۔

''معاف کرنا بیٹا میں نے یہ سارے کپڑے آج شام تک مکمل کر کے دینے ہیں۔ کیونکہ سامنے والی صوفیہ باجی آج رات میں کراچی جا رہی ہیں۔ وہاں ان کے بھائی کی شادی ہے اور تم تو جانتی ہو کہ وہ پیسے بھی اسی وقت ادا کر دیتی ہیں۔''

بھوک کی شدت میں اسے یہ بھی یاد نہ آیا کہ صوفیہ باجی کون ہیں جن کا ذکر اس کی ماں کر رہی ہے اور نہ ہی اسے

ان ساری باتوں سے کوئی غرض تھی۔

"اماں مجھے بھوک لگی ہے۔"

ان کی ساری باتوں کو نظرانداز کر کے اس نے اپنے مطلب کی بات کی۔ ویسے بھی صبح ناشتے کے نام پر کھایا جانے والا ایک پاپا جانے کب کا ہضم ہو چکا تھا۔ بریک میں بھی وہ کبھی کچھ نہ کھاتی کیونکہ اس کے پاس پیسے ہی نہیں ہوتے تھے۔

"کچن کی الماری کھولو، کٹوری میں اچار رکھا ہے۔ وہیں قریب ہی کپڑے میں لپٹی روٹی بھی رکھی ہے۔ نکال کر لے آؤ اور کھالو۔"

"کیوں آپ نے کھانا نہیں کھانا۔" اس نے کھڑے ہوتے ہوئے اپنی ماں سے سوال کیا۔

آج سے پہلے تو کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ اس کی ماں بنا اس کا انتظار کیے اکیلے ہی کھانا کھالے۔ پھر آج ایسا کیسے ہو سکتا تھا۔

"میں نے صبح ناشتے میں جو روٹی کھائی تھی وہ ہی ابھی تک ہضم نہیں ہوئی، تم کھانا کھاؤ۔ میں یہ سلائی مکمل کرنے کے بعد خود ہی کھالوں گی۔"

اسے جواب دے کر وہ پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔ وہ کچن کی جانب آگئی۔ اچار کے ساتھ روٹی کھانے کا سن کر ہی اس کی بھوک قدرے کم ہو گئی تھی۔ اس نے اندر آکر سبزی کی ٹوکری میں جھانکا۔ شاید کوئی آلو مل جائے تو خود ہی سالن بنالے، مگر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

"امی جی آلو نہیں ہیں۔" اس نے اندر سے ہی آواز لگا کر پوچھا۔

"نہیں بیٹا... ابھی یہ کپڑے سلائی کر کے دے آؤں، پھر واپس آتے ہوئے لے آؤں گی، ابھی تم اچار سے کھانا کھالو، مجھے بھوک نہیں ہے۔"

اسے اچار کبھی بھی اتنا پسند نہ تھا یا شاید ہر بار اچار سے روٹی کھا کھا کر اب وہ قدرے تنگ آچکی تھی۔ اس لیے منہ بسورتی کچن سے باہر آگئی۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ گھر میں راشن ختم ہے۔ اسی لیے اس کی ماں اپنی بھوک پیاس بھلائے تندہی سے سلائی کرنے میں مصروف ہے۔ باہر نکلتے ہی اماں نے سلائی والا ہاتھ روک کر ایک نظر اس کے ستے ہوئے چہرے پر ڈالی۔

"دیکھو بیٹا جو ملے بسم اللہ پڑھ کر کھایا کرو اور کھانے کے بعد ہمیشہ اپنے رب کا شکر ادا کرنے کی عادت ڈالو۔ جس کے حکم سے روٹی کا یہ نوالہ تم تک پہنچا۔ ورنہ جانے اس وقت اس دنیا میں کتنے ایسے لوگ موجود ہیں جو بھوکے پیاسے روٹی کے ایک ایک نوالے کو ترس رہے ہیں۔" اپنی ماں کی بات سنتے ہی وہ دوبارہ کچن میں آگئی۔ الماری کھول کر روٹی نکالی، اس پر اچار کی ایک پھانک رکھی اور باہر چارپائی پر آبیٹھی۔

"یاد رکھنا بیٹا، جتنا شکر کرو گی اللہ اتنا ہی نوازے گا۔ ورنہ مجھ جیسے ناشکرے بندوں کو تو وہ آسمان سے اٹھا کر زمین پر پٹخنے میں منٹ نہیں لگاتا۔ اس لیے ہمیشہ اس سے ڈرتے رہو۔"

اس نے ہر وقت اور ہر حال میں اپنی ماں کو اللہ کا شکر ادا کرتے ہی دیکھا تھا۔ وہ تو سوتے جاگتے خالی پیٹ بھی اپنے رب کا شکر ہی ادا کرتی تھی تو پھر جانے وہ کون سی ناشکری تھی، جس کا ذکر اس نے اکثر اوقات اپنی ماں سے سنا تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی کبھی یہ سوال اپنی ماں سے نہ کر سکی۔ اسے لگتا اس ایک سوال کے پیچھے کوئی ایسا درد ضرور چھپا ہے، جو ہمیشہ اس کی ماں کی آنکھوں سے جھانکتا تھا۔

وہ جیسے ہی مارکیٹ سے باہر نکلیں اچانک ہی نگاہ روڈ کے دوسری جانب کھڑی زینب پر پڑی پہلے تو کئی دیر تک انہیں یقین ہی نہ آیا کہ وہ زینب ہے۔ بے شک وہ خود کو کالی چادر میں اچھی طرح لپیٹے ہوئے تھی۔ پھر بھی اس کی

غیر معمولی تیاری انہیں روڈ کے دوسری طرف سے بھی صاف نظر آرہی تھی۔ سب سے زیادہ حیران تو انہیں زینب کے لبوں پر لگی ڈارک ریڈ لپ اسٹک نے کیا۔ انہیں سوچنے پر بھی یاد نہ آیا کہ انہوں نے اس سے قبل کبھی زینب کو اتنی گہری لپ اسٹک لگائے دیکھا ہو وہ تو ہمیشہ سے ہلکے رنگ استعمال کرنے کی عادی تھی اور آج اس کے ہونٹوں پر لگی ریڈ لپ اسٹک نے کالی چادر میں بھی اس کے حسن کو کئی گنا بڑھا دیا تھا۔ مگر انہیں سب سے زیادہ حیرت زینب کے اس طرح تن تنہا روڈ پر کھڑے ہونے کی تھی۔

''یہ یہاں کیا کررہی ہے' وہ بھی بالکل اکیلی۔''

یہاں وہاں نظر دوڑانے پر بھی انہیں اس کے آس پاس کوئی ایسا فرد دکھائی نہ دیا۔ جسے دیکھ کر سوچا جاسکے کہ وہ زینب کے ساتھ ہے اتنے مہنگے شاپنگ مال کے بالکل سامنے کھڑی زینب کے ہاتھوں میں موجود مختلف شاپرز نے انہیں تجسس میں مبتلا کردیا۔ ایسی جگہ جہاں زینب کی رسائی بھی ان کے نزدیک ناممکن تھی۔ وہاں اس کے ہاتھوں میں ڈھیروں ڈھیر سامان انہیں کوئی اور ہی کہانی سنارہا تھا۔

اس سے قبل کہ وہ روڈ کراس کرکے زینب کے پاس جاتیں' تاکہ اسے جتلایا جاسکتا کہ میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے ایک دم ہی بلیک کلر کی کرولا اس کے پاس اندر آکر رکی۔ جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود سالار کو دیکھ کر وہ حق دق رہ گئیں۔ صباحت کی بہن کی شادی پر ہونے والی ایک سرسری سی ملاقات کہاں تک پہنچ چکی ہے۔

انہیں یقین ہی نہ آیا۔ سالار کی وہاں موجودگی صاف ظاہر کررہی تھی کہ زینب اسی کے ساتھ یہاں تک آئی ہے۔ ورنہ اسے تو شاید اس مارکیٹ کا نام بھی نہ پتا تھا۔ انہوں نے زینب کو فرنٹ ڈور کھول کر بڑے استحقاق کے ساتھ سالار کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے دیکھا۔ دوسرے ہی پل آہستہ آہستہ رینگتی گاڑی آگے کی جانب بڑھ گئی' جبکہ وہ ہکا بکا اپنی جگہ ساکت وصامت کھڑی تھیں اور جانے کتنی دیر تک وہ اسی طرح اپنی جگہ کھڑی رہتیں' اگر ان کا ڈرائیور پارکنگ سے گاڑی لے کر نہ آجاتا۔ ڈرائیور کے کئی بار بجائے جانے والے تیز ہارن کی آواز پر کر انہیں اپنی گاڑی کی آمد کا علم ہوا۔ ورنہ وہ تو حیران وپریشان اسی سمت جانب تکے جارہی تھیں۔ جس طرف سالار کی گاڑی میں بیٹھ کر زینب گئی تھی۔

''خان محمد گاڑی ذرا تیز چلانا' مجھے جلدی گھر پہنچنا ہے۔''

گاڑی میں بیٹھنے سے قبل ان کا ارادہ زینب کے گھر جانے کا تھا۔ شاید اس طرح وہ اسے رنگے ہاتھوں پکڑ سکتیں۔ مگر گاڑی میں بیٹھتے ہی ان کا یہ ارادہ تبدیل ہوگیا۔ اب وہ جلد از جلد گھر پہنچنا چاہتی تھیں۔ تاکہ صباحت کو فون کرکے اس نئی صورت حال سے آگاہ کرسکیں۔ جس کا سامنا ابھی کچھ دیر قبل انہوں نے کیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)



سمیہ عثمان



"ناجیہ! تم مجھے تو ہر وقت بچت کے مشورے دیتی رہتی ہو اور فضول خرچی پر اچھا خاصا لیکچر، لیکن تمہیں اپنی یہ فضول خرچی نظر نہیں آتی جو تم اپنی تنخواہ کا نصف حصہ روڈ پر بیٹھے یا کہیں بھی چلتے پھرتے ان پیشہ ور بھکاریوں کو دے دیتی ہو۔" ابھی میرے ساتھ آفس سے واپسی پر ہی ناجیہ نے سگنل پر کھڑے ایک بھکاری کو دس کا نوٹ دیا تو مجھ سے رہا نہیں گیا بڑی مشکل سے اس وقت میں نے خود پر ضبط کیا اور سگنل کھلتے ہی گاڑی کی اسپیڈ بڑھا دی، لیکن گھر آتے ہی جیسے میرا ضبط جواب دے گیا تھا۔

"تو کیا میں غلط کرتی ہوں؟" وہ مجھے معصومیت سے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"یہ تم مجھ سے پوچھ رہی ہو۔ کیا تم خود نہیں جانتیں ایک طرف تم مہنگائی کا رونا روتی ہو اور دوسری طرف تم بڑے آرام سے پیسے یوں ان لوگوں کو دیتی ہو جیسے ان سے مجبور اس دنیا میں کوئی اور ہے ہی نہیں۔"

"میری نظر میں تو یہ ہی مجبور ہیں۔ آپ تو خوامخواہ ہی....."

"خوامخواہ.... ناجیہ۔" میں اس کی بات کاٹ کر فوراً بولا۔ "تم غلط کر رہی ہو۔"

"نہیں احسن! میں غلط نہیں کر رہی کیونکہ میری نیت میں فتور نہیں ہے۔" وہ میری بات کی نفی کرتے ہوئے بولی۔ وہ میری محبت سے اچھی طرح واقف تھی اس لیے اپنی بات ہمیشہ ہی منوالیا کرتی، لیکن میری محبت و چاہت کو سراہتے ہوئے میری اطاعت بھی لازمی کرتی تھی اس لیے میں اس کی بات مان لیا کرتا تھا، مگر اس وقت یہ بات ماننے سے انکاری تھا۔

"بے شک نہیں ہوگا، لیکن مجھے تمہاری یہ بات بالکل پسند نہیں کہ تم اپنی کمائی یوں اڑا دو۔" وہ کچھ نہیں بولی اور خاموشی سے کچن میں چلی گئی تو میں صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔

دن بھر آفس میں کام کرنے سے ذہنی و جسمانی تھکن مجھ پر سوار تھی، میں اس وقت سونا نہیں چاہتا تھا، لیکن آنکھیں بند کرتے ہی میری ہر سوچ پر نیند غالب آگئی تھی۔



ناجیہ اور میں یونیورسٹی میں کلاس فیلو ہونے کے ساتھ بہترین دوست بھی تھے ہم دونوں کی ذہنی ہم آہنگی نے ہمیں کچھ عرصہ میں ہی ایک دوسرے کے بے حد قریب کر دیا تھا اس لیے ہم یونیورسٹی کے بعد بھی کئی گھنٹے ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھے رہتے تھے۔

میں اس کے نوٹس بنانے میں اس کی مدد کرتا تو وہ میرے تقریری مقابلوں، مباحثوں اور بیت بازی میں میری مدد کروائی تھی اس کا ادبی ذوق کافی وسیع تھا علامہ اقبال کے اشعار سے لے کر میر و غالب سب اسے زبانی یاد تھے اس کے علاوہ انگلش لٹریچر پڑھنا پھر ان پر گفتگو کرنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اسے کینٹین میں بیٹھ کر وقت ضائع کرنا بالکل پسند نہیں تھا۔ وہ کلاس لینے کے بعد مجھے بھی اپنے ساتھ لائبریری لے جاتی اور

اگر کبھی میں ضد و غصہ کر کے اسے کینٹین لے جاتا تو اس وقت تو وہ میرے غصہ و ناراضی کی وجہ سے خود پر ضبط کیے بیٹھی رہتی، لیکن بعد میں مجھے فضول خرچی اور وقت ضائع کرنے پر لیکچر دیتی تھی۔

"دیکھا نا! وقت کے ساتھ پیسے بھی ضائع ہوئے۔ اگر ہم لائبریری میں بیٹھ کر کوئی کتاب پڑھ لیتے تو ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا۔"

"لیکن میں کچھ وقت کتابوں سے ہٹ کر تمہارے ساتھ چائے پی کر گزارنا چاہتا تھا۔"

"تم تو بس....." وہ لاپروائی سے میرے محبت کے جذبے کو نظرانداز کرتے ہوئے بولی تو میں اس کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔

"کیا تم نہیں جانتیں کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔" میں اپنی تمام تر محبت کو اپنے لہجے میں سمو کر بولا تو وہ مجھے دیکھنے لگی۔

"احسن! ہر بات کا ایک وقت ہوتا ہے اور وہ اسی وقت اچھی لگتی ہے۔"

"لیکن اگر اس وقت میں سے کچھ وقت ابھی نکالتا



ہوں تو کیا غلط کرتا ہوں۔"

"نہیں۔" وہ شاید میری بات سے قائل ہوگئی تھی یا پھر مجھ سے بحث کرنا نہیں چاہتی تھی اور ایسا نہیں تھا کہ یہ پہلی و آخری بار تھا مجھے جب بھی موقع ملتا میں اسے زبردستی اپنے ساتھ یونیورسٹی کی کینٹین یا پھر ساحل سمندر پر لے جاتا تھا اور وہ اس وقت تو نہیں، لیکن اگلے روز مجھ سے خفا ضرور ہوجاتی اور اسے منانے میں مجھے کوئی بہت زیادہ وقت نہیں لگتا تھا۔ وہ میری ہر بات با آسانی مان لیا کرتی تھی مجھے کبھی بھی اسے کوئی بات سمجھانے میں دقت نہیں ہوئی تھی شاید یہ باتیں بہت ہوتی ہیں کسی بھی انسان کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے اس لیے میں نے ناجیہ کا ہی انتخاب کیا تھا۔ شروع میں امی ابو نے مخالفت کی، لیکن بعد میں میری ضد کے آگے وہ بھی ہار گئے تھے یا شاید اپنے اکلوتے بیٹے کی فرمائش پوری کرنا ان کی ضرورت میں شامل ہوگیا تھا۔

مجھے تعلیم مکمل کرنے کے بعد نوکری نہیں کرنی تھی کیونکہ ابو کا اپنا بزنس تھا، لیکن بجائے میں ابو کا سہارا بنتا میں نے نوکری کرلی اور شاید ابو کو اسی بات کا دھچکا لگا تھا اس لیے ان کی صحت دن بہ دن گرتی رہی اور آخر کار وہ خالق حقیقی سے جا ملے۔ ان کے بعد میں نے بزنس سنبھالنے کی کوشش تو کی، لیکن ایک تو مجھے کوئی تجربہ نہیں تھا دوسرا میرا دماغ اس طرف چلا نہیں سو مجھے نقصان ہوا اور سارا بزنس ٹھپ ہوگیا اسی عرصے میں امی کی طبیعت بھی خراب رہنے لگی تھی۔

میں نے امی سے بہت معافی مانگی مگر شاید ان کے پاس وقت کم تھا، لیکن میں ان خوش قسمت لوگوں میں خود کو شمار کرتا ہوں کہ میری ماں نے آخری وقت میں مجھے معاف کرکے اپنی آنکھیں بند کی تھیں۔ امی ابو کے بعد میں بالکل ہی تنہا رہ گیا تھا اور ایسے میں ناجیہ تھی جس نے مجھے سنبھالا، مجھے زندگی کا احساس دلا کر مصروف عمل کردیا، میں پھر سے نوکری کی تلاش کرنے لگا۔

اب سب کچھ اتنا آسان نہیں رہا تھا کیونکہ دعا دینے والے سائے تو منوں مٹی تلے جا سوئے تھے میری محنت و قابلیت سے حاصل کی گئی ڈگری مجھے ہر در سے مایوس لوٹا رہی تھی۔ مجھے افسوس و ندامت کے ساتھ نجانے کیا کچھ ہو رہا تھا۔ میں ابو کو نہ سمجھ سکا کہ وہ مجھ سے کیا چاہتے تھے اور نہ ہی انہیں اپنی بات سمجھا سکا تھا جب ہی زندگی مجھے مشکل لگ رہی تھی۔

گھر میں پیسے و راشن کی کمی کے باعث ہم دونوں کا موڈ کچھ اب بگڑا بگڑا رہنے لگا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کریں۔ زندگی جیسے تنگ ہورہی تھی اور مشکلیں کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے سے رہنے لگے گھر میں بالکل خاموشی کا راج تھا۔ نہ جانے میری ہستی مسکراتی زندگی کو کس کی نظر لگ گئی تھی۔ دل چاہتا تھا خودکشی کرلوں، لیکن پھر ناجیہ پر نظر جاتی تو اس کا سوچ کر خود کو اچھی امید دلاتا تھا۔

"احسن!" اس رات میں بہت پریشانی کے عالم میں بیٹھا سوچ رہا تھا جب ناجیہ نے مجھے آواز دینے کے ساتھ میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تو میری سوچیں منتشر ہوگئیں اور میں چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے؟"

"ہاں کہو۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا تو وہ میرے قریب بیٹھتے ہوئے تمہید باندھتی ہوئی بولی۔

"احسن! میاں بیوی گاڑی کے دو پہیے ہیں اگر ایک پہیے کو کچھ ہوجائے تو دوسرا پہیہ گاڑی کھینچتا ہے۔ یہ بات آپ جانتے ہیں نا۔" اس نے اپنی بات کے آخر میں تصدیق چاہی تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"لیکن ہماری گاڑی رک گئی ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا... کیا کہنا چاہ رہی ہو۔" میں قدرے غصے میں بولا تو وہ میرا ہاتھ تھام کر سمجھانے والے انداز میں بولی۔

"نہیں احسن غصے سے کچھ نہیں ہوگا بلکہ مزید نقصان ہوگا۔ آپ کا اور میرا اس لیے آپ میری بات تحمل سے سنیں۔" اس کی بات پر میں خاموش ہوکر اسے دیکھنے لگا۔ سب کچھ تو کھو چکا تھا اس لیے مزید کچھ

اور کھونے کی ہمت نہیں تھی وہ قدرے توقف کے بعد بولی۔

"آپ مجھے نوکری کی اجازت دے دیں۔"

"ہرگز نہیں۔" میرے منہ سے غصے سے بے ساختہ ہی نکلا تھا اور وہ مجھے دیکھ کر دھیرے سے بولی۔

"میں اپنی خوشی سے نہیں کر رہی بلکہ گھر کے حالات دیکھ کر مجبورا" مجھے یہ قدم اٹھانا پڑ رہا ہے اور جیسے ہی کہیں آپ کی نوکری لگے گی' میں وعدہ کرتی ہوں کہ میں جاب چھوڑ دوں گی۔" اس کی بات پر میں سوچتے ہوئے انداز میں اسے دیکھنے لگا تھا۔ میری طرح کوئی بھی مرد یہ گوارہ نہیں کرے گا کہ وہ خود بے روزگار رہے اور گھر بیٹھ کر اپنی بیوی کی کمائی کھائے' لیکن حالات کے آگے میں مجبور بے بس تھا۔ اس لیے ناچاہتے ہوئے بھی میں نے ناجیہ کو نوکری کی اجازت دے دی تھی اور خود بھی روزگار کے لیے جدوجہد تیز کردی تھی۔

اس معاشرے میں جسے مردوں کا معاشرہ کہا جاتا ہے ہمیں ہر چیز بہت مشکل سے ملتی ہے اور ہماری نسبت عورت کو ہر چیز با آسانی مل جاتی ہے' لیکن اس کے باوجود بھی وہ خوش نہیں رہتی اور یہ ہی حال ناجیہ کا تھا اسے جاب تو جلدی مل گئی تھی' مگر اس کے مطلب کی نہیں تھی اور میں دھکے کھاتا ایک چھوٹی سی کمپنی میں کلرک کی حیثیت سے اپنے کام کو سرانجام دینے لگا تھا۔

زندگی اب کچھ مہربان ہوئی تھی یا اسے ہم پر ترس آگیا تھا۔ جو بھی تھا' میں اگر خوش نہیں تھا تو مایوسی کے بادلوں کو بھی اپنے آس پاس اب بھٹکنے نہیں دے رہا تھا بلکہ اب محنت کے ساتھ ناجیہ کو بھی خوش کرنے کی کوشش میں لگا رہتا کیونکہ اس عرصے میں ہم دونوں کے درمیان جو ناچاقی و غصہ کی دیوار آکھڑی ہوئی تھی اسے مجھے ہی گرانا تھا اور اس کی جگہ سابقہ محبت کی بہار کے پھول پھر سے مہکانے تھے۔

وقت کا پہیہ اپنی رفتار سے چل رہا تھا' میں جاب کرنے کے ساتھ دوسری کمپنی میں بھی اپلائی کر رہا تھا کیونکہ ہر انسان کی طرح میرے اندر بھی بہتر سے بہتر کی طلب موجود تھی اور پھر وقت و حالات بھی کبھی ایک سے نہیں رہتے سو کچھ عرصے بعد ہی مجھے ایک اچھی و بڑی کمپنی میں جاب مل گئی تھی سیلری پیکج اچھا تھا اس لیے میں نے سوچ کر نامناسب سمجھا اور اسی دوران میں نے اپنی گاڑی خرید لی تھی۔

ناجیہ کے نزدیک یہ سب سے بڑی فضول خرچی تھی کیونکہ اس کے مطابق ہم اس سے پہلے بھی زندگی کا سفر طے کر رہے تھے۔

"اب تم سہولت بھی تو دیکھو! اس سے پہلے ہم بسوں میں دھکے کھا رہے تھے۔"

"لیکن احسن! ہم بہت برے حالات سے گزرے ہیں اس صورت میں ہمیں آگے کی پلاننگ کرنی چاہیے ناکہ ہاتھ کھلا چھوڑ دیں۔"

"پہلے ہم لوگ کرائے میں پیسے خرچ کر رہے تھے اور اب اپنی سواری بھی تو ہے ہمیں کہیں آنے جانے میں مشکل نہیں ہو گی۔"

"یہ ٹھیک ہے کہ اپنی سواری ہے' لیکن پیسے اب کرائے کے بجائے پیٹرول اور گاڑی کے مختلف کاموں میں خرچ ہوں گے۔" وہ میری کسی بھی بات سے متفق ہونے کی بجائے الٹا مجھے سمجھانے لگی تھی۔

"ہم ابھی گاڑی افورڈ نہیں کرسکتے کیونکہ آمدنی بہت کم اور اخراجات زیادہ ہو جائیں گے اور پھر ہم اسی دوراہے پر آکھڑے ہوں گے جہاں سے چلے تھے مشکل ابھی بالکل نہیں ٹلی۔"

میں اسے دیکھنے لگا شاید وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی کیونکہ وقت برا ہو یا اچھا بھی بتا کر نہیں آتا اور انسان کو اس کا سامنا کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔ میں تو ابھی برا وقت دیکھ چکا تھا جو مجھے بہت کچھ سکھا کر گیا تھا۔ گوکہ میں نے سیکنڈ ہینڈ گاڑی لی تھی' مگر ناجیہ نے اسے دیکھتے ہی مجھے لیکچر دے دیا تھا۔

"اچھا اب منہ مت پھلاؤ! اب لے چکے ہو اس لیے کچھ نہیں ہو سکتا' لیکن آئندہ خیال کرنا۔ لو چائے پی لو۔" وہ میری اتری ہوئی شکل دیکھ کر ہلکے پھلکے انداز

میں بولی تھی۔ میں اس کے ہاتھ سے چائے کی پیالی لے کر پینے لگا اور ساتھ ہی یہ بھی سوچنے لگا کہ اس وقت ناجیہ کو لے کر کہیں آؤٹنگ پر چلا جاؤں۔ شادی کے بعد ہم بہت کم ہی کہیں باہر کھانے پر یا سیرو تفریح کے لیے گئے تھے اور اس خیال کے آتے ہی میں ناجیہ کو اپنی گاڑی میں بٹھانے کے بہانے ڈھونڈنے لگا تھا۔

"مجھے اپنی گاڑی میں کب بٹھا رہے ہو۔" اس نے جیسے خود ہی میری مشکل آسان کر دی تھی اور اس کی پچھلی ساری باتیں بھول کر فریش موڈ میں آگیا تھا۔

"ہاں! چلو۔" میں چائے کی خالی پیالی ڈائننگ ٹیبل پر رکھ کر گاڑی کی چابی اٹھا کر تیار اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ میری آنکھوں میں دیکھ کر محبت سے مسکرا کر بولی۔

"حسن! آپ بھی نا۔" وہ کہہ کر میرے ساتھ چل پڑی تھی۔

اب ہماری زندگی کے خوب صورت و مصروف دن شروع ہو گئے تھے۔ صبح ساتھ آفس جانا، لیکن گھر واپسی کی روٹین ہم دونوں کی الگ تھی۔ ناجیہ مجھ سے کافی پہلے گھر آکر رات کے کھانے کی تیاری کرتی تھی، میں کافی حد تک مطمئن وہ خوشحال لائف گزار رہا تھا۔ ناجیہ کی طبیعت میں اب کچھ تبدیلی آرہی تھی۔ وہ مجھ سے بات کرتے ہوئے ایک دم خاموش ہو جاتی یا پھر کوئی کام کرتے ہوئے کہیں کھو جاتی تھی۔ شروع میں، میں اسے ٹوکتا تو وہ فوراً" ہی ہنسی میں بات کو اڑا دیتی، لیکن مجھے تشویش ہونے لگی تھی۔ شاید مصروفیات کے باعث ہم دونوں ایک دوسرے کو ٹائم نہیں دے پا رہے تھے جو بھی تھا مجھے ناجیہ کی اس حالت نے اس کی طرف سے فکر مند کر دیا تھا اور میں چاہتا تھا کہ اب ناجیہ کو زیادہ سے زیادہ وقت دوں، مگر ان دنوں آفس میں کام معمول سے کہیں زیادہ تھا۔

اس روز ہماری شادی کی پہلی سالگرہ تھی، میں کسی بھی طرح آفس سے جلدی نکل کر گھر سے قریب ہی ایک مارکیٹ میں چلا آیا تھا اور وہاں سے ناجیہ کے لیے گولڈ کا ایک لاکٹ خریدا، بیکری آکر کیک اور موم بتی لینے لگا تھا کہ اچانک تیز بارش نے میرا راستہ روکنا چاہا، مگر میں نے پروا نہیں کی اور بیکری سے نکل کر بھیگتا ہوا گاڑی میں آکر بیٹھ گیا۔ گاڑی ریورس کرتا اسے اسپیڈ دے کر سیدھا گھر آیا تھا۔

گھر آیا تو دیکھا ناجیہ کچھ عجیب سے حلیے میں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی تھی۔ گھر میں بالکل اندھیرا چھایا ہوا تھا اور ناجیہ بال کھولے ملگجے میلے سے کپڑوں میں بیٹھی نجانے کیا سوچ رہی تھی، میں نے ڈائننگ ہال کی لائٹ آن کی پھر ناجیہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔

"کیا ہوا؟ ایسے کیوں بیٹھی ہو؟"

"آں۔ کچھ نہیں، بس یونہی۔" وہ کہہ کر اٹھنے لگی تو میں نے اس کے کندھے پر زور دے کر اسے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور خود بھی اس کے سامنے ساری چیزیں رکھ کر پہلے اس کے گلے میں سونے کا لاکٹ پہنایا پھر اس کے سامنے بیٹھا تو وہ مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"تم بھول گئیں۔ آج ہی کے دن ہماری شادی ہوئی تھی۔" میری بات پر اس کے چہرے کے تاثرات ذرا سے بدلے اور وہ لاکٹ کو ـــــ دیکھنے لگی پھر قدرے توقف کے بعد بولی۔

"ان سب کی کیا ضرورت تھی۔ اگر یہ پیسے آپ کسی غریب کو دے دیتے تو کیا برا ہوتا؟" اس کے سوال پر مجھے فوراً" کوئی جواب نہیں سوجھا تو میں اسے دیکھ کر رہ گیا۔

"آپ اتنی فضول خرچی کرتے ہیں کیا آپ کو ذرا احساس نہیں ہوتا کہ آپ کو یہ پیسے کسی مستحق کو دے دینے چاہئیں۔"

"آج کل کوئی مستحق نہیں ہے ناجیہ بیگم۔" میں طنزیہ ہنسی کے ساتھ بولا تو وہ دکھ سے مجھے دیکھنے لگی شاید اسے امید نہیں تھی کہ میں کوئی ایسی بات کروں گا۔

"لوگوں نے نجانے کس کس طرح مانگنے کے طریقے ایجاد کرلیے ہیں۔ شکل ایسی معصوم بنالیتے ہیں

جیسے ان سے زیادہ کوئی غریب نہ ہو اور اندر سے ہم سے زیادہ اچھے حالات ہوتے ہیں۔" میری بات کے جواب میں وہ کچھ نہیں بولی بلکہ بہت خاموشی سے وہاں سے اٹھ گئی تھی پھر اگلے دو دن وہ نجانے کہاں مصروف رہی' مجھ سے پہلے گھر آنے والی ناجیہ میرے بعد گھر آتی اور بغیر کچھ کہے سنے کچن میں مصروف ہو جاتی تھی' لیکن اس کے بعد اس کے مزاج کے ساتھ روٹین بھی سیٹ ہو گئی تھی۔

"تمہیں کیا ہو گیا تھا ناجیہ؟" ایک رات سونے سے پہلے میں نے محبت سے اس سے پوچھا تو وہ چونک کر مجھے دیکھتے ہوئے الٹا مجھ ہی سے پوچھنے لگی۔

"کب؟"

"کچھ روز پہلے۔ ٹھیک سے کچھ کھا رہی تھیں نہ میری طرف متوجہ تھیں۔"

"اچھا۔" وہ کھلکھلا کر ہنسی پھر قدرے توقف کے بعد بولی۔

"مجھے کچھ نہیں ہوا تھا بس اندھیرے سے روشنی کی طرف آ رہی تھی۔"

"کیا مطلب؟" میں ناسمجھی کے عالم میں اسے دیکھنے لگا تو وہ مسکرا کر بولی۔

"کچھ نہیں! سو جائیں۔ صبح آفس بھی جانا ہے۔"

"اوکے گڈ نائٹ۔" میں نے مسکرا کر اپنی طرف کا لیمپ آف کر دیا تھا۔



اگلے دن اتوار تھا سر شام سو جانے کی وجہ سے میری آنکھ صبح معمول سے کافی پہلے کھل گئی تھی۔ ناجیہ نماز سے فارغ ہو کر اب قرآن پاک کی تلاوت کر رہی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس نے رات مجھے نیند سے جگا کر بیڈ روم میں لے جانے کی بھی زحمت نہیں کی تھی' میں صوفے پر لیٹا اسے دیکھنے لگا۔ وہ قرآن پاک کو چوم کر آنکھوں سے لگا کر اسے جزدان میں رکھ رہی تھی۔

"چائے لاؤں آپ کے لیے۔" اس نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے مسکرا کر مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ وہ اس وقت اس قدر خوب صورت لگ رہی تھی کہ میں کچھ بھی سننے سے قاصر ہو کر اس کو دیکھنے میں محو تھا۔ لال دوپٹے کو وہ اپنے چہرے پر لپیٹے سورج کی پہلی کرن کی طرح روشن لگ رہی تھی۔

قدرت نے اسے بہت فرصت سے بنایا تھا۔ تیکھے نین نقوش اور اوپر سے دودھیا رنگ اس کی خوب صورتی میں کہیں زیادہ اضافہ کر گئے تھے۔ صبح کا اتنا خوب صورت منظر دیکھ کر میں اپنی تمام تھکن بھول گیا تھا۔

"احسن! چائے۔" اس نے میرے کندھے پر ہلکا سا ہاتھ رکھ کر چائے کی پیالی میری طرف بڑھائی تو میں اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اپنی نظروں کے حصار میں اسے لیتا ہوا مسکرا کر بولا۔

"اگر مجھے پتا ہوتا کہ چھٹی والے دن کی صبح اتنی خوب صورت ہوتی ہے تو میں ساری رات جاگ کر گزارتا۔"

"اچھا۔" وہ میرے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔

"رات اتنی گہری نیند سو رہے تھے کہ میرے جگانے سے بھی آپ نہیں اٹھے یہاں صوفے پر سونے سے آپ تھک تو گئے ہوں گے۔"

"ہاں..." میں اسے اپنے ایک بازو کے حصار میں لے کر بولا۔

"لیکن تمہیں دیکھ کر میری ساری تھکن دور ہو گئی۔"

"اچھا۔" وہ مسکرا کر شہادت کی انگلی سے میری ناک چھو کر بولی۔

"آپ منہ ہاتھ دھو کر فریش ہو جائیں' میں ناشتا لگاتی ہوں۔" وہ کہہ کر کچن میں چلی گئی تو میں چائے پی کر واش روم میں بند ہو گیا تھا۔

چھٹی کا دن میرا صرف ناجیہ کے لیے ہی ہوتا تھا ہم کہیں باہر نہ بھی جائیں تو گھر میں' میں اس کے ساتھ ہی رہتا تھا تاکہ اسے مجھ سے کسی قسم کی کوئی شکایت نہ ہو۔

ویسے بھی ہم دونوں کی روز کی روٹین ایک جیسی تھی صرف چھٹی کے دن ہی ہم ایک دوسرے کو وقت دے پاتے تھے۔

دن بھر کی تپش کے بعد شام میں قدرے ٹھنڈی ہوا چلنے لگی تھی جس کی وجہ سے موسم کچھ خوش گوار سا ہو گیا تھا۔ درختوں پر چڑیوں کی چہچہاہٹ اور کہیں دور سے آتی کوئل کی کوک شام کے منظر میں قدرتی موسیقی کا عکس شامل کرتے ہوئے اسے دلکش بنا رہی تھیں۔

میں کمرے سے ذرا سے فاصلہ پر بنی بالکونی میں کھڑا شام کی چائے سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اچانک میری نظر ناجیہ کی پیٹھ پر لہراتی ناگن زلفوں پر آکر ٹھہر گئی تھی وہ اپنے گیلے بالوں میں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی برش پھیر رہی تھی۔ میری رگوں میں دوڑتی محبت جوش مارنے لگی تھی اور شام کی چائے نے بھی مجھ پر عجیب سا نشہ طاری کر دیا تھا۔

''چلو! کہیں باہر چلتے ہیں۔'' میں بیڈ کارنر سے گاڑی کی چابی، سیل فون اور اپنا والٹ اٹھاتا ہوا بولا تو وہ خاموش نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں صاف لکھا تھا کہ وہ انکار کر دے گی اس لیے میں اس سے پہلے ہی کمرے سے نکل کر گاڑی میں آبیٹھا تھا۔ وہ کچھ دیر بعد اپنا پرس لیے ہوئے میرے برابر والی سیٹ پر آکر بیٹھ گئی تو میں اسے دیکھتا ہوا بولا۔

''بہت خوب صورت لگ رہی ہو۔ اب بتاؤ کہاں چلیں؟''

''کہیں بھی۔'' خلاف توقع خوش گوار سے موڈ میں بولی تو میں گاڑی کو ہلکی سی اسپیڈ دے کر مین روڈ پر لے آیا تھا۔ میرا ارادہ پہلے اسے شاپنگ کروانے کا تھا اس کے بعد ساحل سمندر کی ٹھنڈی و گیلی ریت پر اس کا ہاتھ تھام کر لہروں کا تعاقب کرنے کے ساتھ آئس کریم کھانے کا اور رات کو گھر واپس آنے سے پہلے کسی ریسٹورنٹ میں اچھا سا ڈنر کرنے کا تھا۔

اس لیے جب میں نے شاپنگ مال کے سامنے گاڑی روکی تو وہ چونکنے کے ساتھ حیرت سے مجھے دیکھنے لگی۔

''یہاں۔''

''ہاں۔ پہلے ہم شاپنگ کریں گے۔ اس کے بعد کہیں اور جائیں گے۔'' میں گاڑی پارکنگ میں کھڑی کر کے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اترتا ہوا بولا تو وہ بھی میری پیروی کرتی ہوئی گاڑی سے اتر کر میرے ساتھ چلنے لگی تھی پھر شاپنگ کرتے ہوئے میں نے ناجیہ کی ایک نہیں سنی نجانے وہ کیا کچھ کہتی رہی تھی اور پھر بالآخر وہ اپنا موڈ آف کیے میرے ساتھ خاموشی سے چلنے لگی تھی۔

''اتنی فضول خرچی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟'' گاڑی میں میرے ساتھ بیٹھ کر وہ چڑ کر بولی۔

''ان میں سے کسی بھی چیز کی فی الوقت ضرورت نہیں تھی آپ نے فضول خرچی کی حد کر دی ہے۔''

''بیوی بچوں پر خرچ کرنا بھی صدقہ جاریہ ہے بیگم۔''

''مگر ضرورت پر۔ بے جا چیزوں پر نہیں۔'' میری بات پر وہ مزید سلگ کر بولی تو میں اسے دیکھ کر رہ گیا۔ میں کسی قسم کی بحث میں الجھ کر اپنا اور اس کا موڈ مزید خراب کرنا نہیں چاہتا تھا اس لیے خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کرنے لگا جبکہ سہانی شام اور ہوا سے اڑ کر آتی ناجیہ کے پرفیوم کی خوشبو مجھے مدہوش کرنے کے ساتھ میرے محبت کے احساسات میں بھی ہلچل مچا رہے تھے۔

سمندر کی گیلی و ٹھنڈی ریت پر چلتے ہوئے میں اچانک اس کے سامنے آکھڑا ہوا اور اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ ڈوبتا سورج اس کی آنکھوں کی لالی چرا رہا تھا۔

''تمہیں پتا ہے ناجیہ! میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں؟''

''ہونہہ۔'' وہ نفی میں سر ہلا کر مسکرائی۔

''اتنی کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں دنیا کی ہر چیز تمہارے قدموں میں رکھ دوں۔''

''فضول خرچی۔'' وہ کھلکھلا کر ہنستی ہوئی بولی۔

''جبکہ میرے لیے صرف آپ اور صرف آپ ہی بہت ہیں۔''

میں اسے دیکھنے لگا اور سوچ رہا تھا کہ یہ کس مٹی سے بنی ہوئی عورت ہے۔ جس کے اندر اور کی ہوس نہیں تھی کم چیز پر شکر کرتی اور نہ ہونے پر صبر کرکے خاموش ہو جاتی تھی۔

''اللہ کے نام پر دے دو بھائی۔'' اس آواز نے میری سوچیں منتشر کر دی تھیں۔ میں نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا تو ایک چھوٹا بچہ ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا۔

''معاف کرو۔'' میں کہہ کر لہروں کو ایک دوسرے کے تعاقب میں بھاگتے ہوئے دیکھنے لگا۔ اس نے مجھ سے مایوس ہو کر ناجیہ کی طرف ہاتھ پھیلا دیے۔

''اللہ کے نام پر کچھ پیسے دے دو باجی۔ صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے اللہ تمہارا بھلا کرے گا۔ اللہ کے نام پر دے دو۔'' اس کی صدا پر ناجیہ بیگ میں ہاتھ مار کر نجانے کیا تلاش کرنے لگی تھی پھر بجلی کی سی تیزی سے ہاتھ باہر نکال کر بند مٹھی میں جو پیسے تھے اس کی طرف بڑھا دیے۔ میں کن انکھیوں سے یہ منظر دیکھنے کے ساتھ ناجیہ کی بے چینی و جلد بازی پر اندر ہی اندر تلملا رہا تھا کہ اچانک میری نظر اس کی بند مٹھی میں دبے لال نوٹ پر گئی تھی۔

''یہ کیا کر رہی ہو؟'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا' لیکن اس سے پہلے وہ سو کا نوٹ اس بچے کے ہاتھ میں جا پہنچا اور وہ مجھ سے شاید خوف زدہ ہو کر دور بھاگا تھا۔

''احسن! میرا ہاتھ۔۔۔'' میرے ہاتھ کی گرفت اس کی کلائی پر زور پکڑنے لگی تو وہ تکلیف سے بولی۔ میں نے ایک جھٹکے سے اس کی کلائی چھوڑ کر اسے دیکھا تھا۔ پبلک پلیس کا خیال کرتے ہوئے میں اپنا غصہ ضبط کرتا گاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔ ناجیہ بھی خاموشی کی چادر لبوں پر تانے میرے ساتھ چل رہی تھی۔

''احسن! کیا ہوا ہے؟'' اس نے گھر میں داخل ہوتے ہی پوچھا تو میرا ضبط جواب دے گیا۔ غصے سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

''کیا تمہیں نہیں پتا کہ کیا ہوا ہے۔ میں فضول خرچ ہوں' میں مانتا ہوں مگر تم۔۔۔'' میں اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اسے دیکھنے لگا تو وہ بجائے اپنی غلطی تسلیم کرنے کے مجھے یوں دیکھنے لگی جیسے میں کچھ غلط کہہ رہا ہوں۔

''ناجیہ! کیا تمہیں اپنی غلطی کا ذرا بھی احساس نہیں؟''

''کیا غلط کیا ہے میں نے؟'' وہ الٹا مجھ سے پوچھنے لگی جس پر مجھے مزید غصہ آ گیا۔

''تم پاگل ہو گئی ہو ناجیہ۔'' میں چیخ کر بولا تو وہ ایک لمحہ کے لیے سہم کر مجھے دیکھنے لگی۔

''تم پیشہ ور بھکاریوں کو سو سو کے نوٹ دینے لگی ہو۔ تمہیں ذرا احساس نہیں کہ تم کتنا غلط کر رہی ہو۔''

''میں آپ کی بات نہیں سمجھ پا رہی۔ آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟'' وہ بہت آہستہ آواز میں بولی تو میں خاموشی سے اسے دیکھنے لگا۔ مجھے اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہونے لگا۔ وہ اتنی ناسمجھ تو نہیں تھی جتنی اس وقت نظر آ رہی تھی' میں مزید الجھنا نہیں چاہتا تھا اس لیے پیر پٹخ کر نچلے پورشن میں بنی لائبریری میں آ کر بیٹھ گیا۔ میرے موڈ کا بھی بیڑا غرق ہو گیا تھا۔

ایک سمجھ دار کو سمجھانا بہت آسان ہوتا ہے' لیکن جب کوئی سمجھنا ہی نہ چاہے اس کے لیے آپ ہزار کوشش کر لیں' مگر کوئی فائدہ نہیں ہو گا اور ناجیہ بھی غلطی پر ہوتے ہوئے سمجھ نہیں رہی تھی کہ یہ کتنا بڑا نقصان ہو سکتا ہے۔ کوئی اسے پیسوں کے لیے جانی نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔

میں نے فی الحال ناجیہ کو اس کے حال پر چھوڑ کر خاموشی اختیار کر لی اور شاید یہ ہی ہم دونوں کے لیے بہتر عمل تھا۔

''آپ ناراض ہیں؟'' رات سونے سے پہلے ناجیہ دودھ کا گلاس بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے پوچھنے لگی' میں نے کوئی جواب نہیں دیا یہ میری ناراضی کا اظہار تھا۔ وہ کچھ دیر مجھے دیکھنے کے بعد کہنے لگی۔

''احسن! ہماری زندگی میں ایسے بہت سے حالات

آجاتے ہیں جن سے ہم امید نہیں کرتے ہم کبھی یہ نہیں سوچتے کہ ایسا کیوں ہوا؟ وجہ جاننے کی ہم کوشش نہیں کرتے اور اپنے آپ سارا الزام حالات و قسمت کو دے کر خود بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔" وہ خاموش ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ میں بظاہر کتاب پڑھنے میں مصروف تھا، لیکن میری ساری توجہ ناجیہ کی طرف تھی۔

"آپ شاید اس بھکاری کو میرے پیسے دینے پر مجھ سے ناراض ہیں۔"

"شاید نہیں یقیناً"۔" میں نے کتاب پر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔

"لیکن آپ نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ میں نے اسے پیسے کیوں دیے؟"

"بات پیسوں کی نہیں۔ دیکھنے کی تھی۔" میں کتاب بند کر کے اسے دیکھنے لگا۔

"نہ تم نے اس بچے کو دیکھا اور نہ ہی اپنے ہاتھ میں پکڑے سو کے نوٹ کو۔"

"ہم نے اپنی محنت سے اس گھر کی ہر چیز لی ہے۔"

وہ الفاظ کو اپنے ذہن میں ترتیب دیتے ہوئے تمہید باندھ کر مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"لیکن اس محنت کے پیچھے ایک ہاتھ بھی تھا جو ہماری نظروں سے پوشیدہ ہونے کے ساتھ ہمیں ہماری منزل کی طرف بڑھاتا چلا گیا اور خاردار راستوں سے نکال کر ہمیں سیدھی سڑک پر لے آیا جہاں ہماری زندگی کی گاڑی باآسانی چل سکتی تھی۔" میں اس کی بات کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں یہ بات تو جانتا تھا کہ ناجیہ کا مشاہدہ مجھ سے کہیں زیادہ ہے اور وہ اس طرح ہوا تھا کہ ناجیہ والد کے ساتھ مختلف ٹور پر جاتی رہتی تھی اس لیے وہ مجھے اپنی بات میں قائل کر لیتی یا کبھی میری مان لیتی اور یہ چیز ازدواجی زندگی کو قائم رکھنے کے لیے بہت ضروری ہوتی ہے۔

مگر ابھی جس موضوع پر وہ مجھے قائل کرنا چاہ رہی تھی میرے نزدیک وہ غیر اہم تھا، لیکن پھر بھی میں اس کی بات سن کر اپنے دلائل دے کر اسے دوبارہ یہ حرکت نہ کرنے سے منع کرتا مگر وہ پوری تیاری کے ساتھ میرے سامنے بیٹھی تھی۔

"ان حالات میں مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں اندھیرے میں زندگی بسر کر رہی تھی۔ اللہ کی ذات کے بغیر تو ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یا کر سکتے تھے؟" اس نے اپنی بات کے دوران مجھ سے پوچھا تو میں جو یکسوئی سے اس کی بات سن رہا تھا نفی میں سر ہلانے لگا۔

"تو جب کوئی ہم سے اس ذات کے نام پر مانگتا ہے تو ہم بجائے اسے کچھ دینے کے دھتکارتے ہیں اور ساتھ ہی نجانے کیا کچھ کہہ جاتے ہیں۔"

"لیکن سو روپے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔" میری سوئی ابھی بھی وہیں اٹکی تھی۔

"رکھتے ہوں گے اور شاید اس کے ساتھ اور بھی بہت ساری چیزیں ہوں گی جو اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہوں گی مگر احسن! اس نے اللہ کے نام پر مانگا تھا اور اس وقت میرے ہاتھ جو بھی لگا میں نے دے دیا۔ کیونکہ جب میرا رب مجھے بے حساب دیتا ہے تو میں کیوں اس کے نام پر مانگنے والے کو دیکھ کر گن گن کر دوں۔"

وہ کہہ کر مجھے دیکھنے لگی اور میں نے عادت کے مطابق منہ کھولا ضرور مگر کچھ بھی کہنے سے قاصر رہا۔ ☆☆

سائمی فقیر حسین



ناولٹ

چاند کی چاندنی پورے صحن کو روشن کیے ہوئے تھی اور وہ فرشی پنکھا لگائے، صحن میں چارپائی پر لیٹا۔ سر تک چادر تانے بے بے اور نانا جان کے سونے کا انتظار کررہا تھا۔ چند ہی منٹوں بعد اسے بے بے کے خطرناک قسم کے خراٹوں کی آواز سنائی دی تھی جس کا مطلب تھا وہ گہری نیند میں جاچکی ہے۔

اس نے آہستہ سے اپنے منہ سے چادر ہٹائی اور اپنی چھوٹی چھوٹی بٹن جیسی آنکھوں کو پُراسرار سے انداز میں گھما کر اپنے دائیں بائیں بے خبر سوئے ہوئے نانا جان اور بے بے کو دیکھا اور محتاط سے انداز میں چارپائی سے اٹھ کر چپل پہننے لگا۔

ایک بار پھر اس کی نظر ڈرتے ڈرتے نانا جان پر پہنچ گئی تھی جو ہاتھ گال کے نیچے رکھے، ٹانگیں سینے سے لگائے محو خواب تھے۔ بے بے کا تو وہ دیکھے بغیر بھی بتا سکتا تھا کہ وہ گرمی کی وجہ سے قمیص پیٹ سے اوپر اٹھائے منہ کھولے سو رہی ہوگی۔

اپنی چارپائی پر تکیے کے اوپر چادر ڈال کر بہت دھیمے اور بے آواز قدموں سے سیڑھیاں چڑھ کر وہ اوپر چھت پر آگیا تھا۔

جہاں ساتھ والی چھت پر قدرے فربہ جسم والی گلابو اپنے دوپٹے کا کونا ہاتھ پر لپیٹے ہیروئن بنی دائیں سے بائیں چکر لگاتے ہوئے یقیناً" اس کا انتظار کررہی تھی۔

"دیکھ گلابو! تیرا اکرم دین زمانے کی ہر دیوار گرا کر تجھ سے ملنے آگیا ہے۔" وہ اپنی چھت پھلانگ کر اس کی چھت پر جاتے ہوئے ہیرو کے انداز میں بولا۔

"کسی کو اتنا انتظار نہیں کراتے بابو! یہ شریفوں کا شیوہ نہیں ہے۔" وہ دوپٹے کے پلو سے کھیلتی ہوئی شمیم آرا بننے کی کوشش میں تھی۔

"پیار کرنے والوں کو اتنا انتظار تو کرنا پڑتا ہی ہے گلابو!" اس کے آدھا کلو کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے گویا ہوا۔

"یہ دنیا کب محبت کرنے والوں کو ملنے دیتی ہے' ابھی بھی نانا جان کے ڈر سے کتنی مشکل سے آیا ہوں۔"

"یہی تو میں پوچھتی ہوں۔ آخر کب تک ہم یونہی راتوں کو چھپ کر ڈر ڈر کر ملتے رہیں گے۔ جوان کڑی (لڑکی) کو تو لوگ یونہی بدنام کردیا کرتے ہیں اور مجھے بدنامی سے بہت ڈر لگتا ہے بابو۔"

وہ اس کی بات کاٹ کر لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے خود کو مجبور و بے بس ظاہر کرنے میں لگی ہوئی تھی۔

"تیرا بابو تجھے بدنام تھوڑی ہونے دے گا جلد ہی تجھے بیاہ کر اپنے سنگ لے جائے گا۔" کرم دین عرف مٹھوا سے شوخی سے دیکھتے ہوئے یقین دلا رہا تھا۔

"ہائے اللہ!" وہ اس کی شادی والی بات پر شرماتے ہوئے اس کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ چھڑاتے ہوئے منہ چھپا گئی تھی۔

"کیا ہوا؟ کسی ڈڈو نے تو نہیں کاٹ لیا۔" وہ اس کے یوں درد سے "ہائے اللہ" کہنے پر گھبرا کر آگے

بیٹھا۔

"تم لڑکے بھی بڑے بے شرم ہوتے ہو جی! بھلا یوں بھی کوئی کسی کنواری کڑی سے شادی کی بات کرتا ہے۔" (گویا شادی کی بات صرف شادی شدہ لوگوں سے ہی کی جاتی ہے)

"کم تو تم کڑیاں بھی نہیں ہوتیں۔ بندے پر جانے کیسا جادو کر دیتی ہو کہ بندہ بے چارہ اپنا آپ ہی بھول جائے۔" وہ قدرے جھکا تھا۔ تب کہیں اس کی آنکھوں میں شوخی سے دیکھنے کے قابل ہوا تھا۔ (کیونکہ! وہ جتنا دبلا اور لمبا تھا۔ وہ اتنی ہی چھوٹی اور موٹی تھی)۔

"اچھا تو میں نے تم پر جادو کیا ہے۔" وہ شوخ ہوئی تھی۔ "تو بتاؤ پھر تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو؟" وہ شرماتے ہوئے اس سے محبت کا اظہار چاہتی تھی۔

"بے بے کہتی ہے کہ مجھے اپنی کھوتی سے بہت محبت ہے، جو سارا دن اس کی سیوا کرتا رہتا ہوں، مگر اب تو تیری محبت میں، میں اسے بھی ٹیم نہیں دے پاتا۔ بے چاری مجھے دیکھ دیکھ کر ہنکتی رہتی ہے۔ اب خود ہی سوچ مٹھو کو اپنی کھوتی (گدھی) سے زیادہ تجھ سے پیار ہے کہ نہیں، جو کھوتی کو بھول کر سارا دن



تیرے سپنوں میں کھویا رہتا ہے۔"

اپنی سوچ کے مطابق وہ اسے بڑی مضبوط دلیل کے ساتھ اپنی محبت کا یقین دلا رہا تھا اور گلابو کو کھوتی والی دلیل کچھ پسند تو نہیں آئی تھی مگر اس کی محبت اور بے تابی کا یقین ضرور آگیا تھا‘ مگر اتنی آسانی سے وہ اس پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ اسے اس کی محبت پر پورا بھروسہ ہے تب ہی بولی۔

"چل جھوٹا!" اس نے اپنی طرف سے ایک ادا سے اپنا نازک ہاتھ آہستہ سے اس کے کندھے پر مارا تھا جبکہ وہ اچانک ہونے والے حملے سے یوں اچھل کر زمین پر گرا تھا جیسے تنکے کو ہوا اڑا کر دور پھینک دیتی ہے۔

"ارے!" وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے گرا دیکھ کر ہنسی تھی۔

"کچھ کھاتا پیتا نہیں ہے کیا؟ جو میری محبت سے رکھا گیا ہاتھ بھی برداشت نہیں کرسکا۔" وہ ہنستے ہوئے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"اگر یہ پیار والا ہاتھ ایسے پڑا تھا تو نا جانے غصے میں پڑنے والا ہاتھ کیسا ہوتا ہوگا۔" اس نے سوچا تھا اور اٹھنے کے لیے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ پھر کچھ خیال آنے پر شرارت سے مسکراتے ہوئے اس نے اس کے ہاتھ کو ہلکے سے جھٹکا دیا تھا تاکہ فلمی انداز میں وہ اس پر آگرے۔ (یہ سوچے بغیر کہ اس بلڈوزر کے گرنے سے اس کی کسی ہڈی پسلی کے سلامت رہنے کی کوئی امید نہیں تھی)۔ گلابو کو تو اس جھٹکے سے ایک انچ بھی فرق نہیں پڑا تھا۔ البتہ اس کے ہلکے سے جھٹکا دینے پر مٹھو صاحب اس کے اوپر گرتے گرتے بچے تھے۔ اسے زندگی میں پہلی بار اپنے دبلے پتلے ہونے پر افسوس ہوا تھا۔

"پنڈ کی مٹیار سے اگر بیاہ کرنا ہے تو جان بنا۔ کچھ کھایا پیا کر۔ میرے سوہنے بابو۔" وہ ہنستے ہوئے ایک ادا سے دوپٹا اس کی آنکھوں کے سامنے سے لہراتے ہوئے پلٹی اور سیڑھیاں اترنے لگی۔

وہ کتنے ہی پل پرانی فلموں کے ہیرو کی طرح بغیر پلکیں جھپکائے اسے دیکھے گیا تھا۔

گلابو سے پہلی ملاقات کی خوشی میں سرشار سا سیڑھیاں اترنے لگا تھا۔ آخری زینے پر کھڑے ہو کر اس نے محتاط سی نظروں سے دائیں بائیں مشکوک انداز میں دیکھا اور یہ یقین کر کے کسی نے اسے چھت پر نہیں دیکھا جانے لگا تھا۔

"اوئی ماں!" وہ سیڑھی سے ایک قدم ہی آگے بڑھا تھا جب کوئی بھاری چیز اس کے سر کے پچھلے حصے سے ٹکرائی تھی چاند تارے سارے سیارے اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے۔ اس سے پہلے چاند تاروں کو پکڑنے کی کوشش میں وہ زمین بوس ہوتا۔ کسی نے اسے کالر سے پکڑ کر جھٹکا دے کر سیدھا کیا تھا۔

"ٹھہر ذرا میں تجھے چوری کرواتی ہوں چوری کرنے آیا تھا۔ وہ بھی صغریٰ کے گھر میں اب کرے گا چوری؟"

بے بے! اس کی گردن ٹانگوں میں دبائے مدھانی سے اس کی خوب دھلائی کر رہی تھی اور وہ سوائے "اوں آں" کرنے کے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی پر چلا بھی نہیں سکا تھا۔ ڈر جو تھا کہ بے بے اس کی آواز نہ پہچان لے۔ وہ تو بھلا ہو‘ بے بے کے گھٹنوں کا‘ جنہوں نے مزید بے بے کا وزن اٹھانے سے انکار کر دیا تھا (حالانکہ آدھا بے بے کا وزن تو اس کی بے چاری گردن نے اٹھا رکھا تھا) اس نے خود کو چھڑانے کے لیے ایک جھٹکا اور مارا تھا۔

"ہائے اللہ! میرے گوڈے (گھٹنے) گئے۔" بے بے اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر چلائی تھی اور وہ ان کی ٹانگوں کے ڈھیلا ہوتے ہی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا تھا۔ اس نے اپنی چارپائی پر گر کر ہی سانس لیا تھا۔

"اے! اب کہاں چھپ گیا ہے۔ ذرا میرے سامنے آ‘ تجھے چوری کرنے کا مزا چکھاؤں۔" بے بے لالٹین لیے سارے گھر میں چور کو ڈھونڈ رہی تھی اور وہ بستر میں گھسا اپنے کراہتے وجود کو سہلا رہا تھا۔

"یہ تیرے چہرے کو کیا ہوا ہے مٹھو؟" صبح نانا جان اس کے سوجے ہوئے چہرے اور گردن کو دیکھتے ہوئے حیران ہوئے تھے۔

"کچھ نہیں نانا جان! وہ رات جب دودھ لینے دکان پر گیا تھا۔ قصائیوں کے گٹر میں گر گیا تھا۔" اس نے ڈرتے ڈرتے پہلے چھپانے کی کوشش کی تھی، مگر نانا جان کی سخت گھوری نے اسے فوراً" ہی کوئی تسلی بخش جواب دینے پر آمادہ کر دیا تھا اور وہ بہانہ بنا گیا تھا کیونکہ اس کے سوا اب کوئی چارہ جو نہیں تھا۔

"نہ اتنا بڑا گٹر تجھے نظر نہیں آیا۔" نانا جان نے اسے گھورا تھا۔

"ٹھیک کہتے ہیں لمبے بندے کی عقل گھٹیوں میں ہوتی ہے۔ تیری تو لگتا ہے گھٹیوں (ٹخنوں) میں بھی نہیں ہے۔ پتا نہیں جب اللہ عقل بانٹ رہا تھا تو کہاں دفع ہو گیا تھا جو تیرے حصے میں کچھ نہیں آیا۔"

نانا جان لگی لپٹی کے بغیر اس کی لاپرواہی پر اسے کھری کھری سنا کر چلے گئے تھے اور وہ منہ بناتے ہوئے ان کی بے وجہ (اس کے خیال میں) کی ڈانٹ پر کچھ بڑبڑا بھی نہیں سکا تھا۔ جانتا جو تھا کہ نانا جان کے کان اتنے تیز ہیں کہ اگر اس کی بڑبڑاہٹ ان کے کانوں تک پہنچ گئی تو اس کی خیر نہیں ہے۔

بے بے (نانی) ہر آنے جانے والے کو، رات چور کی پٹائی والا اپنی بہادری کا قصہ بڑے فخر سے سنا کر داد وصول کرتے ہوئے حیران ہوتی رہی تھی کہ ایک لمحے میں چور غائب کہاں ہو گیا تھا۔

وہ جس نے بے بے کی مار پر طبیعت کی خرابی کا کہتے ہوئے ریڑھی نہیں لگائی تھی وہ بے بے کے فخر و خوشی سے تمتماتے چہرے کو دیکھتے ہوئے دانت پیستا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس نے بے بے کی مار کھانے کے بعد، رات چھت پر جا کر گلابو سے ملنے سے ہی توبہ کر لی تھی اور اب "سیب لو، کیلے لو، امرود لو" کی زوردار آوازیں لگاتا ہوا بظاہر گلی گلی گھوم کر پھل بیچ رہا تھا، مگر اس کا ذہن اس سوچ میں الجھا ہوا تھا کہ گلابو سے کیسے ملاقات کی جائے جس میں بے بے یا نانا جان کی مار کا کوئی خطرہ نہ ہو۔ بہت سوچ بچار کے بعد آخر اسے خط لکھنے کا خیال آیا تھا۔

"یہ ٹھیک ہے۔" اس نے چٹکی بجا کر خوشی کا اظہار کیا تھا۔ "پوری ملاقات نہیں تو آدھی ہی سہی۔" وہ خط لکھنے کا فیصلہ کرتے ہوئے گردن اکڑائے اپنے آئیڈیے پر مسکرایا تھا۔

اس نے سن رکھا تھا کہ محبوب کو لوگ اپنے خون سے خط لکھ کر بھیجا کرتے تھے، مگر اس کے اپنے دبلے پتلے وجود میں تو پین بھرنے جتنا بھی خون نہیں تھا۔

"اب خط لکھنے کے لیے خون کہاں سے لاؤں۔" وہ گال کے نیچے ہاتھ رکھے سوچ میں گم ہو گیا تھا۔

"قصائی۔" کتنی دیر سوچوں میں الجھے رہنے کے بعد اسے قصائی کا خیال آیا تھا اور وہ وقت ضائع کیے بغیر فوراً" قصائی سے بکرے کے خون کی بوتل بھر کر لے آیا تھا۔

"گلابو کو کیا پتا چلے گا کہ یہ میرا خون ہے یا بکرے کا۔" اس نے سوچا تھا اور بے بے کے کسی پڑوسن کے گھر اور نانا جان کے مسجد میں چلے جانے کا یقین کر کے چھت پر چلا آیا تھا۔

"کیا لکھوں۔" وہ پیپر اور قلم کے طور پر جھاڑو کی تیلی لیے بیٹھا لفظوں کو ترتیب دینے لگا تھا۔

"میری پیاری لال گلابو!

بے بے کا مٹھو، تیرا بابو تمہیں سلام پیش کرتا ہے۔

بے بے کی اس دن والی مار میں اور میرے فرشتے ابھی تک نہیں بھولے، اس لیے ملنے آنے سے قاصر ہوں، لیکن تجھ سے "لو یو" بہت کرتا ہوں۔ امید ہے تم بھی مجھ سے لو یو کرتی ہو۔"

اس نے خط لکھ کر ایک نظر اسے دیکھا تھا اور مطمئن ہوتے ہوئے جیب میں ڈالنے لگا تھا جب کسی خیال کے تحت اس کی جیب میں جاتے اس کے ہاتھ رک سے گئے تھے۔

"ارے۔ شعر تو میں نے کوئی لکھا ہی نہیں۔ گلابو

کیا سوچے گی کہ اس کے حسن کی تعریف میں میں نے ایک شعر بھی نہیں لکھا۔" خود کلامی کے انداز میں بولتے ہوئے وہ دوبارہ لکھنے کے لیے پیپر کھول کر بیٹھ گیا تھا، مگر شعرا سے تو کیا اس کے پورے خاندان میں دور دور تک کسی کو نہیں آتا تھا.... مگر

"شعر لکھنا بے حد ضروری ہے۔" اس نے سوچا اور لفظوں کے پیچھے بھاگ دوڑ کر بے شک وہ خود ہانپ گیا تھا، مگر کچھ لکھنے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا۔

چہرہ چاند' آنکھیں ستارے
پھینی ناک گال غبارے

"جی اوئے متھو! تو تو شاعر بن گیا ہے۔" اس نے شعر لکھ کر اپنے کندھے کو تھپکی دیتے ہوئے گردن کو اکڑائے دائیں بائیں داد لینے والی نظروں سے اپنے آگے جمع فرضی مجمع کو دیکھا۔ اپنے تئیں وہ ایک شعر لکھ کر خود کو بڑا معتبر سا شاعر سمجھ لیا تھا۔ شعر گلابو کو ذہن میں رکھ کر جو لکھا گیا تھا۔

"ہاں! اب ٹھیک ہے۔" اس نے ایک نظر پورے خط پر ڈال کر مطمئن اور خوش ہوتے ہوئے خط چوم کر جیب میں ڈال لیا تھا۔

بڑی محتاط نظروں سے وہ سیڑھیاں اتر رہا تھا جب باہر سے آتی بے بے اس کے ہاتھ میں لال بوتل پکڑے دیکھ کر ٹھٹک کر رک گئی تھی۔

"یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے متھو۔" وہ اس کے ہاتھ میں پکڑی بوتل کو بغور دیکھتے ہوئے موٹے عدسوں والی عینک کو انگلی سے ناک پر رکھتے ہوئے مشکوک ہوئی۔

"کچھ نہیں بے بے' قصائی کی ہے۔ اس نے جھاڑیوں والے بابے سے دم کروانے کے لیے دی تھی کہہ رہا تھا کہ اس کی دکان پر کسی نے کچھ کر دیا ہے۔" وہ معصوم سا بنا کن انکھیوں سے بے بے کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"گوشت کی بجائے۔ جب ہڈیاں اور چربی لوگوں کو بیچے گا تو گاہک کیا خاک اس کے پاس جائیں گے۔" بے بے اس قصائی کی بے ایمانی پر ہمیشہ اس سے نالاں رہتی تھی جو پیسے ایک نمبر گوشت کے لے کر نظر بچا کر شاپر میں دو نمبر گوشت ڈال دیتا تھا۔ ہڈیوں اور زیادہ چربی والا۔

"جا جلدی اسے بوتل دے کر آ۔ پھر ریڑھی بھی لگانی ہے۔" بے بے کہتے ہوئے کچن کی طرف بڑھ گئی تھی اور وہ سر ہلاتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھ گیا تھا پہلے اس نے بے بے کی نظر بچا کر بوتل موٹر کے پیچھے چھپا دی تھی پھر باہر نکل گیا۔

گلابو کی دس گیارہ سال کی بہن گلی میں ہی کھیل رہی تھی اس نے اسے دس کے نوٹ کا لالچ دے کر خط گلابو تک پہنچا ہی دیا تھا۔



کرم دین عرف متھو! جو اپنے آٹھ بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا جب ساتویں میں اپنا ریکارڈ قائم رکھتے ہوئے مسلسل دوسری بار فیل ہوا تو اس کے "اب کبھی فیل نہیں ہوں گا ابا" کے وعدے میں آجانے والا ابا اس بار اس کے کسی وعدے میں نہیں آیا تھا اور اس نے لاتوں گھونسوں سے اس کی وہ خبر لی تھی کہ وہ یادگار دن متھو آج تک نہیں بھولا تھا۔ وہ تو بھلا ہو' بے بے کا جو اس دن ان کے ہاں ملنے گئی ہوئی تھی۔ اس سے اپنے لاڈلے' تلی پتنگ متھو کے ساتھ ہونے والا ناروا سلوک کچھ پسند نہیں آیا تھا اور وہ اسے اپنے ساتھ پنڈ لے آئی تھی۔

اس کے امی' ابے نے اس سیدھے سادے باولے اور کسی حد تک بے وقوف متھو کے پنڈ سدھارنے پر سکھ کا سانس لیا تھا۔ جانتے جو تھے کہ نانا جان کی سختی اسے بندے کا پتر ضرور بنا دے گی اور خود اس نے تو اس جیل خانے سے رہائی ملنے پر بھنگڑے ڈالے تھے جہاں ایک کمرے پر مشتمل فلیٹ میں ان دس افراد کا رہنا ایسے ہی تھا جیسے مرغیوں کے ڈربے میں رہنا۔ گرمیوں میں تو پھر بھی گزارا ہو ہی جاتا تھا، مگر سردیوں میں سونے کے لیے انہیں چارپائی کے اوپر چارپائی رکھ کر اسے دو منزلہ عمارت کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ وہ دو بھائی نیچے والی چارپائی پر سوتے اور دو اوپر والی پر.... اسی طرح

چاروں بھینسیں سوتیں جبکہ امی' ابے کو بھی اسی طرح سونا پڑتا۔ ابا بے چارہ آدھی رات تک اپنی چارپائی سے نیچے گردن لٹکائے اس کی ماں کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے' ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے گنگناتا رہتا۔

"چن کتھاں گزاری ای اہی رات وے۔"

اور وہ سب کمبل میں منہ دبائے ابے کی بے قراری پر مسکراتے رہتے۔ بے بے کا گھر تو بہت کھلا اور ہوادار تھا اور اس میں اتنی چارپائیاں کہ وہ کبھی ایک پر اور کبھی دوسری پر اچھلتا رہتا۔ پوری چارپائی پر کروٹ پر کروٹ بدل کر سونے کا جو مزا ہے وہ اسے بے بے کے ہاں آکر ہی محسوس ہوا تھا ورنہ شہر میں تو اکثر ہی جب اس کا بھائی کروٹ لیتا تو دبلا پتلا مٹھو اس کے جھٹکے سے زمین بوس ہو جاتا۔

بظاہر تو بے بے کی نرمی اور محبت میں سب ٹھیک تھا' مگر نانا کی سخت اور اصول پسند طبیعت ابے سے کم نہیں۔ کچھ زیادہ ہی لگی تھی اسے۔ اوپر سے اس کے مزید پڑھنے سے انکار پر انہوں نے اسے مسجد میں قرآن حفظ کرنے پر لگا دیا تھا اور ساتھ ہی اسے گدھا گاڑی لے دی تھی کہ وہ پھل بیچ کر اپنے باپ کا ہاتھ بٹائے۔ ریڑھی لگانے پر تو اسے کوئی اعتراض نہیں تھا' مگر اس جیسے کوڑھ مغز کے لیے قرآن زبانی یاد کرنا — بے حد مشکل —— تھا' مگر نانا جان کو انکار کرنے کی ہمت بھلا اس میں کہاں تھی۔ تب ہی وہ جیسے تیسے مسجد جانے لگا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا۔ مسجد کے امام کا جس نے خود ہی نانا جان سے کہہ دیا تھا کہ۔

"میاں جی! ایک سال میں آپ کا مٹھو صرف آدھا صفحہ یاد کرنے کے قابل ہوا ہے اور وہ بھی اٹک اٹک کر' میرا نہیں خیال کہ وہ اس جنم میں پورا قرآن حفظ کر پائے گا۔"

مجبوراً" نانا جان کو اسے مسجد سے ہٹانا ہی پڑا تھا' مگر وہ پانچ نمازیں اسے ضرور پڑھاتے تھے۔ سردی' گرمی میں اسے نماز چھوڑنے کی کوئی رعایت نہیں تھی اس سے پہلے کہ وہ نانا جان کے ناروا سلوک (اس کے ذاتی خیال میں) سے بددل ہو کر بھاگ ہی جاتا اگر اس کی پڑوسن گلابو کی محبت اسے اپنی نرم آغوش میں جکڑ کر بھاگنے کے تمام راستے بند نہ کر دیتی۔

ہوا کچھ یوں کہ گلاب نورین عرف گلابو اس کی ریڑھی سے پھل لینے آئی تھی۔ وہ اس سے پھلوں کی قیمت پوچھ رہی تھی اور وہ اس کے گول مول' گچھے جیسے وجود اور ٹماٹر جیسے گلابی چہرے میں کھویا کسی اور ہی جہاں میں پہنچا ہوا تھا اور وہ اسے کھویا ہوا دیکھ کر اپنی مرضی کا پھل لے کر پیسے دیے بغیر شرماتی — لجاتی چل پڑی تھی۔

گلابو کو واپس جاتا دیکھ کر اس کا طلسم ٹوٹا تھا اور وہ ہوش کی دنیا میں واپس آتے ہی اس کے پیچھے لپکا۔

"حضور! آپ میری ریڑھی سے پھل لے آئی ہیں' مگر پیسے نہیں دیے۔" پشت پر ہاتھ باندھے بھنویں اچکاتے ہوئے وہ قدرے جھک کر اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ صرف پرانی فلموں کو پسند ہی نہیں کرتا تھا بلکہ اکثر ہی وہ خود کو انہیں فلموں کا کوئی کردار تصور کرتا تھا جیسے کہ اب خود کو محمد علی سمجھ رہا تھا۔ گلابو تو شاید اس سے بھی زیادہ پرانی فلموں کی دیوانی تھی۔ تب ہی تو اس کے پوچھنے پر پلکوں کو اٹھاتے گراتے ہوئے شرمائی سی گویا ہوئی تھی۔

"آپ نے تو ہمارا دل چرا لیا ہے بابو! ہم نے تو آپ سے پیسے نہیں مانگے۔"

ہونٹ کا کونا دانت تلے دباتے ہوئے لمبے لمبے دمے کے مریضوں کی طرح سانس لیتے ہوئے اسے کسی طور زیبا سے کم نہیں لگی تھی۔ شاید اس کے شہر سے آنے کی وجہ سے وہ اسے بابو کہہ رہی تھی اور وہ تو اس کے منہ سے دل چرانے والی بات سن کر خوشی سے جھوم ہی اٹھا تھا۔ کتنے ہی پل وہ بے خود سے کھوئے ہوئے ایک دوسرے کو میٹھی نظروں سے دیکھتے رہے تھے۔

"بائے بابو! پھر ملیں گے۔" وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے ایک ادا سے جانے کے لیے مڑی تھی۔

اور وہ جو ہاتھ ہلاتے ہوئے' بے خود سا اس کے پیچھے

جانے لگا تھا۔ اس کے ایک دم سے دروازہ بند کرلینے پر اب پتا نہیں اس کا سر دروازے پر لگا تھا یا دروازہ اس کے سر پر لگا تھا۔ نتیجہ کتنے ہی پل وہ گول گول دائرے کی صورت گھومتا رہا تھا۔ پتا نہیں خوشی سے یا پھر سر پر لگنے والی چوٹ سے۔۔۔



"گڈی! دیکھ یہ سموسے جاکر اپنی باجی کو ہی دینا۔ ورنہ میں آئندہ سے تجھے ٹافیاں ہرگز نہیں لے کر دوں گا۔" وہ گرم سموسوں والا شاپر گڈی کے حوالے کرتے ہوئے اسے تنبیہہ کرنا اور دھمکی دینا نہیں بھولا تھا۔

"کون سی باجی کو وڈی باجی کو یا چھوٹی باجی کو' میری تو بہت ساری باجیاں ہے کہو تو گنتی کرکے بتاؤں۔" وہ پرافٹ میں ملنے والی چاکلیٹ کا ریپر اتار کر کھاتے ہوئے تفصیل سے اسے بتانے لگی۔

"وڈی باجی کو۔" اس نے جلدی سے وڈی پر زور دیتے ہوئے کہا تھا کہ کہیں گڈی اسے اپنے گیارہ بہن بھائیوں کے نام ہی گنوانا نہ شروع کردیے۔

"یعنی گلابو باجی کو۔" اس نے پرسوچ نظروں سے مٹھو کو دیکھا تھا اور اس کے زور زور سے اثبات میں سر ہلانے پر وہ اپنے دروازے کی سمت بڑھ گئی تھی۔

اس کے جانے کے بعد مٹھو نے دائیں بائیں مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے یہ یقین کرکے کہ اسے کسی نے گڈی کو سموسے دیتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اپنے گھر کی طرف دوڑ لگادی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ اپنے گدھے کو چارہ ڈالنے کے لیے باہر آیا تھا جب اس کی نظر غیرارادی طور پر گلابو کے گھر کی طرف اٹھی۔

"یہ کیا ماجرہ ہے۔" اس کے بڑبڑانے کی وجہ گڈی کے ہاتھ میں پکڑا ہوا سموسہ تھا۔ وہ حیران و پریشان سا ہوتا ہوا تیزی سے اس کے قریب گیا تھا جو اپنے سے چھوٹے چاروں بہن بھائیوں کو لیے بیٹھی مزے سے سموسے کھا رہی تھی۔ اپنی حق وحلال کی کمائی محبوب کی بجائے غیروں کو کھاتا دیکھ کر اس کا خون ہی تو کھول گیا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے گڈی!" وہ اپنی بٹن جیسی چھوٹی چھوٹی آنکھیں نکالتے ہوئے قدرے غصے سے اونچا بولا تھا۔

"نظر نہیں آتا سموسے کھا رہے ہیں۔" وہ اس کے غصے کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بے نیازی سے بولی۔

"یہ سموسے میں نے تجھے گلابو کو دینے کے لیے کہا تھا۔ اس فوج کو کھلانے کے لیے نہیں۔۔۔" اس نے ماتھے پر تیوری چڑھائے دوٹوک انداز میں اسے جتاتے ہوئے اس کے بہن بھائیوں کی طرف اشارہ کیا جو کیچپ میں ہاتھ منہ خراب کیے کھانے میں مصروف تھے۔

"جانتی ہوں۔ تم نے یہ سموسے باجی گلابو کے لیے بھیجے تھے' مگر وہ تو اپنی سہیلی کے گھر میلاد پر گئی ہوئی ہے۔ اب اگر کسی اور کو دیتی تو تُو اور باجی گلابو پکڑے نہ جاتے۔" وہ اسے تفصیل سے خود سموسے کھانے کی وجہ بتا رہی تھی۔

"واقعی یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ اگر گڈی سموسے کسی اور کو دے دیتی تو اور نانا جان کو پتا چل جاتا کہ میں گلابو کو سموسے بھیجتا ہوں تو وہ تو میری چمڑی ادھیڑ کر رکھ دیتے۔" اس نے گڈی کی سمجھ داری پر سوچا تھا اسی لمحے نانا جان گلی کے نکڑ سے برآمد ہوئے تھے اور مٹھو سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ گڈی اس کے ڈرنے پر ہنس دی تھی۔

"یہ خط گلابو باجی نے تمہارے لیے بھیجا ہے اگر لینا ہے تو دس کا نوٹ میرے حوالے کرو۔" وہ خط اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے ڈیل کرنے والے انداز میں بولی۔

وہ جو اس کے ہاتھ میں گلابو کا خط دیکھ کر خوش ہوا تھا۔ اس کے پیسوں والی بات پر ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے گھور کر گویا ہوا تھا۔

"کیوں؟ کس خوشی میں۔۔۔؟"

"اس لیے کہ میں آپ کے بھیجے ہوئے خط کا جواب لائی ہوں اتنا حق تو بنتا ہے نا میرا ٹافیوں سے منہ ہی میٹھا

کرلوں۔" آنکھوں میں چالاکی اور چہرے پر معصومیت لیے وہ مٹھو کو دیکھ رہی تھی۔

"یعنی خط بھیجنے کے لیے روپے بھی، مجھے دینے ہوں گے اور خط وصول کرنے کے لیے بھی مجھے ہی پیسے دینے ہوں گے۔" وہ بھنویں اچکاتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"جب گلابو باجی پیسے نہیں دیں گی تو تمہیں تو دینے ہی ہوں گے۔" وہ کندھے اچکا کر کہتے ہوئے اسے کسی چالاک لومڑی سے بھی زیادہ ہوشیار لگی تھی۔

"پیسے دینے ہیں تو دو۔ ورنہ میں جاؤں۔ مجھے ابھی دوسرے منڈوں کے بھی خط کڑیوں (لڑکیوں) کے گھر دینے جانا ہے۔ بڑے پیسے ملتے ہیں اس کام میں۔۔۔" وہ اسے سوچتا دیکھ کر بے زار سی شکل بنا کر اپنی مصروفیت کا بتاتے ہوئے آخر میں بڑی خوشی سے بولی تھی۔

"اگر پیسے نہ دوں تو کیا تم یہ خط مجھے نہیں دوگی اور واپس لے جاؤ گی۔" وہ اسے مزید پیسے دینے سے کترا رہا تھا۔ ابھی اسے اس پر اپنے ستر روپے کے سموسے کھانے کا غصہ تھا۔ وہ اس سے ہی ستر روپے وصول کرنے کے چکر میں تھا۔

"واپس کیوں لے کر جاؤں گی۔"

مٹھو اس کے جواب پر خوش ہوا تھا۔

"میاں جی کو دوں گی۔ پھر میاں جی جانیں یا تم۔۔۔" وہ کندھے اچکاتے ہوئے بڑی معصومیت سے بولی تھی۔

ناناجان کو بتانے والی بات پر اسے اچھو لگتے لگتے بچا تھا۔ وہ اس کی سوچ سے کہیں زیادہ چالاک تھی۔

تب ہی تو اسے ناناجان کو بتا دینے کی دھمکی دے رہی تھی۔

"میں تو تجھے تنگ کر رہا تھا گڈی۔ بھلا ایسے ہو سکتا ہے کہ میری چھوٹی سی بہن مجھ سے پیسے مانگے اور میں نہ دوں۔" وہ اس چالاک مکار آنکھوں والی گڈی سے بگاڑ نہیں سکتا تھا تب ہی جیب سے دس کا نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے مسکرایا تھا جبکہ اس کا دل کر رہا تھا کہ اس مکار گڈی کی گردن ہی مروڑ دے۔

"آئندہ سے اگر مجھے تنگ کیا تو سیدھا میاں جی (نانا) کو بتاؤں گی جا کر۔" وہ دس کا نوٹ مٹھی میں دباتے ہوئے منہ بنا کر دھمکی دیتے ہوئے پلٹ گئی تھی۔

"ایک بار میری شادی ہو جائے گلابو سے پھر اگر میں نے تجھے اس گھر میں بھی گھسنے دیا تو پھر کہنا۔" اس نے اپنے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کڑے تیوروں سے اسے گھورا تھا۔

بے بے شاید پھر کسی کے گھر گئی ہوئی تھی اور ناناجان یقیناً "مسجد میں گئے ہوئے تھے کیونکہ اسکول سے ریٹائر ہونے کے بعد ان کا زیادہ تر وقت مسجد میں ہی اللہ کو یاد کرتے ہوئے گزرتا تھا۔



میرے بابو! السلام علیکم!

تیری گلابو کو تیرا خط مل گیا ہے

مجھے بہت دکھ ہوا کہ بے بے نے تجھے چور سمجھ کر مارا۔ یقین کرو۔ تیری گلابو تیرے ساتھ ہونے والے ظلم پر اتنا روئی کہ اس کے آنسوؤں سے بالٹی بھر گئی رو رو کر اتنا کمزور ہو گئی ہوں کہ ڈاکٹر نے سیب اور مالٹے کھانے کے لیے کہا ہے۔ اچھا خدا حافظ! میں انتظار کروں گی۔ (تیرا نہیں مالٹوں کا)۔"

خط پر جگہ جگہ دھبے لگے ہوئے تھے یقیناً "یہ گلابو کے انمول آنسو تھے وہ خط پڑھ کر افسردہ سا ہو گیا تھا کہ گلابو اس کو پڑنے والی مار سے روتی رہی ہے۔

اس نے سوچا تھا کہ وہ ایک اور خط گلابو کو لکھ کر بھیجے گا اور اسے بتائے گا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے اور وہ رو رو کر اپنی طبیعت خراب نہ کرے۔



وہ روز، روز گڈی کو پیسے دے کر تنگ آگیا تھا اب تو اس کے ساتھ ساتھ اس کے چھوٹے بہن بھائیوں کو بھی 'دو' دو روپے دینے پڑتے تھے کیونکہ یہ گڈی صاحبہ کا حکم تھا کہ اگر اس نے اس کے ساتھ اس کے بہن بھائیوں کو پیسے نہیں دیے تو وہ اس کا گلابو باجی کے

ساتھ چکر کاٹ کر میاں جی کو بتا دے گی۔ وہ اس کا نانا جان سے ڈرتا اور دبتا جان جو گئی تھی اور وہ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق انہیں پیسے دینے پر مجبور تھا کیونکہ اس کے دبلے پتلے وجود میں نانا جان کی مار کھانے کی ہمت نہیں تھی۔

مگر اب... اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ نہ گڈی کے ہاتھ خط بھیجے گا اور نہ ہی اسے کوئی پیسہ دے گا اس نے خود ہی گلابو تک خط پہنچانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اب بھی وہ ہاتھ میں خط لیے کب سے چھت پر کھڑا ادھر سے ادھر چکر لگا رہا تھا سامنے ہی تو گلابو صحن میں بیٹھی بال کھولے جوئیں نکال نکال کر مار رہی تھی اور اس کے قریب ہی خالہ پینو (گلابو کی ماں) سلائی مشین رکھے کچھ سلائی کرنے میں مصروف تھی۔ گلابو سے چھوٹی چارپائی پر ٹانگیں لٹکا کر بیٹھی انہیں جھولاتے ہوئے گنا چوس رہی تھی۔ اس سے دو چھوٹی بہنیں اسٹاپوں کھیلنے میں مصروف تھی اور دو بڑے بھائی کلہاڑی سے بالن کاٹ رہے تھے۔ گڈی اپنی فوج کو لیے مٹی کے کھلونے بنا رہی تھی۔ (یعنی چھوٹے بہن بھائی) مٹھو کو بچوں سے بھرے اس گھر کو دیکھ کر بے ساختہ اپنے اسکول کی یاد آئی تھی۔ اتنا رش تو اس کے اسکول میں بھی نہیں ہوتا تھا جتنا کہ گلابو کے گھر میں تھا۔

"پتا نہیں یہ خالہ پینو کب گلابو کے پاس سے اٹھے گی۔" اس نے خالہ کو سلائی میں مصروف دیکھ کر کوفت سے سوچا۔ وہ بے چینی سے اس کے اٹھنے کا انتظار کر رہا تھا مگر وہ تو اٹھنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

گلابو کے بڑے بھائی بالن رکھ کر باہر چلے گئے تھے یقیناً" گڈی بھی اپنی فوج سمیت گھر سے باہر چلی گئی تھی تب ہی اسے گھر اب قدرے بڑا اور پر سکون لگا تھا جیسے چھٹی ہونے کے بعد اسکول ہر طرح کے ہنگامے سے بے نیاز اور خاموش ہو جاتا ہے۔

"لگتا ہے مٹھو گڈی کو ہی پیسے دینے پڑیں گے۔" وہ خالہ پینو کو نہ اٹھتے دیکھ کر بڑبڑاتے ہوئے مایوس سا نظر آنے لگا تھا۔ جب اس کی خالہ اٹھ گئی بے ساختہ اس نے خالہ کو مشین اٹھا کر اندر جاتے دیکھ کر ہلکا سا نعرہ لگا کر اپنی خوشی کا اظہار کیا تھا کہ وہ گڈی کو پیسے دینے سے بچ گیا اسے گڈی اور اس کی فوج سے چڑ سی ہوتی جا رہی تھی۔

یہی وہ وقت تھا جب وہ خط گلابو تک پہنچا سکتا تھا جو اس پر نظر پڑتے ہی خالہ سے نظر بچا کر اسے واپس جانے کا اشارہ کر رہی تھی۔ پتا نہیں وہ کیا سمجھا تھا جو آنکھوں میں شوخی لیے جلدی جلدی چھت سے ایک درمیانے سائز کا پتھر اٹھا کر خط لپیٹ رہا تھا خط لپیٹ کر ایک نظر صحن میں بیٹھی گلابو کو دیکھا اور خط اس کی طرف اچھال دیا۔

"اوئی ماں! میں مر گئی۔" خالہ پینو اچانک نا جانے کہاں سے صحن میں آ گئی تھی پتھر میں لپٹا خط عین اس کے سر پر لگا تھا اور وہ چلاتے ہوئے پلٹی تھی۔

"مٹھو تو تو گیا کام سے۔" اس سے پہلے کہ خالہ کی نظر اس پر پڑتی وہ رونی صورت بنا کر کہتے ہوئے دھم سے چھت پر گر کر چت لیٹا اپنی سانس ——— کو معمول پر لانے کے لیے لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ خالہ پینو کی گالیوں اور کوسنے کی آواز اسے بخوبی آ رہی تھی مگر وہ کانوں میں انگلیاں ڈالے لیٹا رہا۔



"خیریت... خالہ پینو! آپ اور ہمارے گھر..." وہ اس کے ہاتھ میں خط پکڑے دیکھ کر بھنویں اچکاتے ہوئے کریدنے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ دل میں یہ خدشہ تھا کہ کہیں خالہ نے اسے چھت پر دیکھ تو نہیں لیا جو نانا جان سے اس کی شکایت لگانے آئی ہے۔

"میں میاں جی کو یہ خط دکھانے آئی ہوں۔" خالہ کی بات پر اس کا جیسے سانس ہی تو رک گیا تھا۔

"وہی مجھے بتا سکتے ہیں کہ خط پر لکھی لکھائی آخر کس کی ہے؟ خالہ بڑے غصے میں لگ رہی تھی۔

"نانا جان بھلا کیسے بتائیں گے کہ اس کی لکھائی ہے۔" اس نے سکون کا سانس لیا تھا کہ خالہ کا شک اس پر نہیں ہے اور اب وہ خط انہیں نانا جان کو دکھانے

سے باز رکھنا چاہتا تھا کہ کہیں نانا جان اس کی لکھائی نہ پہچان لیں۔

"نہ بھلا میاں جی کیسے نہیں لکھائی پہچانیں گے آخر وہ پانچویں تک پنڈ کے منڈوں کو پڑھاتے رہے ہیں۔" وہ ٹلنے والی نہیں تھی۔

"ویسے مجھے پورا یقین ہے یہ حرکت نائیوں کے منڈے کی ہے۔ وہی ہے جو پورے پنڈ میں میری بچیوں پر بری نظر رکھتا ہے۔" خالہ دانت پیستے ہوئے بڑی پر یقین تھی۔

"چھوڑیں نا خالہ! کسی نے یونہی مذاق میں آپ کے گھر خط پھینک دیا ہو گا ورنہ بھلا آپ کے گھر کوئی کسے چھیڑے گا۔" وہ خالہ کو باز رکھنے کی کوشش میں یونہی ہاتھ پر ہاتھ مار کر کندھے اٹھاتے ہوئے دھیرے سے ہنسا تھا۔ اپنے تحت اس نے خالہ کے حق میں بات کی تھی کہ وہ خوش ہو گی' مگر وہ تو اس کی بات پر بھڑک اٹھی تھی۔

"کیوں؟ کوئی ہمارے گھر میں کسی کو کیوں نہیں چھیڑ سکتا آخر مطلب کیا ہے تیرا کہنے کا۔" وہ کڑے تیوروں سے اسے گھور رہی تھی۔ "نہ میں پوچھتی ہوں میری بیٹیاں لولی ہیں یا پھر لنگڑی جنہیں کوئی چھیڑ نہیں سکتا۔ ارے! میری بیٹیاں لاکھوں میں ایک ہیں۔"

"لاکھوں میں ایک نہیں بلکہ لاکھوں کو ملا کر ایک بنتی ہے۔ جسامت میں۔" مٹھو نے کان کھجاتے ہوئے سوچا تھا۔

"جہاں جاتی ہیں میری بیٹیاں لوگ پیروں میں بچھے جاتے ہیں۔" خالہ تو اسے جھڑکتے ہوئے اپنی بیٹیوں کے مداحوں کا فخر سے بتا رہی تھی۔

"حیرت ہے خالہ! لوگوں کے پیروں تلے تو چٹائیاں بچھی ہوتی ہیں اور آپ کی بیٹیوں کے پیروں تلے لوگ بچھ جاتے ہیں۔" وہ بے حد حیران ہوا تھا۔

"اپنی بیٹیوں سے کہیں ذرا آہستہ آہستہ چلا کریں کسی بے چارے میں ان کا وزن اٹھانے کی ہمت نہیں بھی ہوتی ہو گی۔" اس کا اشارہ خالہ کی صحت مند سی بیٹیوں کی طرف تھا اور وہ واقعی بچھے ہوئے لوگوں کا سن کر بہت فکر مند ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ خالہ اسے اپنی بیٹیوں کو موٹا کہنے پر کھری کھری سناتی نانا جان آ گئے تھے۔

"پینو! چھوڑ اس بے وقوف مٹھو کو تیرے میاں جی آ گئے ہیں۔ دکھا انہیں کیا دکھانے آئی ہے۔" بے بے روٹی پکاتے ہوئے شاید ان کی گفتگو سن چکی تھی تب ہی اسے ٹوکتے ہوئے بولی۔

"یہ خط دیکھ کر مجھے بتایئے میاں جی کہ یہ لکھائی کس بندر کس ڈڈو کی ہے۔ مجھے خط بھیجے والے کا پتا چل جائے پھر دیکھیے گا میں اس کھوتے (گدھے) کا کیا حال کرتی ہوں۔" خالہ پینو سفید داڑھی اور سبز عمامے والے نفیس سے میاں جی کے سامنے خط کھول کر رکھتے ہوئے اپنے ارادوں کا بھی بتا رہی تھی۔

"خالہ! کسی کو غلط ناموں سے نہیں پکارتے۔ گناہ ہوتا ہے۔" وہ خود کو بندر اور ڈڈو جیسے ناموں سے پکارتا دیکھ کر برداشت نہیں کر پایا تھا۔ نانا جان نے اسے گھورا تھا جوابا" وہ مودب سا بنا سر جھکا گیا تھا۔

"قلم کی بجائے کسی اور چیز کو خون میں ڈبو کر لکھا گیا ہے یہ جاننا مشکل ہے کہ یہ کس کی لکھائی ہے۔" نانا جان نے بغور تحریر کو دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا تھا۔

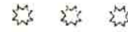
"ویسے تو میں تقریبا" سارے پنڈ کے لڑکوں کی لکھائی پہچانتا ہوں مگر اتنی گندی لکھائی تو میرے خیال میں پنڈ کے کسی بھی لڑکے کی نہیں ہے۔ بابو نام کا لڑکا بھی پنڈ میں کوئی نہیں ہے۔" ماسٹر جی نے اپنے ذہن میں تقریبا" تمام ہی لڑکوں کا نام دہرایا تھا مگر نہ تو کسی کی لکھائی اتنی گندی تھی اور نہ ہی کسی کا نام بابو تھا۔ مٹھو نے بے ساختہ خدا کا شکر کیا تھا کہ آج اس نے پورے خط میں صرف بابو نام دہرایا تھا کہ گلابو خوش ہو گی کہ اسے اس کا لکھا ہوا نام کتنا پسند ہے۔

"میاں جی خط کس سے لکھا ہوا ہے۔" بے بے کسی خیال کے تحت پوچھ رہی تھی۔

"شاید کسی جانور کے خون سے لکھا گیا ہے۔" نانا جان نے خط ناک کے قریب لے جا کر سونگھتے ہوئے کہا تھا۔

بے بے کو بے ساختہ مٹھو کے ہاتھ میں پکڑی خون والی بوتل یاد آئی تھی۔ انہوں نے موٹے عدسوں والی عینک کے پیچھے سے اسے دیکھا تھا اور لمحے میں سمجھ گئی تھی کہ یہ خط بھیجنے والی حرکت کس کی ہے۔

خالہ پینو مایوس سی پلٹ گئی تھی یہ کہتے ہوئے کہ وہ پتا کروالے گی کہ یہ حرکت کس کی ہے۔



"مٹھو! میں تیری ماں سے ملنے شہر جارہی ہوں اگر تو نے اسے کوئی پیغام دینا ہے تو مجھے بتادے۔" صبح وہ روٹی کے بڑے بڑے نوالے توڑ کر منہ میں رکھ کر چبا کم اور نگل زیادہ رہا تھا جب بے بے نے اس کو بتایا تھا۔

"ماں سے کہنا کہ میں بالکل چنگا ہوں اور اس سے کہنا کہ کسی دن آکر مجھ سے مل جائے۔" وہ سادہ سے انداز میں کہتے ہوئے گلاس میں پانی ڈالتے ہوئے پینے لگا تھا۔ بے بے نے اس کی سادگی پر محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا اور برتن اٹھانے لگی تھی ساٹھ سال کی ہونے کے باوجود وہ توانا اور چست تھی ابھی تک وہ سارے گھر کے کام خود ہی کرتی تھی۔



"قسم سے بابو! تمہیں نہ دیکھوں تو مجھے چین نہیں آتا آج بھی اماں مامے کے گھر گئی ہوئی تھی تب ہی پانی بھرنے کے بہانے گھر سے نکلی ہوں کہ شاید تجھ سے ملاقات ہوجائے ویسے تو خط والے واقعے کے بعد اماں مجھے دروازے میں جاتی تک نہیں مارنے دیتی۔"

اسے گھڑا اٹھا کر نہر کی طرف جاتا دیکھ کر وہ پیچھے پیچھے چلا آیا تھا اور اب دونوں نہر کے کنارے لگی سبز گھاس پر بیٹھے تھے جب گلابو نے گھاس کو نوچتے ہوئے اداسی سے اپنے دل کا حال بتایا تھا۔

"مجھ سے بھی بھلا، تجھ سے دور کہاں رہا جاتا ہے گلابو! مگر پتا نہیں کیوں، بے بے اور نانا جان سے تمہاری اور اپنی شادی کی بات کرنے کی ہمت نہیں پڑتی۔" وہ اس کی اداس شکل دیکھ کر خود بھی اداسی سے بولا تھا۔

"ہمت کرلے بابو! کہیں ایسا نہ ہو کہ تو ہمت کرتا رہ جائے اور تیری ہیر کو کھیڑے بیاہ کرلے جائیں۔" وہ آنکھوں کو پٹپٹاتے ہوئے منہ بناگئی تھی۔ شاید اسے مٹھو کی کم ہمتی پسند نہیں آئی تھی۔

"ہاں ہاں، میں ضرور بے بے سے بات کروں گا۔ تو بالکل فکر نہ کر گلابو، کسی مائی کے لال میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ وہ مٹھو کی پسند کو بیاہنے آئے۔" اس نے گلابو کے ساتھ ساتھ خود کو بھی تسلی دی تھی کیونکہ اکثر ہی وہ خود کو یہ تسلی دیتا رہتا تھا کہ آج وہ بے بے سے اپنی شادی کی بات کرے گا مگر ہر بار نانا کی شکل دیکھ کر اس کی ہمت جواب دے جاتی کہ نانا جان کیا سوچیں گا کہ مٹھو کو اپنے بیاہ کی اتنی ہی جلدی ہے پتا نہیں نانا جان کا احترام تھا یا ڈر کہ نانا جان کو پتا چل جانے کے خیال سے وہ بے بے سے بھی بات نہیں کرپاتا تھا۔

"تو تو شہر میں پڑھا ہے نا بابو! پھر تو تجھے انگریزی بہت اچھے سے آتی ہوگی۔ ٹی وی والوں کی طرح۔۔۔" وہ چند لمحے اس کی بات پر میٹھی سی نظروں سے دیکھتے رہنے کے بعد کسی خیال کے تحت آنکھوں میں معصومیت لیے اسے دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"ہاں! مجھے فرفر بولنی آتی ہے انگریزی۔" وہ چٹکی بجاتے ہوئے۔ ساری افسردگی پل بھر میں بھول کر سینہ شان سے تانتے ہوئے پریقین تھا۔

"اچھا تو مجھے ذرہ اس کی انگریزی بتاکہ۔ میں لاہور جانا چاہتی ہوں۔" بہت سوچ کر اس نے اپنے تحت مٹھو کو بہت مشکل جملہ انگریزی بتانے کے لیے دیا تھا۔ شاید وہ یہ جاننا چاہتی تھی کہ مٹھو کتنا ذہین ہے۔

"I go to lahore" یہ ہے اس جملے کی انگریزی تم نے کیا مجھے نالائق سمجھا ہوا تھا۔" کتنی دیر سوچ بچار اور لفظوں کو ذہن میں ترتیب دے کر ہونٹوں کو قدرے آگے اور پیچھے دھکیلتے ہوئے بول کر وہ کس قدر فخر سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"واقعی میرا بابو تو فرفر انگریزی بولتا ہے۔" وہ اس کے منہ سے انگریزی کا ایک جملہ روانی سے سن کر امپریس ہوتے ہوئے آنکھوں میں ستائش لیے اسے

مسکرا کر دیکھ رہی تھی جس کے چہرے پر بڑی فخریہ مسکراہٹ تھی۔

"دیکھ اور پوچھنا ہے تو بتا۔"

"اچھا تو پھر مجھے یہ بتا کہ اگر کڑی (لڑکی) کو لاہور جانا ہے تو اس جملے کو کیسے بولتے ہیں اور اگر منڈے کو جانا ہے تو پھر کیسے۔ اب میرے جیسی تین جماعتاں پاس کو تو تجھے خط لکھنے کے سوا اور کچھ نہیں آتا۔"

مٹھو نے تو یونہی جوش میں اسے مزید انگریزی جملے سنانے کی پیشکش کی تھی اور وہ واقعی فوراً اس سے مزید پوچھنے لگی تھی۔

اس کے پوچھنے پر مٹھو کا دل چاہا تھا کہ وہ اپنا سر زور سے دیوار پر دے مارے کیونکہ گلابو کو مزید سوال پوچھنے کا آئیڈیا اسی ذہن نے تو دیا تھا مگر محبوب کو امپریس کرنے کے چکر میں وہ سوچ میں ڈوب گیا تھا اب جواب تو اسے دینا ہی تھا اسے کیسے کہہ دیتا کہ اس کے ماسٹر نے یہ جملہ اسے ایسے ہی پڑھایا تھا یہ تو اسے کبھی بھی ماسٹر نے نہیں بتایا تھا کہ لڑکے کے لیے یہ ٹینس بولا گیا ہے یا لڑکی کے لیے۔

"کڑی کے لیے چھوٹا آئی لگتا ہے اور اگر منڈے کو لاہور جانا ہو تو ٹوپی والا بڑا آئی۔" بالآخر اسے یہی سمجھ آیا تھا اور اس نے جھٹ اس کے گوش گزار کر دیا تھا۔ جان جو گیا تھا کہ تین جماعتاں پاس گلابو کو کیا سمجھ آئے گی کہ وہ صحیح بول رہا ہے یا غلط.....

"میں اپنے سمجھ دار مٹھو کے صدقے جاؤں۔" وہ اس کی ذہانت کی قائل ہوتے اس کی بلائیں لینے لگی تھی جس نے اس کے مشکل جملوں کی انگریزی بڑی روانی سے اسے بتا بھی دی تھی اور سمجھا بھی دی تھی۔ (اس کے ذاتی خیال میں)۔

"اور کیا یونہی تو ماسٹر مجھے ہر کلاس میں دو سال نہیں لگاتے تھے۔ چودہ سال میں سات جماعتیں پاس کرنا، ہر کسی کے بس کی بات تھوڑی ہے۔"

وہ فخر اور جوشیلے انداز میں اسے متاثر ہوتا دیکھ کر گردن اکڑائے ہوئے تھا اور وہ پانی میں ہاتھ ڈالے بڑی توجہ اور محبت سے اسے دیکھ رہی تھی۔



"مٹھو پتر! میں اور تیرے نانا جان، تیری خالہ پینو کے گھر جا رہے ہیں۔ دعا کرنا خوش خبری لے کر ہی واپس آئیں۔" وہ منڈی سے لائی گئی پھلوں کی پیٹیوں سے پھل نکال کر صاف کر کے ریڑھی پر لگا رہا تھا جب بے بے نیا نکور ویلوٹ کا سوٹ پہنے اس کے قریب آکر خوشی خوشی اسے بتانے لگی تھی۔ وہ جب سے اس کے امی ابے سے مل کر شہر سے آئی تھی ایسے ہی خوش سی تھی۔

"خالہ پینو! پھر امید سے ہے۔" وہ نانی کی خوشی کی یہی وجہ سمجھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں گلابو کے گیارہ بہن بھائی گھومے تھے اور بے بے کا اسے بارہویں متوقع سالے، سالی کے لیے دعا کرنے کا کہنا ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔

"معاف کرنا بے بے! میں اب خالہ پینو کے لیے کوئی دعا نہیں کر سکتا۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر دو ٹوک انداز سے کہا تھا۔

"اب اگر کوئی بچہ بھولے سے بھی جنم لے کر خالہ پینو کے گھر آگیا تو میں ہرگز خالہ پینو کو معاف نہیں کروں گا۔" وہ بھنویں اچکاتے ہوئے قدرے خفا اور غصے سے بولا تھا۔

بے بے جو اس کی حیرت اور غصے پر حیران ہو رہی تھی۔ اس کی بات سمجھ کر اس کے تپنے پر کتنی دیر ہنستے رہنے کے بعد گویا ہوئی تھی۔

"کملے پتر! جیسا تو سمجھ رہا ہے ویسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو تیرے اور گلابو کے رشتے کی بات پکی ہونے کی خوش خبری کی بات کر رہی ہوں۔" وہ مسکراتے ہوئے اسے بتا رہی تھی۔

"اس دن، تیری ماں سے یہی پوچھنے تو شہر گئی تھی کہ اگر اسے گلابو پسند ہے تو تیرے لیے اس کا رشتہ مانگوں، مگر تیرے امی، ابے نے تو تیری ساری ذمہ داری مجھ پر ہی ڈال دی ہے کہ میں اور میاں جی تمہارے لیے جو بہتر سمجھیں وہی کریں۔" وہ خوشی خوشی اسے بتا رہی تھی

اور وہ دل کی مرادیوں اچانک بر آنے پر خوش و حیران سا کھڑا ایک ٹک بے بے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ تو بے بے سے گلابو کے متعلق بات کرنے کا سوچ رہا تھا اور بے بے نے کیسے خود ہی گلابو سے اس کے رشتے کی بات کر کے اس کی مشکل آسان کردی تھی۔ وہ اس پر جتنا بھی خوش ہوتا کم تھا۔

"بے بے! کیا تجھے پتا تھا کہ تیرا مٹھو، گلابو کو پسند کرتا ہے۔" وہ حیرت اور خوشی کی ملی جلی کیفیت لیے پوچھ رہا تھا۔

"مجھے تو اس دن تم پر شک پڑ گیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے جب میں نے تیرے پاس وہ خون والی بوتل دیکھی تھی اور تیری خالہ بینو کے ہاتھ میں وہ خون سے لکھی گئی چٹھی دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ یہ کام تیرا ہی ہے۔ تب ہی میں نے سوچا کہ اپنے مٹھو کی اس کی پسند سے شادی ضرور کرواؤں گی جب میں نے میاں جی سے بات کی تو وہ بھی خوش ہوئے کہ چلو اس بہانے ہی شاید مٹھو کو کچھ عقل آجائے۔" بے بے تفصیل سے اسے بتا رہی تھی اور وہ نانا جان کی بات کا برا منائے بغیر اس بات پر خوش ہوا تھا کہ چلو نانا جان مان تو گئے۔

"تو بہت چنگی (اچھی) ہے میری سوہنی بے بے!" وہ بچوں کی سی معصومیت اور خوشی سے جھومتا ہوا بے بے سے چمٹ ہی تو گیا تھا۔ بن مانگے اسے اس کی محبت مل رہی تھی وہ اس پر جتنا بھی شکر کرتا کم تھا۔

بے بے اور میاں جی گلابو کا رشتہ مانگنے گئے تھے اور گلابو کے امی، ابے نے سوچنے کا ٹائم بھی نہیں لیا تھا اور یہ کہتے ہوئے فوراً" ہاں کردی تھی کہ میاں جیسے شریف اور نیک بندے کے سائے تلے ان کی بیٹی رہے اس سے بڑھ کر انہیں کیا چاہیے۔ ویسے بھی انہیں سیدھا سادہ کماؤ مٹھو بہت مناسب لگا تھا اپنی بے وقوف سی گلابو کے لیے۔

میاں جی نے منگنی کی بجائے شادی کا مشورہ دیا تھا جسے فوراً" گلابو کے ابے نے منظور کر لیا تھا کہ وہ خود بھی منگنی کے جھنجٹ میں پڑنا نہیں چاہتے تھے اس لیے دونوں گھرانوں کی رضامندی کے تحت منگنی کی بجائے سیدھے شادی کی تاریخ طے کردی گئی تھی۔

شادی کی تاریخ طے ہوتے ہی دونوں گھرانوں میں شادی کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔ مٹھو کے بہن بھائی اور امی، ابا بھی شہر سے آگئے تھے اس کی بہنیں روز رات کو برات رکھ کر بجاتے ہوئے اسے چھیڑتیں اور وہ مشرقی لڑکیوں کی طرح شرمایا سا مسکراتا رہتا۔

بالآخر بارات والا دن بھی آہی گیا تھا۔ مٹھو میاں گولڈن شیروانی اور گلے میں نوٹوں والے ہار ڈالے خوب سج رہے تھے۔ اس کی اماں نے کتنی ہی دیر بلائیں لے کر اس کی نظر اتاری تھی پیسے اتار کر کام والی ماسی کو دیے تھے پھر کہیں جا کر مٹھو ڈھول کی تھاپ پر ناچتے یار دوستوں کے ساتھ مسجد میں سلام کرنے کے بعد گلابو کے ہاں گیا تھا۔ جہاں رنگ برنگی تتلیوں کی طرح مختلف رنگوں میں سجی لڑکیوں نے پھولوں کی پتیاں نچھاور کر کے ان کا استقبال کیا تھا اور مٹھو میاں گردن اکڑائے بڑی شان سے چلتے ہوئے ٹینٹ کے بیچ رکھے گئے صوفے پر بیٹھ گئے تھے بمعہ یاروں کی بارات کے ساتھ....

"دلہا بھائی دس کا نوٹ تو دینا۔ ذرا قلفی کھانی ہے۔" گڈی نے اس کے پیسوں والے ہار کو للچائی نظروں سے دیکھتے ہوئے بڑے پیار سے پیسے مانگے تھے۔ شاید وہ جان گئی تھی کہ اب رعب سے پیسے نہیں ملیں گے اور وہ جو کہتا تھا کہ اب وہ کبھی بھی گڈی کو ایک روپیہ تک نہیں دے گا۔ اس نے مسکراتے ہوئے بڑے شاہانہ انداز میں دس کا نوٹ نکال کر اسے تھما دیا تھا۔

شاید خوشی انسان کو ایسا ہی سخی اور خیال کرنے والا بنا دیتی ہے۔

"دولہا بھائی ذرا پانچ روپے تو دینا وہ آلو چنے لینے ہیں۔" گڈی بھی اپنے نام کی ایک تھی وہ کتنی ہی بار اسے کچھ نہ کچھ کھانے کا کہتے ہوئے پیسے لے گئی تھی اور اب پھر اس کے سامنے کھڑی پیسے مانگ رہی تھی۔

"چلو بھاگو! نہیں ہیں ــــ پیسے۔" بالآخر وہ اس کے پیسے مانگنے پر تنگ آکر دھیرے سے ڈپٹتے ہوئے بولا تھا۔ خیال جو تھا کہ دولہا بہت اونچا نہیں بولا کرتے۔

گڈی نے چند لمحے اسے دیکھا تھا اور پھر واپس چلی گئی۔
باراتیوں کو کھانا کھلانے کے بعد مٹھو میاں کو گھر کے اندر سلامی دینے کے لیے لے جایا گیا تھا۔
"جیجا جی! پئیں نا۔" سلامیوں کے بعد دودھ پلائی کی رسم ہو رہی تھی جب گلابو کی چھوٹی بہن' زرق برق کپڑوں میں اپنے بھاری جسم کو دائیں بائیں جھولاتے ہوئے سہیلیوں کے سنگ دودھ کا سجا سجایا گلاس لے کر چلی آئی تھی اور اب آنکھوں میں شوخی لیے خود کو مادھوری سمجھتے ہوئے ایک ادا سے بولی تھی۔
مٹھو نہ جانے کیوں۔ منہ پر رومال رکھے شرما سا گیا تھا۔
"آپ اپنے ہاتھوں سے پلائیں گی تو ضرور پئیں گے۔" اس کے دوستوں نے یہ جاننے کے لیے کہ دودھ پلائی رسم میں کڑیوں کو کیسے لاجواب کرنا ہے۔ کوئی سو سے قریب پاکستانی اور انڈین فلمیں دیکھی تھیں اور اب بڑی شان سے اس کی دائیں بائیں بیٹھے بالوں میں ایک ادا سے ہاتھ پھیرتے ہوئے خود کو ہیرو ثابت کرنے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔
اب بھی گلابو کی بہن کے کہنے پر مٹھو کا ایک دوست کالر کو جھٹکتے ہوئے مسکرایا تھا۔
"ہم اگر اپنے ہاتھوں سے کچھ پلائیں گی تو وہ زہر ہو گا۔" گلابو کی ایک بانس کی طرح لمبی سہیلی نے دوپٹا جھولاتے ہوئے کن انکھیوں سے انہیں دیکھتے ہوئے کہا تھا۔
"ارے یہ وہی فلم نہیں ہے۔" مٹھو نے کسی فلم کا نام لیتے ہوئے اپنے برابر بیٹھے اپنے جیسے سوکھے سڑے کاشف سے پوچھا تھا۔ وہ پرسوں رات دیکھی جانے والی فلم کو ریوائز ہوتا دیکھ کر بے حد حیران ہوا تھا۔
"لگ تو اسی فلم کے ڈائیلاگ رہے ہیں۔" کاشف اپنے پنجے نما ہاتھ پر گال رکھے گلابو کی کسی سہیلی کو بے خود سا دیکھتے ہوئے کسی اور ہی جہان میں پہنچا ہوا تھا۔
"آپ کے ہاتھ سے زہر پینا۔ ہمارے لیے کسی امرت سے کم نہیں ہو گا۔" مٹھو کے ایک اور یار نے دل کے مقام پر ہاتھ رکھتے ہوئے آنکھوں میں اشتیاق لیے ان رنگ برنگی تتلیوں کو دیکھا۔
اس کے یوں کہنے پر وہ سب کی سب حیران سی ایک دوسرے کو دیکھنے لگی تھیں۔
"اے بھلا یہ کون سی فلم کا ڈائیلاگ تھا۔" گلابو کی سہیلی نے ساتھ والی لڑکی کے کان میں سرگوشی کی تھی۔ جواباً" اس نے فلم کا نام اور اس کا اگلا سین بھی بتا دیا تھا۔
"لگتا ہے کمبختوں نے بھی وہی فلم دیکھ رکھی ہے جو ہم نے دیکھی ہے۔" گلابو کی بہن کو ان کے پہلے ڈائیلاگ پر شک اور حیرت اور دوسرے پر یقین ہی تو ہو گیا تھا اس سے پہلے کہ وہ دانت پیستے ہوئے انہیں کھری کھری سناتی۔ ماحول دھڑام دھڑام کی آوازوں سے گونج اٹھا تھا۔
"ہائے اللہ! میں مرگئی۔ یا اللہ رحم۔" لمحے میں ہی سارے گھر کا نظام درہم برہم ہو گیا تھا۔ عجیب افراتفری کا عالم تھا۔ سب مہمان ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔
"ارے! ہم نے تو پٹاخے چھوڑے تھے اور آپ سب ڈر گئے۔" گڈی اور بلو ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے ہنس رہے تھے۔
"شکر ہے اللہ! میں سمجھی شریکوں نے میری گلابو کی شادی میں بم مار دیا ہے۔" خالہ پینو سینے پر ہاتھ رکھے لمبے لمبے سانس لیتی ہوئی دم سادھے مٹھو کی اماں اور بے بے کو ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے دیکھ کر بولی تھی۔
ہیروئن بنی لڑکیاں ایک دوسرے پر گری ہوئی تھیں اور اب اٹھنے کی کوشش میں تھیں اور خود کو ہیرو سمجھنے والے باراتی صوفوں اور چارپائیوں کے پیچھے سے برآمد ہو رہے تھے۔ پٹاخوں سے کہیں زیادہ ڈر تو انہیں بڑی بوڑھیوں کے چیخنے سے لگا تھا۔
"ہائے اللہ! میرا مٹھو نظر نہیں آرہا! کہیں پٹاخوں کے ساتھ ہی تو نہیں اڑ گیا۔" بے بے نے ایک نظر مجمعے پر ڈالی تھی اور دلہے میاں کو کہیں نہ پا کر

حواس باختہ سی منہ پر کپڑا رکھ کر بھوں بھوں کر کے رونے لگی تھی۔

"ہائے! میرا اکرم دین کہاں چلا گیا؟" بے بے کی ہاں میں ہاں ملانے والی مٹھو کی ماں نے تو اس کی گمشدگی پر باقاعدہ اپنا سینہ پیٹنا شروع کر دیا تھا سب لوگ دولہا کی اچانک گمشدگی پر گھبرا کر اسے ڈھونڈنے کے لیے اٹھے تھے۔

"میں یہاں ہوں اماں!" بے بے کے رونے اور ماں کے سینہ پیٹنے پر مٹھو میاں کی گھبرائی سی آواز سنائی دی تھی۔

"کہاں؟" بے بے کے ساتھ ساتھ اس کی اماں نے بھی گردن گھما کر متلاشی نظروں سے اپنے دائیں بائیں دیکھا تھا، مگر وہ ہوتا تو دکھائی دیتا۔

"چارپائی کے نیچے بے بے!" مٹھو میاں حواس باختہ سا رونی صورت بنائے بولے۔

"بے بے صدقے، اپنے پتر پر۔" بے بے اسے یوں منہ لٹکائے دیکھ کر تڑپ کر آگے بڑھی تھی۔

"وے! کمبختو کھڑے کیوں ہو۔ میرے پتر کو نکالو۔"

بے بے کے ساتھ ساتھ اس کی اماں نے بھی باراتیوں کے دو دو ہاتھ مار دیے تھے۔

باراتی اپنے کندھوں پر پڑنے والے دھموکوں کو سہلاتے ہوئے اگلے ہی لمحے مٹھو میاں کو کندھے سے گھسیٹ کر باہر نکال رہے تھے جو لمبے لمبے سانس لیتا ڈرا سہما سا دوبارہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ منہ ابھی بھی چڑیا کے بوٹ (بچے) کی طرح کھلا اور بٹن جیسی چھوٹی آنکھوں کے سامنے ابھی بھی اندھیرا سا چھا رہا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ یہ پٹاخے گڈی اور بلو نے صرف اسے ڈرانے کے لیے پھوڑے تھے جو اس نے انہیں پیسے نہیں دیے تھے۔ مٹھو میاں ان شیطان بچوں کے شر سے محفوظ رہ کر خیر و عافیت سے گھر واپس جانے کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ وہ اپنی پوری زندگی میں اتنا خوار اور حواس باختہ نہیں ہوا تھا جتنا اپنی شادی کے دن، وہ گلابو کے بہن بھائیوں کے ہاتھوں ہو رہا تھا۔

"گڈی یا بلو! شادی کے بعد میرے گھر کے آس پاس بھی بھٹکے تو ان کی ٹانگیں نہ توڑ دیں تو میرا نام بھی مٹھو نہیں۔" اس نے بڑے کڑے تیوروں سے ہنستے مسکراتے گڈی اور بلو کو دیکھ کر سوچا تھا۔

رخصتی کا شور اٹھا تھا اور وہ جو قدرے ناراض اور سہما ہوا بیٹھا تھا کہ نہ جانے اب اس گھر میں اس کے ساتھ کیا ہو جائے وہ گلابو کو لہنگا کرتی میں ملبوس دلہن بنے، سہیلیوں کے سنگ آتا دیکھ کر سارا ڈر و کوفت بھول کر بے خود سا ہوتے ہوئے یک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔ لہنگے کرتی میں بے شک اس کا وزن دگنا لگ رہا تھا، مگر وہ لگ کمال رہی تھی اس نے گلابو کو کن انکھیوں سے دیکھ کر سوچا تھا۔

"اے، اے دولہے کو دیکھو، کیسے اپنی گلابو پر فدا ہو رہا ہے۔" کسی نے اسے یوں بے خود سا گلابو کو دیکھتے ہوئے شرارت سے کہا تھا اور مٹھو میاں جلدی سے دھیما سا مسکراتے ہوئے نظروں کو جھکا گئے تھے۔ دلہن کو دولہا کے ساتھ کھڑا کر کے چند تصویریں اتاری گئی تھیں اور پھر مٹھو میاں اپنی دلہن کے سنگ بڑے مضبوط اور سہج سہج کر قدم اٹھاتے ہوئے اسے رخصت کروا کر جانے لگے تھے کہ.....

"ہائے ابا! تیری گلابو گئی!" گلابو کی اس دردناک آواز پر دولہا میاں کا دل ڈوب کر ابھرا تھا وہ بے حد پریشان سا گھبرا کر پلٹا تا جہاں گلابو مہمانوں کے ہجوم کے بیچ نم آنکھوں والے اپنے ابے کے گلے لگے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ دل گرفتگی اور اداسی سے گلابو کو روتا دیکھ کر بھی اسے یقین تھا کہ گلابو بی بی کسی فلم کے سین کو دہرا رہی ہے۔

گلابو کو یوں روتا دیکھ کر باراتیوں کی آنکھیں بھی بھیگ رہی تھیں اور اس کی بہنیں اور بھائی تو گلابو کے گلے لگ کر بلک بلک کر رو رہے تھے جیسے وہ جنگ کرنے جا رہی ہو جہاں سے اس کے لوٹ کر آنے کی امید نہ ہو۔

گلابو اور اس کے گھر والوں کو روتا دیکھ کر خود نرم دل مٹھو کا دل بھی دھاڑیں مار کر رونے کو چاہنے لگا تھا، مگر

مرد ہونے کے زعم میں وہ خود کو مضبوط اور بے نیاز ظاہر کرنے کی کوشش میں گردن اکڑائے کھڑا تھا۔

جیسے تیسے کر کے آخر گلابو کی رخصتی ہو ہی گئی تھی۔ مٹھو کا چھوٹا بھائی رکشا کو پھول پتیوں سے سجائے باہر دروازے پر دولہا اور دلہن کا منتظر کھڑا تھا (جی ہاں! دولہا میاں! دلہن کو رکشا میں لینے آئے تھے)

دولہن کا ساتھ والا گھر ہونے کی وجہ سے انہوں نے زیادہ پیسے گاڑی پر خرچ کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا وہ تو رکشا کے حق میں بھی نہیں تھے۔ وہ تو مٹھو کے چھوٹے بھائی کو دولہن کو پیدل گھر میں لانا مناسب نہیں لگا تھا تب ہی وہ کرائے پر رکشا تیار کر کے لے آیا تھا۔

مٹھو میاں بڑی شان سے دلہن کو رکشا میں بٹھا کر اوپر والی بڑی اور لمبی گلی سے چکر لگا کر گھر لے ہی آئے تھے اور اس کے بہن بھائیوں کے جنجال پورے کے پیچھے رہ جانے پر بے ساختہ اس نے خدا کا شکر ادا کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کرم دین! میری بات سن۔" نانا جان نے نائی کے ساتھ ولیمے کی تیاری کے لیے دیگوں کا حساب کتاب لگاتے ہوئے اپنے دوستوں کے بیچ بے زار سی شکل بنا کر بیٹھے مٹھو کو آواز دے کر بلایا

"جی نانا جان!" وہ شیروانی میں ملبوس نانا کے سامنے مودب بنا کھڑا تھا۔

"تو اپنے کمرے میں جا' تیری ووہٹی تیرا انتظار کر رہی ہوگی۔ دوستوں کے ساتھ تو بندہ ہمیشہ ہی بیٹھا رہتا ہے' آج صرف تم پر تمہاری ووہٹی کا حق ہے۔" میاں جی نے بڑے سبھاؤ سے اسے سمجھایا تھا وہ نانا جان کے کہنے پر شرما سا گیا تھا۔

"اپنی بیوی کو عزت اور بھروسہ ضرور دینا کرم دین! مرد جب اپنی بیوی کو عزت دیتا ہے تو جواباً" عورت کی محبت دگنی ہو جاتی ہے اور بھروسہ ہو تو کبھی میاں بیوی میں کوئی رنجش جگہ نہیں بنا سکتی۔" ہمیشہ اس کے نہ پڑھنے پر اس سے نالاں رہنے والے نانا جان آج کیسے محبت اور دوستانہ انداز سے اسے سمجھا رہے تھے۔

"میں ایسا ہی کروں گا نانا جان!" اس نے دل کی گہرائیوں سے نانا جان سے کہا تھا اور ان کے جانے کا کہنے پر سر ہلاتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

"مٹھو بات تو سن۔" اس کے دوستوں نے پیچھے سے ہانک لگائی تھی' مگر وہ ان سنی کرتا ہوا اندرونی حصے کی طرف بڑھ گیا۔ پاگل تھا جو اپنی نئی نویلی دلہن کی میٹھی پیار بھری باتیں چھوڑ کر اپنے دوستوں کی روکھی پھیکی باتیں سنتا جو اسے کب سے سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ اپنی بیوی کو سر پر نہ چڑھا لینا اس سے ذرا رعب سے بات کرنا۔ میاں جی شاید اس کے دوستوں کی باتیں سن چکے تھے تب ہی انہوں نے اسے اپنے پاس بلا کر بڑے پیار و محبت سے سمجھایا تھا۔

"مٹھو بھیا! ہمارا نیگ؟" وہ صحن میں بے ڈھنگے پن سے آڑے ترچھے لیٹے مہمانوں سے نظر بچا کر اپنے نئے گلابو کے جہیز سے آراستہ ڈیکوریٹڈ کمرے میں اس کا انتظار کرتی اپنی دلہن کے پاس جانے کی کوشش میں تھا جب اس کی چار بہنیں' سات آٹھ کزنز کے ساتھ دروازے کے آگے اس کے سامنے نیگ کے لیے ہاتھ پھیلائے کھڑی مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہی تھیں۔ مٹھو میاں نیگ کے مطالبے پر بے ہوش ہوتے ہوتے بچا تھا۔

"کیسا نیگ' کوئی پیسہ نہیں ہے میرے پاس تم لوگوں کو دینے کے لیے۔" سارا دن وہ نیگ کے نام پر اتنے پیسے لٹا چکا تھا کہ اب وہ اپنی بہنوں سے صاف بچ کر نکل جانا چاہتا تھا۔

"وہی نیگ جو دولہے اپنی دلہن کے کمرے میں جانے سے پہلے اپنی بہنوں کو دیتے ہیں۔" اس کی بڑی بہن نے بھنویں اچکاتے ہوئے اسے جتایا تھا۔

"اگر آپ کے پاس پیسے نہیں ہیں تو ٹھیک ہے پھر جب پیسے ہوں گے تب ہی ہم آپ کو آپ کی دلہن کے پہلو میں جانے کی اجازت دیں گے۔" اس کی کزن نے گڈی کے انداز میں کہتے ہوئے دروازے کے سامنے اپنے بازو پھیلا دیے تھے جس کا مطلب تھا کہ وہ اندر پیسے دیے بغیر کسی طور نہیں جا سکتا۔

"یہی ہے میرے پاس آپس میں بانٹ لینا۔" مٹھو نے ان کا اٹل انداز دیکھ کر جیب سے چند سو سو کے نوٹ نکال کر انہیں تھما دیے۔

مٹھو اپنے بالوں کو ہاتھ سے سنوار کر چند لٹیں ماتھے پر رکھتے ہوئے اپنے کالر کو جھٹک کر سیدھا کرتے ہوئے دل میں ہزاروں ارمان اور آنکھوں میں محبت کے جگنو سجائے اپنے کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔

"یا اللہ! میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا۔" وہ دروازے کی کنڈی لگا کر جیسے ہی پلٹا اسے اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا اس نے حیرانی سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے اپنے سجے سنورے کمرے پر نظر دوڑائی۔

"کمرہ تو میرا ہی ہے پر یہ سب یہاں کیا کر رہے ہیں؟" اس نے الجھن سے سوچتے ہوئے بیڈ پر دلہن بنی بیٹھی گلابو پر۔ اور اس کی دائیں بائیں دو سے تین سال کی عمر کے دو عدد ننھے منے گول گپے جیسے پھولے پھولے بھائیوں پر نظر ڈالی جو منہ میں چوسنی دبائے بڑے مزے سے سو رہے تھے۔

گڈی اور بلو صوفوں پر بیٹھے جہیز میں آنے والے ٹی وی پر بڑے آرام اور انہماک سے کارٹون دیکھ رہے تھے۔ مٹھو کو کمرے میں دیکھ کر انہوں نے بڑی اپنائیت اور محبت سے مسکرا کر اسے ویلکم کیا اور اس کی جواب میں ملنے والی گھوری کو نظر انداز کرتے ہوئے دوبارہ ٹی وی پر نظر جمالی۔

"گلابو! یہ فوج یہاں کیسے؟" وہ بہت الجھا اور حیران تھا اسے سمجھ ہی نہیں آرہی تھی کہ یہ حقیقت ہے یا خواب۔۔۔

"کرم دین! میرے بھائی اور میری بہنیں مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں اگر وقت بے وقت مجھ سے ملنے آجائیں تو تم برا نہیں منانا اور یہ چھوٹے تو ہمیشہ میرے ساتھ ہی سوتے تھے۔ اماں سے بھی زیادہ پیار مجھ سے کرتے ہیں۔ ابھی بھی رو کر ضد کر کے میرے پاس سونے آئے ہیں، مگر تم فکر نہیں کرو۔ گڈی اور بلو ٹی وی دیکھ کر جاتے ہوئے انہیں لے جائیں گے۔"

گلابو آنکھیں مٹکاتے ہوئے کسی قدر اپنائیت اور مان سے اس سے درخواست کر رہی تھی۔ آج پہلی بار مٹھو میاں کو لگا تھا کہ یہ کوئی فلمی سین کی ریہرسل نہیں ہو رہی بلکہ آج گلابو اپنے اصلی اور حقیقی رنگ میں اس سے بات کر رہی تھی اسے گلابو کا یہ رنگ بہت اچھا لگا تھا۔ "مگر میں۔۔۔" وہ کچھ کہنے لگا تھا۔

"آپ میرے دل میں رہیں گے۔ بڑی شان اور مان کے ساتھ۔ وہاں سے آپ کو کوئی نہیں ہٹا سکتا۔ میرے دل پر صرف آپ کا حق ہے۔" اس کے شرما کر ـــــ کہنے پر مٹھو میاں بے خود سا ہوتا ہوا عین اس کے سامنے بیٹھ گیا تھا۔ اس محبت کے مان اور ادا سے وہ مٹھو جیسے سادہ انسان سے جان بھی مانگتی تو وہ انکار نہیں کرتا۔

"دلوں میں گنجائش ہونی چاہیے جگہ خود بہ خود بن جاتی ہے۔ ویسے بھی تیرے بہن بھائی کیا میرے بہن بھائیوں سے الگ ہیں جب ان کا جی چاہے وہ تم سے ملنے آسکتے ہیں۔" وہ اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے دھیرے اور دل سے ہر رنجش بھلا کر (جو گڈی اور بلو کے ساتھ تھی) پر خلوص لہجے سے بول رہا تھا۔

گلابو نے بہت محبت اور ممنون نظروں سے اسے دیکھا تھا جو اپنے دل کے ارمان، دل میں چھپائے گڈی اور بلو کے جانے کے انتظار میں بیٹھا ان کے ساتھ کارٹون دیکھ رہا تھا۔

"ایسی سہاگ رات شاید ہی اس روئے زمین پر کبھی کسی کی ہوئی ہوگی کہ دولہا میاں کارٹون دیکھ کر اپنا دل بہلا رہے ہوں اور دلہن اپنے ننھے منے بھائیوں کو سلا رہی ہوں۔" مٹھو میاں نے سادگی سے محبت پاش نظروں سے گلابو کو بھائیوں کو تھپکی دے کر سلاتے ہوئے دیکھ کر کہا تھا۔

اس کی بات پر گلابو شرما کر رخ موڑ گئی تھی اور مٹھو میاں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے نظریں ٹی وی اسکرین پر جما دی تھیں۔ اس یقین پر کہ گلابو جیسی محبت کرنے والی لڑکی کے ساتھ زندگی بہت خوشیوں اور امنگوں بھری گزرے گی۔

☆ ☆

مکمل ناول

عتیقہ ملک

دل اک شہر ملال



تیسری قسط ۳

"بالکل بھی نہیں۔" وہ ذرا سا اس کا سر تھپتھپا کر ساحر کے برابر بیٹھ گیا تھا۔

"ہائے بھیا! بھابھی سچ میں اتنی ہی پیاری ہیں۔ جتنی کہ مووی میں نظر آرہی تھیں۔" ساحر نے کسی جاننے والے کے ہاتھ سندس کے اصرار پر اسے ولیمے کی مووی بھجوائی تھی۔ سنڈے کو جب وہ سنبل اور ماں کے ساتھ بیٹھا شام کی چائے پی رہا تھا جب سندس کا امریکہ سے چہکتا ہوا فون آگیا تھا۔

"شکر ہے بھیا اتنی پیاری لڑکی آپ کو مل گئی کوئی اور نہیں لے اڑا۔" اس کا دور اندیش خدشہ ساحر کے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر گیا تھا۔

"اور پتا ہے بھابھی کی آنکھیں بالکل آپ کی طرح ہیں۔" وہ نان اسٹاپ بولے جارہی تھی۔ ساحر کو اس کے مفروضے پر بہت زور سے ہنسی آئی تھی۔

"ہاں بھئی میاں بیوی رشتہ دار ہوتے ہیں۔ ان کے نقش ایک جیسے ہونے چاہئیں نا۔" وہ اپنی ہنسی روک کر اس کے بچکانہ تبصرے کا جواب دے رہا تھا۔

"کوئی نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ جتنی پیاری آنکھیں آپ کی ہیں' اتنی ہی بڑی بڑی اور خوب صورت آنکھیں بھابھی کی بھی ہیں۔ میں آپ کو بے وقوف نظر آتی ہوں' آپ میرا مذاق اڑانے لگے' ایک تو میرے بغیر شادی کرتے ہوئے آپ کو ذرا خیال نہیں آیا۔ کہ میرے دل میں کتنے ارمان ہوں گے آپ کی شادی کے۔" اگلے پل وہ روہانسی ہو کر کہہ رہی تھی۔ وہ جتنے پیارے اور پر خلوص دل کی مالک تھی اتنی ہی جلدی ہرٹ بھی ہوتی تھی۔ یہی بہت تھا کہ اس نے ولیمے سے اپنی غیر حاضری کو قبول کرلیا تھا۔ ورنہ رو دھو کر خود کو ہلکان کرنے لگتی۔ تو اسے سمجھانا ناممکن ہو جاتا۔

"ارے نہیں میری گڑیا۔ وہ تو۔۔۔ دیکھو نا اچانک یہ سب کرنا مجبوری تھی۔ ورنہ تمہاری اتنی اچھی بھابھی کو کوئی اور لے اڑتا تو۔۔۔" ساحر نے اس کی بات لوٹا کر اپنا دفاع کیا تھا۔

"اپنے گھر پارٹی کر کے میں نے دوستوں کو مووی دکھائی تو سب پوچھ رہے تھے کہ تمہاری بھابھی کس کی پسند ہے میں نے کہا میری۔۔۔"

"چلو یہ کریڈٹ تم ہی لے لو۔" اس نے خاصی فراخدلی دکھائی تھی۔

"اچھا میری بھابھی سے بات کروائیں نا۔"

"وہ تو شاور لے رہی ہے۔ پھر بعد میں بات کرے گی۔" اس کے ساتھ مزید تھوڑی سی گپ شپ کے بعد ریسیور سنبل کے حوالے کر کے باہر جانے کے لیے نکلا تھا۔

"کبھی کوئی اچھی شکل نہیں دیکھی جو اس قدر تعریفیں کر کے اس کو سر پر چڑھا رہی ہو۔" سنبل اس پر چڑھ دوڑی تھی۔

"کیا ہے آپی بھابھی اتنی پیاری۔۔۔"

"فضول بکواس بند کرو تمہیں پتا ہے نا کہ اس گھر میں لیلیٰ کو آنا تھا پھر۔۔۔"

"لیلیٰ کے مقدر میں جو ہو گا اسے بھی مل جائے گا یوں بھی اب اس بات کا کیا ذکر ہے۔" سندس نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

"میری طرح شادی کے چھ سال بعد بے اولادی کی تلوار تمہارے سر پر لٹک رہی ہوتی تو سب کچھ مقدر کے حوالے نہ کرتیں۔"

"تو اللہ سے مانگیں نا بھائی کی خوشیوں کے پیچھے کیوں پڑی ہوئی ہیں۔"

"تو تمہارے بھیا کو کس نے کہا تھا کہ اس چڑیل سے اپنی خوشیاں مشروط کرے کم بخت کہیں کی۔" آخر میں وہ نفرت سے بڑبڑائی تھی۔

"آپی!" سندس اس کی بڑبڑاہٹ سن کر گویا دنگ رہ گئی تھی۔



"افوہ ساحر، آپ آفس مجھے فون کرنے کے لیے گئے ہیں۔ یا کام کرنے کے لیے؟" مسز شاہ کے بے حد اصرار پر وہ دس دن کے لیے ہنی مون پر مری گئے تھے۔ اور واپس آکر ایک دو دن کے گیپ کے بعد ساحر آج آفس گیا تھا۔ مگر ڈیڑھ گھنٹے کے دوران اس نے حمرہ کو تیسری کال کی تھی۔ اپنے کمرے کے دروازے سے نکلتی مسز شاہ کے قدم ٹھٹک گئے تھے۔ وہ غیرارادی طور پر دو قدم اندر ہو کر اس کی بات سننے لگی تھیں۔

"میں نے سوچا تھا آپ آفس جائیں گے تو خوب سارا سوؤں گی۔ مگر جونہی نیند آنے لگتی ہے جناب کا فون آجاتا ہے۔" یہ جھنجلایا ہوا مان بھرا انداز ان کے بیٹے کی دین ہی تو تھا۔

"ابھی تو گیارہ بجے ہیں گھڑ بیبیوں کی طرح آپ کو لنچ کی بھی فکر پڑ گئی۔" وہ خاموش ہو کر دوسری طرف کی بات سن رہی تھی۔

"نہیں میں آفس نہیں آؤں گی۔ سعد بھائی مجھے اتنی شرارت سے دیکھتے ہیں جیسے میرا کوئی افیئر تھا آپ کے ساتھ۔" وہ رونکھی ہو کر انکار کر رہی تھی۔

"ٹھیک ہے گھر پر لنچ کرنے آجائیں۔ ورنہ پانچ بجنے میں تو بہت ٹائم ہے میں آپ کو بہت مس کروں گی۔"

"ادائیں دکھانا تو آتی ہیں تبھی یوں لٹو ہوا پھرتا ہے ساحر۔" بیگم شاہ بڑبڑائیں۔

"میں آپ کے لیے ڈش بناؤں؟" وہ زور سے ہنس کر کہہ رہی تھی یہاں آنے کے چوتھے روز اس نے ساحر کے اصرار پر بریانی بنائی تھی اور اس نے کھائی بھی تھی مگر اس مشورے کے ساتھ کہ آئندہ ایسی کوشش نہ کرنا، یوں بھی اسے بمشکل آٹا گوندھنا، روٹی پکانا اور سادہ سی ترکاری بنانا آتی تھی۔ البتہ ساحر کو اس کے ہاتھ کی بنی چائے بہت پسند آئی تھی اور یہ کام وہ اس کے لیے کبھی کبھار کردیتی تھی۔

"میں چائے کی ڈش ہی بنا سکتی ہوں۔ آپ آتے ہوئے رسک لے آئیے گا۔ دو کپ بناؤں گی ایک میں رسک میں ڈبو کر کھائیے گا دوسرا پینے کے کام آئے گا۔ ٹو ان ون ڈش ہے۔" مسز شاہ کو لگا وہ اس کی فرمائش کو چٹکیوں میں اڑا رہی تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے ایک بجے سے پہلے مت آئیے گا اور اگر آ بھی گئے تو نیچے ہی بیٹھیے گا۔ ایک بجے تک مجھے ڈسٹرب نہیں کرنا۔" وارننگ دیتے ہوئے خدا حافظ کہہ کر فون بند کیا اور مسکراتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف بڑھی تھی مسز شاہ جو ناشتا کرنے جا رہی تھیں ان کی بھوک پیاس سب ختم ہو گئی تھی۔ وہ خاصی بددل ہو کر واپس کمرے میں آئیں اور صوفے پر بیٹھ کر کچھ سوچنے لگی تھیں۔

حمرہ احمد اپنے نصیب پر خود ہی رشک کرتی اور اپنی ہی نظر لگ جانے سے ڈرتی تھی۔ کبھی کبھی اسے خیال آتا کہ اس کے بابا آخری دنوں میں اس کے لیے بہت اداس اور پریشان ہوا کرتے تھے۔ شاید کسی قبولیت کے لمحے میں انہوں نے اس کے لیے بہت دل سے دعا کی تھی جو ساحر شاہ کی ایسی انمول محبت اس کا نصیب ٹھہری تھی اس کی زندگی کا انمول اثاثہ آسودہ طرز زندگی، بے فکر سے روز و شب، ساحر کی والہانہ محبتیں اور خوب صورت ساتھ وہ دن بدن نکھرتی جا رہی تھی۔ ساحر کے لائے ہوئے شاندار ڈریسز پہن کر جب وہ خود کو آئینے میں دیکھتی تو کئی مرتبہ خود بھی حیران رہ جاتی تھی۔

"ساحر میں پہلے ایسی تو نہیں تھی؟" کئی مرتبہ وہ اس سے سوال کر بیٹھتی۔

"آپ پہلے بھی ایسی ہی تھیں سویٹ ہارٹ۔ بس ہم نے ذرا محبت کا بلش آن مارا ہے۔" وہ اس کے گرد حصار قائم کر کے محبت سے کہتا تو وہ واقعی بلش ہونے لگتی تھی اور اس کا دل اس بے پایاں محبت پر ناز کرنے لگتا۔

جب وہ دونوں تیار ہو کر کہیں جانے کے لیے نکلتے اور مسز شاہ سے آمنا سامنا ہو جاتا تو وہ ٹیپیکل ماؤں کی طرح ان کے صدقے واری ہو کر نظر اتارنے کی فکر میں لگ جاتیں اور اس کے ساتھ ساحر کو بھی ماں کے

اس روپ پر حیرت ہوتی تھی انہوں نے حمرہ کو یوں دل سے قبول کیا تھا جیسے یاد ہی نہ ہو کہ ان کا بیٹا ان سے بغیر پوچھے بتائے گھر لایا تھا۔

یوں لگتا ہے کہ وہ خود کتنی منتوں' مرادوں سے اسے بیاہ کر لائی ہوں' ہاں چلتے چلتے اگر وہ کبھی مڑ کر دیکھ لیتے تو شاید اس نفرت سے قطعی بے خبر نہ رہتے جو انہیں یوں والہانہ انداز میں اکٹھے دیکھ کر مسز شاہ کی آنکھوں میں اترتی تھی مگر وہ دونوں ہی پر خلوص اور صاف نیت کے تھے۔ ان کا ظاہر و باطن ایک تھا اس لیے وہ لاوا جو ان کی خوشگوار زندگی کو بھسم کرنے کے لیے پک رہا تھا اس سے بے خبر رہے۔



ساحر پندرہ دن کے لیے سنگاپور گیا ہوا تھا۔ وہ بوریت اور ڈپریشن سے بچنے کے لیے یونہی نیچے لاؤنج میں چلی آئی تھی۔ نیک بابا کی بیٹی زرینہ نے غالباً" کالج سے چھٹی کی تھی۔ اس لیے کچن میں باپ کے ساتھ ہاتھ بٹانے کو موجود تھی۔ حمرہ کو اکیلا بیٹھا دیکھ کر وہ اس کے پاس آ گئی۔ اس کی زرینہ سے خاصی فرینڈ شپ تھی۔ اس کے ساتھ گپیں لگاتے اور ٹی وی کے چینل چینج کرتے ہوئے نہ جانے کتنی دیر گزری تھی۔

کیا تو نے میرا حال پریشان نہیں دیکھا

کسی چینل پر حامد علی خان کی آواز میں غزل چل رہی تھی۔

"یہ غزل مجھے بہت پسند ہے میری آل ٹائیم فیورٹ ہے۔ اس نے والیم بڑھاتے ہوئے خوش ہو کر بتایا تھا۔

"تو آپ موبائل میں ریکارڈ کرلیں جب دل چاہے سنا کریں۔" زرینہ نے مشورہ دیا تھا ساحر نے یہاں آنے کے بعد اسے ایک خوب صورت سا موبائل لا کر دیا تھا۔ مگر وہ اس کا استعمال ذرا کم ہی کرتی۔۔۔۔۔۔

وہ باہر جاتا تو سونے سے قبل لمبی لمبی گپ لگاتا اب بھی دو دن سے دن میں کئی کئی بار کال کرنے کے علاوہ وہ رات کو دو ڈھائی گھنٹے بات چیت کرتا تھا۔

"اچھا جاؤ ذرا میرے کمرے سے موبائل اٹھا لاؤ۔" زرینہ اس کے کہنے پر موبائل لے کر آئی اور ریکارڈنگ اسٹارٹ کر کے ٹی وی کے بالکل قریب جا رکھا تھا۔

"بی بی! والیم فل کر دیں تبھی ٹھیک سے ریکارڈ ہو گا۔" اس نے ریموٹ اٹھا کر والیم فل کر دیا تھا۔ ریکارڈ تو شاید ٹھیک سے ہو تا مگر اتنا والیم سماعتوں پر بھاری گزر رہا تھا سو وہ دونوں لان میں آ گئی تھیں۔ تبھی مسز شاہ اور سنبل شاپنگ سے واپسی پر لاؤنج میں داخل ہوئیں تو سارا لاؤنج حامد علی خان کی آواز سے گونج رہا تھا۔

"دیکھیں تو اس مہارانی کو ٹی وی یوں کھلا چھوڑ رکھا ہے جیسے اس کے تھرڈ کلاس باپ کا گھر ہو۔" سنبل نے صوفے پر شاپر پھینک کر ٹی وی آف کیا اور مسز شاہ سے مخاطب ہوئی تھی۔

"چھوٹے گھر کی لڑکی ہے نوکروں کے ساتھ کیسے فرینک ہوتی ہے جیسے رشتہ داری نکلتی ہو۔" مسز شاہ نے لاؤنج کی گلاس وال سے پرے لان میں جھولے پر بیٹھ کر زرینہ کے ساتھ باتیں کرتے حمرہ کو دیکھا تھا۔

"انہی میں سے تو ہے رشتہ داری کیوں نہیں گانٹھے گی۔" سنبل نے ایک مرتبہ پھر اس کی کلاس پر تنقید کی تھی۔

"ماما آپ کب اس کو چلتا کریں گی؟" سنبل خاصی جزبز ہو کر پوچھ رہی تھی۔

"میں تو آنٹی کینز کو تسلیاں دے دے کر تھک گئی ہوں کہ لیلیٰ ہی اس گھر کی بہو بنے گی۔ ہم مناسب وقت دیکھ کر اس کو دفع کریں گے مگر۔۔۔۔"

"تمہارے بھائی کے عشق کا بھوت اترے تو میں کچھ کروں۔" مسز شاہ کے انداز میں بے بسی تھی۔

"آپ کچھ کریں گی تو یہ بھوت اترے گا۔"

"اس نے لاڈو رانی کو ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا ہے۔ وہ اس کے خلاف بھلا کچھ سن سکتا ہے۔"

"وہ اس لیے کہ وہ اسے پاکیزہ پری سمجھتا ہے۔ اس کے کردار پر دو چھینٹے اڑائیں پھر دیکھیں کیا ہوتا ہے۔"

"بیٹا وہ اس کے بارے میں بہت پکی ہے اس طرح تو۔۔۔۔"

"بات کردار پر آئی تو سارا ٹیچ وچ نکل جائے گا۔ ساحر نے اس کا انتخاب کیوں کیا؟ خوب صورتی، تعلیم، مینو زیا خاندان دیکھ کر کچھ بھی تو خاص نہیں ہے۔ یہ سب تو ہمارے سرکل کی لڑکیوں میں وافر مقدار میں تھا مگر یہ بنی ہو گی اس کے سامنے حیا کی ملکہ اور وہ ریجھ گیا ہو گا۔ اسے یہاں سے نکالنے کا ایک ہی راستہ ہے۔"

"ہوں۔" مسز شاہ نے پرسوچ انداز میں سر ہلایا تھا۔

"میں ذرا ریسٹ کرنے لگی ہوں میرے لیے ایک کپ چائے بھجوا دیں۔" وہ ماں کی برین واشنگ کر کے چلتی بنی جبکہ مسز شاہ بہت دیر تک سوچوں میں الجھی رہیں۔ تبھی زرینہ نے اندر آ کر ٹی وی کے سامنے رکھا موبائل اٹھا کر ریکارڈ کو سیو ——— کیا تھا غزل کے ساتھ حمرہ کی بربادی کی داستان بھی سیو ہو چکی تھی۔

"یہ کیا ہے؟ کس کا موبائل ہے؟" مسز شاہ اپنے خیال سے چونک کر پوچھ رہی تھیں۔

"بیگم صاحبہ، یہ حمرہ بی بی کا موبائل ہے میں نے ....."

"ادھر رکھو اسے اور دو کپ چائے بنا لاؤ۔" انہوں نے خاصے درشت لہجے میں کہا تو وہ موبائل وہیں رکھ کر کچن میں چلی گئی تھی۔ مسز شاہ نے اٹھ کر موبائل ہاتھ میں لیا اور پرسوچ انداز میں دیکھنے لگیں۔ تبھی موبائل وائبریٹ ہوا اور ساحر کالنگ کے الفاظ چمکے تو انہوں نے کچھ سوچے سمجھے بنا بزی کا بٹن پش کر دیا تھا تھوڑی دیر کے بعد لاؤنج میں فون کی گھنٹی بجی تو انہوں نے ریسیور اٹھایا تھا۔ دوسری طرف ساحر تھا۔ سرسری سی بات چیت کے بعد اس نے حمرہ کے بارے میں پوچھا تھا۔

"وہ لان میں فون پر بات کر رہی ہے میں سمجھی شاید تم سے ..... اچھا ہولڈ کرو بلاتی ہوں۔" ایک منٹ کے لیے انہوں نے ریسیور ٹیبل پر رکھا اور ذرا ایزی ہو کر بیٹھ گئیں۔

"ہاں بیٹا میں نے اسے بتایا ہے آ رہی ہے اور سناؤ سنگاپور کا موسم کیسا ہے؟" تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے کچھ سوچ کر ریسیور کان سے لگایا تھا۔ وہ بے دلی سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔

"ماما، حمرہ کیوں نہیں آ رہی، بات کروائیں نا میری۔" دس پندرہ منٹ کی مزید گپ شپ کے بعد وہ الجھ کر پوچھ رہا تھا۔

"پتا نہیں بیٹا میں نے بتایا تو ہے۔ شاید کسی فرینڈ سے موبائل پر بزی ہے۔ تم بعد میں بات کر لینا۔" انہوں نے سرسری سا کہا تو اس نے خدا حافظ کہے بغیر فون بند کر دیا تھا۔

"نیور مائنڈ مائی چائلڈ۔ اب آسمان سے مدد کو فرشتے تو نہیں آئیں گے مجھے خود ہی کچھ کرنا ہو گا۔" انہوں نے مسکرا کر ریسیور رکھ دیا تھا۔

"آخر ایسی کون سی دوست ہے جس سے گفتگو کو گیپ نہیں دیا جا سکتا۔" دوسری طرف ساحر نے موبائل بیڈ پر پھینکتے ہوئے سوچا تھا۔



دوسرے دن اس نے بارہا ٹرائی کیا مگر حمرہ کا موبائل آف اور گھر کا نمبر بزی مل رہا تھا ..... جبکہ حمرہ صاحبہ ساری دوپہر نیند کو چھوڑ کر لاؤنج میں براجمان رہیں کبھی صوفے پر ٹیک لگا کر کمر سیدھی کرتی۔ کبھی سیڑھیوں پر بیٹھ کر فون کو دیکھتی۔

"موبائل گم ہوا مگر ساحر کے پاس یہ نمبر تو ہے وہ فون کیوں نہیں کر رہے؟" جھنجلا کر خود سے پوچھتی۔

"موبائل کہاں غائب ہوا ہے آخر؟ زرینہ تو اتنی اچھی ہے وہ کیسے چوری کر سکتی ہے اور نیک بابا! توبہ اتنے باریش بزرگ انسان کے بارے میں ایسا سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ ماسی تو صبح جلدی چلی جاتی ہے اور صغراں تو دو دن سے چھٹی پر ہے۔" ہر جگہ ڈھونڈ لیا اس نے۔ مگر موبائل کہیں نہیں تھا۔

"یہ حمرہ کی کون سی دوست ہے، جس سے وہ اتنی دیر سے گفتگو کر رہی ہے۔" میٹنگ کے بعد ہوٹل کی طرف جاتے ہوئے ساحر نے ٹرائی کیا اور گھر کا نمبر بزی پایا

کر جھنجھلاتے ہوئے سوچا تھا۔
"ساحر اس نمبر پر کال کیوں نہیں کر رہے ؟"
موبائل کی تلاش میں ناکام ہو کر حمرہ نے ایک مرتبہ پھر سوچا۔ یوں بھی وہ فون کبھی کبھار اور وہ بھی ساحر کو ہی کیا کرتی تھی۔ ورنہ ریسیور اٹھا کر دیکھ لیتی کہ یہ تو زندگی کی رمق سے خالی پڑا تھا کیونکہ اس کا پلگ پیچھے سے نکال دیا گیا تھا۔



اس سے اگلے دن مسز شاہ پورا دن گھر پر ہی رہیں۔
"سو سنار کی اور ایک لوہار کی "انہیں سنار تو بننا نہیں تھا۔ لوہے کو گرم کر کے اس پر زور کی ایک ضرب لگانی تھی۔ اور حمرہ نامی قصے کو لئے گھر سے پاک کرنا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں آتے ہوئے آخری سیڑھی پر تھی جب فون کی بیل بجی، مگر اس کے پہنچنے سے پہلے ہی صوفے پر ٹی وی دیکھتی مسز شاہ فون اٹینڈ کر چکی تھیں۔
"ہیلو! بیٹا کیا حال ہے ؟" ان کی گفتگو سنتی حمرہ کا دل کھل اٹھا وہ ان کے قریب چلی آئی تھی۔
"کیا بات ہے ؟" ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر اس سے پوچھ رہی تھیں۔
"آنٹی ساحر کا فون ہے ؟"
"نہیں سنبل کا، تم نے بات کرنی ہے ؟" وہ اس سے انجان بن کر پوچھ رہی تھیں۔
"نہیں۔" وہ بے دلی سے کہہ کر صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔
"ذرا میرے لیے چائے کا ایک کپ بنا لاؤ۔" وہ کم ہی اسے کوئی کام کہتی تھیں سو مجبوراً "اٹھ کر کچن میں آ گئی مختصر سے حال احوال کے بعد اس نے حمرہ کو بلانے کو کہا تھا۔
"بیٹا وہ تو اپنی دوست کی طرف گئی ہوئی ہے۔"
"کس دوست کی طرف ؟" وہ حیران ہو کر پوچھ رہا تھا۔
"پتا نہیں کون سی دوست ہے۔" اس کے پوچھنے پر لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔
"آپ کو بتا کر نہیں گئی۔" وہ حیران ہوا تھا۔
"ارے نہیں بتا کر کیوں نہیں گئی، اتنی بچی ہے بھلا بتائے بغیر جا سکتی ہے میں نے خود ہی اتنی تفصیل نہیں پوچھی۔" وہ انتہائی اطمینان سے بتا رہی تھیں۔
"تم اس کے موبائل پر بات کر لو نا۔" انہوں نے مفت مشورہ بھی دے ڈالا تھا کچن میں چائے بناتی حمرہ کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ وہ کس دوست کے گھر گئی ہوئی ہے۔ اس سے اگلے روز لاؤنج کے سیٹ کا پلگ آف کر کے اپنے کمرے میں پڑے سیٹ کی بیل کا والیم اتنا کم کر دیا کہ باہر آواز نہ جا سکے۔ چند روز تک یہ آنکھ مچولی جاری رہی۔ مگر اس کی حمرہ سے بات نہیں ہو پائی تھی۔ اور مسز شاہ نے کمال انجان پن سے ہلکے پھلکے شکوک و شبہات کو جنم دینے کے بعد لفظوں کے اس کھیل میں سب سے مضبوط مہرہ آگے بڑھا دیا تھا۔
"بیٹا میں تو حمرہ پر حیران ہوں اتنی اچھی سمجھ دار بچی تھی کہ مجھے اس پر فخر ہوتا تھا مگر پتا نہیں اب اسے کیا ہو گیا ہے۔"
"ماما پلیز ٹو دا پوائنٹ بتائیں کیا ہوا ہے اسے ؟" وہ بہت پریشان ہو رہا تھا۔
"تم یہاں ہوتے تھے تو تمہاری غیر موجودگی میں بھی مجھ سے اجازت لے کر چلی تو جاتی تھی مگر......"
"تب کو چھوڑیں اب کیا بات ہے پلیز مجھے بتائیں۔"
"مجھے کہتی تھی کہ میری دوست پک اینڈ ڈراپ دے گی، کل میں مسز کاظمی کی بیٹی کی عیادت کو جا رہی تھی تو ایک مرد اسے ڈراپ کر کے جا رہا تھا میں نے پہچانا نہیں کون تھا ؟"
"آپ نے حمرہ سے پوچھا نہیں کہ کون ہے ؟" وہ خاصے ضبط سے کہہ رہا تھا۔
"فوراً" پوچھا تھا مگر آئیں بائیں شائیں کرتی منہ سے کچھ پھوٹے بغیر اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔ سارا وقت موبائل پر لگی رہتی ہے۔" اور ساحر کو یقین آیا یا نہیں۔ مگر اس کے سارے ٹور کا پریشانی میں بیڑا غرق ہو

کر رہ گیا تھا۔ وہ کچھ بھی مینج نہیں کر پا رہا تھا۔ دو ہفتے قیام کا ارادہ ملتوی کر کے اس نے ایک روز بعد کی سیٹ کنفرم کروالی تھی۔



صبح نماز پڑھ کر یونہی ٹیرس پر بجھے ہوئے دل کے ساتھ بیٹھی رہی۔ سورج ذرا اوپر آیا تو کمرے میں آئی تھی۔ دل اس قدر بوجھل ہو رہا تھا کہ ناشتے کو بھی جی نہیں چاہ تھا۔ پچھلے ماہ میں یہ پہلی دفعہ ہوا تھا ساحرا تنے لمبے عرصے کے لیے باہر گیا تھا ورنہ تو ہفتہ بھر میں ہی اس کی واپسی ہو جاتی تھی۔ اور یہ بھی پہلی بار ہی ہوا تھا آٹھ دن سے اس کی حمرہ سے بات نہیں ہوئی تھی۔ اس کی آواز سنے بغیر اس سے بات کیے بغیر اسے دیکھے بنا مزید پانچ دن رہنے کا سوچ کر دل کسی بھاری پتھر تلے محسوس ہو رہا تھا۔ سو تکیے میں منہ چھپائے پڑی رہی۔ دل کا بوجھ نمی بن کر تکیے میں جذب ہو رہا تھا۔ تبھی دروازے پر دستک ہوئی مگر اس نے خاص توجہ نہ دی تھی۔

"حمرہ بیٹا!" مسز شاہ دروازے پر کھڑی تھیں۔

"جی! جی آنٹی۔" وہ فوراً سیدھی ہو کر آنکھیں صاف کرنے لگی تھی۔ انہوں نے دیکھا مگر نظر انداز کر گئیں۔

"وہ سنبل کا فون آیا ہے۔ اسے کچھ شاپنگ کرنی ہے تم ذرا اس کے ساتھ چلی جاؤ میری تو طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے آنٹی۔" دل تو کہیں جانے کو نہیں چاہ رہا تھا مگر مروت میں انکار نہ کر سکی تھی۔

"پیا کی پیاری پیا جی کو آنسو بہا کر یاد کر رہی تھی آج ناشتا بھی نہیں کیا۔" مسز شاہ نیچے جا کر بیٹی کو فون پر کہہ رہی تھیں۔

"ماما یہ رونا اور یہ فاقے تو اب عمر بھر اس کا نصیب رہیں گے۔" سنبل زہر خند ہنسی ہنس دی تھی۔

"اچھا تم گیٹ سے دور ہی رہنا کسی ملازم نے دیکھ لیا تو گواہیاں دینے بیٹھ جائیں گے۔" انہوں نے بیٹی کو محتاط رہنے کی ہدایت کی تھی۔

"ماما پلیز میرا پلان مجھے نہ سمجھائیں۔" سنبل نے ماں کو ٹوک دیا تھا۔

"تمہارا دکی تو مناسب وقت پر پہنچ جائے گا نا؟" وہ پھر تصدیق کر رہی تھیں کہ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔

"سب ریڈی ہے۔ بس آپ بہو صاحبہ کو باہر بھیجیں میں پہنچنے ہی والی ہوں۔"

"دس بجے کی فلائٹ ہے مگر دس بجے فکس نہ پہنچ جانا، فلائٹ لیٹ بھی ہو سکتی ہے میں مس کال دوں تبھی...." مسز شاہ نے بیٹی کو وارن کیا تھا۔

سنبل آپی کے ساتھ آ کر وہ حیران پریشان ہوتی رہی۔ اسے تو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ انہیں کچھ خریدنا بھی ہے یا پھر... ایک دو دفعہ پوچھا بھی مگر وہ ہوں ہاں کر کے رہ گئیں۔ آخر انہوں نے کاٹن کے تین سوٹ پسند کیے جن کا موسم بھی نہیں تھا ایک فلاور شاپ سے بکے لیا۔ ایک ریسٹورنٹ میں ریفریشمنٹ لے کر بار بار گھڑی دیکھ کر ٹائم گزارا بقول ان کے ڈرائیور کا انتظار تھا دو تین مرتبہ شاید ڈرائیور کی مس کال آنے پر باہر نکلی تھیں۔

"آپی آپ لوگوں نے نئی گاڑی لی ہے اور ڈرائیو بھی نیا رکھا ہے؟" سنبل کی گاڑی اور ڈرائیور کو وہ پہچانتی تھی۔ جواب میں سنبل نے پھر بس "ہوں ہاں" کی تھی عجیب روڈلی سا بی ہیویر تھا۔

"یہ لڑکا ڈرائیور تو نہیں لگتا۔" بلیک پینٹ اور لائٹ بلو شرٹ میں ملبوس ڈرائیور کو سرسری نظر دیکھ کر اس نے سوچا اور پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی تھی۔

"مجھے یہاں کچھ کام ہے ڈرائیور تمہیں چھوڑ کر مجھے پک کرے گا کیونکہ پھر مجھے گھر جانا ہے۔" ایک جگہ گاڑی رکوا کر سنبل اسے ہدایات دیتی اتر گئی تھی۔

"بیٹا مجھے تو ایک گھنٹے کا کہہ کر گئی سویرے ہی نکلی ہے اب تین گھنٹے گزر گئے بس آنے ہی والی ہو گی۔"

ساحر بروقت فلائٹ کے باعث ساڑھے دس بجے گھر پہنچ چکا تھا۔ مگر حمرہ کی عدم موجودگی اسے کھولا گئی تھی۔

"ادھر ٹیرس پر بیٹھتے ہیں۔ تم اس بندے کو دیکھنا جو

اسے پک اینڈ ڈراپ دیتا ہے۔ شاید اس کا کوئی کزن وغیرہ ہو۔" مسز شاہ نے خاصی معصومیت سے قیاس آرائی کی تھی اور تبھی ان کے موبائل پر سنبل کی کال آگئی تھی۔ وہ سڑک پر نظریں جمائے ان کی بات چیت بے دھیانی سے سن رہا تھا۔

"ہاں ساحر سنگاپور سے واپس آگیا ہے۔ آج ہی واپس آیا ہے۔ لو بات کرلو۔" انہوں نے موبائل اس کی طرف بڑھایا تھا۔ وہ انکار کرنا چاہتا تھا مگر پھر مجبوراً" بات کرنا پڑ گئی۔

"ہیلو ساحر کیسے ہو۔ میں تو ساہیوال آئی ہوئی ہوں' خوب موجیں ہیں آج کل یہاں کا موسم بھی خاصا پلیزنٹ ہے۔" وہ اس کی سن کم اور بول زیادہ رہی تھی۔ ساہیوال میں اس کی سسرال تھی اور ساحر کو ایک بات بخوبی سمجھ آئی کہ آج کل وہ سسرال گئی ہوئی تھی۔ کیونکہ شاید ہر چیز میں اس نے ساہیوال کا ہی ذکر کیا تھا۔ تبھی ایک نئے ماڈل کی کرولا سامنے سڑک کے ایک طرف رکی تھی۔ ماں کے توجہ مبذول کرانے پر اس نے موبائل آف کیے بغیر ٹیبل پر پٹخ دیا تھا۔

"بس یہاں گاڑی روک دیں۔" حمرہ نے اس نئے ڈرائیور کو شاہ ہاؤس کے سامنے پہنچ کر کہا تو اس نے گاڑی گیٹ کے ساتھ روکنے کے بجائے دوسری طرف روکی تھی یعنی اب اسے سڑک کراس کر کے جانا تھا۔ وہ سنبل کے شاپر اٹھائے گاڑی سے نکلی جو نہ جانے وہ کیوں اس کے حوالے کر گئی تھی۔

"ایکسکیوزمی میم! یہ بیگ بھی آپ کا ہے۔" ڈرائیور نے گاڑی سے اتر کر فرنٹ سیٹ سے ایک شاپنگ بیگ اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا تھا۔

"مگر یہ تو....." اس نے متذبذب ہو کر وہ شاپر بھی پکڑ لیا تھا۔ اور تبھی اس ڈرائیور نے شاید اس کی طرف بڑھا کر دوسرا ہاتھ اس کی طرف دراز کیا شاید وہ اس کے گال ٹچ کرنا چاہتا تھا یا اس کے کندھے پر ہاتھ رکھنا چاہتا تھا۔ اس کی انگلیاں ذرا سی حمرہ سے مس ہوئیں تو وہ بدک کر دو قدم پیچھے ہٹی اور ڈرائیور کو حیرت سے دیکھا جو پوری کی پوری بتیسی کی نمائش کر رہا تھا۔

جیسے وہ اس کا کوئی قریبی رشتہ دار ہو' وہ تیزی سے سڑک کراس کر کے گیٹ کی طرف تقریباً" بھاگتے ہوئے آئی اور پیچھے مڑ کر دیکھا وہ کھڑکی سے ذرا سا سر نکال کر اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ تبھی اس نے ایک الوداعی بوسہ ہاتھ کے اشارے سے اس کی طرف اچھالا اور زن سے گاڑی بڑھا کر لے گیا تھا۔



"ارے آپ... یوں اچانک؟" کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے ساحر کو کمرے کے بیچوں بیچ کھڑے پایا تھا۔ وہ اتنی بد حواس تھی کہ نہ خوشی کا اظہار کر سکی اور نہ ہی حیرت کا' مگر پھر شاپر صوفے پر پھینکتے ہوئے پوچھنے لگی تھی۔ اپنی کیفیت میں وہ اس کے چہرے کے برفیلے تاثرات نوٹ نہیں کرپائی تھی۔

"کہاں سے آرہی ہو؟" وہ انتہائی پتھریلے انداز میں اس سے پوچھ رہا تھا۔

"میں تو سنبل آپی کے ساتھ گئی تھی انہیں کچھ شاپنگ کرنی تھی تو....."

چٹاخ' چٹاخ۔ کی بھرپور آواز کے ساتھ ساحر کا اٹھا ہاتھ اس کے چہرے کا رخ موڑ گیا تھا۔

"میں تم سے جو پوچھ رہا ہوں وہ بتاؤ گھٹیا عورت۔" اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتی ساحر نے اس کا گلا دونوں ہاتھوں میں دبوچ لیا اور اس کا سانس چند سیکنڈوں میں ہی رکنے لگا تھا۔

"کیا کر رہے ہو ساحر مار دو گے اسے۔" مسز شاہ جو ٹیرس کے کھلے دروازے سے سارا تماشا دیکھ رہی تھیں یک دم خوفزدہ سی آگے بڑھیں اور اس کے ہاتھوں کا دباؤ پورا زور لگا کر کھولا اور اسے پیچھے دھکیلا تھا۔

"آنٹی انہیں بتائیں نا میں سنبل آپی کے ساتھ گئی تھی آپ نے ہی مجھے بھیجا تھا۔" وہ لہرا کر کارپٹ پر گری مگر اگلے پل بیڈ کا سہارا پکڑ کر اٹھنے کی کوشش میں کہہ رہی تھی۔

"کیا بکواس کر رہی ہو سنبل تو ساہیوال گئی ہوئی

ہے۔ تم کسی دوست کی طرف جانے کا کہہ رہی تھیں۔" مسز شاہ نے ناگواری سے چیخ کر کہا اور شاید اس کے یوں بولنے کے جرم میں ہی اس کے اور ساحر کے درمیان سے ایک طرف ہو گئیں تو وہ ایک بار پھر کارپٹ بوس ہو کر اس کی ٹھوکروں کی زد میں تھی۔ چند لمحوں میں ہی اس کی بولنے کی سکت تو ختم ہو گئی مگر ہوش و حواس بھی سلب ہو رہے تھے۔ اس کے منہ سے خون نکلنے لگا تھا۔ مگر ساحر کا غصہ کم ہونے کے بجائے بڑھ رہا تھا۔ "نیک محمد 'صغراں' چوکیدار" مسز شاہ زوردار آواز سے سب کو بلا رہی تھیں۔ اور نیک محمد تو شور کی آواز سن کر پہلے ہی کمرے کے دروازے سے لگا کھڑا تھا۔ مگر اب مسز شاہ کے کہنے پر وہ سب اسے کھینچ کھانچ کر نیچے لے گئے تھے۔ ٹیرس پر پڑے موبائل سے یہ سب سنتی سنبل کا دل چاہ رہا تھا وہ چلتی گاڑی میں بھنگڑا ڈالنا شروع کر دے۔

"بی بی جی! آپ کو صاحب نے اتنا کیوں مارا ہے؟" اسے دیکھ کر زرینہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

"مجھے ..... مجھے نہیں ..... نہیں پتا۔" گزرے نو ماہ میں ساحر نے اس پر ہاتھ اٹھانا تو در کنار کبھی جھڑکا تک نہیں تھا۔ وہ تو اس کی کسی بات کے جواب میں "نا" بھی نہیں کہتا تھا۔ اب اس قدر بے رحمی سے مار کی کوئی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ سنبل کے ساتھ گئی تھی یا نہیں گئی تھی۔ مسز شاہ کی تردید اس کے سلب ہوتے حواس سمجھنے سے قاصر ہو رہے تھے۔

"یہ پانی پی لیں۔" زرینہ نے گلاس اس کے منہ سے لگانا چاہا مگر اس کے اعصاب اس بری طرح کانپ رہے تھے کہ باوجود کوشش کے ایک گھونٹ بھی نہ پی سکی اور کارپٹ پر سر ڈال دیا تھا۔

"آپ اوپر لیٹ جائیں۔"

"نہیں مجھے کمبل لا دو' مجھے سردی لگ رہی ہے مجھے درد ہو رہا ہے۔" اکڑی ہوئی گردن کے ساتھ بولنا بھی محال لگ رہا تھا۔ زرینہ نے بیڈ سے تکیہ اٹھا کر اس کے سر کے نیچے رکھا اور اس پر کمبل ڈالا تھا۔

مسز شاہ ساحر کو اپنے کمرے میں بٹھا کر سمجھائے جا رہی تھیں۔

"دیکھو بیٹا بچی ہے معاف کر دو اور یوں مار پیٹ کا کیا فائدہ؟ ٹھیک ہے جو عورت اپنا آپ کسی غیر مرد کے ساتھ شیئر کر کے آئے اسے اپنے گھر میں کون رکھنا چاہے گا مگر ....."

"ماما پلیز اگر آپ مجھے اوپر نہیں جانے دے رہیں تو یہاں اکیلا چھوڑ دیں۔" یک دم وہ چیخ اٹھا تھا۔

"اوکے 'اوکے۔" وہ اسے اکیلا چھوڑ کر موبائل اٹھائے باہر آ گئیں اور سنبل کو تمام تر تفصیل سے آگاہ کرنے لگیں وہ تو پہلے ہی سب سن چکی تھی۔

"ہائے ماما میں ساہیوال نہ گئی ہوتی تو اس آوارہ کا حشر اپنی آنکھوں سے دیکھ کر دل کو ٹھنڈک پہنچاتی۔" سنبل ٹھٹھا مار کر کہہ رہی تھی۔



ساحر کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ مسز شاہ نے اندر جھانک کر دیکھا۔ باتھ روم کا دروازہ بند تھا اور ساحر سامنے کے کھلے دروازے کے منظر سے ٹیرس کی ریلنگ پر کہنی ٹکائے مسلسل سگریٹ کا دھواں اڑا رہا تھا ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی اس وقت وہ کیا سوچ رہا تھا بلکہ صحیح معنوں میں دیکھ رہا تھا۔ کوئی بھی اس معاملے سے بے خبر انسان آسانی سے جان سکتا تھا وہ یقیناً "تصور ہی تصور میں اس منظر کو دہرا رہا تھا جو آج سے تین دن پہلے دیکھ چکا تھا۔

"بیٹا کیا ہو رہا ہے۔" وہ کمرے سے ہوتی ہوئی ٹیرس پر آ گئی تھیں۔

"بس یونہی۔" وہ ہنوز اسی پوزیشن میں کھڑا رہا تھا۔

"وہ موبائل جس کے بارے میں حمرہ کہہ رہی تھی گم ہو گیا ہے ذرا اس کا نمبر تو ڈائل کر کے دیکھو..... پتا تو چلے موبائل کہاں غائب ہوا ہے۔" انہوں نے بظاہر سادگی سے سوال اٹھایا تھا۔ ساحر نے قدرے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور پاس ہی ٹیبل پر دھرا موبائل اٹھا کر نمبر ڈائل کیے۔ اندر کمرے سے موبائل کی گھنٹی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ ساحر متلاشی نگاہوں سے

اندر دیکھتا ہوا آیا تھا۔ تبھی حمرہ باتھ روم سے برآمد ہوئی اس نے خاصی پریشان نظروں سے الجھ کر سائیڈ ٹیبل پر دھرے اپنے پرس کی طرف دیکھا تو ساحر نے پرس اٹھا کر اس میں موبائل کی موجودگی کا یقین کیا اور اگلے ہی لمحے وہ پرس پوری قوت سے اس کے منہ پر دے مارا تھا مسز شاہ کی آنکھوں کی چمک اور ہونٹوں کی مسکراہٹ میں جو پوشیدہ تھا وہ تو صرف حمرہ ہی دیکھ سکتی تھی ساحر تو ....

"تم تو کہہ رہی تھیں کہ موبائل گم ہو گیا ہے۔" وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا تو مسز شاہ لپک کر درمیان میں آگئیں۔

"رک جاؤ ساحر، تم میری مٹی پلید کرنا چاہتے ہو اس بڑھاپے میں مجھے خوار کرو گے۔ اس بدکردار لڑکی کے خون سے ہاتھ رنگ کر جیل جانا چاہتے ہو۔ جب ثابت ہو گیا کہ باہر مردوں سے یارانے لگائے پھرتی ہے اسے تمہارے ساتھ رہنا گوارہ نہیں تو دے دو اسے طلاق؟ یہ بھی اپنی مرضی کی زندگی گزارے اور تم بھی..... بھلا مرد کی دنیا کبھی ایک عورت پر ختم ہوتی ہے۔ اسے طلاق دے کر اس جھگڑے کو ختم کرو۔"

"ماما میں اسے طلاق دے دوں؟" ساحر نے بے حد نفرت اور طیش سے اس کی طرف دیکھا تو حمرہ کی آنکھیں خوف کی شدت سے پھیل گئیں۔ وہ اسے کچھ بھی کہنے سے روکنا چاہتی تھی۔ اس کی منت کرنا چاہتی تھی۔ اسے اپنی صفائی کچھ الفاظ کہنے تھے۔ مگر ہر عضو مفلوج ہو کر گویا سماعت بن کر رہ گیا تھا اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہی ہو۔

"نہیں ماما میں اسے طلاق نہیں دوں گا۔ یہ میرے کندھوں پر سوار ہو کر یہاں آئے اور میری غیرت اور عزت کا جنازہ نکال کر اپنی من مرضی کی زندگی جیئے میں تو اس گھر کے تہہ خانے میں قبر بنا کر اسے زندہ دفن کروں گا۔" مسز شاہ کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی وہ تو سمجھ رہی تھیں لوہا گرم ہے ذرا سی چوٹ لگا کر اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھال لیں گی۔ مگر یہاں تو الٹا ساحر ضد میں آگیا تھا۔ دوسری طرف بیڈ کراؤن پر ہاتھ رکھ کر کھڑی حمرہ کی ساکت سانسیں چلنا شروع ہو گئی تھیں۔



سندس کی ڈلیوری میں متوقع پیچیدگیوں کے باعث ڈاکٹرز نے اسے سیزیرین کا کہا تھا۔ وہ تو اتنے چھوٹے دل کی تھی کہ ذرا سی پریشانی کو اپنے اوپر سوار کر لیتی تھی۔ اب تو اس کی گھبراہٹ کا اور ہی عالم تھا۔ حالانکہ وہ روزانہ صبح شام اس سے فون پر بات کر کے ڈھیروں تسلیاں دیتیں۔ مگر اس کی پریشانی کا گراف نیچے آ کر نہیں دے رہا تھا۔ اس کا شوہر رضوان بھی بار بار آنے پر اصرار کر رہا تھا۔ امریکہ جیسے ملک میں جہاں ملازم بھی نہیں ملتے۔ آس پڑوس سے امید نہیں ہوتی وہاں سندس ڈلیوری سے پہلے گھر اور بعد میں گھر اور بچے دونوں کو کیسے سنبھالتی سو انہوں نے ساحر کو ٹکٹ کروانے کا کہہ دیا تھا۔ ایک ہفتے بعد ان کی فلائٹ تھی۔

دو ماہ سے ساحر اپنی ہی ضد پر اڑا ہوا تھا۔ جبکہ وہ چاہتی تھی کہ حمرہ نامی کانٹا اس کی زندگی سے نکال کر جائیں۔ دو تین ماہ میں ساحر ذرا سنبھل جائے تو واپس آ کر اس کی اور لیلیٰ کی شادی کر دیں۔ مگر وہ اسٹوپڈ ان کے کہے پر یقین کر کے کتنی مرتبہ اس کے بخیے تو ادھیڑ چکا تھا مگر طلاق کے نام پر اس کی بالکل الٹی لاجک مسز شاہ کی سوچ اور سمجھ سے بالاتر تھی۔ ایزی چیئر پر جھولتے ہوئے وہ مسلسل کئی گھنٹوں سے اسی مسئلے کا حل سوچے جا رہی تھیں۔ بالآخر ایک فیصلہ کر کے انہوں نے اس پر عمل درآمد کرنے کا تہیہ کیا تھا۔ صغراں کھانے کے لیے پوچھنے آئی تو فی الحال اسے منع کر کے انہوں نے حمرہ کو بلانے کا کہا تھا۔

"جی آنٹی آپ نے مجھے بلایا ہے؟" تھوڑی دیر بعد پژمردہ سی وہ ان کے سامنے تھی۔

"ہاں بیٹھو۔" انہوں نے چیئر روک کر اسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور چند لمحے خاموشی سے دیکھے گئیں۔

''کیوں اس کے ہاتھوں ضائع ہونا چاہتی ہو؟''
بالآخر انہوں نے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔
''ابھی تو میں یہاں ہوں تو بچت ہو جاتی ہے۔ اگلے ہفتے میں سندس کے پاس جا رہی ہوں' اس کا تو ہاتھ روکنے والا بھی کوئی نہیں ہو گا۔''
''آنٹی آپ میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہی ہیں؟''
جواباً وہ تڑپ کر پوچھ رہی تھی۔
''میں کیوں کر رہی ہوں؟ تمہیں نہیں پتا کیا؟ اپنی اوقات اپنی حیثیت کا اندازہ نہیں ہے جو مجھ سے یہ سوال کر رہی ہو۔'' حمرہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں انہیں دیکھتی رہی۔
''دیکھو بی بی' میرا بیٹا ایک بے کار کھلونے کو اٹھا کر گھر لے آیا۔ بچہ ہے نا ابھی' میں نے اسے کھیلنے کی اجازت دی' مگر اب اس کھلونے کو گلے کا ہار بنا لے۔ میں اسے ایسا کرنے کی اجازت ہرگز نہیں دے سکتی۔''
''آنٹی میں تو آپ کو اپنی ماں کی جگہ سمجھتی ہوں آپ میرے ساتھ یوں مت کریں پلیز۔'' اس کے پاس التجا کرنے کے سوا کچھ نہ تھا۔
''تم مجھے ماں سمجھو یا خالہ' مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں' تمہارے اسٹیٹس کی کسی لڑکی کو میں گھر میں کپڑے برتن دھونے کا کام دے سکتی ہوں۔ آفس میں چھوٹی موٹی جاب بھی دے سکتی ہوں۔ مگر اس گھر کی مالکن ...... ناممکن اس گھر کی مالکن وہی ہو گی جو میری مرضی سے آئے گی۔ یوں بھی ساحر کی منگنی سنبل کی نند سے طے تھی۔ تمہارے یہاں رہنے کی صورت میں میری بیٹی کا گھر اجڑ سکتا ہے جو کہ میں کبھی نہیں ہونے دوں گی۔ مجھے سمجھ نہیں آتی تم جیسی لڑکیاں پرائے مردوں کو قابو کیوں کرتی ہیں؟'' وہ چپ چاپ سر جھکائے سن رہی تھی۔
''میں تمہیں روز روز پٹتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔ میرے اندر بھی دل ہے۔ تمہاری بھلائی کے لیے میں نے سوچا ہے کہ تمہیں کسی اور شہر میں سیٹل کر دوں۔ تمہاری جاب لگوا دیتی ہوں' تمہاری رہائش کا بندوبست کر دیتی ہوں۔ یہ سب میں ساحر سے خفیہ کروں گی اور تمہیں اس کی غیر موجودگی میں یہاں سے نکال دوں گی۔ یہاں رہو گی تو جلد یا بدیر طلاق تو تمہیں دے ہی دے گا مگر ستا کر تڑپا کر ظلم کر کے' مجھے ڈر ہے کہیں تم اس کے ہاتھوں ختم نہ ہو جاؤ' تم پھر سے اپنا گھر آباد کر لینا' مگر ذرا ہاتھ ہولا رکھنا' کسی اکاؤنٹنٹ یا کلرک وغیرہ تک' کیونکہ حسن اتنی بڑی چیز بھی نہیں ہے کہ گدا کو شاہ بنا دے۔'' انہوں نے کافی حقارت سے مشورہ دیا تھا۔
''آنٹی میری زندگی میں کسی کی گنجائش نہیں اور آپ ایک شادی شدہ لڑکی کو یہ کیسے......''
''اور یوں بھی تھوڑے سے وقت کے بدلے تم گھاٹے میں کب رہی ہو۔ پانچ لاکھ تمہارے بھائی نے اینٹھ لیے۔ دس لاکھ حق مہر کے نام پر تم نے وصول کیے۔'' حمرہ کی آنکھوں میں حیرت اترنے لگی تھی۔
''حیران کیوں ہو رہی ہو؟ میں نے تمہارے یہاں آنے کے اگلے ہفتے ہی سب کچھ پتا کروا لیا تھا اور بھی بہت کچھ تم نے بٹورا ہو گا۔'' طنزیہ انداز میں کہتے ہوئے ان کی سوئی پھر پچھلے نقطے پر گھوم گئی تھی۔
''آنٹی میں......'' اس نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا تھا۔
''بہرحال مجھے بتا دینا' تم نے کل جانا ہو یا پرسوں' میں سارا ارینجمنٹ کر دوں گی۔'' گویا انہیں یقین تھا کہ اب وہ انکار نہیں کر سکتی۔ اور اس کے جانے کے بعد ساحر کو یقین آ جاتا کہ وہ یقیناً ''کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ اور حمرہ اپنی آنکھوں میں اترتی جل تھل کو قابو کرنے کی کوشش میں تیزی سے کچھ کہے بغیر ان کے کمرے سے نکلتی تھی۔ بھلا اس عورت کے سامنے وہ کیوں آنسو بہاتی' وہ اتنی آسانی سے اس کی تقدیر برباد کرنے جا رہی تھی۔



اس نے جن آنسوؤں کو اس بے رحم عورت کے سامنے بہنے سے روکا تھا۔ وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے

تیزی سے سسکیوں کے ساتھ رواں ہوئے تھے۔ اس نے کمرے کا دروازہ کھول کر بند کیا اور بیڈ پر گر کر اور بھی زیادہ شدت سے رونے لگی تھی۔ یہ جانے بغیر کہ ساحر گھر واپس آچکا ہے اور کمرے میں موجود ہے۔ وہ ڈریسنگ روم سے چینج کر کے نکلا تھا۔

"بہت رویا جارہا ہے۔ اتنے عرصے سے ملاقات جو نہیں ہوئی۔" اس کے گھر سے نکلنے پر پابندی تھی۔ وہ کوئی فون کرنے یا ریسیو کرنے کی بھی مجاز نہیں تھی۔ سو وہ اپنے حساب سے رونے کی وجہ سوچ چکا تھا۔ اس کی آواز پر وہ تیزی سے اٹھ بیٹھی اور ایسی بے بس نظروں سے یونہی روتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔ جو بیڈ کے دوسری طرف آکر لیٹ چکا تھا اور اسے زہر خند نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ یک دم وہ اٹھی اور بیڈ کے دوسری طرف گھوم کر پائنتی پر آن بیٹھی اور اس کے پاؤں پر ہاتھ رکھے دیے تھے۔

"ساحر میں نے کچھ نہیں کیا' میں نے کچھ بھی نہیں کیا ' پلیز میرا یقین کریں۔" اس کے پیروں پر سرسراتے حمرہ احمد کے کانپتے ہاتھوں کا اثر تھا یا اس کی آنکھوں سے گرنے والے اس کے آنسوؤں کا' وہ کچھ بے بس سا ہو کر اس کی طرف دیکھے گیا تھا۔

"میں ایسا کیسے کر سکتی تھی؟ آپ میری بات کا یقین کریں۔" اسے لگا ساحر کی آنکھوں میں کوئی نرم سا تاثر لوٹنے لگا ہے وہ ایسا کیسے کر سکتی تھی یہ تو ساحر نے بھی بہت مرتبہ سوچا تھا۔ مگر وہ آنکھوں دیکھا منظر بھلا کیسے جھٹلا سکتا تھا۔ "تو پھر وہ کون تھا حمرہ جو تمہارے ساتھ سڑک پہ کھڑے ہو کر بھی اس قدر محبت کر رہا تھا۔" وہ انتہائی اذیت سے پوچھ رہا تھا۔

"میں سنبل آپی کے ساتھ گئی تھی آنٹی نے مجھے خود......" اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ساحر کا ہاتھ گھوما اور بیڈ کے کنارے ٹکی حمرہ الٹ کر کارپٹ پر جا پڑی تھی اور پھر تیزی سے اٹھ کر روتے ہوئے باہر نکل گئی تھی دو مرتبہ ملازمہ کو بھیجنے کے بعد بھی ساحر جب ٹیبل پر نہ پہنچا تو مسز شاہ اسے خود بلانے چلی آئی تھیں۔

"ساحر بیٹا کھانا لگ چکا ہے۔ آؤنا۔" انہوں نے کمرے کا دروازہ کھول کر محبت سے پکارا اور اندر چلی آئی تھیں۔ پورا کمرہ سگریٹ کے دھوئیں سے یوں بھرا ہوا تھا۔ کہ سانس لینا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔ شادی کے بعد اس نے سگریٹ پینا بہت کم کر دیا تھا مگر اب تو لگتا تھا اس کا کھانا اور پینا بھی یہی ہے۔

"ماما کھانا بھوک نہیں ہے۔ اب کیا اس منحوس گھر میں دو گھڑی آرام بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے تو اچھا تھا سڑک کنارے کسی درخت کے نیچے پڑ کر دو گھڑی سکون کا سانس لے لیا جائے۔" اس کے چہرے پر پھیلا کرب کمرے کی فضا' اس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ وہ حق دق رہ گئی تھیں۔ "اس کلموہی کے جانے کے بعد لیلیٰ سے شادی کروں گی تو خود بخود سنبھل جائے گا۔" سست روی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے انہوں نے خود کو تسلی دی تھی۔



"میں تمہاری یہ طلاق کی رٹ سن سن کر تنگ آگئی ہوں۔ میں بھی اسے طلاق ہی دلوانا چاہتی ہوں مگر جس نے طلاق دینی ہے وہ نہیں دے رہا تو میں اب کیا کروں" مسز شاہ خاصی پریشان تھیں۔ سنبل کی کال آنے پر اس نے اپنی بات دہرائی تو وہ غصے میں اس پر الٹ پڑی تھیں۔

"آپ کچھ کر رہی ہوتیں تو وہ آوارہ شاہ ہاؤس میں دندناتی نہ پھر رہی ہوتی مجھے تو لگتا ہے آپ اور آپ کا بیٹا میرے سر پر سوکن لا بٹھائیں گے تب بھی آپ لوگوں کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"اتنا آسان نہیں ہے تمہارے سر پر سوکن لا بٹھانا 'تمہارے چچا کی پوری فیملی ہماری زمینوں پر عیش کر رہی ہے۔ پہلے میں بزنس میں کھپتی رہی اور اب ساحر اسی کا ہو کر رہ گیا ہے اور وہ لوگ سالانہ ٹھیکے کے چند لاکھ ہمارے منہ پر مار کر نواب بنے پھرتے ہیں۔ آج ہم اپنی آدھی زمینیں علیحدہ کرلیں تو ان کے ٹھاٹ باٹ ادھورے رہ جائیں گے۔ اس بات کا انہیں بھی اچھی

طرح سے اندازہ ہے۔" مسز شاہ نے سارے پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر تسلی دی تھی۔

"ماما آپ کو نہیں پتا چچا چچی کو پوتے کھلانے کی کتنی آرزو ہے۔ جب بھی چچی فون کرتی ہیں اسی موضوع کو لیے ہوئے ہوتی ہیں۔ باتوں باتوں میں کتنی بار وہ مجھے جتا چکی ہیں کہ اتنا عرصہ کوئی انتظار نہیں کرتا۔"

"تو ان سے کہو جو دو کنوارے پھرتے ہیں ان کا بندوبست کریں اور اپنی خواہش کو پورا کریں۔"

"اور کل کلاں کو زبیر یہ سب کہنے لگے تو انہیں کیا جواب دوں گی؟" سنبل نے تیکھے انداز میں دریافت کیا تھا۔

"آپ نے اس آوارہ سے بات نہیں کی اسے ڈرائیں دھمکائیں....."

"میں اپنی طرف سے ہر کوشش کر چکی ہوں اسے ڈرایا بھی ہے صاف صاف بتا دیا ہے کہ بی بی تم یہاں سے بوریا بستر گول کرو تو یہی تمہارے حق میں اچھا ہو گا۔ جتنی اس نے مار کھائی ہے اور پھر بھی یہاں رہ رہی ہے مجھے نہیں امید کہ یہ اس طرح گھر چھوڑنے پر تیار ہو گی۔" انہوں نے آخر میں حمرہ کے رویے کا تجزیہ کر کے ناامیدی کا اظہار کیا تھا۔

"گھر تو اسے چھوڑنا ہی ہو گا ماما مگر پھر کچھ اور سوچنا پڑے گا۔" سنبل نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ماما میں نے وکی سے بات کی ہے۔ اس کے نزدیک یہ کوئی پرابلم ہی نہیں ہے۔ بس ذرا ہاتھ کھلا رکھنا پڑے گا۔" دو روز بعد سنبل ایک نئے پلان کے ساتھ ماں کے روبرو تھی۔

"وکی کیا کرلے گا؟" مسز شاہ نے الجھ کر پوچھا تھا۔

"وکی بہت کچھ کرلے گا بلکہ اب تو سب کچھ وہی کرلے گا۔" سنبل نے جوش و خروش سے جواب دیا اور پھر وہ انہیں اپنا سارا پلان بتاتی چلی گئی۔

"نہیں، نہیں سنبل ایسا ممکن نہیں ہے۔ اگر ساحر کو پتا چل گیا تو....." مسز شاہ اس کی بات سن کر کانپ اٹھی تھیں۔

"ساحر کو کیسے پتا چلے گا ہم پہلے کی طرح یہ کام پوری ہوشیاری سے کریں گے۔ بلکہ ہم نے جو کچھ پہلے کیا ہے۔ اس پر بھی ساحر کی یقین کی ایک بار پھر مہر لگ جائے گی۔ اور وہ اپنے انتخاب کو غلط قرار دے کر ہمیشہ کے لیے بھول جائے گا۔ اس طرح وہ آسانی سے لیلیٰ کے لیے بھی مان جائے گا۔"

"ہوں۔" سنبل کے پر یقین انداز نے انہیں بھی سوچ میں ڈال دیا تھا۔

"مگر ایک بات کا خیال رکھنا ہو گا یہ کام کسی ایسے روز ہونا چاہیے جب ساحر اس شہر میں موجود نہ ہو۔"

"شہر تو کیا میں اسے ملک سے ہی باہر بھیج دوں گی۔" مسز شاہ نے اطمینان سے جواب دیا تھا۔ ساحر سنگاپور میں اپنے آفس کی ایک برانچ کھولنا چاہتا تھا۔ پہلے بھی وہ اسی سلسلے میں گیا تھا مگر پھر وہاں کا ٹور ادھورا چھوڑ کر واپس آنا پڑا تھا' مسز شاہ نے اسے اکسایا کہ وہ ان کے امریکہ جانے سے پہلے وہاں کا کام مکمل کر آئے۔



"آنٹی یہ میرا دوست فرحان باقی ہے۔" مسز شاہ سنبل کے بلاوے پر اس کے گھر آئی ہوئی تھیں۔ کیونکہ اس نے وکی کو ٹائم دے رکھا تھا۔

انہیں وہاں گئے تھوڑی دیر گزری تھی جب وکی ایک جھاڑ جھنکار سی داڑھی اور کندھوں تک آتی الجھی ہوئی لٹوں والے شخص کو لیے چلا آیا تھا۔ وکی یونیورسٹی میں سنبل کا کلاس فیلو تھا بظاہر سوٹڈ بوٹڈ اور ہینڈسم نظر آنے والا بروکن فیملی کا یہ فرد معاوضہ لے کر کوئی بھی کام کرنے کے لیے تیار رہتا تھا اسی طرح اس کا تعلق مختلف تنظیموں اور کرمنل لوگوں سے بھی تھا۔ وہ ضرورت پڑنے پر ان کے لیے کام کر بھی دیا کرتا تھا اور ان سے کام لے بھی لیا کرتا تھا۔

فرحان باقی ہی وہ شخص تھا جو اس کے دعوے کے مطابق حمرہ کو شاہ ہاؤس سے غائب کر کے ایسی جگہ پہنچا سکتا تھا جہاں کبھی پلٹ کر اس کی رسائی ساحر تک نہ ہو سکے۔ ساحر کل سنگاپور جا رہا تھا اور سنبل کا اصرار تھا کہ اس کے سنگاپور پہنچنے کے روز ہی اسے حمرہ کے فرار کی اطلاع مل جانی چاہیے تاکہ وہ یہی سمجھے کہ حمرہ شدت سے موقع کی تلاش میں تھی۔

"آئم سوری میڈم چیک نہیں کیش چلے گا۔" جونہی مسز شاہ نے تین لاکھ کا چیک کاٹ کر اس کے سامنے رکھا فرحان باقی معذرت کر کے کہنے لگا تھا۔

"آج تو سنڈے ہے کیش ڈیلیور کرنا ہمارے لیے مشکل ہو گا۔" انہوں نے مجبوری بیان کی تھی۔

"ہماری بھی مجبوری ہے میڈم۔ ہمارے دھندے میں ایڈوانس پے منٹ ہوتی ہے اور وہ بھی نقد۔" باقی نے شانے اچکا کر کہا تھا۔

"اوکے میں کل دس بجے تک آپ کو تین لاکھ کیش دے دوں گی۔" مسز شاہ نے رضامندی ظاہر کی تھی۔

"ٹھیک ہے پھر یہ کام پرسوں ہی ہو گا۔"

"نہیں نہیں یہ کام کل ہی ہونا چاہیے۔" سنبل فوراً" بول اٹھی تھی۔

"باقی صاحب آپ جب کل وہاں آئیں گے تو رقم وصول کرنے کے بعد لڑکی اٹھایئے گا۔"

"میڈم میں اپنے دو آدمیوں کو ساتھ لے کر آؤں گا۔ انہیں آج ہی ایڈوانس پے منٹ کرنی ہو گی۔ وہ پچاس پچاس ہزار میں کہاں سے دوں گا۔"

"باقی بہت نکھرا ستھرا پیس ہے۔ باہر لے جا کر اس کی تگڑی رقم وصول کر سکو گے۔" وکی نے اس کی طرف جھک کر کہا تھا۔

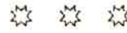
"تگڑی رقم وصول کرنے کے لیے تگڑی رقم خرچ بھی کرنا پڑتی ہے یہ کام اب اتنا آسان نہیں رہا۔" اس نے ہچکچاہٹ ظاہر کی تھی۔

"جانے بھی دو میں تمہیں کل ساری رقم ملنے کی گارنٹی دیتا ہوں۔" وکی نے اصرار جاری رکھا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" تھوڑی سی سوچ و بچار کے بعد وہ مان گیا تھا۔

"میڈم' ہمارے طے شدہ کام میں دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ ہم کام نہ کریں یا نہ کر سکیں۔ اس صورت میں ہم ایڈوانس پے منٹ واپس کرتے ہیں۔ دوسری صورت میں آپ کام کروانے کا ارادہ تبدیل کر دیں یا صورت حال کے موافق ماحول فراہم نہ کریں۔ اس صورت میں ہماری پے منٹ یقینی ہوتی ہے۔"

باقی نے اٹھنے سے قبل ان پر واضح کیا تھا اور وہ بھلا کیوں کوئی اعتراض کرتیں انہیں تو ہر صورت باقی سے کام لینا ہی تھا۔



سکون آور میڈیسن لینے کے باوجود وہ ساری رات ٹھیک سے سو نہیں سکی تھیں۔ ان کے دل کو بے چینی نے گھیر رکھا تھا ساحر نے صبح سنگاپور جانا تھا یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اہم بات تو یہ تھی کہ کل حمرہ کو بھی اس گھر سے بے دخل ہونا تھا۔ اگر — ساحر واپس آکر اسے ڈھونڈنے کی کوشش کرتا یا ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو جاتا' تب ان کی حقیقت چھپی رہے گی؟ ان کے ذہن میں بار بار خیال آرہا تھا۔ ساحر یقینی طور پر یہ سمجھتا کہ وہ کسی کے ساتھ اپنی مرضی سے فرار ہوئی ہے۔ پھر وہ اسے ڈھونڈنے کی کوشش کیوں کرے گا؟ اپنے خیال کو وہ خود ہی جھٹلاتیں۔ پھر باقی نے یقین دلایا تو ہے کہ چند گھنٹوں میں ہی وہ اسے اس شہر سے دور لے جائے گا۔

صبح جلدی اٹھ کر وہ لاؤنج میں آبیٹھیں اور ساحر کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگیں۔ وہ رات کو دیر سے واپس آیا تھا اس لیے ابھی تک سو رہا تھا۔ نو بجے انہوں نے ملازمہ کو اسے جگانے کے لیے بھیجا تھا۔

"صاحب اٹھ چکے ہیں۔" صغراں نے نیچے آکر بتایا تو وہ ایک بار پھر بے چینی سے تمام صورت حال پر غور کرنے لگی تھیں۔

"گیارہ بجے کی فلائٹ ہے اس نے ابھی ناشتا بھی نہیں کیا۔" صغراں کو ڈرائیور کو بلانے کا کہہ کر انہوں نے وال کلاک پر نظر ڈالی۔

"السلام علیکم" تب ہی وہ تیار ہو کر چلا آیا تھا۔ مگر اس کے سلام کا جواب دینے کے بجائے ان کی نظریں سیڑھیوں سے نیچے اترتی حمرہ پر بے اختیار رک گئی تھیں۔ جو خاصی فریش لگ رہی تھی۔

"حمرہ تمہیں چھوڑنے ایئرپورٹ جا رہی ہے۔" بدحواس سا ہو کر انہوں نے ساحر سے سوال کیا تھا۔

"نہیں میرے ساتھ جا رہی ہے۔" سلائس اٹھاتے ہوئے ساحر کا سپاٹ سا جواب ان کے حواس مزید مختل کر گیا تھا۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے ساحر وہاں تم کام کرنے جا رہے ہو۔" انہوں نے اس کے فیصلے سے باز رکھنا چاہا تھا۔

"اس لیے تو ساتھ لے کر جا رہا ہوں یہ یہاں رہے گی تو میں وہاں کام نہیں کر پاؤں گا ماما' اور میں اسے سیریں کروانے نہیں لے جا رہا' ہوٹل کے کمرے میں پڑی رہے گی۔" حمرہ اپنے متعلق ہونے والی گفتگو سے بظاہر انجان بریڈ ہاتھ میں پکڑے سوچ رہی تھی کہ اس کا کرنا کیا ہے؟

"وہ بھی خاصی موٹی آسامی لگ رہا تھا۔ یہاں تو پھر بھی میں موجود ہوں اگر وہ وہاں پہنچ گیا تو تب بھی تم بے خبر ہی رہو گے۔" ساحر نے ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ زور سے پٹخا اور تیز تیز قدم اٹھاتا باہر کی طرف چلا تھا۔ حمرہ بھی جلدی سے اٹھ کے پیچھے چلی تھی۔

"یا خدایا۔" مسز شاہ سر پکڑ کر ٹیبل پر تنہا بیٹھ گئیں۔



اونچی پہاڑی پر سفید کپڑوں میں ملبوس وہ شخص اس کی طرف پیٹھ کیے بیٹھا تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ خود کہاں ہے۔ مگر اس کی پوری توجہ اس شخص کو پہچاننے پر مرکوز تھی۔ وہ اس کا چہرہ دیکھنا چاہتا تھا وہ تیزی سے بھاگ کر اس کے سامنے پہنچا مگر ایک مرتبہ پھر اسے اس کی پیٹھ دکھائی دے رہی تھی۔ تب اسے یاد آیا جب بھی وہ اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرتا وہ اس کی طرف پیٹھ کر لیتا تھا۔ اس خیال کے ساتھ اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اس نے اٹھ کر دیکھا سب محو خواب تھے۔ وہ ایک مرتبہ پھر خواب کو ذہن میں لاکر کچھ یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ہمیشہ اس خواب کو دیکھنے پر اسے لگتا تھا۔ وہ اس کے بابا ہیں۔ جو اس کی طرف سے پیٹھ کر لیتے ہیں۔ وہ یقیناً" اس سے ناراض

ہیں اور ناراض کیوں نہیں ہوں گے؟ یہ خواب وہ تب سے دیکھ رہا تھا جب سے رانی گئی تھی۔

"کیا ہے یار تم تو بالکل ہی دل چھوڑ بیٹھے ہو، رب بہتر کرے گا ان شاءاللہ۔" وہ خاصی دیر سے دیوار سے ٹیک لگائے سامنے سے آنے والی ہلکی ہلکی روشنی کو ساکت نظروں سے دیکھ رہا تھا جب انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر مدھم سرگوشی نما آواز میں اسے تسلی دی تھی نہ جانے کب آنکھ کھلنے پر وہ اس کے قریب آکر بیٹھا تھا۔

"ہاں رب تمہارے لیے بہتر کرے گا۔ تم نے اپنی بہن کا گھر بسانے کے لیے گردہ بیچ دیا تھا، تمہاری چھوٹی بہن تمہارا معصوم بھائی، تمہاری ماں تمہارے لیے دعائیں کریں گے۔" اور رب ان کی دعائیں مستجاب کرے گا۔ مگر میں کس برتے پر بہتری کی امید رکھوں۔" وہ بے آواز سوچ رہا تھا۔

"میں نے لالچ میں آکر اپنی یتیم بہن کو بیچ دیا تھا۔ اپنے بابا کی رانی بیٹی کو میں نے یوں گھر سے نکالا تھا جیسے کوئی طاقت ور بادشاہ اپنی کمزور رعایا کو جلاوطن کردے اس کے آنسو مجھے ان سلاخوں سے رہا ہونے دیں گے کیا؟" ملائیشیا میں غیر قانونی طور پر داخل ہونے والے آٹھ افراد کا گروہ پکڑا گیا تھا۔ جن میں اشرف بھی شامل تھا۔ ان افراد میں زیادہ تر لوگ وہ تھے جو اپنے گھر والوں کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے تھے۔ انہیں غربت کی زندگی سے نکالنے کی خواہش رکھتے تھے۔ اشرف واحد تھا جسے یہ اسیری اپنے گناہوں کا پیش خیمہ لگ رہی تھی۔ جس کا ضمیر اسے چین نہیں لینے دے رہا تھا۔

"میں آپ کی بہن نہیں ہوں آپ میرے بھائی نہیں ہیں کیا؟" وہ کئی بار جاگتی آنکھوں کے سامنے آنسوؤں سے لبریز وہی سوال لیے آن کھڑی ہوئی جو اس نے آخری روز کیا تھا۔ روز جسے سن کر ایک لمحے کے لیے اشرف کا دل بھی پسیج گیا تھا۔ امجد اس کا چھوٹا بھائی اس کے بعد کبھی اس کی شکل دیکھنے کا روادار نہیں رہا تھا۔ ملائیشیا روانہ ہونے سے چند روز قبل جب اس نے زبردستی کسی بات پر اس سے مخاطب ہونے کی کوشش کی تھی، تو وہ لکڑی اٹھا کر اسے مارنے کو دوڑا تھا۔

"میں بہت دفعہ تم سے کہہ چکا ہوں مجھ سے کلام مت کیا کرو۔ کسی روز تمہارا خون کر بیٹھوں گا۔" وہ تو اس کے انداز پر حق دق رہ گیا تھا جبکہ اماں درمیان میں آگئی تھیں۔

"اشرف تو اس کے منہ نہ لگا کر، وہ اس کی بہت سگی تھی نا۔" انہوں نے خوفزدہ ہو کر اسے ٹوک دیا تھا۔

دین چاچا نے بتایا تھا کہ وہ بہت خوش ہے وہ ایک مرتبہ گاؤں آئی تھی مگر اس سے نہیں ملی تھی۔ کیا میں کبھی رانی سے مل سکوں گا؟ میں اس سے معافی مانگ سکوں گا؟ پتا نہیں وہ کہاں ہوگی۔ اس نے بے حد دل گرفتی سے سوچا تھا۔ اس سے وہ نہیں جانتا تھا کہ رانی اس سے چند میل پانی کی مسافت پر یہیں کہیں انہی فضاؤں میں سانس لے رہی ہے۔



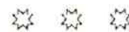
وہ ہوٹل کی ساتویں منزل کے ایک کمرے کی کھڑکی سے دور تک نظر آتے پانی میں تیرتے بحری جہازوں اور کشتیوں کو ساکت نگاہوں سے دیکھ رہی تھی یا پھر وہاں سے نظر اٹھا کر دائیں طرف ساحلی پارک میں گھومتے پھرتے سیاحوں کو دیکھنے لگتی۔ سنگاپور سے آنے کے پہلے روز جب ساحر نے باہر جاتے ہوئے اسے بتایا کہ وہ کمرہ باہر سے لاک کر کے جائے گا تو اس کا دم بے حد گھٹنے لگا تھا۔ پھر اس کو سنبل کی نظریں اور مسز شاہ کا رویہ یاد آیا اور ساس، نندوں کے جلا دینے کے واقعات نظروں کے سامنے پھرنے لگے تو اس نے خود کو تسلی دے ڈالی تھی۔

مگر ساحر کے جانے کے بعد کوشش کے باوجود وہ سونے میں کامیاب نہ ہو سکی تو ٹی وی لگالیا مگر آوازیں گڈمڈ سی ہوتی محسوس ہونے لگی تھیں۔ تب وہ کھڑکی کے پاس آن کھڑی ہوئی اور یہ کام چند گھنٹے گزارنے کے لیے اسے مناسب لگنے لگا تھا۔ ذرا سی کھٹک پر اس نے مڑ کر دیکھا ساحر دروازہ کھول کر اندر داخل ہو رہا

تھا۔ اس نے اپنا سر دوبارہ کھڑکی کے شیشے سے ٹکادیا تھا۔ اس پر نظر ڈالتے ہوئے ساحر نے اس کی آنکھوں کا خالی پن بہت شدت سے محسوس کیا تھا۔ اس پل وہ کتنی تنہا اور اداس لگ رہی تھی۔ سو وہ خاموشی سے اسے دیکھے گیا۔ کبھی اس کا دل چاہتا تھا جہاں حمرہ احمد پاؤں رکھے وہاں وہ پھول بچھادے۔ اب بھی شاید اس کے دل کا موسم وہی تھا مگر وہ اس کے دل پر پاؤں رکھ کر گزری تھی۔ اس کی عزت' اس کی غیرت کو روند کر' اب ساحر شاہ خود سے بدل چکا تھا سو وقت کو حمرہ پر بدلنا ہی تھا۔

''میں تمہیں کل راشد کی طرف چھوڑ دوں گا۔'' پتا نہیں کیوں اس کے منہ سے نکل گیا تھا۔ راشد اس کا دوست تھا پہلی بار چند ماہ پہلے جب حمرہ ساحر کے ساتھ سنگاپور آئی تھی تو راشد کی بیوی مہرین نے اسے بہت بھرپور کمپنی دی تھی۔

''اس کی ضرورت نہیں' آپ اپنا کام کریں میں یہاں پریشان نہیں یوں کم از کم محفوظ تو ہوں۔'' ساحر کو اس کا جواب بہت عجیب لگا تو وہ اس کے الفاظ پر غور کرنے لگا تھا پھر سر جھٹک کر واش روم کی طرف بڑھ گیا۔



ساحر کو سنگاپور میں کچھ زیادہ ہی دن لگ گئے تھے۔ جب تک وہ واپس آئے مسز شاہ سندس کے پاس جاچکی تھیں۔ وہ ان کے امریکہ جانے کی خبر سن کر بے حد خوش تھی۔ مگر واپس آکر اس نے جانا امریکہ بھلا کون سا دور ہے۔ یا اگر نظروں سے دور ہے بھی تو سماعتوں سے بے حد قریب اس قربت کی بدولت وہ ہر دوسرے روز اس کے دل و دماغ میں جو زہر حمرہ کے خلاف انڈیلا کرتی تھیں۔ اس کی بدولت اس کے لیے نفرت اور اذیت کا باب ہمہ وقت کھلا رہتا تھا۔ بھلا ایسے منظر کو یاد دلانا کون سا مشکل تھا۔ جو ساحر نے بنفس نفیس اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔

اور وہ تو باتوں باتوں میں بہت سے ایسے مناظر کی تصویر کشی کر جاتی تھیں جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ مگر حمرہ زیر عتاب ضرور رہتی۔ ایسے میں اس کا دل چاہتا تاروں سے مزین اس ننھے آنلے کو اٹھا کر کہیں دور پھینک آئے' جہاں ساحر کی سماعتوں تک اس کی ماں کی آواز نہ پہنچ سکے۔ مگر یہ اس کے اختیار میں کہاں تھا۔ اس کے اختیار میں تھا صبر کرنا اور وہ بے بسی سی خاموشی کے ساتھ صبر اور برداشت سے کام لیتی آرہی تھی رب سے دعا کے ساتھ کہ وہ اس کے گھر کو ٹوٹنے سے بچالے۔ وہ چائے کا کپ لے کر کچن سے نکلی تو سنبل مرکزی دروازے سے اندر داخل ہو رہی تھی۔ حمرہ چہرے پر کوئی بھی خیر مقدمی تاثر لائے بغیر خاصے اطمینان سے صوفے پر جا بیٹھی اور ٹی وی آن کر کے چائے کے سپ لینے لگی تھی۔

''اوہ ابھی تک یہیں ہو' میں نے سنا تھا تم کسی لمبے ٹور پر جانے والی ہو' ماما نے تمہیں خاصی برائٹ آفر دی تھی؟'' سنبل اسے دیکھ کر گویا حیران ہوتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''نہیں تو۔ ہاں وہ ساحر کہہ رہے تھے امریکہ جانے کا' سندس کی گڑیا کو دیکھنے کا' میں نے انکار کردیا۔ مجھے ان لوگوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' ان ماں بیٹی نے اگر اسے برباد کرنے کا سوچ بھی لیا تھا تو وہ کیوں خود کو کمزور ظاہر کرتی پچھلے چند ماہ میں اسے یہ اندازہ تو ہوگیا تھا کہ ساحر اسے اپنی زندگی سے بے دخل کرنے والا نہیں ہے سو اس نے انہیں باور کرانے کا سوچ لیا تھا کہ ان کی ہر کوشش بے کار ہے۔ سو اتنے اطمینان سے جواب دیا کہ سنبل کچھ حیران سی رہ گئی تھی۔

''ساحر تو تمہیں گھاس نہیں ڈالتا یہاں کیوں ٹکی ہوئی ہو؟''

''یہ ڈش ساحر نے کبھی ٹرائی نہیں کروائی؟'' اس نے مصنوعی چونک کر سنبل کی طرف دیکھا تھا۔

''تم نے سب کچھ ساحر کے ساتھ ہی ٹرائی کیا ہوگا؟'' سنبل نے اس کی پچھلی زندگی پر چوٹ کی تھی۔

''آف کورس کسی بھی لڑکی کی زندگی میں دو لوگ اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ایک اس کا باپ اور دوسرا اس

کا شوہر' میرے باپ نے میری بہترین تعلیم و تربیت کی اور میرے شوہر نے دنیا کی ہر خوشی ہر آسائش میرے قدموں میں ڈھیر کردی۔" حمرہ نے بہت اطمینان سے جواب دیا تھا۔

"اور بھائی؟" سنبل نے طنز سے آنکھیں نچائیں "اس نے تمہارے ٹکے وصول کیے۔" حمرہ کے چہرے پر ایک لحظے کے لیے سایہ در آیا مگر پھر وہ سنبھل گئی تھی۔

"بھائی بڑا سیکنڈری سا رشتہ ہوتا ہے۔ یہی دیکھ لیں کہ آپ کے بھائی اپنی بہن کا گھر بچانے کے لیے اپنی محبت کی قربانی نہیں دے سکے۔" اس نے لاپروائی سے مسکرا کر کہا تو سنبل سلگ اٹھی تھی۔

"کون سی محبت؟ وہ جو میں نے ناک کے راستے نکال دی ہے۔" وہ استہزائیہ انداز میں پوچھ رہی تھی۔

"غلط فہمی ہے آپ کی' اگر آپ نے ان کی محبت ناک کے راستے نکال دی ہوتی تو آج میں اس گھر کی مالکن نہ بنی بیٹھی ہوتی۔" اس نے تفاخر سے جواب دیا تھا۔

"مائی فٹ۔۔۔ مالکن؟ بہت جلد تم اس گھر کے باہر جھاڑو دینے والوں کی کیٹگری میں آجاؤ گی۔" اس نے تنفر سے ابرو اچکا کر کہا تھا۔

"جی نہیں بہت جلد میں گھر کی بلا شرکت غیرے مالک بن جاؤں گی اگرچہ وہ تو میں ابھی بھی ہوں۔"

"صغراں ذرا میرے کپڑے استری کر دینا۔" اس نے اٹھتے ہوئے آواز لگائی تھی۔

"ویسے آپی وہ برائٹ آفر آپ کے لیے بہت سوٹ ایبل ہے۔ آپ اپنے نام نہاد شوہر سے طلاق لے کر کوئی نیا بر ڈھونڈیں اور پھر گھر بنائیں۔ یہ ادھر ادھر کیوں رلتی پھرتی ہیں۔" زبیر بزنس کے بہانے ہفتے میں پانچ دن کراچی رہتا تھا اور باوجود اصرار کے سنبل کو ساتھ لے جانے پر تیار نہیں ہوا تھا سو اس نے جاتے جاتے چوٹ کر دی تھی۔ وہ آخری سیڑھی پر تھی اور سنبل پہلی سیڑھی پر نیچے ریلنگ پر ہاتھ جمائے اس کے پراعتماد انداز کو حیران ہو کر دیکھ رہی تھی۔ حمرہ کی آخری بات گویا اس کے تن بدن کو آگ لگا گئی تھی۔

"ٹھہرو میں تمہیں بتاتی ہوں گھر اور بر کا کھیل۔۔۔"

وہ یک دم پرس پھینک کر تیزی سے اوپر بڑھی تھی۔ انداز ایسا تھا جیسے اسے بھنبھوڑ کر رکھ دے گی۔ حمرہ غڑاپ سے کمرے کے اندر غائب ہوئی اور دروازہ لاک کر لیا تھا۔

"دو ٹکے کے معمولی ڈرائیور کی بچی۔۔۔ نکل باہر میں تمہیں بتاتی ہوں آج میں تمہارا ایسا حشر کروں گی کہ تم یاد رکھو گی۔ گھٹیا لڑکی تمہاری جرات کیسے ہوئی مجھ سے اس طرح بات کرنے کی۔۔۔" وہ زور زور سے دروازہ پیٹنے لگی تھی۔

"کھولو دروازہ ورنہ میں دروازہ توڑ دوں گی۔' نیک محمد۔۔۔ نیک محمد' صغراں' اوپر آؤ۔" اس نے زور و شور سے دروازہ بجانے کے ساتھ نوکروں کو پکارا تھا۔

صغراں تو ان دونوں کی ساری بحث سن چکی تھی جبکہ نیک محمد بھی کچن میں کچھ نہ کچھ صورت حال سے باخبر تھا ہی۔۔۔ سو اس نے کچن سے نکل کر اوپر سے آتی آوازیں سنیں اور پھر سے کچن میں چلا گیا تھا یہ مالکوں کا جھگڑا ہے ہم ان کے بیچ کیوں پڑیں صغراں بھی برتن دھونے کے بہانے کچن میں گھس گئی تھی۔ حمرہ جو بڑے دھڑلے سے سنبل کی ہر بات کا جواب دیتی رہی تھی اب اس کی دھمکیاں سنتی مسلسل پریشان ہوتی خاموشی سے آنسو بہا رہی تھی سنبل کا بس نہیں چل رہا تھا کہ دروازہ توڑ کر اندر گھس آئے اور اس لڑکی کا حشر نشر کر ڈالے جسے وہ یہاں سے نکالنے کی ہر ترکیب آزما چکی تھی' مگر وہ اس کے مستقبل کے لیے مستقل خطرے کا نشان بنی ہوئی تھی۔

"اتنے ہی گر آتے ہیں مردوں کو قابو کرنے کے تو کسی بازار میں جا کر بیٹھو خوب کمائی کرو گی' اب کھولو نا دروازہ' میں بھی ذرا دیکھوں تمہیں گھر کی مالکن میں تمہارے چہرے پر تیزاب پھنکوا دوں گی' تمہارا ایسا حشر کروں گی کہ تم یاد رکھو گی۔" سنبل کا غصہ ٹھنڈا ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ وہ مستقل دروازہ بجاتے ہوئے اول فول بک رہی تھی۔ سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ

ابھری جسے کسی ملازم کا گمان کر کے اس نے نظر انداز کر دیا تھا اور جب وہ چاپ اس کے قریب آکر تھمی تو اس نے مڑ کر دیکھا اور اس کے ہوش اڑ گئے تھے ساحر بے حد حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"ساحر تم... تم دیکھو اس چیپ لڑکی کو..."

"یہ کیا ہو رہا ہے آپی؟" اس نے سنبل کی بات مکمل ہونے سے پہلے سرکشی سے سوال کر ڈالا تھا۔ ساحر کی آواز سن کر حمرہ نے تیزی سے اٹھ کر دروازہ کھولا تھا۔

"میں نے یونہی ادھر کا چکر لگا لیا مگر اس تھرڈ کلاس لڑکی کو دیکھو..."

"پلیز آپی اسٹاپ دس نان سینس ٹاک۔" اس نے سابقہ انداز میں اسے ٹوکا اور نظر بیڈ پہ بیٹھ کر آنسو صاف کرتی حمرہ پر ڈال کر ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گیا تھا۔ سنبل دروازے کے بیچوں بیچ کھا جانے والی نظروں سے حمرہ کو دیکھتی ہوئی ساحر کے واپس آنے کا انتظار کر رہی تھی۔

"ساحر اس نے مجھے کیا کہا سنو تو..."

"دوسروں کے گھر جا کر اس قسم کی فضول سچویشن کری ایٹ کرنے کی کوئی تک نہیں بنتی۔" اس نے سنبل کی بات کاٹ کر ایک مرتبہ پھر سخت انداز میں کہا تھا۔

"ساحر تم اس بدکردار لڑکی کی خاطر میری توہین..."

" I say Justshatup " وہ اتنے زور سے دھاڑا کہ حمرہ بے ساختہ ہی اپنی جگہ سے ڈر کر کھڑی ہو گئی تھی۔ سنبل غصے سے جھٹکا کھا کر واپس مڑی تھی۔



رات کا جانے کون سا پہر تھا۔ جب بجلی کی شدید کڑک نے اسے آنکھیں کھولنے پر مجبور کیا تھا۔ شام سے ہی موسم خاصا خراب تھا' مگر اس وقت بارش کی تیز بوندیں کھڑکی کے شیشوں پر دستک دے رہی تھیں۔ کمرے میں چھائے اندھیرے سے گھبراہٹ محسوس ہونے لگی تو وہ اندازے سے بیڈ کے دوسری طرف لگے سوئچ بورڈ سے لائٹ آن کرنے کے لیے اٹھی تھی جب بورڈ کے قریب پہنچتے پہنچتے اس کا پاؤں ٹیبل سے ٹکرایا اور زوردار آواز کے ساتھ وہ منہ کے بل گرتے گرتے بچی تھی۔

"کیا ہے؟" ساحر کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔

"وہ میں لائٹ آن کرنے لگی تھی۔" اس نے گھبرا کی وضاحت کی۔

"لائٹ گئی ہوئی ہے۔" وہ شاید پہلے سے ہی جاگ رہا تھا کیونکہ اس کی آواز سے نیند کا تاثر غائب تھا وہ اندازے سے چلتی ہوئی دوبارہ بیڈ پر آئی' مگر یونہی بیٹھی رہی۔ ایسا موسم اسے اپنی زندگی کے بے حد تلخ ترین دن کی یاد دلا دیتا تھا۔ بجلی کی دل دہلا دینے والی کڑک' خوف ناک ہوا کی شائیں شائیں اور کھڑکی کے شیشوں پر برستی بوندوں کا ارتعاش سنتی وہ کہیں پیچھے چلی گئی تھی۔

یادوں کے قافلے ذہن پر دستک دینے لگے تو اسے محسوس ہی نہ ہوا کب آنکھوں کی سطح گیلی ہوئی اور کب دل کا بوجھل پن گالوں پر اترنے لگا تھا۔ وہ اندھیرے میں بے آواز کافی دیر تک روتی رہی۔ اچانک ہی کمرے کا اندھیرا نائٹ بلب کی مدھم روشنی سے جگمگا اٹھا تھا۔ ساحر اس کی طرف آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ شاید روشنی کے احساس کے تحت اس نے آنکھیں کھولی تھیں۔

"کیوں رو رہی ہو؟" وہ کچھ حیرت اور طنز سے پوچھ رہا تھا۔ اس کا سوال سیدھا سادا ہوتا تو وہ جواب نہ دیتی مگر...

"یہ موسم بہت خراب ہے۔ ایسے ہی ایک موسم میں بابا مجھ سے دور چلے گئے تھے۔" وہ اس کے چہرے پر بکھرا کرب' آنسو اور دل گرفتی کو دیکھتا رہا۔ اس کا ایک ایک نقش کسی اذیت کا داستان گو بنا ہوا تھا۔ اگلے پل ساحر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور خود سے قریب کیا تو حیرت سے گویا اس کے آنسو بھی تھم

گئے تھے۔ بجلی کڑک رہی تھی۔ بارش کی بوندیں کھڑکی کے شیشوں پر تڑپ رہی تھیں' مگر حمرہ احمد اس سب سے بے نیاز ساحر شاہ کی مہربان پناہ میں سمٹ کر اپنی زندگی میں دوبارہ سے در آنے والی کچھ خوش گمان آہٹیں سن رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

کسی مہربان لمحے نے ساحر شاہ کے دل کو بدلا تھا اور حمرہ احمد کے دل نے اس تبدیلی کے دائمی رہنے کی خواہش کی تھی' مگر اس کی یہ خواہش سراسر کی خام خیالی ثابت ہوئی۔ اگرچہ اس کا رویہ حمرہ کے ساتھ خاصا بہتر ہو گیا تھا۔ وہ اس سے کھانے ناشتے کا پوچھتی تو سنجیدہ سے انداز میں جواب دے دیا کرتا تھا اس کے سامنے سرو کرکے وہ خود بھی ٹیبل پر بیٹھ جاتی تھی۔ اس کے علاوہ بھی ضرورت کی بات چیت کر لیا کرتی۔ اگرچہ ان کا تعلق ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہو گیا تھا' مگر حمرہ کے لیے یہی غنیمت تھا کہ ساحر کی سلگتی آنکھیں بات بے بات اس کے لیے شرارے نہیں برساتی تھیں اور وہ بھی گھنٹوں ٹیرس پر بیٹھ کر خود کو سگریٹ کے دھوئیں میں نہیں جلاتا تھا۔

ہاں اس کا انداز اب بھی ہمہ وقت پر سوچ ضرور رہتا اور چند دنوں میں حمرہ نے بارہا اس کی غلط فہمی کو دور کرنے کا سوچا تھا' مگر بات کہاں سے شروع کرے کہ وہ پہلے کی طرح بھڑ نہ جائے اور جو گنجائش اس کے لیے ساحر نے اپنی زندگی میں نکالی ہے۔ وہ بھی معدوم ہو جائے۔ اسے بات کو مناسب طریقے سے شروع کرنے کا کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ دوسری طرف گھر کی فل ٹائم ملازمہ صغراں مسز شاہ کی مخبر ہونے کا فریضہ بھی سنبھالے ہوئے تھی اس روز ساحر دوپہر کو جلدی گھر واپس آیا اور کھانے وغیرہ کا منع کرکے سو گیا تھا۔ خاصی دیر کے بعد اٹھ کر اس نے حمرہ کو چائے کے ساتھ سر درد کی ٹیبلٹ لانے کو کہا تھا۔ تب ہی فون کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ نیک بابا اس ٹائم تھوڑی دیر کے لیے کوارٹر میں چلے جاتے تھے۔ وہ کچن میں اطمینان سے چائے بناتی رہی کہ اسے تو فون سننے کی اجازت ہی نہیں تھی۔ ساحر گھنٹی کی آواز سن کر نیچے آیا تھا۔

"ساحر بیٹا چند روز پہلے میں نے مسز کاظمی کی عیادت کے لیے انہیں فون کیا تھا۔ انہوں نے مجھ سے ایک بات کہی سمجھ نہیں آتی تمہیں بتاؤں یا نہیں؟" دوسری طرف مسز شاہ تھیں جو ادھر ادھر کی باتوں کے بات کافی پر سوچ اور متذبذب سے انداز میں کہنے لگی تھیں۔

"کیا بات ہے ماما اتنا سوچ کیوں رہی ہیں؟ بتائیں نا پلیز؟" اس نے ہلکے پھلکے انداز سے کہا تھا۔

"مگر وعدہ کرو کہ تم حمرہ کو کچھ نہیں کہو گے۔"

"اوکے۔" حمرہ کا نام آتے ہی وہ خاصا الرٹ ہو گیا تھا۔

"دراصل وہ حمرہ کے کسی خاصے ہاٹ افیر کا تذکرہ کر رہی تھیں جس کی سرکل میں بڑی دھوم ہے مسز کاظمی کو تو میں نے ٹوک دیا' مگر دیکھو نا لوگ کیا کہتے ہوں گے۔ شاہ ہاؤس کی بہو ہو کر کیا چن چڑھائے پھرتی ہے۔ اتنی اچھی بچی تھی پتا نہیں اسے کیا ہو گیا ہے۔" دوسری طرف ساحر شاہ کے کانوں سے بھی دھواں نکل رہا تھا۔ حمرہ نے چائے کے ساتھ کباب تل کر بسکٹ کا ہاف رول پلیٹ میں نکالا اور ٹرے لا کر ساحر کے سامنے لا رکھی تھی۔

"ساحر آپ خالی پیٹ ٹیبلٹ نہ لیں پہلے کچھ کھا..." ساحر پتا نہیں دوسری طرف سے بات سن رہا تھا یا یوں ریسیور کان سے لگائے ساکت بیٹھا تھا۔ تیزی سے اٹھ کر اس نے سامنے کھڑی حمرہ کو اس قدر زور سے دھکا دیا کہ وہ انتہائی بے ہنگم سے انداز میں صوفے پر جا گری تھی۔ اس نے سنبھل کر انتہائی خوف زدہ انداز میں ساحر کی طرف دیکھا جو سلگتی آنکھوں میں وحشت لیے اسے انتہائی تنفر سے دیکھ تھا اس کی آنکھوں میں بہت کچھ تھا' مگر حمرہ کو صرف یہی سمجھ آیا کہ اس کا بسیرا پھر سے کانٹوں پر ہے۔

☆ ☆ ☆

"بابا... بابا!" اس نے ریلنگ پر ہاتھ رکھ کر ایک دو

مرتبہ آواز لگائی تھی، مگر بابا نہ جانے کچن میں کس کے ساتھ باتوں میں مصروف تھے۔ لہٰذا اس کی پکار پر کوئی ردعمل سامنے نہیں آیا تھا۔ وہ سیڑھیاں اتر کر آہستہ آہستہ نیچے آئی تھی، مگر قدرے ہانپ کر آخری سیڑھی پر بیٹھ گئی اور چکراتے سر کو گھٹنوں پر گرا لیا تھا۔

"بی بی جی! کیا ہوا خیر تو ہے۔" تب ہی زرینہ کچن سے باہر نکلی اور اس کی طرف لپکی تھی اس کی آواز پر بابا بھی باہر آ گئے تھے۔

"بابا میری طبیعت خراب ہے مجھے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔" کل سے بخار کے ساتھ ساتھ ابکائیاں کر کے وہ حال سے بے حال ہو چکی تھی سو اپنی مدد آپ کے تحت ڈاکٹر کے پاس جانے کا تہیہ کر لیا تھا۔

"بیٹا آپ کو تو صاحب نے باہر جانے سے منع کر رکھا ہے۔"

"بابا میری طبیعت بہت خراب ہے۔" اس نے ریلنگ سے سر ٹکا لیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگی تھی۔

"بیٹا جی میں لے جاتا ہوں آپ کو ڈاکٹر کے پاس، مگر صاحب کو پتا چلا تو میرے ساتھ تو جو ہو گا آپ کو تو۔۔۔" نیک بابا نے اسے ڈرانے کی کوشش کرتے ہوئے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"میں صاحب کو فون کر دیتا ہوں وہی آپ کو اسپتال لے جائیں گے۔" نیک بابا نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"انہیں پتا ہے کہ میری طبیعت خراب ہے۔" ساری رات اس کی بے آرام گزری تھی، مگر نہ جانے ساحر کو اس کی ماں نے فون پر کیا کہا تھا کہ اس کے مزاج کی تلخی عروج پر پہنچ گئی تھی۔ اس نے حمرہ کی طبیعت خرابی کی بھی پروا نہیں کی تھی۔

"بابا ابھی تو صاحب کے آنے میں اتنی دیر ہے انہیں بھلا کیسے پتا چلے گا اور آپ لوگ دوائی لے کر جلدی سے واپس آ جائیے گا۔" زرینہ نے درمیانی راستہ نکال کر مشورہ دیا تھا۔

"اگر اس دوران ان کا فون آ گیا تو۔۔۔" بابا کو ایک اور خدشے نے آن گھیرا تھا۔

"میں کوئی بہانہ کر دوں گی یوں بھی وہ بی بی سے تو۔۔۔" زرینہ غالباً" یہ کہنے جا رہی تھی کہ ساحر حمرہ سے کب فون پر بات کرتا ہے، مگر اس کی دل شکنی کے خیال سے زبان داب گئی تھی۔

"ٹھیک ہے بیٹا آپ چلی چلیں میں گاڑی نکالتا ہوں۔" بابا کو بھی اس کی حالت پر رحم آ گیا تھا۔ ڈاکٹر صوفیہ یا لیاز کے پاس جاتی تو فوراً" سے واپس آ جاتی، مگر اس صورت میں ساحر کو اطلاع مل جاتی تھی سو راستے میں جو اسپتال مناسب نظر آیا وہیں بابا کو چلنے کا کہہ دیا تھا۔

"آپ کو کون سے ڈاکٹر سے چیک اپ کروانا ہے۔" ریسپشن پر بیٹھی سفید یونیفارم میں ملبوس نرس نے پرچی بنانے سے قبل اس سے استفسار کیا تھا۔

"جس کے پاس اپائنمنٹ ذرا جلدی مل جائے۔" گھر سے نکلتے ہی اسے واپسی کا خیال ستانے لگا تھا سو اپنی ضرورت کے حساب سے جواب دے دیا تھا، مگر اب ڈاکٹر نثار کامران کے روم کے باہر کاریڈور میں انتظار کرتے ہوئے حیران ہو کر سوچ رہی تھی کہ ہر روز اتنے مریض ہوتے ہوں گے یا اس کی قسمت کی گردش کے حساب سے آج اتنا رش ہے۔ ایک گھنٹے بعد باری آنے پر ڈاکٹر نثار نے چند سوالات پوچھنے کے بعد ڈاکٹر رخشندہ رضا کی طرف ریفر کیا تو اس کی آنکھوں کے آگے گویا صدمے سے اندھیرا چھانے لگا تھا۔

ڈاکٹر رخشندہ کے کمرے کے باہر خواتین کی ایک لمبی تعداد کو دیکھ کر کتنی مرتبہ اس کا دل چاہا دوا لیے بغیر ہی واپس چلی جائے۔ ایک مرتبہ اسی سوچ کی انگلی پکڑے باہر نکل آئی، مگر نیک بابا جو تھوڑی دیر پہلے اس کے انتظار میں کھڑے تھے اب نہ جانے کس سرنگ میں گھس گئے تھے سو ان کا انتظار کرنے سے بہتر تھا کہ ڈاکٹر کے ہاں باری کا انتظار کرے۔ کم بخت چھٹی حس آرام سے بیٹھنے بھی نہ دے رہی تھی۔ نہ جانے بار بار کون سے اشارے دے رہی تھی، مگر تھی تو بے زبان حس بے چاری اسی لیے چھٹے نمبر پر آئی تھی ورنہ منہ

کھول کر بتا نہ دیتی کہ حمرہ احمد آج کا دن اتفاقات و حادثات کے حساب سے تمہاری زندگی کا برا ترین دن ہے۔

ڈاکٹر رخشندہ نے چند سوالات کیے اور پھر ایک نرس کے ہمراہ چند ٹیسٹ کروانے بھیج دیا تھا اور ٹیسٹوں کی رپورٹس ہاتھ میں پکڑے وہ دوبارہ سے ڈاکٹر رخشندہ کے پاس پہنچی تو شام کے گہرے ہوتے سائے اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا بن کر ناچنے لگے تھے۔

"ہاں صوفی یار گیٹ پر پہنچو بس ایک دو پیشنٹ ہیں انہیں بھگتا کر نکلتی ہوں۔" ڈاکٹر صاحبہ کا موبائل گنگنایا تو انہوں نے کان سے لگا کر کسی سے بات چیت شروع کی تھی۔ اب اسی کی کسر رہ گئی تھی حمرہ کو سچ مچ رونا آنے لگا، مگر خیر انہوں نے جلدی موبائل کان سے ہٹا لیا تھا۔

"ڈاکٹر صاحبہ! میری آج طبیعت اتنی خراب تھی پہلے تو سوچا چھٹی کرلوں مگر گڈو کے پرچوں کے بعد گاؤں جانا ہے اس لیے مجبوراً" چلی آئی۔" سفید لباس میں ملبوس اسپتال کی آیا نے سامنے براجمان ہوئے کتھا چھیڑ دی تھی۔ ڈاکٹر جو رپورٹس کو دیکھ کر اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ رک گئی۔

"دوا تو لی تھی آپ نے، کچھ افاقہ ہوا۔" ڈاکٹر خاصی ہمدردی سے پوچھ رہی تھی۔

ساحر تو بس گھر آنے ہی والا ہوگا۔ اس نے دیوار پر وال کلاک تلاش کرنا چاہا تھا۔

"مبارک ہو بھئی، آپ کی رپورٹ پازیٹو ہے ون منتھ پریگننسی ہے۔"

(یا خدا یہ خاتون تھوڑی دیر بعد بھی آسکتی تھی، مجھے تو پہلے ہی اتنی دیر ہو رہی ہے)

"مگر آپ کی رپورٹس اتنی کلیئر نہیں ہیں۔ فرسٹ آف آل تو آپ کو کمپلیٹ بیڈ ریسٹ کرنا ہوگا۔ ورنہ مس کیرج کا بھی چانس ہو سکتا ہے۔"

"ڈاکٹر صاحبہ نسیم آپ سے ملنے کو آئے گی کسی روز۔" رش میں کام کرنے والے میڈیکل پروفیشن کے لوگوں کو یونہی بیچ میں گپیں لگا لینے کی عادت ہوتی ہے سو وہ خاتون ایک مرتبہ کسی کا ذکر کر رہی تھی۔

"یا خدا یہ خاتون یہاں سے کب اٹھیں گی۔" حمرہ نے ایک نظر اس کے ہلتے ہونٹوں کو دیکھا اور دوسری نظر کھڑکی سے کسی بلا کی مانند نازل ہوتی شام پر ڈالی تھی۔

"میں نے اس لڑکی کو کہاں دیکھا ہے۔" ڈاکٹر نے پرچی کے اوپر لکھے نام پر نظر ڈالی اور پھر بغور اسے دیکھا تھا۔

"یہ میں نے کچھ میڈیسن لکھ کر دی ہیں چھ ماہ تک آپ کو ریگولر یوز کرنی ہوں گی۔ درمیان میں کچھ میڈیسن چینج بھی ہوں گی۔ آپ کو ہر مہینے کچھ ٹیسٹ بھی کروانے ہوں گے۔" ڈاکٹر نے پرچی اس کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے کہا تو وہ چونکی تھی۔

"ڈاکٹر صاحبہ مجھے ایسی کیا بیماری ہے جو مجھے اتنا عرصہ میڈیسن کھانی ہوں گی۔" پہلے ٹیسٹ اور اب میڈیسن کا ذکر سن کر وہ پریشان ہوگئی تو ڈاکٹر نے پہلے اسے اور پھر اچنبھے سے اپنے سامنے بیٹھی آیا کی طرف دیکھا تھا۔ اگلے پل وہ دونوں قہقہہ لگا کر زور سے ہنس پڑی تھیں۔

"میرڈ ہو نا تم؟" ڈاکٹر نے اپنی ہنسی پر قابو پا کر پوچھا تھا۔

"جی!" اس نے فقط سر ہلایا تھا۔

"او مائی گاڈ میں اتنی دیر سے کیا بک بک کیے جا رہی تھی کہ تم پریگننٹ ہو، تمہارا دھیان کہاں لگا ہوا تھا۔" حمرہ کا دل زور سے دھڑکا تھا۔

"اچھا میں سمجھی آپ یہ ساری باتیں ان سے کہہ رہی ہیں۔" اس نے سامنے بیٹھی آیا کی طرف اشارہ کیا کر دیا کمرہ ان دونوں کی ہنسی سے زعفران زار بن گیا تھا۔

"بیٹا میرے شوہر کو جنت مکانی ہوئے تیرہ برس گزر گئے، میرے سفید چونڈے میں کیوں خاک ڈلواتی ہو۔" اور دل میں کروٹ لیتی بے تحاشا خوشی کے ساتھ آیا کی بات پر حمرہ کو دکھ نے بھی آن گھیرا۔ وہ جتنی

پریشان تھی سامنے کھڑے گدھے اور اونٹ میں فرق نہ کر سکتی تو عمر کا تناسب بھلا کہاں دیکھتی، مگر اس نئی خبر نے ایک لمحے کے لیے ساحر شاہ کے خوف کو کہیں دور بھگا دیا تھا۔

"اچھا آپ نے جو احتیاطیں مجھے بتائی تھیں وہ ذرا ریپیٹ کردیں پلیز۔" وہ ڈاکٹر کے سامنے اسٹول پر ٹک کر اس کی ہدایات کو بہت غور سے سنتی چلی گئی تھی۔

نیک محمد کا بھائی اور بھرجائی گاؤں سے آئے تھے۔ زرینہ ان کی آؤ بھگت کرنے اپنے کوارٹر میں گئی تھی جب ساحر کا فون آیا، نیک محمد بھی شاید اپنے کوارٹر میں گیا ہوا تھا اور حمرہ بی بی تو بہت دیر سے باہر گئی ہوئی تھیں۔ اس نے سب کے غیر موجود ہونے کی بابت بتایا تھا۔

"صوفی! صوفی! دیکھو وہ لڑکی کون ہے؟" وہ دونوں شاپنگ کے لیے نکلی تھیں۔ ایک سگنل پر رکی ہوئی گاڑیوں کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر رخشندہ نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی ڈاکٹر صوفیہ کا بازو ہلا ڈالا تھا۔

"کون سی؟" اس جاہلانہ حرکت پر اس نے ڈاکٹر رخشندہ کو گھورا جو چہرے پر مسکراہٹ لیے قدرے پیچھے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"وہ جو آنکھیں بند کر کے سیٹ سے ٹیک لگائے ہوئے ہے۔" اس نے ایک لائن چھوڑ کر اگلی لائن میں کھڑی گاڑی کی طرف اشارہ کیا جس کا صرف پچھلا حصہ انہیں نظر آرہا تھا۔

"ارے یہ تو حمرہ ہے ڈاکٹر صاحب کے کزن کی وائف۔"

"اوہ مائی گاڈ میں بھی کہوں، میں نے اسے کہیں دیکھا ہے۔ یہ وہی ہے نا تمہارے گھر پر ملاقات ہوئی تھی اس نے لوکل قسم کا ڈریس پہنا ہوا تھا۔"

"ہاں ہاں وہی ہے۔"

"مزے کا لطیفہ سنو، یہ آج میرے پاس چیک اپ کے لیے آئی نا تو میں نے پریگننسی رپورٹ پازیٹو ہونے کا۔۔۔"

"ہائیں یہ پریگننٹ ہے۔ کمال ہے ساحر اسے میرے پاس کیوں نہیں لایا۔" ڈاکٹر صوفیہ نے جوش سے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

"اور اس بدتمیز نے اتنی بڑی خبر ہم سے چھپائی۔ ابھی ڈاکٹر صاحب سے بات کرتی ہوں۔" ڈاکٹر صوفیہ نے ڈیش بورڈ سے موبائل اٹھا کر نمبر ڈائل کیا تھا۔

"نہیں یار ابھی تھوڑی پہلے ہی تو۔۔۔" ڈاکٹر رخشندہ نے پیچ اپ کروانا چاہا، مگر ڈاکٹر صوفیہ دوسری طرف بات شروع کر چکی تھی۔



"کہاں گئی تھیں تم؟" تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر اس نے دھاڑ سے دروازہ کھولا اور ہاتھ میں پکڑا بریف کیس زور سے بیڈ پر دے مارا تھا۔ وہ جو چند منٹ پہلے ہی واپس آکر سارے دن کی تھکن اور ٹینشن سے خود کو آزاد کرتے ہوئے بیڈ پر لیٹی سنہرے روپہلے سپنے میں کھوئی ہوئی تھی۔ تیزی سے نہ اٹھتی تو بریف کیس اس کے اوپر آن گرتا۔

"میں۔۔۔ میں اسپتال گئی تھی۔" ازحد پریشان ہو کر وہ اٹھ گئی تھی۔

"بکواس بند کرو میں تمہیں۔۔۔"

"آپ بے شک نیک بابا سے پوچھ لیں۔ میں ان کے ساتھ گئی تھی۔"

"نیک بابا کی جرات کہ وہ میرے منع کرنے کے باوجود تمہیں باہر لے کر گیا۔" ساحر تیزی سے دانت پیستا ہوا کمرے سے نکل گیا تھا۔

"نیک بابا۔۔۔ نیک بابا!" اس نے اتنے زور و شور سے پکارا کہ نیک محمد کے ساتھ گھر کے سارے نوکر لاؤنج میں اکٹھے ہوگئے تھے۔ حمرہ جو یہ سوچ رہی تھی کہ ساحر کے گھر آنے پر پریگننسی رپورٹ اسے دے گی تو وہ بھی یقیناً بے حد خوش ہوگا۔ سنبل اور اس کی ماں نے سازش کا جو جال اس کے گرد بنا تھا شاید اسے اس سے رہائی مل جائے مگر اب؟ ساحر شاہ کسی عفریت کی مانند اس کی خوشی کو پل بھر میں نگل سکتا تھا۔

وہ ایک ایسا طوفان بنا کھڑا تھا جو اس کے دل میں جلتے

امید کے دیے کو پل بھر میں بجھا ڈالتا' بیڈ ریسٹ کی جو ڈوز وہ اسے دینے والا تھا اس کے بعد حمرہ احمد ایک مرتبہ پھر خالی ہاتھ رہ جاتی اور یہ اسے کسی صورت گوارا نہیں تھا۔ گھر چھوڑنے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی' مگر اب؟ سوال اس کی اپنی زندگی کا نہیں تھا۔ اس کے وجود سے منسلک ایک اور زندگی کا تھا۔ وہ خوشی جو اسے اکیلے پن کے احساس سے نکال کر چند گھنٹے پہلے اس کی اپنی نظروں میں معتبر کر گئی تھی۔ وہ اسے خود سے جدا ہوتے کیسے دیکھ لیتی۔ رشتوں کو ترسی ہوئی حمرہ احمد اس امید کی خود سے بڑھ کر حفاظت کرنا چاہتی تھی۔

کمرے سے باہر نکل کر لاؤنج سے آتی ساحر کی بلند آواز سنتے ہوئے اس نے لمحوں میں فیصلہ کیا تھا۔ اس سے پہلے کہ ساحر واپس کمرے میں آتا۔ وہ تیزی سے کوریڈور کی پچھلے لان میں جانے والی سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔ اس طرف ایک چھوٹا سا دروازہ پچھلی سڑک پر کھلتا تھا۔ عام طور پر گھر کے نوکر کوئی سودا سلف لانے کے لیے قریبی اسٹور پر جاتے وقت یہ دروازہ کھول لیتے تھے۔ حمرہ وہی راستہ اختیار کر کے بے سوچے سمجھے باہر نکل آئی تھی۔

مسجدوں کے لاؤڈ اسپیکر مغرب کی اذانیں نشر کر رہے تھے۔ مین روڈ سے مخالف سمت میں جاتے ہوئے نسبتاً "سنسان سڑک پر چلتے ہوئے اسے شاہ ہاؤس سے دور چلے جانے کی خواہش تھی۔ پہلے تو وہ تیز تیز قدموں سے چلتی رہی۔ مگر آگے جا کر نسبتاً "پُر رونق سا ایریا شروع ہوا تو اس نے ایک دیوار کا سہارا لے کر رکتے ہوئے آنسو صاف کیے اور پھر آہستہ روی سے قدم بڑھائے تھے۔ اس کی کون سی کوئی منزل تھی جس تک پہنچنے کی اسے جلدی ہوتی۔ اکا دکا گاڑیاں سڑک سے گزر رہی تھیں۔ شاید یہ اس کی دیوانی سی چال کا اثر تھا کہ دو موٹر سائیکل سوار تیسری مرتبہ چکر لگا کر اس کے پاس سے گزرے تو وہ چونکی تھی۔ اس کی ساکت حسیات یک دم بیدار ہوئی تھیں۔ موٹر سائیکل آگے جا کر ایک مرتبہ پھر اس کی طرف آ رہا تھا۔ وہ تیزی سے سڑک کراس کر کے ایک PCO میں گھس گئی تھی۔

ساحر نیک محمد کی طبیعت خاصی تیز رفتاری سے صاف کر رہا تھا۔ جب پاس پڑے لاؤنج کے فون کی بیل بجی تھی۔

"ہیلو...!" شاید ماں کا فون ہو۔ یہی سوچ کر اس نے ریسیور کان سے لگایا تھا۔

"اے کھوتے... تو باپ بننے والا ہے اور اتنی بڑی خبر تم نے مجھ سے چھپائی۔" دوسری طرف ایاز تھا۔ جو اس کی آواز سنتے ہی بغیر سلام دعا کے شروع ہو گیا تھا۔

"کیا؟" ایک لمحے کے لیے ساحر کو لگا شاید وہ اس کا نمبر ڈائل کر کے کسی اور سے مخاطب ہے۔

"گدھے کے کان! اگر تیری جیب کٹ گئی تھی' تو بھی مجھے بتا دیتے۔ میں خود پورے شہر میں مٹھائی تقسیم کر دیتا۔ آخر کو چاچا بننے والا ہوں' اور تو حمرہ کو اس کباڑ خانے میں چیک اپ کروانے کیوں لے گیا۔" ایاز کی خوشی دیدنی تھی۔ بغیر کوئی وقفہ دیے وہ اس سے باز پرس بھی کرنے لگا تھا۔

"تمہیں کس نے بتایا؟" انتہائی بے تکے انداز میں اس کے منہ سے نکلا تھا۔

"واہ... تم کیا سمجھے تھے' مجھے پتا نہیں چلے گا۔ وہ جس کباڑ خانے میں تم حمرہ کو لے کر گئے تھے۔ وہاں کی ڈاکٹرنی صوفیہ کی دوست ہے۔" ایاز نے یوں خوش ہو کر بتایا جیسے اس نے ساحر پر چھاپا مار لیا ہو۔

"نہیں... اچھا... ہاں..." وہ اسے بتاتے بتاتے رک گیا کہ وہ خود اس کے منہ سے سن رہا ہے۔

"صوفیہ تو کہہ رہی تھی خود سے نہیں کہنا جب تک ساحر یہ خوشی شیئر نہیں کرے گا۔ مگر یار قسم سے تھوڑی دیر میں ہی پیٹ میں درد ہو گیا میں نے سوچا تم سے بات کر ہی لوں۔ بڑی مشکل سے تھوڑی دیر گزاری ہے۔ اور یہ تم میری کال کیوں نہیں اٹینڈ کر رہے تھے۔"

"اچھا ایاز میں تمہیں تھوڑی دیر میں کال کرتا ہوں۔" وہ اس کے اتنے سارے سوالوں اور اتنی ساری شکایتوں کے جواب دیتا یا اپنے دل کو سنبھالتا جو خوشی

سے جھوم اٹھا تھا۔ سو "مختصراً" کہہ کر کچھ بھی سنے بغیر ریسیور رکھ دیا تھا۔ غصے کے آتش فشاں پر گویا کسی ٹھنڈ کا فوارہ برسا دیا تھا۔ "آپ لوگ جائیں۔" نوکروں سے کہہ کر مسکراتا ہوا وہ اوپر کمرے میں آیا تھا۔ "حمرہ۔۔۔ حمرہ!" یہ خوشی اس سے شیئر کرنے کو دل چاہا تھا جو اس کی اصل حقدار تھی۔ اس وقت اس تک ساحر کی آواز پہنچتی تو وہ یقیناً "اس کی خوشی اور سرشاری کو محسوس کرلیتی۔ مگر وہ تو باتھ روم 'ڈریسنگ روم اور روم میں کہیں بھی نہیں تھی۔ حتیٰ کہ ٹیرس بھی خالی تھا۔ اگلے پندرہ منٹ میں شاہ ہاؤس کا کونا کونا حتیٰ کہ کوارٹرز تک بھی دیکھ لیے گئے تھے۔ چوکیدار نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔

"صاحب جی! وہ پچھلا گیٹ کھلا ہوا ہے شاید حمرہ بی بی ادھر سے باہر چلی گئی ہوں۔" زرینہ جو لان میں اسے دیکھنے گئی تھی ایک نئی اطلاع لیے واپس آئی تھی۔

"نیک بابا آپ پلیز گاڑی لے کر اس روڈ پر اسے دیکھیں۔" وہ خود گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر کی طرف لپکا اور نیک محمد کو بھی ہدایت کی تھی۔



"ڈاکٹر ایاز اسپیکنگ۔" بیل بجنے پر ڈاکٹر ایاز نے پیڈ پر نسخہ تجویز کرتے ہوئے ریسیور کو کندھے اور کان کے درمیان پھنسایا تھا۔

"ایاز بھائی میں حمرہ۔۔۔ بات کر رہی ہوں۔"

"ہاں بھئی کیا حال ہیں۔ وہ تمہارے میاں کو میں مینٹل وارڈ میں داخل کرنے کا سوچ رہا۔۔۔"

"ایاز بھائی پلیز ہیلپ می۔۔۔ میں بہت پرابلم میں ہوں۔" حمرہ نے ڈاکٹر ایاز کی بات کاٹ دی تھی۔

"کیا ہوا خیریت؟" ڈاکٹر ایاز نے پین پیڈ کے اوپر رکھ کر ریسیور ہاتھ میں تھاما تھا۔

"میں۔۔۔ میں۔۔۔ سڑک پر ہوں۔" شاید وہ رو بھی رہی تھی۔

"کیوں؟ تم سڑک پر کیوں ہو۔ کس کے ساتھ ہو۔ کیا ہوا ہے؟" ڈاکٹر ایاز بے ساختہ ہی کھڑا ہو گیا تھا۔

"آپ ادھر آسکتے ہیں؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ تم بتاؤ۔ کہاں ہو تم؟"

"میں۔ روڈ سے گھر کی پچھلی طرف لیفٹ سائیڈ پر جو روڈ۔۔۔"

"مجھے دیں میں ان کو ایڈریس بتاتا ہوں۔" مردانہ آواز منظر سے ابھری تھی۔

"ایاز بھائی یہ انکل آپ کو ایڈریس بتائیں گے۔"

"آپ کون ہیں؟ اور کیا پرابلم ہے۔" ایڈریس تیزی سے سنتے ہوئے ایاز اسی شخص سے پوچھ رہا تھا۔

"یہ خاتون میرے پی سی او سے فون کرنے آئی ہیں۔ کسی پرابلم میں ہیں غالباً"۔ آپ آجایئے پلیز۔"

"اوکے میں پانچ منٹ میں آتا ہوں۔"

"صوفیہ بھابھی! وہ میں آج آپ کے پاس رہ سکتی ہوں نا" گاڑی پی سی او کے سامنے رکتے ہی ایاز اور صوفیہ گاڑی سے باہر نکلے تو حمرہ سڑک کراس کر کے ان کے پاس آئی تھی اور صوفیہ کے بازو سے لپٹ کر روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"ہاں تم ہمارے پاس رہ سکتی ہو مگر بتاؤ تو سہی مسئلہ کیا ہے؟"

"صوفیہ پلیز گاڑی میں بیٹھو۔" ایاز نے اسے ٹوکا اور پھر پے منٹ کرنے کے لیے پی سی او کے اندر چلا گیا کہ حمرہ بالکل خالی ہاتھ تھی۔

"یہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟" واپس آکر ایاز نے گاڑی "شاہ ہاؤس" کی طرف موڑی تو وہ بوکھلا کر چلا اٹھی تھی۔

"حمرہ بیٹا آرام سے 'کوئی مسئلہ ہے تو ہم ساحر سے بات کرتے ہیں۔" ڈاکٹر ایاز نے اپنے تئیں اسے تسلی دی تھی۔

"ایاز بھائی میں نے گھر نہیں جانا' آپ واپس چلیں۔" ایاز کی تسلی کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

"کیا بے وقوفی ہے حمرہ' جو بھی ایشو ہے گھر جا کر ڈسکس کرتے ہیں؟" صوفیہ نے اسے گھر کا تھا۔

"روکیں گاڑی۔ میں نے نہیں جانا آپ لوگوں کے ساتھ۔" ہذیانی انداز میں کہہ کر اس نے گاڑی کا

دروازہ کھول کر اترنا چاہا تو جہاں صوفیہ نے اسے بازو سے پکڑ کر کھینچا وہیں یک دم ایاز نے بریک لگائے تھے ورنہ اس سے بعید نہیں تھا کہ چلتی گاڑی سے ہی چھلانگ لگا دیتی۔

"ٹھیک ہے ہم اسپتال جارہے ہیں مگر دوبارہ ایسی حرکت مت کرنا۔" ڈاکٹر ایاز نے قدرے سختی سے مڑ کر اسے مخاطب کیا اور ٹرن کرنے کے لیے ٹریفک کی طرف توجہ کی تھی۔



ڈاکٹر ایاز اپنی سیٹ پر بیٹھا مسلسل ساحر کا نمبر ٹرائی کرتے ہوئے مریضوں کو بھگتا رہا تھا۔ مگر گھر اور موبائل دونوں پر کوئی اٹینڈ نہیں کر رہا تھا۔

"کیا ہے یار؟ میں اس وقت بہت مصیبت میں ہوں۔" کافی دیر کے بعد اس نے ایاز کی کال اٹینڈ کی مگر کچھ سنے بغیر ہی شروع ہو گیا تھا۔ پس منظر میں گاڑیوں کے شور سے ڈاکٹر ایاز نے اندازہ لگایا کہ وہ یقیناً" اب گھر سے باہر حمرہ کو ہی تلاش کرتا پھر رہا تھا۔

"تمہاری مصیبت بی بی تو یہاں پہنچ چکی ہیں۔ اب تم کہاں آوارہ گردیاں....."

"کیا۔ کون۔ حمرہ تمہارے پاس ہے۔" اس کی بات کاٹ کر ساحر نے خاصی بے تابی سے پوچھا تھا۔

"جی ہاں" ڈاکٹر ایاز نے اختصار سے جواب دیا تھا۔

"تو پہلے بتانا تھا۔ تھینک گاڈ۔" سکون کی سانس لے کر وہ اس پر چڑھ دوڑا تھا۔

"پہلے..... کون سا پہلے؟" ڈاکٹر ایاز نے حیرانی کا اظہار کیا۔

"آدھ گھنٹے سے تو تمہیں کال کر رہا ہوں، تم اٹینڈ تو کرو۔"

"اچھا ٹھیک ہے میں دس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔"

"مجھے بتاؤ تو سہی حمرہ! آخر ہوا کیا ہے؟" صوفیہ خاصی عاجز ہو کر اس کے قریب آن بیٹھی تھی۔ حمرہ جواب دینے کے بجائے آنسو بہاتی رہی۔

"اس نے تمہیں گھر سے نکالا ہے؟"

"نہیں۔" حمرہ نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"تو پھر کسی فلم کی دکھیاری ہیروئن کی طرح رات کو سڑکوں پر مٹر گشت کیوں کرتی پھر رہی تھیں؟" صوفیہ کو حقیقتاً" اس کی بات سن کر تاؤ آگیا تھا۔

"وہ محترم تمہیں سارے شہر میں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ اور تم گویا کوئی کامیاب معرکہ مار کر بیٹھی ہو۔"

"آپ نے..... آپ نے ساحر کو بتا دیا کہ میں یہاں ہوں۔" صوفیہ کی بات سے خطرے کا الارم اس کے اندر بجا تو وہ ۔ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ جیسے ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر مثبت جواب سن کر بھاگ پڑے گی۔

"نہیں نہیں تم نے منع کیا تھا تو بھلا کیسے بتا دیتے۔" ڈاکٹر صوفیہ نے مصلحتاً" تسلی دی تو وہ قدرے پر سکون ہو کر بیٹھ گئی' اسپتال کے اندر ہی ان دونوں نے ایک بیڈ روم 'ڈرائنگ روم اپنے لیے مختص کر رکھا تھا جہاں وہ ریسٹ بھی کر لیتے۔ ایمرجنسی کی صورت میں رات کو Stay بھی کرتے اور اپنے پرسنل مہمانوں کو یہیں پر اٹینڈ کرتے تھے۔ وہ دونوں وہیں پر براجمان تھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں حمرا کا سارا سکون غارت ہو گیا جب اس نے ڈاکٹر ایاز کے ساتھ ساحر کو اندر آتے دیکھا اس نے ایک حیرت بھری اور شاکی نظر ڈاکٹر صوفیہ اور ایاز پر ڈالی تھی۔



"حمرہ! پلیز گھر چلو" خاصی دیر سے ساحر بہت نارمل انداز اور نرم لہجے میں اس کی منتیں کیے جا رہا تھا۔

"میرا کوئی گھر نہیں ہے اور آپ کے گھر جانا ہوتا تو وہاں سے نکلتی ہی کیوں؟" حمرہ اس کی نرمی کو ڈاکٹر صوفیہ اور ایاز کی موجودگی پر محمول کرتے ہوئے اس کے جھانسے میں آنے کو تیار نہ تھی۔

"ایاز بھائی آج میں آپ کے گھر رہ سکتی ہوں نا؟" وہ کوئی تیسری مرتبہ یہ سوال کر رہی تھی۔

"چلو ٹھیک ہے رہ لو مگر پھر کیا کرو گی؟" ڈاکٹر صوفیہ نے پوچھا تھا۔

"صبح ہی میں چلی جاؤں گی۔" وہ مکمل تہیہ کیے ہوئے تھی۔
"کہاں جاؤ گی؟" ساحر اپنی نشست سے اٹھ کر اس کے قریب آن بیٹھا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھ رہا تھا۔
"کہاں جاؤں گی؟" اس نے زیر لب جیسے اس کا سوال دہرایا اور نظروں کا زاویہ بدل کر کچھ دیر پلکوں کو جھپکتی رہی۔
"کہیں.... بھی۔ کہیں بھی.... بھائی کے پاس۔" اس نے آنکھوں میں آئی نمی کو روکنے کی کوشش کی ڈاکٹر ایاز نے صوفیہ کو اٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔
"آپ کہاں جا رہی ہیں؟" حمرہ نے اس کا بازو پکڑ کر روک لیا تھا۔
"ہم لوگ ذرا مریضوں کو دیکھ لیں تم آپس میں کچھ نائنل...."
"میں نے کچھ فائنل نہیں کرنا۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں۔" وہ اس کے ساتھ اکیلے بیٹھنے کا رسک نہیں لینا چاہتی تھی سو اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
صوفیہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر ایاز کی طرف دیکھا جو باہر جاتے جاتے دروازے میں رک گیا تھا۔
"بڑی مہربانی' آپ تشریف رکھیے میں بھی کہیں نہیں جا رہی۔" صوفیہ واپس بیٹھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
کچھ تو ساحر کے دل میں نئی خبر سے ملنے والی مسرت کا احساس تھا اور پھر اس کا گھر سے نکل کر صوفیہ اور ایاز کے پاس آنا بدگمانی کی کئی تہیں وقتی طور پر اڑا کر لے گیا تھا حتی کہ ماں کے فراہم کیے حتمی ثبوت بھی اپنا اثر کھونے کو تھے۔ مگر حمرہ کے خیال میں پہلے اس کے جرم کون سے ساحر کی نظروں کم تھے جو اب یوں گھر سے نکل آنا اس کے خیال میں ساحر اس قدر نرم لہجہ اس لیے اپنائے ہوئے تھا کہ وہ دھوکا کھا کر اس کے ساتھ چل دے اور وہ گھر جا کر دل کی بھڑاس نکال لے۔
"ایاز میری بات سنو۔" کافی دیر کی بحث کے بعد بھی جب وہ گھر چلنے پر راضی نہ ہوئی تو ساحر اٹھ کر باہر چلا اور اس کے پیچھے ڈاکٹر ایاز بھی....
"حمرہ بے بی پلیز گھر جاؤ' یہ کیا بے وقوفی ہے۔" ایک مرتبہ پھر ایاز نے واپس آکر اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔
"میں آپ کو بتا چکی ہوں' میں نے گھر نہیں جانا' امپاسبل۔ صرف ایک رات بلکہ چند گھنٹوں کی تو بات ہے۔ میں آپ کے گھر نہیں رہ سکتی کیا؟" ان کا اصرار اسے بالکل نہیں بھا رہا تھا۔
"نہیں' میں تھوڑی دیر کے لیے تمہیں اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتا' جب تک ساحر اجازت نہ دے۔" یک دم ہی ڈاکٹر ایاز کا لہجہ بے مروت ہو گیا تو وہ شاکی نظروں سے اسے دیکھنے لگی تھی۔
"اگر کلثوم بھی یوں منہ اٹھا کر آجائے تو اسے بھی واپس بھیج دوں۔" اس نے اپنی سگی بہن کا حوالہ دیا تھا۔
اس کے لہجے پر حمرہ کے چہرے کا بدلتا رنگ دیکھ کر بے اختیار ہی ساحر کا دل چاہا وہ اسے یوں بات کرنے سے روک دے۔ اگرچہ اس کے کہنے پر ہی تو ایاز نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا' مگر اگلے پل یہ سوچ کر خاموش رہا کہ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ سر جھکائے کچھ سوچتی رہی۔
"گھر چلیں!" اس نے کسی کو مخاطب کیے بغیر کہا تو ان تینوں نفوس کے چہروں پر سکون در آیا تھا۔
اس بات سے بے خبر کہ وہ رات گزارنے کا ایک اور ٹھکانہ سوچ چکی ہے' اسپتال کی مین بلڈنگ کے پیچھے چند کمرے تھے جو کبھی کبھار استعمال کیے جاتے تھے۔ ان سے ملحق ایک بڑا سا اسٹور روم جہاں ناکارہ اور غیر استعمال شدہ سامان پڑا رہتا تھا۔ ایک دو دفعہ وہ ساحر کے ساتھ آئی تھی تو صوفیہ کے لیبر روم میں بزی ہونے پر اسپتال کے کونے کھدروں میں وقت گزاری کے لیے جھانکتی پھری تھی' اگر وہ اس اسٹور میں جا کر بیٹھ جاتی تو ساحر شاہ پورے شہر میں بانس ڈلوا کر بھی اسے ڈھونڈ نہ پاتا۔
وہ دانستہ طور پر چلتے ہوئے ذرا سا ساحر سے پیچھے

چلنے لگی تھی۔ کاریڈور میں آگے جاکر دو راستے تھے ایک مرکزی گیٹ کی طرف اور دوسرا پچھلی طرف کو جاتا تھا۔ وسیع و عریض کاریڈور جس سے دونوں اطراف کمرے تھے۔ اس وقت رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ اکا دکا نرسیں یا مریضوں کے رشتہ دار آجا رہے تھے۔ وہ ساحر کے ساتھ چلنے کے بجائے یک دم دوسری طرف مڑ گئی۔ کاریڈور کے اختتام پر سیڑھیاں تھیں۔ اس کی عجلت کا باعث تھا یا پھر آدھے دن سے مسلسل کی جانے والی جدوجہد کا نتیجہ' اسے ہلکا سا چکر آیا اور یوں محسوس ہوا گویا کسی اندھیرے غار میں گرتی چلی گئی ہو۔

ساحر نے گاڑی پارکنگ کی طرف لے جانے کے بجائے یونہی روش پر بلڈنگ کے سامنے روکی تھی۔ گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ حمرہ اس کے ساتھ نہیں ہے کچھ انتظار کے بعد وہ واپس کاریڈور میں متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا آرہا تھا جب اس نے ڈاکٹر صوفیہ کو دو نرسوں کے ساتھ تیزی سے پچھلی طرف جاتے دیکھا وہاں کچھ بھاگ دوڑ اور ہلچل محسوس ہوئی تھی۔

اس نے ہوش میں آنے کے بعد کسی سے کچھ نہیں پوچھا۔ سیڑھیوں پر گر کر بے ہوش ہونے سے قبل واحد خیال جو اس کے ذہن میں آیا تھا وہ یہی تھا کہ جس امید کو زندہ رکھنے کی خاطر اس نے یہ ساری کوشش کی تھی وہ خوشی نہیں رہی۔ وہ امید اس کا ساتھ چھوڑ چکی ہے آنکھیں کھول اس نے ارد گرد کا جائزہ لیا اور پھر نظروں کا زاویہ بدل کر چھت کو دیکھنے لگی تھی۔

"حمرہ! ہم نے تمہیں ساحر کے ساتھ بھیجا تھا۔ تم اسپتال کے پیچھے کیا کرنے گئی تھیں؟" ڈاکٹر صوفیہ کے پوچھنے پر وہ سپاٹ نظروں سے اس کا چہرہ دیکھتی رہی۔

"بولو نا آخر ایسی کیا وجہ ہوگئی تھی جو تم اس کے ساتھ کسی صورت جانے کو تیار نہیں ہوئیں۔" ڈاکٹر صوفیہ نے دوبارہ اصرار کیا تو اس نے مختصراً" وجہ بتا کر آنکھیں موندلی تھیں۔ آنکھوں کے کناروں سے آنسوؤں کی قطاریں رواں ہوگئیں' ڈاکٹر صوفیہ دنگ رہ گئی تھی۔ ساحر اسے مار پیٹ کیوں کرنے لگا؟ وہ تو خود اس کی حالت پر اس قدر پریشان ہوا تھا مزید کچھ پوچھے بغیر اس نے باہر جاکر ساحر کو یہی بات بتادی تھی۔ وہ اندر آکر اسٹول کھینچ کر اس کے پاس آن بیٹھا اور اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر ڈھیروں تسلیاں دیں تو اس کے دل کو قرار آیا یا نہیں' مگر وہ چپ ضرور ہوگئی تھی۔



"تم نے ہمیں کیوں نہیں بتایا۔" ڈاکٹر صوفیہ اس کی کہی ہوئی ایک بات سے جان گئی کہ ان کے درمیان وجہ تنازعہ کوئی معمولی نہیں تھی۔ لہٰذا دوسرے دن بصد اصرار حمرہ سے ساری بات سن کر وہ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھی۔

"آپ کیا کرتیں؟"

"ہم لوگ ساحر سے بات کرتے وہ تمہارا منہ توڑ سکتا تھا' مگر ہماری بات مجبوراً" ہی سہی اسے پوری سننا پڑتی اور ساری بات سن کر وہ بھی یقیناً" تمہیں بے گناہ قرار دے دیتا۔" صوفیہ کو اس کی بے وقوفی پر پچھتاوا ہو رہا تھا۔

"آپ کو.... آپ کو میری بات پر یقین آگیا۔" اس کے لہجے میں ابھی بھی خدشے بول رہے تھے۔

"یقین کیوں نہیں آئے گا' میں تمہیں جانتی نہیں ہوں کیا؟ تم دیکھنا میں اس ساحر کے بچے کی کیسی خبر لیتی ہوں ماں بہنوں کی سازشوں کی خبر نہیں اور اس نے تمہیں اتنا ٹارچر کیا۔" صوفیہ کا غصہ آؤٹ آف کنٹرول ہو رہا تھا۔

"آپ ایاز بھائی کو یہ بات مت بتایئے گا پتا نہیں وہ کیا سوچیں؟"

"انہوں نے کیا سوچنا ہے وہ بھی اس کم بخت کی چھترول کریں گے۔"

"مگر تم اتنے عرصے سے یہ سب کچھ سہہ رہی تھیں تو تم نے ہمیں تک کیوں نہ بتادیا۔" صوفیہ کا ملال کم

ہونے میں نہیں آرہا تھا۔
"میری آپ سے ملاقات ساحر کی موجودگی میں ہوئی تھی پھر مجھے خیال نہیں آیا کہ آپ میری مدد کریں گی یوں بھی اتنا شرمناک الزام دہراتے ہوئے....." اس کی آواز بھیگ گئی تھی۔
"ہوں۔" صوفیہ پرسوچ انداز میں تاؤ کھا رہی تھی۔



"شکر ہے میری بھی کسی روم میں ڈیوٹی لگی ہے' ورنہ میں تو پچھلے ایک ہفتے سے وارڈ میں رہ کر تنگ آگئی ہے' اتنے سارے مریضوں کی فرمائشیں پوری کرنے میں مجال ہے ذرا ڈھنگ کی آنکھ لگی ہو۔ اوپر سے گھر جاکر آرام کرنے کا بھی موقع نہیں ملتا۔" رات کی ڈیوٹی پر تعینات نرس آف کرنے والی کولیگ سے اظہار خیال کررہی تھی۔
"چلو پھر آج تمہاری موجیں ہوگئیں۔" آف کرنے والی نرس نے آہستگی سے ہنس کر کہا تھا۔
"ہاں آج تو میں خوب سوؤں گی' یہ پیشنٹ تو ویسے بھی تنگ نہیں کرتی' کوئی ریجڈ بندہ ہو تو یہاں بھی آرام کرنا محال ہوجائے۔" حمرہ دیوار کی طرف کروٹ لیے ان کی گفتگو سن رہی تھی۔
"پیشنٹ کا بھی خیال رکھنا' ڈاکٹر صوفیہ اس کے بارے میں بہت تاکید کرتی ہیں' ان کی ریلیٹو ہے۔"
"میں جانتی ہوں اس کے ہسبنڈ کو ڈاکٹر ایاز کے پاس آتے جاتے دیکھا ہے' ویسے اس بے چاری کے ساتھ کتنا برا ہوا نا' مس کیرج بھی ہوا اور ڈاکٹر صوفیہ کہہ رہی تھیں یہ آئندہ کبھی ماں نہیں بن سکے گی۔"
حمرہ احمد کو یوں لگا اس کا وجود کسی پٹڑی پر ایستادہ ہے اور اس کے اوپر سے کوئی ٹرین گزر رہی ہے۔ اس کے وجود کے ٹکڑے بکھر گئے تھے اور ان ٹکڑوں کو اکٹھا کرنا کس قدر مشکل لگ رہا تھا۔ سانسوں کا تسلسل گویا ٹوٹ رہا تھا۔ دھڑکنیں ساکت ہوگئی تھیں۔ رگوں میں دوڑتے لہو کی جگہ ایک "آہ" ایک "فریاد" گردش کرنے لگی تھی۔ یا اللہ میرے پاس پہلے کون سے رشتے تھے جو زندگی کے اس موڑ پر بھی تو نے مجھے محرومی بخش دی۔
"اتنا اچھا کپل ٹوٹ گیا۔" ایک مرتبہ پھر اس کی سماعتوں نے کام کرنا شروع کیا تھا' وہ دونوں اسے یقیناً" سویا ہوا سمجھ کر دھیمی آواز میں باتیں کررہی تھیں۔
"اللہ نہ کرے بے چاری کے ساتھ اتنا بڑا حادثہ ہوا اوپر سے تم بد فالیں منہ سے نکالے جارہی ہو۔" پہلی نرس نے دہل کر گویا دوسری کو ٹوکا تھا۔
"اس کا ہسبنڈ اتنا لونگ اور کیئرنگ ہے۔" ساتھ ہی اطمینان کا اظہار کیا تھا۔
"ہاں دو چار مہینے محبت جتائے گا' دل جوئی کرے گا پھر اولاد کی کمی کا شکوہ کرے گا' اس کے اگلے پچھلے اپنی نسل کی سرخروئی کا سوچیں گے تب وہ چند تسلیاں اس کے ہاتھ میں تھما کر نئی دلہنیا گھر لے آئے گا۔" خاصے دل جلے انداز میں اس کے مستقبل کا منظرنامہ پیش کیا گیا تھا۔ وہ ساکت نظروں سے دیوار کو تکے جارہی تھی۔ روم روم میں اذیت بلبلا رہی تھی' مگر آنسو کہیں گم ہوگئے تھے دو گھنٹے پتھرائی ہوئی کیفیت میں گزرنے کے بعد اس کے درد کو آنسوؤں کا رستہ ملا تو ساری رات اس کا تکیہ بھیگتا ہی رہا۔



حمرہ نے کئی مرتبہ خود سے یہ بتانے کی کوشش کی تھی اور کتنی بار تو اس کے پوچھنے پر بتانے کی کوشش کہ وہ سنبل آپی کے ساتھ شاپنگ کے لیے گئی تھی' مگر ہر مرتبہ اپنی بات کے آغاز میں اس نے منہ کی کھائی تھی' مگر صوفیہ بھابھی کی زبانی سارا واقعہ سن کر کسی ڈائریکٹ کیے ہوئے پلے کی مانند محسوس ہونے لگا تھا۔ ایک طرف حمرہ بے قصور نظر آتی تھی تو دوسری طرف ماما اور سنبل آپی کے بارے میں سوچ کر دل و دماغ الجھنے لگتے تھے' آخر ماما ایسے کیسے کر سکتی ہیں' انہوں نے حمرہ کو کتنے کھلے دل سے قبول کیا تھا' مگر حمرہ کا گاڑی کی پچھلی سیٹ سے نکلنا اس کا عجلت میں سڑک کراس کرنا اور اب گھر سے نکل کر صوفیہ اور ایاز کے پاس جانا' اپنی کوکھ میں موجود اس کی امانت کی حفاظت خود سے بڑھ کر کرنا'

یہ سب اسے بے قصور ظاہر کرنے پر اصرار کرتے تھے' بھلا ایسی عورت جو اپنے شوہر سے بے وفائی کرتی پھر رہی ہو' وہ اس کی اولاد کی ماں بننے کی اس قدر چاہ کیونکر رکھ سکتی ہے۔

وہ دو روز پہلے آفس سے ایک اہم نوعیت کی فائل گھر لایا تھا' اس ارادے کے ساتھ کہ ذرا فرصت سے اس پر کام کرے گا' مگر کام کرنا تو ایک طرف رہا سرے سے فائل ہی گم کر بیٹھا تھا۔ سعد کئی مرتبہ فون کر کے اسے فائل بھجوانے کو کہہ چکا تھا' سو اس نے فائل کی تلاش میں کمرے کو کھنگال ڈالا تھا' فائل تو نہ ملی البتہ حمرہ کا موبائل جو اس نے سنگاپور سے واپس آنے کے بعد اپنی تحویل میں لیا تھا لاک دراز کو کھولنے پر ملا تھا۔

فائل کی تلاش کا کام چھوڑ کر اس نے یونہی کچھ سوچ کر موبائل چارجنگ پر لگایا اور تھوڑے سے انتظار کے بعد سارے آپشنز چیک کرنے لگا تھا۔ کال ہسٹری سے لے کر میسجز کے سارے باکس حتیٰ کہ ریکارڈ وغیرہ تک کھنگال ڈالا تھا یہ سوچ کر کہ حمرہ موبائل بزی کیوں رکھتی تھی' سارے آپشنز خالی تھے سوائے ریکارڈ فائل میں ایک غزل تھی۔ شاید اداس سے بول اس کی موجودہ کیفیت کے ترجمان تھے جو وہ یونہی بے دھیانی سے اپنی سوچوں میں الجھا سننے لگا تھا مگر دھیان اس طرف بالکل بھی نہیں تھا۔

مگر یک دم ہی موبائل سے ابھرنے والی آوازیں سن کر نہ صرف چونک گیا تھا بلکہ ساری توجہ بھی اس طرف مبذول ہو گئی تھی۔ "دیکھیں تو مہارانی کو ٹی وی یوں کھلا چھوڑ رکھا ہے جیسے اس کے تھرڈ کلاس باپ کا گھر ہو۔" سنبل آپی کے تیکھے الفاظ یقیناً" حمرہ کے بارے میں تھے۔ "چھوٹے گھر کی لڑکی ہے نوکروں کے ساتھ ایسے فرینک ہوتی ہے جیسے رشتہ داری نکلتی ہو۔" ماما کا یہ انداز اس نے پہلی بار سنا تھا اور ۔۔۔ جوں جوں سنتا گیا اس کی سماعتیں گویا مفلوج ہوتی چلی گئیں سیا پاکیزہ پری۔۔۔ کردار پر کیچڑ۔۔۔ اس نے جیسے خود کلامی کرتے ہوئے سنبل کے الفاظ دہرائے تھے۔ حمرہ کا اپنی صفائی میں کہا گیا ایک ایک لفظ بالکل سچ تھا۔

"ماما آپ نہیں جانتیں آپ نے مجھے کتنی اذیت دی ہے۔" وہ بیڈ پر گر سا گیا تھا۔

دل و دماغ کسی کرب کی زد میں تھے' جس لڑکی کی آنکھوں میں اس نے کبھی آنسو نہ دیکھنے کا عزم کیا تھا اسے بے دریغ رلایا تھا جس لڑکی کو اس نے ہمیشہ خوشیاں دینے کا عزم کر رکھا تھا اسے بے سبب غم کی آندھی کے حوالے کر کے کس قدر تنہا کر دیا تھا۔ اب بار' دو بار' سہ بار اور پھر ساری ساری رات وہ موبائل پر وہی گفتگو سنتا رہا۔ اس کے اپنے موبائل کی بیل بجی تو اس نے نمبر دیکھے بغیر ہی آف کر دیا کہ اس وقت وہ کسی سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔

وہ خود احتسابی کے کڑے عمل سے گزر رہا تھا اگرچہ ماما اور سنبل نے حمرہ کی ذات پر ایسا گھناؤنا حملہ کیا تھا تو

خود اس نے کیا کیا؟ ایک مرتبہ بھی اس کی بات مکمل طور پر نہیں سنی تھی۔۔۔ کیوں؟ حمرہ کا بے داغ ماضی بھی تو اس کے سامنے تھا پھر وہ اس کی کوئی دلیل سننے کو کیوں تیار نہیں تھا وہ اس کھیل کا اتنی آسانی کے ساتھ حصہ کیوں بن گیا۔

اور جب ماں کے امریکہ جانے کے بعد اس نے حمرہ کو دوبارہ سے اپنی زندگی میں قبول بھی کرلیا تو کیسے؟ وہ جو اس کے ذرا سے التفات پر بہت مسرور ہو جاتی تھی اور خوشی اس کے انگ انگ سے جھلکنے لگتی تو وہ اسے شک کی نگاہ سے جانچا کرتا تھا جب وہ اس کے کام پہلے کی طرح اپنے ہاتھوں سے کرکے مطمئن اور سرشار نظر آتی تو وہ بغور اس کے چہرے پر طمانیت ملاحظہ کرنے لگتا اور ایسے میں حمرہ کے چہرے پر انجانا سا کرب جھانکنے لگتا جیسے وہ اس کی سوچ سے اس کے ذہن میں سرسراتے شک کے ناگ سے واقف ہو۔

ساحر کو وہ شام یاد آئی' جب وہ سعد کی طرف جانے کے ارادے سے شاور لینے کے انتظار میں بیٹھا تھا کیونکہ حمرہ اس کا کرتا شلوار پریس کررہی تھی۔ اس وقت بھی اس کا ذہن یونہی الجھا ہوا تھا اور اس کی حمرہ پر پڑتی نگاہیں پرسوچ تھیں وہ خاموشی سے کپڑے اس کے ہاتھ میں دے کر پلٹی تو ساحر نے اس کا بازو تھام کر اپنی طرف موڑا تھا اسے یوں لگا تھا کہ جیسے حمرہ کی جھکی نگاہیں ڈبڈبائی ہوئی ہیں۔

"کیا ہوا ہے؟" اپنے پاس بیڈ پر بٹھا کر اس نے حمرہ کا چہرہ اونچا کیا تو آنسو اس کے رخساروں پر پھیل گئے تھے۔

"پلیز حمرہ بتاؤ نا کیوں رو رہی ہو؟" ساحر کا دل اس کے آنسوؤں کے ساتھ پگھلنے لگا تھا۔

"آپ یہ سوچتے ہیں نا کہ میں آپ کے کام خود کیوں کرتی ہوں کسی ملازمہ سے کیوں نہیں کہہ دیتی؟" وہ اس کی سوچ پڑھ چکی تھی۔

"ہاں میں یہی سوچتا ہوں۔" ساحر نے بے بسی سے سپاٹ سے انداز میں اعتراف کیا تو وہ چند پل اسے التجائیہ نظروں سے دیکھتی رہی اس کے ہونٹ کانپے اس نے کچھ کہنا چاہا تھا' مگر پھر یک دم ہی اپنا آپ چھڑا کر کمرے سے نکل گئی کیونکہ اسے معلوم تھا ساحر اس کی بات پر یقین نہیں کرے گا۔ ساحر کا دل چاہا تھا وہ اس کے پیچھے جاکر اس کے آنسو سمیٹے مگر ایک آنکھوں دیکھا منظر اس کے ارادے کی راہ میں حائل ہوا تو وہ شاور لینے کے لیے اٹھ گیا تھا۔

آج ساحر کی سمجھ میں آرہا تھا۔ حمرہ اس روز بھی یقیناً" اسے بتانا چاہتی تھی کہ اس نے اس کی عزت اور غیرت کو ٹھیس نہیں پہنچائی وہ تو سنبل کے ساتھ گئی تھی۔

اس کی التجائیہ نظریں اس کی بے بسی اور کرب ساحر کی نگاہوں کے سامنے پھرنے لگا تھا کسی بھی پاک دامن عورت کے لیے اس سے بڑھ کر اذیت کی بات کیا ہوسکتی ہے کہ اس کے کردار پر الزام لگا کر اس کی زندگی کو مشکل بنادیا جائے۔

ساحر کو وہ دوپہر یاد آنے لگی جب اس نے حمرہ کے رونے پر طنز کیا تھا اور وہ اس کے پاؤں پڑ کر اپنی بے گناہی کا یقین دلانے لگی تھی۔ "مگر۔۔۔ کیا میں اس کی ان ساری تکلیفوں کا ازالہ کرسکوں گا۔"

فجر کی اذان کے وقت تھوڑی دیر کے لیے اس کی آنکھ لگی تھی جو نیک بابا کے دروازہ ناک کرنے پر کھلی تھی۔

"صاحب ڈاکٹر صاحب تین دفعہ فون کرکے آپ کا پوچھ چکے ہیں' میں نے انہیں ہولڈ کروایا ہے۔"

"کہاں ہو یار! حمرہ نے ہمیں بہت تنگ کر رکھا ہے۔" اس نے ریسیور کان سے لگایا تو ایاز جھنجلائے ہوئے انداز میں کہنے لگا تھا۔

"خیریت؟" وہ شام سے اسپتال نہیں گیا تھا سو خاصا پریشان ہوا۔

"میں تمہارا نوکر لگا ہوا ہوں جو فون پر تمہیں خیریت کی اطلاع کرتا پھروں۔ تم خود کہاں مرے پڑے ہو۔" اس نے بے مروتی سے کہہ کر فون پٹخ دیا تو ساحر کمرے میں آکر اسپتال جانے کی تیاری کرنے لگا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

عنبرین اعجاز

دل آویز ہے

"نواب منزل" میں جس روز سے منے میاں کی آمد ہوئی تھی اسی دن سے تمام افراد خانہ ان کے پالنے کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھے تھے گویا منے میاں کوئلے کی دہکتی ہوئی انگیٹھی ہوں۔

خدا جانے اس ننھی سی جان سے ایسے کیا مطالبات منوانا تھے، کون سے مذاکرات کرنا تھے جو چوبیس گھنٹے یہیں دھرنا مارے بیٹھے رہتے۔ منے میاں کی تو مجبوری تھی، منے جو ٹھہرے۔ سارا سارا دن **پنگھوڑے** میں بلا مقصد دائیں بائیں جھولتے رہنا اور ٹکر ٹکر دیکھنا۔ یہ بھی کوئی کام تھا بھلا۔ گھر والوں کے لیے تو وہ باعث تفریح تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نئے انٹرٹینمنٹ چینل کا آغاز ہو گیا ہو۔

گول مٹول سے گورے چٹے منے میاں کو اپنے گرد ہر وقت کا یہ **جمگھٹا** ہرگز پسند نہ تھا، مجال ہے جو تازہ ہوا کا ایک جھونکا ہی گزرنے دیں۔ اس پہ مستزاد اہل خانہ کا مضحکہ خیز انداز گفتگو۔ آپس میں اچھی بھلی بات چیت کرتے جو منے میاں کو با آسانی سمجھ آجاتی لیکن جب منے میاں سے مخاطب ہوتے تو الفاظ کی صحت تلفظ سے بے نیاز و بے پروا ہو کر لفظوں کی وہ ٹانگیں، بازو، گردنیں مروڑتے اور اتنا توتلا تتلا کے بولتے کہ



منے میاں کے پلے ایک لفظ نہ پڑا۔

منے میاں دراصل روز اول سے ہی خاصے حقیقت پسند اور عملی نوعیت کے شیر خوار واقع ہوئے تھے۔ ابھی اپنے پالنے میں ہی تھے کہ قدرت نے انہیں عمیق مشاہدے کی قوت سے مالا مال کر دیا تھا۔ امی حضور نے جب ان کے نرم نرم روئی جیسے ہاتھوں میں جھنجھنا تھمایا اور پھر اسے ہلا جلا کر دکھایا اور سنایا تو ایک سنسنی سی منے میاں کے رگ و پے میں سرائیت کر گئی۔ کسی خوفناک ۔۔۔ سانپ کی پھنکار سے مشابہہ آواز نے ان کے سارے بدن میں سنسناہٹ دوڑا دی تھی منے میاں کے تن بدن میں جاری خفیف سی لرزش دیکھ کے تمام حاضرین کے چہرے پر خوشی و طمانیت کی لہر دوڑ گئی کہ شکر ہے جو منے میاں نے "مثبت رد عمل" کا اظہار کیا ہے۔

بیرونی صدر دروازے پر دستک ہونے پر جب افراد خانہ باری باری کمرے سے رخصت ہوئے تو منے میاں نے چپکے سے اس مکروہ کھلونے کو نہایت آہستگی کے ساتھ پالنے سے نیچے فرش پر لڑھکا دیا لیکن منی جو پلنگ کے دوسری طرف زمین پہ بیٹھی اپنی گڑیا کو دلہن بنانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی 'لپک کے اٹھی اور اس بے یار و مددگار جھنجھنے ۔ کو بصد عقیدت و احترام اٹھا کے 'منے کی بند مٹھی زبردستی کھول کے جبرا" اسے تھما دیا۔ پھر جھک کے منے میاں کے گلابی گلابی گال پہ اس زور سے پیار کیا کہ منی کی دونوں پونی ٹیل کے بال منے میاں کی آنکھوں اور چہرے کی نازک حساس جلد پہ چبھنے اور خارش پیدا کرنے لگے۔

بالآخر ایک روز تو منے میاں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا انہوں نے صدق دل سے منی کی گڑیا کو بد دعا ہی دے ڈالی کہ منی کی گڑیا کو زور سے ٹیکہ (انجکشن) لگے اور وہ چیخیں مار مار کے روئے اس سوچ کے ساتھ ہی منے میاں نے زچ ہوتے ہوئے پوری قوت کے ساتھ اپنی چند روزہ زندگی کے اس اولین "ان پریکٹیکل" کھلونے کو دور چوکھٹ پہ دے مارا۔ عین اسی لمحے پڑوس کی خالہ حبیبن وارد ہوئیں جھنجھنا ان کے سر پر اس زور سے بجا کہ رہے سہے اعصاب بھی جھنجھنا کے رہ گئے۔

"اف میرے خدایا! میں بتائے دے رہی ہوں خیر النساء! تمہارا یہ پوتا مستقبل میں نہایت شریر اور اول نمبر کا ضدی ثابت ہوگا۔ بلاوجہ خلق خدا کو ستانے والا۔ یقیناً" قومی اسمبلی میں بھاری اکثریت سے نشست جیتے گا اور بے گناہ معصوم عوام کو زندگی کی بنیادی سہولیات سے محروم کرکے ہی اسے چین ملے گا۔" خالہ حبیبن اپنا سر تھامے مستقل بڑبڑائے جا رہی تھیں۔ شدت تکلیف سے ان کی کرنجی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے۔ دراصل وہ صبح سے ہی واپڈا اور سوئی گیس والوں پر برہم ہو رہی تھیں۔ آٹے اور چینی کی متوقع قلت کی فکر بھی ستائے جا رہی تھی۔ اتنے سارے بحران اور عوام کی غریب اکیلی جان ۔ آخر غصہ کیسے نکالیں۔ جب بھڑاس کو نکاس کا راستہ نہیں ملتا تو وہ آنسوؤں کی صورت آنکھوں کے رستے بہہ نکلتی ہے۔ سو منے میاں نے جو بھی کیا 'مناسب کیا۔

"اے ہے حبیبن! میرے پوتے کو کیوں کوستی ہو۔ مستقبل کی پیشنگوئیوں کا اتنا ہی شوق ہے تو کسی اخبار رسالے کی راہ لو' وہاں تمہاری زیادہ ضرورت ہے 'غیر معیاری جرائد میں!" دادی جی کی تسبیح تیزی سے گھومنے لگی۔

"ہائے ہائے خیر النساء! یہ تمہارا چار دن کا لونڈا۔ ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے نہیں اسے پیدا ہوئے! بخدا یہ لڑکا بہت ہی فسادی ہے۔ دنیا میں قدم رنجہ فرماتے ہی ہم دونوں پڑوسنوں میں لڑائی بھی کروا دی۔" خالہ حبیبن نے اپنی جوانی کی یادگار "کروشیے" اور دھاگے کے چھوٹے سے گولے کو سمیٹتے ہوئے اپنی کمر سیدھی کی اور کھلکھلا کے ہنس دیں۔

موسم سرما میں خالہ حبیبن کے ہاتھ میں اون سلائیاں ٹک ٹک کرتی رہتیں اور گرمیوں میں کروشیے

کی نازک سلائی دھاگے کو آگے پیچھے بل دیتی رہتی۔

معاً" منے میاں کو تمام اہل خانہ کے ہاتھوں میں ہمہ وقت رہنے والی اشیاء کا خیال آیا مثلاً" منی کے ہاتھ میں ہروقت اس کی گڑیا ہوتی' داداجی کے ہاتھ میں اخبار یا پڑھائی کی عینک' دادی جان کے ہاتھوں میں تسبیح' ابا کے ہاتھ میں قلم کاغذ اور چائے کی پیالی۔ کالم نویس جو ٹھہرے۔ اپیا کے ہاتھ میں ڈائجسٹ' کام والی صفو کے ہاتھ میں جھاڑو' موٹو بھیا کے ہاتھ میں کھانے پینے کی کوئی نہ کوئی چیز اور چاچو منیر کے ہاتھ میں ہروقت تولیہ (وہ کیمسٹری میں ایم ایس سی تھے اور بلا کے وہمی واقع ہوئے تھے) مولوی صاحب کے ہاتھ میں ڈنڈا' ٹیوشن پڑھانے والی مس الماس کے ہاتھ میں کتابیں' فائلیں جبکہ پڑوس کی خالہ حبیبن کی لاڈلی بیٹی سونیا آپا کے ہاتھ میں "میٹھے" کی پلیٹ جس پہ کروشیے کی نازک لیس والا سرپوش دھرا ہوتا۔ وہ ہروقت سولہ سنگھار کیے رہتیں۔

منے میاں کا سونیا آپا کی بابت یہ ذاتی خیال تھا کہ اپنے گھر میں ان کے ہاتھ میں آئینہ ہوتا ہوگا۔ سر کی بال پن سے لے کر پاؤں کے ناخن کی نیل پالش تک وہ جیولری اور کاسمیٹکس کا چلتا پھرتا اسٹال لگتی تھیں کاجل سے اٹی پٹی ان کی آنکھیں جنہیں دادی "کوئلے کی کان" کہتی تھیں' اس "راز" سے صرف منے میاں ہی واقف تھے کیونکہ دادی منے میاں کے علاوہ اور کسی کے سامنے نہیں بڑبڑاتی تھیں۔ سونیا آپا کی کوئلہ زدہ آنکھیں نہ جانے کس کی تلاش میں گردش کناں رہتیں۔ دادی کو بڑا گلہ ہوتا کہ دوپہر میں تیار کی جانے والی سویٹ ڈش' سونیا آپا رات کو کیوں لے کر آتی ہیں بچ رہتی ہوگی تو بچی کھچی اٹھالاتی ہوگی کہ رزق ضائع ہونے سے تو بہتر ہے کہ کسی کے منہ میں پڑجائے اور احسان علیحدہ۔

بہرحال منے میاں کو اگر یہ علم ہو جاتا کہ کمبخت جھنجھنا کس عقلمند کا لایا ہوا تحفہ ہے تو وہ فی الفور اس سوغات سے ہی اس کے خریدار کے سر کا نشانہ باندھتے اب کی بار منے میاں کے دل سے صفو کام والی کے لیے بددعا نکلی کہ منگنی ٹوٹے اس صفو کمبخت کی! جس نے خالہ حبیبن کے مہندی اور ناریل کے تیل سے چپڑے سر سے رگڑ کھائے جھنجھنے کو فرش (جس پہ حال ہی میں فنائل کا پونچھا لگایا گیا تھا) سے اٹھا کر منے میاں کے گال کے ساتھ چپکا دیا۔ نازک مزاج' حساس طبیعت منے میاں اس تند و تیز ناخوشگوار باس کی تاب نہ لاسکے۔ وہ اپنے ہوش و حواس سے بے گانہ ہونے کو تھے کہ سونیا آپا کے کومل وجود نے انہیں نزاکت و احتیاط کے ساتھ اپنے گداز بازوؤں میں بھرلیا۔ نازک اندام ہاتھوں کا لمس اور سونیا آپا کے گلابی رنگ آنچل سے اٹھتی گل یاسمین کے عطر کی دھیمی سی مہک نے منے میاں کے مشام جاں کو معطر کردیا تھا۔ منے میاں کو اپنا وجود موتیے کی نازک کلی کی طرح ہلکا پھلکا سا محسوس ہونے لگا۔

اور ایک اپیا تھیں جو اس زور سے مسل مسل کے پیار کرتیں گویا آٹا گوندھ رہی ہوں یا پھر منے میاں پلاسٹک کے بنے ہوئے کوئی کھلونا ہوں وہ بھی "میڈان چائنا" کی جعلی مہر والا بس یہی لمحہ' فیصلے کا لمحہ تھا اور منے میاں نے اٹل فیصلہ کرلیا تھا کہ جوانی کی دہلیز پر پہلا قدم دھرتے ہی وہ پہلا کار خیر یہی انجام دیں گے کہ سونیا آپا کے گھر اپنا رشتہ بھجوائیں گے باعزت طریقے سے انہیں اپنا شریک حیات بنانے کے لیے۔



منیر چاچو کی ملازمت کو چھ ماہ مکمل ہونے کو تھے اور اب ان کے لیے چاند سی سگھڑ دلہن کی تلاش کا باقاعدہ آغاز ہو گیا تھا۔ بقول دادو بچوں کو ٹیوشن پڑھانے والی مس الماس بہت سلجھی ہوئی' شائستہ اطوار کی مالک اور سادگی کا پیکر تھیں۔ اگرچہ ان کی آواز' لب ولہجہ' انداز گفتگو اور نشست و برخاست' ہر ہر عمل سے سولہویں صدی کی تہذیب و متانت جھلکتی بلکہ ابلتی تھی' رہی سہی کسر موٹے موٹے عدسوں والی پلاسٹک کے کالے فریم والی عینک سے پوری کردی تھی۔ بلاشبہ وہ بزرگ اور معمر خواتین کی اولین پسند قرار دی جاسکتی تھیں بلکہ

منیر چاچو جیسے نوجوان جو اعلا تعلیم یافتہ اور برسرروزگار ہوں' ان پر دوسری نظر ڈالنا گوارا نہ کریں۔

منے میاں کو بھی ان سے کچھ خاص انسیت نہیں تھی۔ سو جب کبھی مس الماس انہیں محبت سے اٹھاتیں اور پچکارتیں تو منے میاں اپنا آدھ پاؤ کا سر گھما کے attitude کے بڑے مظاہرے کرتے۔ پھر بھی مس الماس نظر بد سے بچاؤ کی دعا پڑھ کے منے میاں پہ دم ضرور کرتیں اور ہولے ہولے تھپتھپا کے جھولا برد کردیتیں۔ دوسری طرف سونیا آپا بھی خاصے کی چیز تھیں۔ گھر والوں کی عدم موجودگی میں منے میاں کو ہاتھ لگانا تو درکنار چھونا تک پسند نہ کرتیں بلکہ ناک سکوڑے گھورتی رہتیں اور اپنی اماں' خالہ جبین کے کان میں نہ جانے کن لوگوں کے متعلق تمسخرانہ باتیں کرکے کھی کھی کرتیں۔

حقیقت تو یہ تھی کہ سونیا آپا اور ان کی اماں نے "کوڈورڈز" میں ان تمام اہل خانہ کے فرضی نام رکھے ہوئے تھے پھر بھی منے میاں دل کے ہاتھوں مجبور تھے کہ "دل تو بچہ ہے جی!"

پھر ایک دن وہ ہوا جس کا دور دور تک گماں نہ تھا۔ افراد خانہ دوپہر میں کسی قریبی عزیز کے ہاں عقیقہ کی دعوت میں مدعو تھے۔ ایا بھی خوب سج سنور کے گئی تھیں انہیں "کسی" کو دکھانا مقصود تھا۔ ایک کمرے میں منی اور بھیا مس الماس سے ٹیوشن پڑھ رہے تھے۔ منے میاں قریب ہی اپنے پنگھوڑے میں نیند پوری کررہے تھے۔ ٹیوشن کا ٹائم پورا ہوچکا تھا اب صرف منیر چاچو کی آمد کا انتظار تھا جونہی منیر چاچو دفتر سے گھر لوٹے' مس الماس بچوں کو ان کے حوالے کرکے چلی گئیں۔ جب تک چاچو منہ ہاتھ دھو کے آئے تب تک سونیا آپا بھی گرما گرم گلاب جامن کی چاندی کے ورق اور پستے بادام کی ہوائیوں سے سجی پلیٹ لیے آ گئیں۔

خوشبو اپنی آمد کا پتا دیتی ہے۔ چہار سو گل یاسمین کی بہار سی چھا گئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے سونیا آپا کو آج چاچو کی دفتر سے جلد واپسی کا علم تھا۔ چاچو منیر نے ہاتھ پونچھتے ہوئے گیلا تولیہ صحن کی تار پہ لٹکایا' منی اور بھیا پہ ایک اچٹتی سی نظر ڈالی جو صحن میں شٹاپو کھیلنے میں مگن تھے۔ منیر چاچو سونیا آپا کے ہمراہ چپکے سے منے میاں کے کمرے میں آپہنچے۔

گل یاسمین کی دلفریب مہک سے منہ میاں کی آنکھ بھی کھل گئی تھی۔ چاچو منیر بضد تھے کہ سونیا آپا انہیں یہ گلاب جامن اپنے رس ملائی جیسے نرم و سفید ہاتھوں سے کھلائیں یعنی ایک ٹکٹ میں دو مزے اور سونیا آپا جواب میں شرماتے لجاتے ہوئے اپنا ہاتھ منیر چاچو کے ہاتھ میں گھما رہی تھیں' چھڑا نہیں رہی تھیں۔ منے میاں کا لہو کھول اٹھا۔ مبہم سی کھسر پھسر کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں' بس آواز آرہی تھی' تصویر نہیں۔ پھر چاچو نے قدرے صاف آواز میں فرمائشی پروگرام کو مزید آگے بڑھایا۔

"وہ گانا تو ایک بار گنگنا دو جو تم شکیلہ کی مہندی میں گا رہی تھیں۔ واللہ! فقط ایک بار! ارے وہی والا.... راجا کے ماتھے تلک لگے گا' رانی کی مانگ سیندور۔ میں بھی اپنے من کی آشا پوری کروں گی ضرور۔" منیر چاچو نے اپنے بے سرے ہونے کا ثبوت دیا۔

"اوئی ماں!" سونیا آپا شرمانے کے تمام عالمی ریکارڈ توڑتے ہوئے باہر کی طرف لپکیں۔

"اماں اور بھابھی کو بہت جلد تمہارے گھر بھیجنے والا ہوں۔ بخدا! پھر یہی گھر تمہارا گھر کہلائے گا۔" منیر چاچو کی آواز نے دور تک سونیا آپا کا تعاقب کیا۔ یہ سننے کی دیر تھی کہ منے میاں نے احتجاجاً" عالم غیض و غضب میں زور زور سے گلا پھاڑ کے رونا اور چلانا شروع کردیا چاچو نے جھٹ سے گود میں اٹھالیا' کندھے سے لگا کے تھپکی دی۔ منے میاں نے انتقامی کارروائی کی اور چاچو کے بال اپنی مٹھیوں میں جکڑ کر خوب زور آزمائی کی' ان کی بھنویں نوچ ڈالیں' عینک اتار کے دور دیوار پہ آویزاں "لال شربت" والوں کے کیلنڈر پہ دے ماری۔ اسی پہ اکتفا نہیں کیا بلکہ چاچو کی آنکھوں میں اپنی انگلیاں چبھودیں۔ چاچو درد سے بلبلانے لگے۔ دونوں چچا بھتیجا باہم گتھم گتھا ہوگئے تھے۔ اسی

دوران دروازے پہ دستک ہوئی مس الماس اپنی فائل بھول گئی تھیں۔ گھر میں داخل ہوتے ہی جو انہوں نے یہ شور و غوغا سنا تو جھٹ سے منے میاں کو منیر چاچو کے گود سے لیا۔ منے میاں صدمے سے نڈھال ضرور تھے کہ انہیں چاچو سے یہ امید تو ہرگز نہ تھی کہ وہ اپنے بھتیجے کے حق پر ڈاکہ ڈالیں گے لیکن منے میاں ابھی بھی بقائمی ہوش و حواس تھے۔ انہیں فوری طور پر ایک تجویز سوجھی۔ مس الماس کے کان میں پہنی چاندی کی بالی کو انہوں نے اپنی مٹھی میں جکڑ لیا اور اس زور سے کھینچا تانی کی کہ بالی اتار ہی لی۔ مس الماس کراہنے لگیں۔

یہ بالیاں منے میاں کی دادو نے انہیں ایف اے پاس کرنے پر بطور تحفہ عنایت کی تھیں۔ سو جہاں سے سوغات آئی تھی وہیں واپس چلی گئی۔ مالکوں نے دی تھی، مالکوں نے ہی واپس لے لی۔ دکھ غم کیسا؟

منیر چاچو کھونٹی پہ ٹنگے دادو کے سفید ململ کے دوپٹے پہ گرم گرم پھونکیں مار کے اپنے سوجے ہوئے سوٹوں پہ سکائی کر رہے تھے۔ معاً" منے میاں نے چاچو کی جانب اچکنا شروع کر دیا ادھر مس الماس کو بھی گھر واپس جانا تھا لہٰذا منے میاں کو ایک بار پھر چاچو کے حوالے کر کے اپنی فائل اٹھا کے چلی گئیں۔ منے میاں نے حسب پلاننگ منیر چاچو کی قمیص کی اوپر والی جیب میں مس الماس کی بالی ڈال دی۔

☆ ☆ ☆

"اماں جی! اماں جی! آپ کو کچھ دکھانا ہے۔ یہ دیکھیے! منیر کی قمیص کی جیب سے کیا برآمد ہوا ہے!" منے میاں کی والدہ منیر چاچو کی قمیص الٹ پلٹ کے دادو کو دکھانے لگیں۔

دادو مطمئن تھیں ان کا خیال تھا کہ وجنتی مالا یا سائرہ بانو کی کوئی فوٹو ہوگی کیونکہ منیر چاچو بچپن سے ہی خاصے "فلمی" واقع ہوئے تھے لیکن بہو کی ہتھیلی پہ چاندی کی سرخ و سفید موتیوں والی بالی دیکھ کے وہ بھی حیرت کے سمندر میں ڈوبنے لگیں۔ وہ اس بالی کو بخوبی پہچانتی تھیں۔ لیکن چاچو منیر کی جیب میں مس الماس کی بالی کا کیا کام؟

"اماں! سمجھا کریں ناں۔" منے میاں کی والدہ نے ساس کے کان میں رازدارانہ سرگوشی کی اور تمام تر امکانات سے روشناس کرایا اب دادو اور امی جان نے بطور خاص نوٹ کیا کہ کچھ دنوں سے مس الماس کے دونوں کان خالی تھے۔ دادو کے استفسار پر انہوں نے کان کی ایک بالی کے گم ہونے کا عذر پیش کیا اور ہچکچاتے ہوئے ٹال مٹول سے بھی کام لیا گویا چور کی چوری پکڑی گئی ہو۔ دادو اور امی جان کے ہونٹوں پہ معنی خیز مسکراہٹ تیرنے لگی۔

بے شک اللہ ان کی مدد ضرور کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کریں۔ گھر بھر میں خوشیوں کے شادیانے بج رہے تھے۔ یہ اس دور کا تذکرہ ہے جب موبائل فون ناپید تھے اور بالخصوص شادی بیاہ کے معاملات میں بزرگوں کے سامنے جرات انکار کو اعلا درجے کی بے ادبی و گستاخی شمار کیا جاتا تھا۔ منیر چاچو کا دل چپ چاپ خون کے آنسو بہا رہا تھا جبکہ دلہن بنی مس الماس کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔ منے میاں بوروکیڈ کی سنہری اچکن اور ٹوپی میں نظر لگ جانے کی حد تک خوبرو لگ رہے تھے۔ نوشے میاں سے زیادہ روپ تو شہ بالے پہ آیا تھا۔ سونیا آپا کہیں دکھائی نہ دے رہی تھیں۔ اس دشمن جاں کے بغیر تو منے میاں کی ہر خوشی ادھوری تھی۔

بڑے بھیا کے ہاتھ میں موتی چور کا بڑا سا لڈو تھا جسے وہ پہلا اور آخری لڈو سمجھ کے بہ رضا و رغبت یوں کھا رہے تھے گویا اہم مذہبی فریضہ انجام دے رہے ہوں۔ ایک کونے میں منی ڈھولک سنبھالے اکیلی بیٹھی تھی۔ ڈھولک پہ اپنی دلہن بنی گڑیا ٹکا رکھی تھی جو آج نشو کے کرن لگے سرخ غرارے میں ملبوس تھی۔ ڈھولک کے بے ربط سے ڈھم ڈھم میں منی اپنی ناپختہ آواز میں گانے کا ستیاناس کرنے لگی۔

راجا کی آئے گی بارات
رنگیلی ہو گی رات
مگن میں ناچوں گی

☆ ☆

مصباح نوشین

یہ پل کی ساعتیں

ناولٹ

وہ کچن میں چائے بنا رہی تھی جب منجھلی بھابھی اسماء نے اسے اسلام آباد جانے کی اطلاع دی تھی۔ چچا میاں اس اتوار کو آرہے تھے اسے لینے کے لیے... امی جان نے اجازت دے دی تھی۔ طارق بھیا سے بات کرنا ابھی باقی تھی اور وہ چچا میاں نے یقیناً" خود ہی کرلینی تھی، سو ارفع کو اب اپنی پیکنگ کرنا تھی۔ چچی جان کو عرصہ دراز سے جوڑوں کے درد کا مسئلہ تھا، ہر موسم میں وہ نڈھال رہتیں، خصوصاً" جاڑے کے موسم میں تو ان کی بدحالی عروج پہ ہوتی، سارا گھر نوکروں کے سپرد ہوتا۔ اولاد تو تھی نہیں جو نگرانی کرتی، ایسے میں ہر سردی کے موسم میں چچا میاں آکر ارفع کو اپنے ساتھ لے جاتے، پانچ بھائیوں کی اکلوتی و لاڈلی بہن ارفع بھی سال بھر کے بعد ملنے والی اس آؤٹنگ کی بے حد شوقین و دلدادہ تھی۔ چچا میاں بہت بڑے نیوکلیئر انجینئر تھے۔ ان کا سرکل خاصا وسیع تھا۔ آئے روز پارٹیز اور ایگزیکٹو ڈنرز ہورہے ہوتے، جس میں چچا میاں کی فیملی بطور خاص مدعو کی جاتی، خصوصاً" ہرویک اینڈ یا تو چچا میاں کے گھر کوئی پارٹی ہوتی یا ان کے فرینڈز یا کولیگز کے ہاں... ارفع کو ایسا لائف اسٹائل بہت پسند تھا۔ دل سے ایسے روٹین لائف کی متمنی وہ سال بھر جاڑے کے موسم کی آمد کا انتظار کیا کرتی، جبکہ ان کے گھر کا ماحول تھوڑا دبا دبا سا تھا۔ مذہبی اور روایات کا پابند... یہی وجہ تھی کہ وہ ذہنی طور پر اپنے ماحول سے خاصی خائف رہتی تھی۔ اسی لیے بھابھی کے بتانے پر وہ فوراً" سے بیشتر امی جان سے تصدیق کرنے کو بھاگی تھی۔ چائے لے کر کمرے میں آئی تو امی جان جائے نماز تہ کرکے پلٹ رہی تھیں۔

"گرما گرم چائے حاضر ہے امی جان؟" وہ ان کے بیڈ کی طرف آنے پر فوراً" بولی اور آگے بڑھ کر چائے کا گرم گرم کپ پکڑا دیا۔

"جیتی رہو؟ شام کو اسماء کے ساتھ بازار چلی جانا، اپنے لیے کچھ نئے کپڑے وغیرہ خرید لینا۔" انہوں نے جیسے یاد آنے پہ فوراً" کہا تھا۔

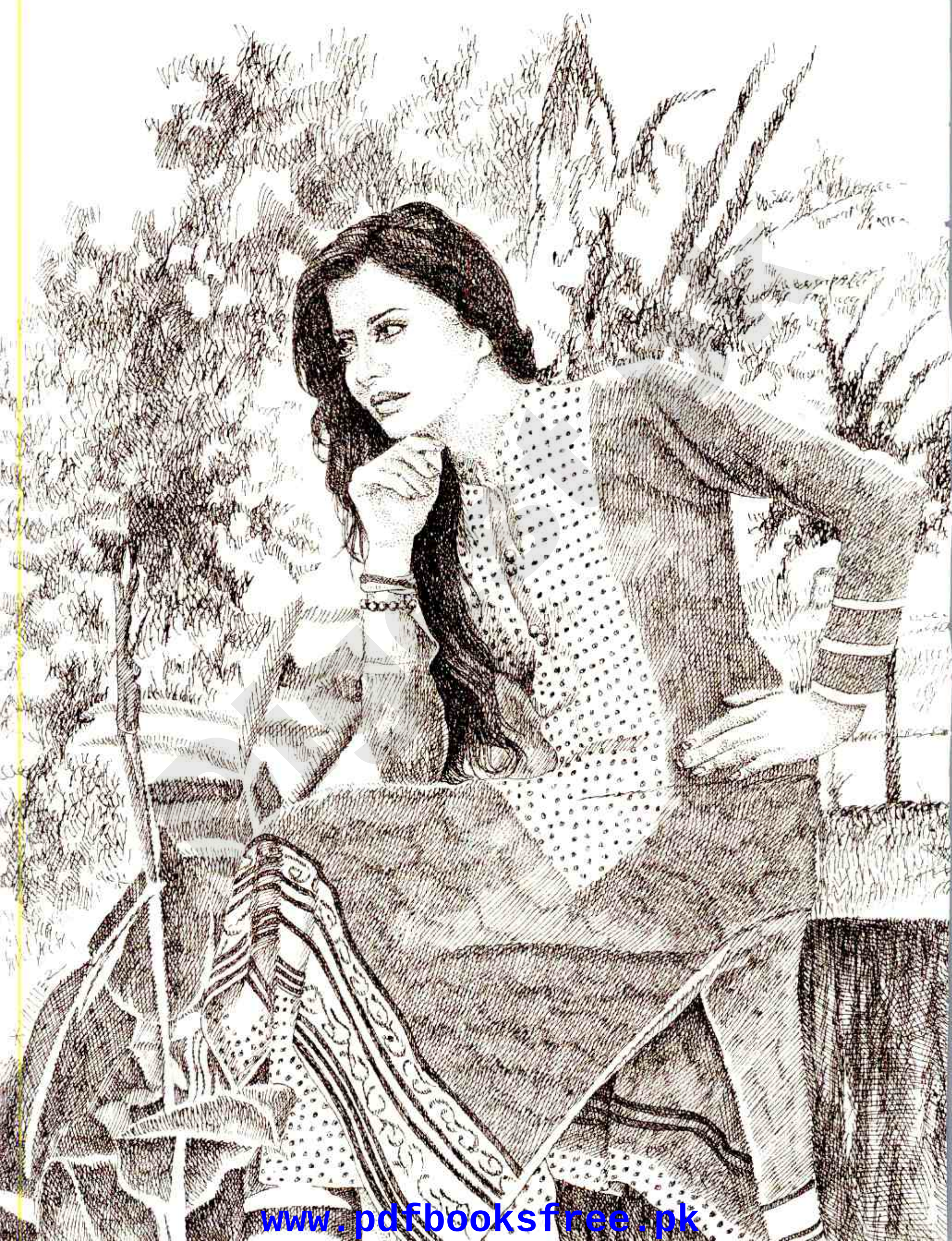
"ارے... نئے کپڑے کس لیے امی جان۔" اس نے حیران ہونے کی شاندار ایکٹنگ کی۔

"جمال بھائی کا فون آیا تھا۔ اتوار کو لینے آرہے ہیں تمہیں... تین، چار ماہ تو تمہیں وہیں پہ رہنا ہوگا نا... کافی سارے کپڑوں کی ضرورت ہوگی تمہیں۔" انہوں نے تفصیل بتائی۔

"کب آرہے ہیں چچا میاں۔" من میں پھوٹتے لڈوؤں کو چھپائے بظاہر سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"اس اتوار کو... ابھی تین دن ہیں تم آج ہی کپڑے لے آؤ، نجمہ سے کہہ کر ارجنٹ سلوالو، سلائی کے زیادہ پیسے دے دیں گے۔" انہوں نے حل تراشا۔

"وہیں جاکر خرید لوں گی، اسلام آباد کے فیشن کے مطابق... چچی جان بھی تو لے کردیں گی نا۔" اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ مبادا امی جان کا موڈ ہی نہ خراب ہوجائے۔



"بری بات ارفع! جب خود خرید سکتی ہو تو پھر پرائی آس رکھنے کا کیا فائدہ... اور پھر دبا بے چاری تو خود سے بھی بے زار رہتی ہے' وہ کیسے جا پائے گی تمہارے ساتھ بازار؟" امی جان نے فوراً" اس کی کھنچائی کی تھی۔

"سوری امی جان... لیکن میرا مطلب وہ نہیں تھا جو آپ سمجھ رہی ہیں' میں بس اتنا کہنا چاہ رہی تھی کہ ان کا رہن سہن ہمارے ماحول سے بہت مختلف ہے۔ ہر روز تو ان کے ہاں اتنے امیر' امیر دوست احباب آرہے ہوتے ہیں' ان سب سے مجھے ملنا ہوتا ہے اور وہ سب اتنے مہنگے اور جدید تراش خراش کے لباس پہن کر آتے ہیں کہ ان کے درمیان میں اپنے سادہ کپڑوں میں ملبوس احساس کمتری محسوس کرتی ہوں' پچھلی بار بھی چچی نے میرے سارے کپڑے اٹھا کر الماری میں رکھوا دیے تھے اور اپنے ڈیزائنر سے کہہ کر میرے لیے لباس تیار کروائے تھے۔ میں تو بس اس وجہ سے کہہ رہی تھی؟" نروٹھے پن سے وضاحت کرتی ارفع اس سمے امی جان کو بے حد پیاری لگی۔

"دیکھو بیٹا! لوگوں سے یوں متاثر ہونا چھوڑ دو... ہر انسان کو اپنے نصیب کا ملتا ہے اور ہمیں چاہیے کہ ہم ہر حال میں اپنے رب کے شکر گزار بنیں... خود پر اور اپنی پہچان پر فخر کرنا سیکھو' کیونکہ ہم اپنی ذات میں بذات خود منفرد ہیں' لوگ ہمیں کاپی کریں' ناکہ ہم ان کی... اور پھر یہ بھی تو سوچو کہ ان کے درمیان تم اپنی سادگی میں کتنی منفرد اور پیاری لگتی ہوگی تمہاری شناخت و پہچان مہنگے لباس اور میک اپ کی محتاج نہیں ہونی چاہیے؟"

"سوری امی جان۔" ارفع کا سر مارے شرم کے جھک گیا تھا۔ واقعی میں وہ کیوں اتنی سطحی سوچ کی حامل ہو رہی تھی' واقعی اللہ کا دیا سب کچھ تو تھا ان کے پاس' مگر ان کے خاندان کی سادگی اور مذہبی اقدار کی پاسداری ان کے خاندان کے مثالی وصف تھے اور ان پر ارفع کو فخر ہونا چاہیے تھا نا کہ احساس کمتری۔

☆ ☆ ☆

آفیسرز کالونی میں شام کے سائے بتدریج پھیل رہے تھے۔ جب ان کی گاڑی پورچ میں رکی تھی۔ اس وقت مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں' دن بھر کا سفر کرنے کے باوجود بھی ارفع بہت ترو تازہ سی تھی' یہ خوشی شاید اس کے چچا میاں کے گھر آنے کی وجہ سے تھی اس نے ایک طائرانہ نگاہ پورے گھر پہ ڈالی تھی۔ وہ جب بھی ان کے گھر آتی کوئی نہ کوئی تبدیلی اس کی منتظر رہتی تھی۔ اس وقت بھی وہ خوشی سے چیخ کر لان میں بھاگی تھی۔ جس کے بیچوں بیچ گلاب کی بکھری پتیوں سے مشابہہ فوارہ بہہ رہا تھا۔ جو کہ پچھلے سال نہیں تھا اور جسے یقیناً" حال ہی میں تعمیر کروایا گیا تھا۔

"اللہ چچا میاں... یہ..." وہ خوشی و حیرت کے ملے جلے جذبات کے زیر اثر ان کی جانب پلٹی تھی۔ جمال اکبر ہنستے ہوئے قریب چلے آئے۔

"میری بیٹی کی فرمائش تھی اس کے آنے سے پہلے پوری بھی تو کرنی تھی نا۔" پیار سے اس کے سر پہ ہلکی سی چپت لگا کر انہوں نے اس سے کہا تھا۔ وہ چچا میاں اور چچی کی بے حد لاڈلی تھی۔ پچھلے سال اس نے ہی چچا میاں کو سرسری سا یہاں فوارہ بنوانے کا مشورہ دیا تھا۔

اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ چچا میاں اس کی بات کو اتنی اہمیت دیں گے۔

"شکریہ چچا میاں... دیکھیں تو کتنا پیارا لگ رہا ہے۔" وہ بچوں جیسی خوشی سے چہکتے ہوئے بولی تھی۔

"چلو اب اندر آجاؤ' کافی ٹھنڈ ہوگئی ہے۔" وہ اسے لیے اندر آگئے تھے' جہاں لاؤنج میں صوفے پر نیم دراز دیبا چچی ان دونوں کی آمد کی منتظر تھیں۔ ارفع نے دیکھا' لاؤنج کی ساری سجاوٹ نئے سرے سے کی گئی تھی۔ قالین و پردے' میچنگ صوفوں کے ساتھ تھے۔ حتیٰ کہ لاؤنج میں آن ہیٹر باڈی کا رنگ بھی ٹی وی لاؤنج کی آرائش سے ہم رنگ تھا۔

"اس دفعہ تو بہت سے سرپرائز میرے منتظر ہیں چچی جان۔" ان سے گلے ملتے ہوئے خوشی سے بھرپور آواز

میں چھکتے اس نے گھر میں کی گئی سجاوٹ سے متعلق کہتے انہیں چھیڑا تھا۔

"یہ تو ہم نے اپنی بیٹی کے استقبال کی تیاریاں کی ہیں میری جان۔" محبت سے اپنے کیوٹکس سے سجے لمبے ناخنوں والے ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر چومتے انہوں نے جواباً" کہا تھا۔ ارفع نہال ہو گئی۔

"میں تو یہاں آنے کے لیے ترس گئی تھی۔ اس دفعہ تو سردیاں بھی کافی لیٹ شروع ہوئیں؟"

"تو کہہ دیتیں۔ میں بلوالیتی۔" دیبا چچی نے فوراً" کہا تھا جبکہ چچا میاں چینج کرنے اپنے کمرے میں چلے گئے تھے۔ ملازم کولڈ ڈرنکس لے آیا تھا۔ ارفع نے تھام لی مگر چچی نے ٹھنڈا پینے سے انکار کر دیا تھا۔

"طارق بھیا کہاں آنے دیتے ہیں چچی جان۔ تین' چار ماہ کتنے مشکل سے رہ پاتی ہوں آپ کے پاس' جانتی تو ہیں آپ بھی؟"

"تمہاری امی بھی تو وہاں اکیلی ہوتی ہیں نا۔ ورنہ میرا تو خود دل نہیں چاہتا تمہیں بھیجنے کو۔۔۔ رونق لگی رہتی ہے تمہاری وجہ سے تو۔۔۔" دیبا چچی نے بھی فوراً" پیار جتایا تھا۔

"اس دفعہ تو بہت فریش لگ رہی ہیں' بیمار تو کہیں سے نہیں لگ رہیں؟" ارفع نے ان کے نئے ہیئر اسٹائل اور چمکتی جلد کو دیکھتے انہیں چھیڑا تھا۔ دیبا چچی مسکرادی تھیں۔

"تو کیا کرتی' بیماری کا ناٹک نہ کرتی تو تم نے بھلا کہاں آنا تھا؟"

"ہاں یہ بات تو ہے؟" دونوں ایک ساتھ ڈھیرے سے ہنس دی تھیں۔



دوسرے روز وہ تھوڑا لیٹ اٹھی' رات بھر جاگ کر اس نے اور چچی نے باتیں کی تھیں' سو صبح کافی دیر تک سوئی رہی تھی' وہ جب نہا دھو کر کمرے سے باہر نکلی تو چچا میاں آفس جا چکے تھے اور چچی لان میں بیٹھی دھوپ سینک رہی تھیں۔ نومبر کا دوسرا ہفتہ چل رہا تھا۔ صبح اور شام کو ہلکی ہلکی دھند پڑتی' جبکہ گیارہ بجے دھوپ نکل آئی۔ وہ ان کے نزدیک چلی آئی۔ دیبا چچی اسے دیکھ کر والہانہ مسکرادیں۔

"السلام علیکم چچی جان' صبح بخیر۔" وہ ان کے گلے لگی ان کے گال چومتی بولی تھی۔ جواباً" انہوں نے بھی اسے گال چوم کر صبح بخیر کہا تھا۔

"ناشتا کرلیا آپ نے؟" اب وہ ان کے سامنے رکھی کین کی کرسیوں میں سے ایک پر ان کے مقابل بیٹھی پوچھ رہی تھی۔

"میں نے تو صبح ہی کرلیا تھا تمہارے چچا کے ساتھ' تم نے حاجرہ کو اپنے لیے ناشتا بنانے کو کہا؟"

"جی۔۔۔ بس لے کر آتی ہی ہوگی۔" کہنے کے ساتھ وہ اپنے لمبے بال' جو کہ نہانے کی وجہ سے کافی گیلے تھے۔ پشت پہ بکھیر کر انہیں سہلانے لگی تھی۔ دیبا چچی نے ستائشی انداز میں اس کے لمبے بالوں کو دیکھا تھا' پھر توصیفی انداز میں بولی تھیں۔

"تمہارے بال تو ماشاء اللہ مزید لمبے ہوگئے ہیں۔" وہ ان کی تعریف پہ مسکرائی' مگر جملے کے اختتام پہ سٹپٹائی۔

"کیا خیال ہے کٹوانہ دیں' کسی اچھی شیپ میں؟" وہ مائل بہ شرارت تھیں۔

"کیوں مروانے پہ تلی ہیں چچی جان' پچھلی مرتبہ بھی امی نے خوب صلواتیں سنائی تھیں اور بھابھی نے الگ بھیا کے کان بھرے تھے۔"

"کیوں رفیعہ تو خود ہر وقت نت نئے اسٹائل بنواتی ہے۔ اس نے ایسی بات کیوں کی؟" دیبا چچی کے لہجے میں حیرت تھی۔

"اس لیے کہ ان کے خیال میں کنواری لڑکی کو فیشن کرنا زیب نہیں دیتا۔ شادی شدہ کی الگ بات ہے۔" وہ تلخی سے کہتی مسکرائی۔ دیبا چچی کو اس کی بات سن کے اچنبھا اس لیے نہیں ہوا کہ وہ رفیعہ کی فطرت سے آگاہ تھیں۔

طارق بھائی گھر کے بڑے بیٹے تھے۔ اس حساب سے پورے گھر کی ذمہ داری ان پہ تھی۔ وہ جتنے کو آپریٹو

تھے رفیعہ بھابھی اسی قدر نان کو آپریٹو' حالانکہ پانچوں بھائی شادی شدہ تھے۔ اپنی اپنی کفالت خود کرتے تھے۔ صرف ارفع اور والدہ کی ذمہ داری طارق بھیا نے بخوشی اپنے کندھوں پہ لے رکھی تھی اور وہ بھی رفیعہ بھابھی کو خوب کھلتی تھی ارفع کے ابا کا بینک بیلنس ارفع کے جہیز اس کی تعلیم اور امی جان کی ضروریات زندگی اور علاج معالجے کے لیے مختص ہونے کے باوجود بھی رفیعہ بھابھی کا بس نہیں چلتا تھا کہ ان دونوں ماں' بیٹی کو کسی جادو کے منتر سے کہیں گم کردیں۔ حالانکہ طارق بھائی سے چھوٹے ابتسام بھائی اور پھر فرخ اور غفور بھائی الگ اپنی اپنی جگہ پہ کتنی ہی مرتبہ انہیں اپنے ساتھ رہنے پہ اصرار کرچکے تھے۔ مگر امی جان نہیں مانتی تھیں۔ طارق بھائی تو اچھے تھے۔ ان دونوں کا خوب خیال بھی رکھتے تھے۔ ان میں سے کسی کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کرکے نہ تو وہ طارق بھائی کو دکھی کرنا چاہتی تھیں اور نہ ہی اپنا بھرم گنوانا۔ سو مسائل کا ایک حل خاموشی میں تھا اور وہ خاموش تھیں۔

"تمہارے لیے کچھ کپڑے بنوائے ہیں میں نے۔" ناشتا کرتے ارفع کے ہاتھ لمحہ بھر کو تھمے۔

"کیا فائدہ چچی جان... بعد میں کون سا پہن پاؤں گی۔ آپ پلیز اتنا تکلف مت کیا کریں؟" دیبا چچی کو معلوم تھا۔ یہ سب وہ رفیعہ کی وجہ سے کہہ رہی تھی۔

"میں اس دفعہ تمہیں سادہ کپڑے بنوا کردوں گی' جہاں عالم سے کہا ہے میں نے۔" انہوں نے خلاف توقع اس کی بات سے مخالفت نہیں کی تھی۔ نہ ہی بحث' خاموشی سے اپنے ڈیزائنر کا نام بتادیا تھا۔

"فیشن صرف یہ ہی تو نہیں ہوتا کہ آپ ایسے لباس کا انتخاب کریں جن کا کٹ اور اسٹائل آپ کی عریانی یا برہنگی ظاہر کرے۔ بلکہ آپ مکمل اور جامع لباس پہن کر بھی فیشن ایبل نظر آسکتے ہیں۔" اس کے تذبذب کے جواب میں جہاں عالم نے کہا تھا۔ وہ خاموش ہورہی اور پھر واقعی میں جہاں عالم نے جدید تراش اور اسٹائل کے مختلف اقسام کے انگرکھا اسٹائل فراک' چوڑی دار پاجامے' گھیر والی فراکیں کرتے اور لمبی قمیصیں بنا کردی تھیں جو دیدہ زیب بھی تھیں اور عریانی کا خدشہ بھی نہیں تھا۔ کسی کے دامن پر کام تھا تو کسی کے گلے پر بیل تھی' غرض ہر طرح سے تمام ملبوسات قابل ستائش تھے۔



پمز میں وہ دیبا چچی کا منتھلی چیک اپ کروانے آئی تھی۔ ڈاکٹر سے انہوں نے کل شام ہی اپائنٹ منٹ لے لی تھی۔ آج اس نے جہاں عالم کی ڈیزائن کردہ گھیردار فراک' چوڑی دار پاجامے کے ساتھ پہن رکھی تھی۔ اپنے لمبے بالوں کو کیچر میں مقید کیے چند ایک لٹیں چہرے کے اطراف میں جھول رہی تھیں۔ لائٹ پنک لپ اسٹک لگائے وہ صحیح معنوں میں بہت پیاری لگ رہی تھی۔ اتنی تیاری وہ عام طور پر کسی شادی میں جانے پر کرتی تھی۔ مگر چچا کے گھر اسے ہر وقت خود کو بالکل ایسے ہی مین ٹین رکھنا پڑتا تھا۔ چیک اپ کے بعد وہ چچی کو وہیں پہ بٹھا کے اسپتال میں سامنے نظر آتے میڈیکل اسٹور سے دوائیاں لینے چلی گئی تھی۔ وہ ارگرد سے بے نیاز بہت اعتماد کے ساتھ چلتی ہوئی میڈیکل اسٹور کی انٹرنس پر پہنچ کر اپنی مطلوبہ ادویہ کے لیے اٹنڈنٹ کو میڈیسن سلپ دے رہی تھی۔ جب ہی اسے اپنی پشت پہ کسی کی نگاہوں کا ارتکاز محسوس ہوا تھا۔ وہ بے اختیار پیچھے مڑی تھی۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس نے اپنا موبائل وہیں کاؤنٹر پہ رکھا اور خود کارنر میں بنے بک ریک کی طرف بڑھی تھی۔ اس کا موبائل بالکل بھی اچھی کنڈیشن میں نہیں تھا جو اسے اس کی چوری کا ڈر ہوتا' کسی کا بینڈیج کرواتا ہاتھ سرعت سے ارفع کے موبائل فون کی طرف بڑھا تھا۔ اس کا نمبر نوٹ کیا جاچکا تھا۔



آفریدی ہاؤس میں پارٹی فنکشن تھا۔ سوائے چچی کے ہمراہ لازمی شرکت کرنا تھی۔ چچی نے خود اس کا

میک اپ کیا تھا۔ گہرے گلابی رنگ کے کرتے پاجامے میں کھلے بالوں کے ساتھ وہ بے حد موہنی لگ رہی تھی۔ کانوں میں دیبا چچی نے اپنے ڈائمنڈ کے ٹاپس پہنا دیے تھے۔ جن کی منعکس ہوتی روشنی اس کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے اس کی دلکشی میں اضافہ کیے دے رہی تھی۔ جی تین میں ان کا محل جیسا سفید بنگلہ تھا۔ ان کے داخل ہونے پر حاضرین محفل نے ایک طائرانہ نگاہ ڈالی تھی۔ مگر ایک شخص پلکیں جھپکانا بھول گیا تھا۔

شبیر جان اٹالین ریسٹورنٹس کے مالک جن کے ہوٹلز کی چین تھی۔ ملائیشیا سے اپنے اسلام آباد میں کھلنے والے اٹالین کیفے کا افتتاح کرنے کے لیے آئے اس پارٹی کے مہمان خصوصی.... سب کی توجہ کا محور وہ تھے۔ مگر ان کی توجہ کا مرکز وہ سادہ سی لڑکی تھی جو پارٹی میں نظر آتی باقی تمام لڑکیوں سے منفرد تھی۔ جسے کل شام انہوں نے میڈیکل اسٹور پر دیکھا تھا۔ ان کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ یوں انہیں دوبارہ نظر آئے گی۔ جسے دیکھتے انہوں نے ایک بے اختیارانہ و بے ساختہ حرکت کی تھی۔ حالانکہ وہ اڑتیس سالہ میچور مرد تھے۔ مگر —— ٹین ایج لڑکوں کی طرح سے کل پہلی چوری کی تھی۔ انہوں نے اس لڑکی کا فون نمبر چرایا تھا۔ جس کا وہ نام تک نہیں جانتے تھے۔ یہ تک نہیں کہ وہ شادی شدہ تھی یا غیر شادی شدہ... گاڑی کا ٹائر بدلتے ان کا ہاتھ زخمی ہوا تھا۔ اس لیے بینڈیج کروانے کا سوچ کر ہی قریبی میڈیکل اسٹور پہ گاڑی روکی تھی۔ آج ڈرائیور ان کے ساتھ نہیں تھا اور اچھا ہی ہوا کہ نہیں تھا' ورنہ ان کی بے اختیاری دیکھ کر کیا سوچتا۔

اپنی اڑتیس سالہ زندگی میں ان کے ... لڑکیوں سے افیئر زرہ چکے تھے۔ مگر کوئی لڑکی بھی شادی کے لیے ان کے من کو نہیں بھائی تھی۔ ان کے سب دوست احباب شادی شدہ تھے اور بہت اچھی زندگیاں گزار رہے تھے اور ان سب کے اصرار کے باوجود بھی وہ شادی کے لیے ہامی نہیں بھرتے تھے۔ کیونکہ جیسی لڑکی انہیں چاہیے تھی ویسی لڑکی ابھی تک انہیں ملی ہی نہیں تھی۔ مگر کل شام انہیں اپنی تلاش ختم ہوتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ بے اختیار نفیس احمد آفریدی اور ان کی مسز کی جانب بڑھے تھے۔ جو ان لوگوں کو ویلکم کر رہے تھے۔ وہ ان کے نزدیک چلے آئے۔ ارفع نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کے شبیر جان کو دیکھا تھا۔ وہ بالکل ویسے ہی تھے جیسا کوئی بھی ویل آف رئیس زادہ ہو سکتا ہے۔ ارفع کی نظریں جھک گئی تھیں۔ مگر شبیر اپنی نگاہیں نہیں جھکا پائے تھے۔ مسز آفریدی نے ان کا تعارف چچا میاں اور دیبا چچی سے کروانے کے بعد ارفع سے کروایا تھا۔

"یہ ارفع ہے، جمال صاحب کی اکلوتی و لاڈلی بھتیجی۔" مسز آفریدی کی بات پہ انہیں لمحے بھر کو حیرت ہوئی تھی۔ تو کیا وہ ان کی بیٹی نہیں تھی۔

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ارفع۔" نگاہوں میں اس کے سراپے کو سراہتے انہوں نے خوشدلی سے کہا تھا۔ ارفع ان کی نگاہوں کی گرمی سے پگھلی جا رہی تھی۔ جواب بھی نہ دے سکی۔ مارے شرم کے سر مزید جھک گیا اور شبیر جان کا دل بھی گویا ارفع کے قدموں میں گھٹنے ٹیکنے کو بے قرار تھا۔ ایک لمحے نے ان کی زندگی بدل دی تھی۔ انہوں نے ایک بھرپور نظر دوبارہ

ارفع کو دیکھا۔ اپنی نسوانیت کی حفاظت کرتی مشرقی لڑکی پوری آب و تاب سے ان کے من کے سنگھاسن پہ براجمان ہو چکی تھی۔

"پانچ تاریخ کو میرے اٹالین کیفے کا انوگریشن ہے۔ آپ کی وہاں شمولیت میرا مان بڑھائے گی۔" چلتے چلتے انہوں نے رک کر چچا میاں کو دعوت نامہ دیا تھا۔

"جی ضرور۔۔۔ ہم لازمی شرکت کے لیے آئیں گے۔ آپ کی ذرہ نوازی ہے کہ آپ نے ہمیں اس قابل سمجھا۔" دیبا چچی نے فوراً" جواباً" کہا تھا۔ وہ گفتگو کے فن سے واقف تھیں۔ خوب جانتی تھیں کہ کس کو کس طرح سے ڈیل کرنا ہے۔ ارفع متاثر ہوئے بغیر رہ نہ سکی تھی۔

"ارفع کے لیے الگ سے انوی ٹیشن ہے؟" انہوں نے یاد دہانی کروانا ضروری سمجھا۔ وہ پھر بھی چپ رہی تھی۔

"جی کیوں نہیں، یہ بھی ضرور آئے گی۔" دیبا چچی نے فوراً" بات کو سنبھالا تھا۔



"آج مجھے تم پر بہت غصہ آیا؟" گھر آنے کے بعد دیبا چچی نے فوراً" اس سے کہا تھا۔

"کیوں۔۔۔ کیا ہوا؟" ارفع کے لہجے میں اچنبھا تھا۔

"شبیر تمہیں کھا تو نہیں جاتا، اگر اس سے اچھے طریقے سے بات کرلیتیں تو۔" ارفع کی اٹکی سانس بحال ہوئی۔

"تین مرتبہ اس نے تمہیں مخاطب کیا اور تینوں مرتبہ تمہاری طرف سے جواب ندارد۔۔۔ ویسے تو اتنی کانفیڈنٹ بنتی ہو اس وقت اعتماد کے ساتھ ایک لڑکے سے بات نہیں کر سکیں، کتنی سبکی ہوئی مجھے، تم اندازہ نہیں کر سکتیں۔" وہ اچھا خاصا ناراض تھیں۔

"چچا میاں کی موجودگی میں، میں ان سے کیا بات کرتی۔" وہ منمنائی، مگر چچی ذرا بھی متاثر نہیں ہوئیں۔

"جیسے وہ تم سے کر رہا تھا۔۔۔ اور پھر صرف حال چال ہی تو پوچھ رہا تھا۔ رہی بات تمہارے چچا میاں کی تو وہ کنزرویٹو بالکل بھی نہیں ہیں۔" انہوں نے اس کے ایکسکیوز کو چٹکی میں اڑایا۔

"اوہو چچی جان آپ خوامخواہ ٹینشن لے رہی ہیں۔ انہیں تو یاد تک نہیں ہوگا اور پھر میری ان کے سامنے کیا حیثیت، وہ تو صرف چچا میاں کو جانتے ہیں اور وہ ان سے بہت اچھے طریقے سے ملے ہیں۔"

"تم نہیں سمجھوگی۔" دیبا چچی نے سر پیٹنے والے انداز میں کہا تھا۔



اور یہ ارفع کی خام خیالی تھی کہ انہیں یاد نہیں ہوگا۔ وہ کپڑے چینج کرکے بیڈ تک آئی ہی تھی کہ ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھا اس کا موبائل بجنے لگا تھا۔ رات کے ساڑھے بارہ بج گئے تھے۔ اس وقت تو گھر والے فون نہیں کیا کرتے تھے۔ اس نے نمبر اٹھا کر دیکھا تو انجان تھا۔ بے دلی سے اس نے فون ریسیو کیا تھا۔ اس کے ہیلو کے جواب میں کسی نے اپنی سماعتوں میں رس انڈیلتی آواز میں پوچھا تھا۔

"ارفع۔۔۔" وہ چونکی، اجنبی تو اس کے نام سے بھی واقف تھا، مگر اس کے لیے تو نمبر و آواز دونوں ہی انجان تھے۔

"جی۔۔۔" وہ نہ جانے کیوں ہکلا سی گئی۔ دوسری جانب کوئی زندگی سے بھرپور ہنسی ہنسا تھا۔

"کیسی ہیں۔" اللہ اللہ اپنائیت کی حد تھی، مگر وہ ہنوز انجان۔

"شبیر بات کر رہا ہوں۔" انہوں نے آہستگی سے کہتے بم پھوڑا۔ ارفع حق دق رہ گئی۔

"کون شبیر؟" اس نے سرسری لہجہ اپناتے لاعلمی کا اظہار کیا۔ مگر شبیر جان بدمزا نہیں ہوئے۔ وہ محظوظ سے انداز میں ہنس دیے۔ جیسے وہ اسی سوال کی توقع کر رہے تھے۔

"آج شام پارٹی میں ملاقات ہوئی تھی آپ کے ساتھ، اپنے اٹالین کیفے کی انوگریشن پارٹی کے لیے آپ کو مدعو کرنا چاہ رہا تھا۔ اس لیے اس وقت آپ کو

زحمت دی ہے۔" وہ بہت شستہ آواز و انداز میں اپنی فون کال کی وضاحت کررہے تھے۔

"یہ کون سا وقت ہے؟" ارفع نے بگڑتے پوچھا۔

"صبح تک کا انتظار کرتا تو پھر آپ کبھی بھی پہچان نہ پاتیں' ابھی چند گھنٹے پہلے کی ملاقات تو آپ کے حافظے میں محفوظ رہ نہیں پائی۔" وہ بہت دھیمے انداز میں طنز کررہے تھے۔ ارفع کو خجالت محسوس ہوئی۔ اسے ربا چچی کی بات یاد آئی تو لہجہ فوراً" ہموار کرتے جواب دیا۔

"ارے نہیں اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔" وہ دھیمے سروں میں ہنسی تھی۔ دوسری جانب شبیر جان کو لگا جیسے مندر کی ساری گھنٹیاں ایک ساتھ گنگنا اٹھی ہوں۔

"چلیے پھر تو آپ کو یاد رہے گا نا ایک بندہ ناچیز پرسوں شام اٹالین کیفے میں آپ کے لیے محو انتظار ہوگا۔"

"میں کوشش کروں گی آنے کی۔" ارفع نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ اسے ان کا انداز گفتگو بہت اچھا لگا تھا۔

"آپ وعدہ کررہی ہیں نا؟" شبیر جان نے فوراً" بے تابی سے پوچھا تھا۔

"میں نے کہا کوشش کروں گی؟" نچلے لب کا کونا دباتے اس نے شرارت سے کہا تھا۔

"اور مجھے یقین ہے کہ آپ آئیں گی۔" شبیر جان کے لہجے میں یقین بول رہا تھا۔

"اللہ اللہ اتنا اعتماد.... کس پر؟" ارفع کو اس شخص میں دلچسپی محسوس ہوئی۔ جب ہی بات سے بات نکلی جارہی تھی۔ فوراً" نیا سوال داغ دیا' شبیر اس بار کھل کر مسکرائے۔

"آپ پر...." ارفع جی بھر کے حیران ہوئی۔ اس کے لیے قطعی انجان شخص اس پر اتنا اعتماد کرتے اس قدر پریقین تھا۔

"میں سمجھی نہیں آپ کا مطلب؟"

"سمجھ جائیں گی جب یہ انتظار آپ کو وہاں پر لے آئے گا۔" ان کے لہجے میں اب کی بار پہلے سے زیادہ یقین تھا۔ ارفع چاہتے ہوئے بھی تردید نہ کرپائی تھی۔

”رکھتا ہوں۔۔۔ پرسوں شام پانچ بجے۔“ انہوں نے جاتے جاتے یاددہانی کرائی۔

”ارے۔۔۔ ایک بات تو میں پوچھنا ہی بھول گئی؟“ اچانک یاد آنے پہ اس نے پوچھا تھا۔

”جی فرمایئے۔۔۔ میں ہمہ تن گوش ہوں؟“ اف اتنی شستہ اردو وہ ملایشیا میں رہ کر بولتا تھا اور ہم پاکستان میں رہ کر نہیں بولتے‘ ارفع کو اپنی سوچ پر خود ہی شرمندگی ہوئی۔

”آپ کو میرا نمبر کہاں سے ملا؟“

”حالانکہ یہ سوال آپ کو سب سے پہلے پوچھنا چاہیے تھا۔“

”چلیں یاد تو آگیا۔۔۔ آپ بتائیں۔“ اپنی خجالت مٹانے کو اس نے دھونس جمائی۔

”لمبی کہانی ہے‘ کبھی فرصت ہوئی تو بتاؤں گا۔“ کہتے انہوں نے کھٹاک سے فون بند کردیا تھا۔ ارفع فون کو ہاتھ میں لیے سوچتی رہ گئی۔



دوسرے روز جانے کیوں‘ مگر وہ دیبا چچی کو رات آنے والی شبیر جان کی کال کے متعلق نہیں بتا پائی۔ حیرت و استعجاب میں گھری وہ دن بھر اس فون کال کے سحر میں کھوئی رہی تھی۔ رہ رہ کر اسے ان کا دلفریب انداز گفتگو یاد آتا رہا۔ کھلا ڈلا دوستانہ انداز۔۔۔ غرور و تکبر سے مبرا۔۔۔ کبھی خوش ہوتی‘ کبھی الجھ جاتی‘ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا سارا معاملہ شبیر جان فطرتاً ایسے تھے یا صرف بطور خاص اسے ہی اتنی زیادہ عزت و احترام اہمیت کے ساتھ بخش رہے تھے۔ اس نے دل میں مصمم ارادہ کرلیا تھا وہاں جانے کا‘ کیونکہ پارٹیز اور گیدرنگ کے شوقین چچا میاں بھی ایسا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا کرتے تھے۔

اسی شام طارق بھائی چلے آئے۔ اسے یہاں آئے تقریباً دو ہفتے تو ہو ہی چکے تھے۔ فون پہ البتہ روزانہ باقاعدگی سے بات ہوتی‘ پھر بھی وہ ایک ڈیڑھ ہفتے بعد اس سے ملنے لازمی آیا کرتے تھے۔ رفیعہ بھابھی کی فطرت و عادات سے قطع نظر طارق بھائی اس سے بے حد پیار کرتے تھے۔ وہ صحیح معنوں میں ان کی بے حد لاڈلی تھی۔ طارق بھائی کو دیکھ کر اسے بے حد خوشی ہوئی تھی۔ وہ ارفع کے لیے ڈھیروں چیزیں لائے تھے۔ امی جان نے کچھ نئے کپڑے بنوا کر بھیجے تھے۔ نئی جرسی‘ نئے کوٹ‘ شوز کے ساتھ طارق بھائی نے اسے ڈھیر سارے خرچ کے لیے رقم الگ سے دی تھی۔ حالانکہ اس کی ارفع کو کوئی خاص ضرورت بھی نہیں تھی۔

”امی جان کو ہی لے آتے طارق بھائی۔“ وہ صوفے پر بیٹھے تھے۔ ان کے پاس قدموں میں نیچے پڑے کشن پہ بیٹھتے ارفع نے لاڈ سے کہا تھا۔

”میں نے تو کہا تھا۔ مگر امی جان خود نہیں مانیں اور ویسے بھی اس اتوار کو سلمیٰ کے بیٹے کا عقیقہ ہے۔ ان سب کو وہاں جانا ہے۔“ طارق بھائی نے اپنی سالی کا بتایا۔ جس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تھا۔

”شام کو میرے ساتھ بازار چلنا‘ جس چیز کی ضرورت ہو خرید لینا۔“ طارق بھائی نے پیار سے ارفع سے کہا تھا۔ ارفع مسکرا دی۔ جبھی لاؤنج میں داخل ہوتی دیبا چچی فوراً“ بول اٹھی تھیں۔

”ارے کیسی باتیں کرتے ہو طارق۔۔۔ ارفع ہماری اپنی بیٹی ہے۔ اسے کسی چیز کی ضرورت ہوگی تو وہ تم سے کیوں کہے گی‘ ہم سے کیوں نہیں کہے گی۔“

”چچی جان بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ طارق بھائی مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں فی الحال چچی جان میرے کہنے سے پہلے ہی ہر ضرورت پوری کردیتی ہیں۔“ ارفع نے بھی دیبا چچی کی بات کی تائید کی تو طارق بھائی کو ماننتے ہی بنی۔

”میرا بس چلے تو میں اسے واپس جانے ہی نہ دوں‘ مگر تم لوگ تو مجھ سے بیر باندھ لیتے ہو۔ ارفع کو میرے پاس رہنے ہی نہیں دیتے۔“ ارفع چچی نے شکوہ کیا تھا۔

”کیا کریں چچی جان۔۔۔ مجبوری ہے۔ ارفع کو یہاں چھوڑ دیں تو ہمارا اپنا گھر بڑا سونا سونا سا لگتا ہے اور پھر امی جان بھی خود کو اس کے بغیر بہت اکیلا اکیلا محسوس کرتی

ہیں۔" طارق بھائی نے فوراً" دیبا چچی کی ناراضی کے ڈر سے اس کے یہاں نہ رہنے پر وضاحت دی تھی۔

"چلو کوئی بات نہیں' میں ارفع کی شادی یہیں اسلام آباد میں کروادوں گی اور اس لڑکے کو گھر داماد بنالوں گی' ٹھیک ہے ناں ارفع۔" اب طارق بھائی کے سامنے ارفع اس بات کا کیا جواب دیتی' خاموشی سے سر جھکا کر مسکرادی' جبکہ طارق بھائی قہقہہ لگا کر خوب ہنسے تھے۔

"رفیعہ کے ہاں کوئی خوش خبری ہے پھر۔" دیبا چچی نے اچانک یاد آجانے پہ پوچھا تھا۔

"دعا کریں چچی... پانچوں بھائیوں کے سونے آنگن میں رب پھول کھلا دے۔" طارق بھائی نے افسردہ ہوتے کہا تو دیبا چچی اور ارفع نے بے اختیار آمین کہا تھا۔



بہت دل چاہنے کے باوجود بھی وہ پانچ تاریخ کو اٹالین کیفے کی انوگریشن پارٹی میں نہیں جا سکی تھی' جس کا ارفع کو بہت قلق تھا۔ طارق بھائی اسی شام اسے زبردستی آئس کریم کھلانے اور آوٹنگ کروانے باہر لے گئے تھے۔ ان کے خیال میں ارفع جب سے آئی تھی گھر میں ہی قید تھی' سو ان کے خیال کے پیش نظر ارفع کو اپنا دل مارنا پڑا تھا۔ ویسے بھی طارق بھائی کی موجودگی میں وہ ایسے کسی فنکشن میں جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ طارق بھائی کو کسی طور یہ بات گوارا نہ تھی۔ حالانکہ چچا میاں نے تو طارق بھائی سے بھی خوب اصرار کیا تھا۔ مگر انہوں نے شائستگی سے منع کردیا۔

خوب گھومنے پھرنے' شاپنگ اور بہترین ہوٹلنگ کرنے کے باوجود بھی ارفع کا من ویسے ہی اداس اور دلگرفتہ سا تھا۔ رہ رہ کر یقین سے بھرپور گمبھیر لہجہ سماعتوں کو ڈسے جا رہا تھا۔ "مجھے یقین ہے آپ ضرور آئیں گی' میرا انتظار آپ کو وہاں لے آئے گا۔" اور اس کا یقین اسے نہ دیکھ کر کیسے متزلزل ہوا ہوگا؟ خودی کا زعم اور انتظار کے دعوے کیسے کرچی کرچی ہو کر بکھرے ہوں گے۔ ارفع سوچ کر پانی پانی ہو گئی۔ وہ کیا سوچتے ہوں گے اس کے بارے میں' کیسی لڑکی تھی کہ جسے عزت و احترام' مان اور محبت کا جواب دینا نہ آتا تھا۔ وہ ہائی فائی کلاس کا بندہ کہاں جانتا ہوگا ارفع کی معاشرتی اور سماجی مجبوریاں... اس کا رہن سہن چچا میاں کا معیار و مرتبہ ان کی طرز زندگی دیکھ کر کوئی شخص ایسی بات سوچ بھی کیسے سکتا تھا۔ جو ایسا خیال شبیر جان کے دل میں اٹھتا۔

"مسٹر شبیر نے بہت پوچھا تمہارا... کہہ رہے تھے میرے خصوصی بلاوے پر بھی نہیں آئیں کیا آپ کی بھتیجی صاحبہ نے؟" واپسی پر دیبا چچی نے ہنستے ہوئے اسے بتایا تھا۔ ارفع سن کھڑی رہ گئی تو گویا ارفع کو وہ مغرور اور خود پسند تصور کر رہے تھے۔ جانے کیوں' مگر ارفع کو ذرا بھی اچھا نہیں لگا کہ مسٹر شبیر اس کے بارے میں ایسی رائے رکھتے ہیں۔ رات جب وہ کمرے میں آئی تو ناچاہتے ہوئے بھی اس کی انگلیاں ایک شناسا سا' مگر اجنبی نمبر پہ سوری کا میسج ٹائپ کر رہی تھیں۔ اگلے چند لمحوں میں اسی نمبر سے کال موصول ہوئی تھی۔

"میں بہت شرمندہ ہوں مسٹر شبیر۔" چھوٹتے ہی اس نے بے تابی سے کہا تھا' نہ سلام' نہ دعا۔

"ارے..." دوسری جانب وہ بے حد شائستگی سے مسکرائے تھے۔ جیسے وہ ایسے ہی کسی جملے کو سننے کے متمنی تھے۔

"آئی ایم ایکسٹریملی ویری سوری مسٹر شبیر' شاید آپ کو لگتا ہو کہ میں ایک خود پسند اور مغرور لڑکی ہوں' جسے عزت کی' احترام کی قدر نہیں' جبکہ ایسا بالکل بھی نہیں ہے میرے بھائی آئے ہوئے تھے اور مجھے اچانک ان کے ساتھ جانا پڑا۔ حالانکہ میرا آنے کا ارادہ تھا اس تقریب میں' مگر..." بے ربط سے انداز میں ایک ہی سانس میں بولتی وہ شبیر جان کو اچھا خاصا حیران کر گئی تھی۔

"مگر..." اب کی بار انہوں نے دلچسپی سے پوچھا' انہیں ارفع کا بات کو ادھورا چھوڑ دینا قطعی نہ بھایا

تھا۔

"ایکچوئیلی مسٹر شبیر۔ میرے گھر کا ماحول ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں بلاوجہ گھر سے باہر نکلنے کو ایسے فنکشنز میں جانے کو کچھ اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ چچا میاں کی بات الگ ہے۔ وہ بہت لبرل مائنڈڈ ہیں، جبکہ میرے گھر والے بہت کنزرویٹو۔۔۔ اسی لیے بھائی کی موجودگی میں۔۔۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا میں کیا کہنا چاہتی ہوں۔" اپنی بات کے اختتام پہ وہ حسب روایت پھر بات ادھوری چھوڑے ان کی رائے طلب کررہی تھی۔ شبیر جان اس بار کھل کے مسکرائے۔۔۔ انگلیوں میں دبے سگار کی راکھ کو ایش ٹرے میں جھٹکا اور ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرکے صوفے پر نیم دراز ہوگئے۔

"ارفع! اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ یہ جو اتنی لمبی چوڑی وضاحت آپ نے مجھے دی ہے۔ اس کی ضرورت نہیں تھی، اس لیے کہ وہ سب جو آپ مجھے ابھی بتا رہی ہیں، میں پہلے سے وہ سب جانتا ہوں تو آپ کو کیسا لگے گا؟"

"جی۔۔۔ مجھے بہت حیرت ہوگی۔ میرا مطلب ہے ہو رہی ہے۔" شبیر جان مسکرائے، پھر سگار کا ایک لمبا کش لیا اور دھواں فضا میں چھوڑتے دھوئیں کے مرغولوں پہ نظریں جمائے کچھ سوچ کر بولے۔

"اس روز آفریدی ہاؤس میں واحد آپ وہ خاتون تھیں جن کو میں نے خود سے بلایا تھا، جانتی ہیں کیوں۔۔۔" ارفع کے خاموش رہنے پر وہ تھوڑی دیر بعد خود ہی اپنی بات کی وضاحت کرنے لگے تھے۔

"اس لیے کہ اس پارٹی میں ماسوائے آپ کے کوئی بھی اس قابل نہیں تھا کہ اسے میں ذاتی طور پر دعوت نامہ دیتا، اس کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھاتا۔ آپ منفرد ہیں، اسی لیے ساری پارٹی میں اپنی سادگی کے ساتھ منفرد نظر آرہی تھیں اور مجھے منفرد لوگ ہی اپیل کرتے ہیں، جو بھیڑ میں بھی اپنی الگ پہچان رکھتے ہوں۔ آپ نہیں آسکیں، اس کا مجھے قلق ضرور تھا، مگر افسوس نہیں، کیونکہ۔۔۔ چلیں چھوڑیں۔" ارفع جوان کی خوب صورت باتوں کے سحر میں کھوئی ہوئی تھی، یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ انہوں نے بات ادھوری کیوں چھوڑ دی۔

"آپ کے گھر میں کون کون ہوتا ہے ارفع۔" اچانک انہوں نے بات بدل دی تھی۔

"میں، میرے پانچ بھائی، ان کی بیویاں اور میری امی جان۔" اس نے مختصر سا تعارف کروایا تھا۔

"اور آپ کے بھتیجے، بھتیجیاں۔" شبیر جان نے دلچسپی سے پوچھا تھا۔

"میرے پانچ بھائیوں کی اولاد نہیں ہے فی الحال۔" اس نے اس بار بھی اختصار سے کام لیا۔

"اس کا مطلب ہے گھر میں اس وقت صرف آپ ہی چھوٹی ہیں۔"

"اور یقیناً" لاڈلی بھی۔۔۔"

"جی۔۔۔" ارفع بے ساختہ ہنس دی۔

"میں بہت چھوٹی تھی، جب میرے والد کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ ان کی وفات کے بعد مجھے طارق بھائی نے ہی باپ بن کے پالا ہے۔ اسی لیے میں باقی بھائیوں کی نسبت ان سے زیادہ اٹیچ ہوں۔"

"یہ تو ایک اتفاق ہے کہ میں بھی بہت بچپن میں یتیم ہوگیا تھا۔ بدقسمتی سے گھر میں سب سے چھوٹا تھا۔ بھائی تو پھر بھی اچھے تھے۔ مگر بھابھیوں کو ایک وقت کی روٹی مجھ جیسے نکمے اور آوارہ کو کھلانی مشکل پڑتی تھی۔ سو بہت بچپن میں، میں نے اپنا گھر چھوڑ دیا تھا۔" شبیر جیسے کرب آمیز یادسے پیچھا چھڑانے کو بے دردی سے مسکرائے ارفع حق دق رہ گئی۔

"تو کیا آپ کو کسی نے نہیں روکا۔" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"کسی کو میری ضرورت ہی نہیں تھی۔" انہوں نے درد کو چھپاتے بے دردی سے کہا تھا۔

"آپ کبھی اپنے گھر والوں سے نہیں ملے کیا؟"

"ملتے ہیں وہ لوگ اب مجھ سے، جب مجھ جیسے آوارہ اور نکمے انسان کو ایک کامیاب بزنس مین کے روپ میں دیکھتے ہیں تو بہت فخر بھی محسوس کرتے ہیں، بڑی بھابھی تو مجھے اپنا لاڈلا کہتی ہیں۔" ارفع کو دکھ ہوا، وہ

کس قدر دکھی و تنہا تھے۔

"تو پھر آپ نے شادی کیوں نہیں کی ابھی تک۔"

"میں محبتوں کو ترسا ہوا انسان ہوں ارفع۔۔۔ جسے کبھی گھر کا کھانا اور بستر نہیں ملا۔ مجھے گھر کو بنانے والی' گھر میں رہنے والی بیوی چاہیے' جو روز شام آفس سے واپسی پہ سج دھج کے میرا استقبال کرے۔ صبح سے شام میرے واپس آنے کا انتظار کرے۔ جس کی زندگی مجھ سے شروع ہو کے مجھی پہ ختم ہو' جس کی زندگی کی باقی ترجیحات میرے بعد شروع ہوتی ہوں اور ابھی تک مجھے ایسی لڑکی ملی ہی نہیں تھی۔" آخر میں وہ ہلکا سا مسکرائے۔

"تھی سے کیا مراد ہے آپ کی۔ اب کوئی نظر میں ہے۔" ارفع کو شرارت سوجھی۔

"ہو سکتا ہے آپ کا خیال صحیح ہو۔" انہوں نے گول مول جواب دیا۔

اس روز ان لوگوں نے بہت باتیں کی۔ اپنی اپنی زندگی کی خوشیاں' محرومیاں' دکھ سکھ سب ایک دوسرے سے کہہ ڈالے تھے۔ ان دونوں کو ایک دوسرے کی ذات میں بچھڑا اپنا کوئی پرانا دوست مل گیا تھا شاید۔ گفتگو کے اختتام پہ وہ دونوں بہترین دوست بن چکے تھے۔



"میں نے اپنی اڑتیس سالہ زندگی میں کبھی بھی اتنی باتیں نہیں کیں اور نہ ہی اتنا مسکرایا ہوں' جتنا رات آپ سے باتیں کرتے وقت میں ہنسا اور بولا ہوں۔"

گڈ مارننگ وش کے میسج کے ساتھ ارفع کو یہ میسج موصول ہوا تھا۔ اس کے ہونٹوں کو بے ساختہ ایک دلفریب مسکراہٹ نے چھوا تھا۔

"ان شاء اللہ اب آپ یوں ہی ہنستے مسکراتے رہیں گے۔" جوابی میسج بھیج کے وہ واش روم میں فریش ہونے چلی گئی تھی۔ واپس آئی تو ایک اور میسج موصول ہو چکا تھا۔ ارفع نے دلچسپی سے پڑھا۔

"یہ آپ کی دعا ہے یا گارنٹی۔" سادگی و معصومیت سے پوچھا گیا تھا۔ ارفع بھی شرارت کے موڈ میں تھی۔ جب ہی لکھ دیا۔

"گارنٹی۔" دوسری جانب شبیر کھل کر مسکرائے' بلکہ قہقہہ لگا کر ہنسے۔

"اگر آپ کا ساتھ رہا تو یقیناً" میں اب تمام عمر ہنستا مسکراتا رہوں گا۔" انہوں نے زیر لب کہا تھا' پھر میسج ٹائپ کیا۔

"آپ کی معذرت کل میں نے قبول نہیں کی تھی شاید؟"

"ایں۔۔۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟" ارفع کو واقعی میں سمجھ نہیں آئی تھی۔

"جس طرح میں نے آپ کو بالمشافہ مدعو کیا تھا۔ اسی طرح آپ کو بھی معذرت اسی طرح سے کرنی ہوگی۔" انہوں نے بہت شائستگی سے اپنا مدعا بیان کیا تھا۔ ارفع سوچ میں پڑ گئی کہ اس بات کا کیا جواب دے۔

"دیکھیے مسٹر شبیر۔۔۔ میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ میرے لیے بہت مشکل ہے' یوں بلا جھجک باہر جانا۔۔۔ ایسے میں' میں کس طرح۔۔۔" ارفع کو اپنی بات سمجھانا بے حد دشوار لگا۔

"لیکن آپ نے یہ بھی تو کہا تھا کہ آپ کے چچا میاں کے گھر کا ماحول اس سے بالکل الگ ہے۔" فوراً" جواب آیا تھا۔ وہ اپنی ہی کہی بات میں الجھی تھی' اسی لیے مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اس نے ہامی بھر ہی لی تھی۔ اسے بس اب موقع کی تلاش تھی۔



افق کے پار نارنجی تھال بس گرنے کو تھا۔ ہوا خشک اور سرد تھی۔ ارفع نے گرم شال اپنے گرد اچھی طرح سے لپیٹی اور باہر آگئی' چچا میاں اور دیبا چچی نوٹ بک پہ جھکے کچھ لکھنے میں مصروف تھے۔

"آؤ۔۔۔ آؤ ارفع۔۔۔ مہمانوں کی لسٹ تیار کر رہے ہیں۔ تمہارے چچا میاں پارٹی ارینج کر رہے ہیں۔ تم نے کسی کو بلانا ہو تو بتاؤ۔" دیبا چچی نے صوفے پہ اپنے

نزدیک اس کے لیے جگہ بناتے ہوئے اسے بتایا تھا۔ ارفع کا دل بے اختیار چاہا وہ شبیر جان کا نام لے لے'مگر وہ کہہ نہیں پائی۔

"میں کون سا کسی کو جانتی ہوں چچی۔" بے دلی سے کہا تھا۔

"ارے ہاں جمال۔۔۔ مسٹر شبیر کا نام لکھا آپ نے۔" دیبا چچی جانے کیسے من کی بات پڑھ لیا کرتی تھیں۔ارفع کے چہرے پہ ایکدم رونق آگئی۔

"کون مسٹر شبیر۔۔۔ وہ جن کی ہوٹلز کی چین ہے؟"

چچا میاں کو یاد آیا۔ارفع کو حیرت کے ساتھ ساتھ انجانی سی خوشی بھی ہوئی۔شبیر جان کے نام کے ساتھ سب سے بڑی پہچان ان کا بزنس تھا۔جو بلاشبہ کئی ممالک میں پھیلا تھا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں وہی ان کا نام تو آپ نے لکھا ہی نہیں۔" دیبا چچی نے بے تابی سے جیسے ان کی عقل پہ واری صدقے ہوتے کہا تھا۔

"ارے جناب! ان کا نام تو میں نے سب سے پہلے لکھا ہے'آپ بھی نا بیگم صاحبہ'بس مان لیجیے کہ اب بوڑھی ہو گئی ہیں۔" چچا میاں نے دیبا چچی کو چھیڑا تھا۔ ارفع محظوظ انداز میں ہنستی رہی۔

پھر ایک شام جب وہ اور چچی ڈاکٹر کے پاس سے لوٹے تو اچانک چچا میاں کو خیال آیا کہ شبیر جان کے گھر تو دعوت نامہ بھیجا ہی نہیں'اسی لیے ان کے خیال میں اب انہیں خود جا کر مدعو کرنا چاہیے تھا۔ارفع دل ہی دل میں ملاقات کی ایسی سبیل بننے پر حیران رہ گئی تھی۔ وہ اس وقت کھلے ٹراؤزر کے ساتھ لانگ شرٹ میں ملبوس کھلے بالوں کے ساتھ بے حد پیاری لگ رہی تھی۔اس کا سوٹ عنابی رنگ کا تھا اور اس نے ہلکی آتشی گلابی لپ اسٹک لگا رکھی تھی'جو کہ اس کی گندمی رنگت پہ بے حد کھل رہی تھی۔ارفع نے جلدی سے میسج ٹائپ کیا۔

"میں آپ کے گھر معذرت کے لیے آ رہی ہوں۔"

"آپ مجھے دل و جان فرش راہ کیے اپنا منتظر پائیں گی؟" ارفع نے مسکراتے ہوئے چچی کی نظر بچا کے مسیج پڑھا تھا۔

اگلے آدھے گھنٹے میں ان کی گاڑی ایف ٹین سیکٹر میں شبیر جان کے وسیع و عریض سفید بنگلے کے ڈرائیو وے میں جا رکی تھی۔شبیر جان خود باہر ان کے استقبال کے لیے کھڑے تھے۔وہ بے حد پر تپاک انداز میں ملے تھے۔ارفع جانتی تھی یہ سب وہ اس کی خاطر کر رہے تھے۔ارفع نے ایک طائرانہ نگاہ پورے گھر پہ ڈالی تھی۔ ان کا گھر بے حد خوب صورت تھا۔ان کے لان کا لینڈ اسکیپ بے حد منفرد اور اچھوتا تھا اور ڈرائنگ روم دنیا بھر کے قیمتی نوادرات کا نمونہ تھا۔ ہر چیز سے نفاست اور معیار جھلک رہا تھا۔ارفع بے حد متاثر ہوئی تھی۔ چچا میاں اور دیبا چچی پہ بھی ان کی امارت کا اثر پڑا تھا۔ شبیر جان جیسے شاندار مرد کو ایسے ہی شاندار گھر میں رہنا چاہیے تھا۔

"گھر تو ماشاءاللہ بہت شاندار ہے مسٹر شبیر۔۔۔ اب گھر والی بھی ایسی ہی آجانی چاہیے اس گھر میں'کیونکہ اب صرف اسی کی کمی ہے۔" دیبا چچی نے مسکراتے ہوئے کہا تو ارفع کا دل سولی پہ لٹک گیا۔شبیر'ارفع کو دیکھ کر محبت سے مسکرائے تھے۔

"مجھے شاندار نہیں محبت کرنے والی سلیقہ مند بیوی چاہیے مسز جمال' آپ کی نظر میں ایسی کوئی لڑکی ہے۔" شبیر نے سارا بوجھ دیبا چچی کے کندھوں پہ رکھ دیا تھا۔

"ارے لڑکیاں تو ہزاروں ہیں' آپ اپنی پسند بتا دیجیے۔" دیبا چچی تو ویسے بھی ایسے کاموں کی شوقین تھیں۔فوراً" راضی ہو گئیں اتنے میں ملازم نے آکر چائے کا پیغام دیا تو بات وہیں رہ گئی تھی۔ وہ لوگ ڈائننگ روم میں آئے۔ ٹیبل انواع و اقسام کی اشیا سے بھرا ہوا تھا۔شبیر جان خود آگے بڑھ بڑھ کے ساری ڈشز ان لوگوں کو پیش کرتے رہے۔حالانکہ یہ کام بٹلر بھی کر سکتا تھا۔ مگر ان کی تشفی کیسے ہوتی بہانے بہانے۔انہوں نے ارفع کو پورا گھر دکھایا تھا۔ارفع کوئی بچی تو نہ تھی جو ان کی پذیرائی میں چھپے جذبوں کو سمجھ نہ

پاتی' ان کی روشن آنکھوں کی قندیلوں میں محبت کی جلتی ہوئی جوت نہ دیکھ پاتی۔ ارفع نے خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کیا تھا۔

"آپ کی آمد کا انتظار رہے گا۔" چلتے وقت آہستگی سے ارفع نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا تھا۔

"اور آپ کا انتظار محض انتظار نہیں ہوگا۔"

تھوڑی دیر بعد گاڑی میں بیٹھتے ہی ارفع کو جواب موصول ہوا تھا۔ گاڑی ڈرائیو وے سے مڑ رہی تھی۔ ارفع نے بے اختیار گردن موڑ کر پیچھے دیکھا' شبیر جان مسکرا رہے تھے۔



چچا میاں نے پارٹی گھر کے بجائے میریٹ میں دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ ارفع بہت پرجوش تھی' کیونکہ چچا میاں کے ساتھ ساتھ ارفع کا بھی من پسند ہوٹل میریٹ ہی تھا۔ دیبا چچی نے بہت خوب صورت بیرون کلر کی ساڑھی باندھی تھی۔ ساتھ منقش ڈائمنڈ کی جیولری تھی۔ وہ بلاشبہ ایک نفیس اور گریس فل خاتون تھیں۔ جبکہ ارفع کے لیے انہوں نے گہرے سبز رنگ کی گھیردار فراک کے ساتھ چوڑی دار پاجامہ بنوایا تھا۔ بال اچھی شیپ میں کٹے تھے۔ نفاست سے کیا میک اپ اسے کسی اپسرا سے کم نہیں ظاہر کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پہ ایک خاص قسم کی ملاحت تھی۔ جو اسے بے حد پرکشش ظاہر کرتی تھی۔ اسے منفرد و خوب صورت دکھاتی تھیں۔

شبیر جان نے سرخ گلابوں کا بوکے لاکے بطور خاص ارفع کو پیش کیا تھا۔ ارفع نے دیکھا لائٹ گرے کلر کے تھری پیس میں شبیر جان اپنے لمبے قد کے ساتھ بہت ہینڈسم نظر آرہے تھے۔

"بہت خوب صورت لگ رہی ہیں ہمیشہ کی طرح۔۔۔" شبیر جان نے آہستگی سے سرگوشی کی تھی۔ ارفع بلش کرتی سر جھکا گئی تھی۔

"میں بہت اسٹریٹ فارورڈ بندہ ہوں ارفع۔۔۔ کھلی کتاب کی طرح سے زندگی گزاری ہے میں نے۔۔۔ اپنی خوبیاں خامیاں سب سے آگاہ کردیا ہے آپ کو۔۔۔ میری پسندیدگی سے بھی آپ واقف ہیں' بس اب مجھے آپ کی اجازت درکار ہے۔ کیا شریک سفر کے طور پر آپ میرا ساتھ قبول کریں گی۔" کھانے کے بعد جب کافی کا دور چلا تو شبیر جان خود کو یہ سب کہنے سے روک نہیں پائے تھے۔ ارفع ان کی اس قدر جلد بازی پہ حیران رہ گئی تھی۔

"آپ نے جواب نہیں دیا۔" چند لمحے کا انتظار بھی شبیر جان کو ناگوار گزرا تھا۔

"اتنی جلدی۔۔۔ آپ یہ فیصلہ کیسے کرسکتے ہیں۔" ارفع کو حیرت کے ساتھ ساتھ الجھن بھی تھی۔

"جلدی کہاں۔" وہ ہنسے۔

"مجھ سے پوچھیں' کتنی دیر ہوچکی۔" وہ دھیرے سے مسکرائے' ارفع ان کی مبہم بات سے کوئی مطلب نہ اخذ کرسکی تھی۔

"محبت کی اس راہ گزر کا میں اکیلا مسافر ہوں یا آپ بھی میری ہم سفر ہیں'؟" گہرے گمبھیر لہجے میں وہ چاندنی رات میں اس کے کانوں میں محبت کا فسوں پھونک رہے تھے۔ ارفع کی دھڑکنیں اتھل پتھل ہوگئیں۔ جذبات الگ شوریدہ سری پہ اترے تھے۔ اسے تو اپنی سانسیں تک اپنی مخالف محسوس ہورہی تھیں۔

"آپ کی خاموشی کو میں کیا سمجھوں انکار یا اقرار۔۔۔" جب وہ کچھ دیر مزید نہیں بولی تو شبیر جان نے جیسے تڑپتے ہوئے سوال کیا تھا۔ ارفع نے جھکا سر اٹھایا تو وہ حق دق رہ گئے' اس کی ہرنی جیسی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھری تھیں۔

"مجھے معاف کیجیے گا مسٹر شبیر۔۔۔ محبت کی اس راہ گزر میں بھلے آپ اکیلے نہیں' مگر میں ہرگز اس بات کا یقین آپ کو نہیں دلاسکتی کہ میرے گھر والے آپ کو قبول کرپائیں گے۔ ہمارے اسٹیٹس میں زمین آسمان کا فرق ہے اور۔۔۔"

"مجھے صرف اتنا بتاؤ ارفع کیا تم مجھے اپنا شریک سفر بنانا چاہتی ہو یا نہیں' باقی کسی بھی دوسری بات کی

میرے نزدیک نہ کوئی اہمیت ہے 'نہ وقعت۔" وہ سنجیدہ ہوئے' دوٹوک انداز میں بازپرس کررہے تھے۔ ارفع نے آہستگی سے سرہلادیا تھا۔

"آپ کاساتھ میرے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں مسٹر شبیر۔" اس بار وہ کھل کے مسکرائے' مسکراہٹ تو جیسے روز بروز ان کی شخصیت کا خاصہ بنتی جارہی تھی۔

"تو پھر بے فکر رہیے۔۔۔ آپ کو عزت واحترام سے اپنی زندگی میں شامل کروں گا۔ آج سے خود کو میری امانت سمجھیے گا۔" اتنا کہہ کے وہ آگے بڑھ گئے تھے۔ ارفع نم آنکھوں سے مسکرادی تھی۔



دھند میں لپٹی سرد صبح کو اسے ایک کوریئر موصول ہوا تھا۔ کسی نے اس کے نام تحفہ بھیجا تھا۔ سرخ گلابوں کے بوکے سے وہ جان گئی تھی کہ تحفہ بھیجنے والا کون ہو سکتا ہے۔ وہ اس وقت دیبا چچی کی پنڈلیوں کی زیتون کے تیل سے مالش کررہی تھی۔ جب چوکیدار نے اسے وہ پیکٹ لاکے دیا تھا۔ دیبا چچی نے فوراً" بکے میں موجود کارڈ پڑھا تھا۔

"اچھا تو بات یہاں تک پہنچ گئی اور ہمیں خبر تک نہیں ہوئی؟" انہوں نے وش کارڈ پہ نظریں گھماتے ارفع کو شرارت سے دیکھا تھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں چچی جان۔۔۔" ارفع کی سمجھ میں نہیں آیا' وہ کیا کہے۔

"سمجھ تو میں اور بھی بہت کچھ رہی ہوں بیٹا جی۔۔۔ اچھا اسی لیے اس روز مجھے مسٹر شبیر لڑکی دیکھنے اور آس پاس دیکھنے کی صلاح دے رہے تھے اور میں ایسی بے خبر کہ مجھے سمجھ ہی نہیں آئی۔" اب وہ اسے تنگ کررہی تھیں۔

"چچی جان پلیز۔۔۔ اتنا شرمندہ تو مت کریں۔ بلکہ میری تو خود سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ کیا کروں۔۔۔ انہوں نے مجھے پرپوز کیا ہے۔" ارفع نے اٹکتے ہوئے ساری بات من وعن دہرادی تھی۔ دیبا چچی سن کر ہنس دیں۔

"ارے پگلی۔۔۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے اور ویسے بھی مسٹر شبیر ہر لحاظ سے ایک پرفیکٹ انسان ہیں' تمہیں ان سے زیادہ بہتر جیون ساتھی تو مل ہی نہیں سکتا۔"

"مگر چچی جان طارق بھائی۔۔۔" ارفع کو ڈر تھا کہ اس کے گھر والے کسی طور بھی اس کا رشتہ قبول نہیں کریں گے۔

"ہمارے اور ان کے اسٹیٹس میں بہت فرق ہے چچی جان۔"

"تو کیا ہوا ارفع۔۔۔ اس میں اتنی ٹینشن والی کون سی بات ہے اور دیکھو بیٹا ہمارا سب کچھ تم لوگوں کا ہی ہے نا' تو پھر فکر کیسی' تم اس سے کہو رشتہ بھیجے' باقی میں سنبھال لوں گی۔ اب گفٹ کھول کے دیکھو کہ کیا بھیجا ہے مسٹر شبیر نے۔" وہ پیار سے اسے چمکارتے بولیں تو ارفع بھی مطمئن سی ہو کے گفٹ کا ریپر کھولنے لگی تھی۔ اندر ایک خوب صورت ایپل کا آئی فون تھا۔ ارفع کو وہ بے حد پسند آیا۔ دیبا چچی بھی متاثر ہوئی تھیں۔ ارفع کو حیرت ہوئی' انہیں کیسے خبر ہوئی تھی کہ اس کا موبائل مخدوش حالت میں ہے اور اسے نئے اور اچھے موبائل کی سخت ضرورت بھی ہے۔ شکریہ کے مسیج کے ساتھ ان کو ارفع نے یہ سوال بھی لکھ بھیجا تھا۔ جواباً" ان کی کال آئی تھی۔

"جس روز میں میڈیکل اسٹور پہ بینڈیج کروانے گیا تھا اور آپ کا نمبر چوری کیا تھا۔ اسی روز میں نے آپ کا موبائل بھی دیکھ لیا تھا۔ سو اسی لیے سوچا کہ اتنے خوب صورت ہاتھوں میں خوب صورت موبائل فون ہی ہونا چاہیے۔" ارفع نے بے اختیار اپنے ہاتھ دیکھے تھے۔ مخروطی انگلیوں والے نرم گندمی ہاتھ۔۔۔ سب اس کے ہاتھوں کی نرماہٹ کی تعریف کرتے تھے۔ مگر آج سے پہلے اسے کبھی بھی اپنے ہاتھ اتنے اچھے نہیں لگے تھے۔

"آپ اس قدر غور سے دیکھتے ہیں مجھے؟" اس کے لہجے میں حیرت ـــــ تھی۔

"باخدا ہمیشہ آپ کو عزت کی نگاہ اور احترام کی نظر سے دیکھا ہے کبھی بے باکی سے دیکھنے کی جسارت نہیں کی میں ایسی گستاخی کا مرتکب ہو ہی نہیں سکتا؟" ارفع ان کی وضاحت پہ شرمندہ سی ہو گئی۔

"میرا مطلب وہ نہیں تھا؟" پھر بات بدلتے بولی تھی۔

"چچی جان سے بات ہوئی میری۔ آپ اپنے گھر والوں کو بھیجیں... پھر...؟" شبیر جان کو لگا۔ انہیں ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو وہ خوشی سے دوسری جانب چیخ اٹھے تھے۔

"کیا واقعی تم سچ کہہ رہی ہو ارفع... کیا انہیں کوئی اعتراض نہیں؟" وہ خوشی سے بے قابو ہوئے جا رہے تھے۔ ارفع ان کی دیوانگی پہ ہنس رہی تھی۔

چند روز بعد دو باوقار خواتین نفیس سے آدمی کے ساتھ چچا میاں کے گھر شبیر جان کا رشتہ لائی تھیں۔ وہ شبیر کے بڑے بھائی، بھابھی اور چھوٹی بہن تھیں۔ دونوں خواتین ارفع سے بہت پیار سے ملی تھیں۔ دیبا چچی اور چچا میاں کو وہ لوگ بے حد پسند آئے تھے۔ انہوں نے چچا میاں اور دیبا چچی سے لاہور ارفع کے گھر والوں کے ساتھ رشتہ کی بات کرنے اور تمام معاملات کو ہینڈل کرنے کا اصرار کیا تھا۔

ارفع بے حد خوش تھی۔ خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کر رہی تھی۔ شبیر جان جیسے شاندار اور بھرپور مرد کا ساتھ اسے ہوش و خرد سے بے گانہ کیے دے رہا تھا۔ شبیر جان کے جان نثار، محبت سے بھرپور لہجے میں کی جانے والی مسحور کن باتیں اس پر کسی فسوں کی مانند اثر کرتی تھیں۔

اسے لگتا زندگی شبیر جان کے ساتھ کے بغیر بہت بے معنی اور سونی تھی۔ وہ خود کو مکمل محسوس کرنے لگی تھی۔ اپنے نام کے ساتھ شبیر جان کا نام، کسی جان فزا احساس کی طرح اسے محبت کی وادی میں مست ہو کر رقص کرنے پہ مجبور کر دیتا۔

شبیر جان خود طارق بھائی اور باقی گھر والوں سے ملنے آئے تھے۔ ابتسام بھائی کو تو وہ بے حد پسند آئے تھے۔ امی جان ان کے گھر والوں سے مل کر بے حد مطمئن تھیں۔ باقی کی ساری گارنٹی چچا میاں کے سر تھی۔ اسما بھابھی، صائمہ، انیقہ ـــ بھابھی اسے شبیر کے نام سے گدگداتیں ارفع کے چہرے پہ آنے والے خوش کن لمحات کا گلال سا بکھر جاتا۔ رفیعہ بھابھی کا بس نہیں چلتا تھا۔ ارفع کے چہرے پہ تیزاب پھینک کے اسے کہیں منہ دکھانے لائق نہ چھوڑیں۔ وہ فطری طور پر ایک حاسد خاتون تھیں۔ ارفع کو وہ پسند اس لیے بھی نہیں کرتی تھیں کہ وہ طارق بھائی کی لاڈلی تھی اور اپنے علاوہ وہ کسی اور کی اہمیت چاہتی ہی نہ تھیں۔ خصوصاً" اپنے مجازی خدا کے معاملے میں تو بالکل بھی نہیں۔ جبھی انہوں نے دل ہی دل میں منصوبہ بنایا تھا۔



"آپ نے اس لڑکے کی عمر دیکھی... بلکہ لڑکا کہنا بھی اچھا خاصا مذاق لگتا ہے اسے دیکھ کے تو..." رات حسب عادت وہ طارق بھائی کے پاؤں دباتی اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے پہلی سیڑھی تیار کر رہی تھیں۔ طارق بھائی خاموشی سے انہیں دیکھ کر رہ گئے یہی فکر تو انہیں کھائے جا رہی تھی۔ ارفع اور شبیر کی ایج میں اٹھارہ سال کا فرق تھا اور یہ کوئی کم فرق نہیں تھا۔

"ایک بات کہوں، برا تو نہیں مانیں گے نا؟" وہ چاپلوسی کرتے ان کے ذرا نزدیک ہوئیں۔

"نہیں... برا کیوں تم ارفع کی بڑی بھابھی ہو۔ اس کے لیے اچھا ہی سوچو گی، کہو کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"دیکھیں طارق... اچھا تو نہیں لگتا، مگر خود سوچیں ارفع میرے لیے بیٹیوں جیسی ہے۔ آدھی عمر کے مرد کے ساتھ بیاہ دینا بھلے ان کے پاس بے حد دولت و عزت ہے۔ مگر یہ انصاف تو نہیں نا اور پھر ہم اس کے بارے میں جانتے ہی کتنا ہیں۔ کیا گارنٹی ہے کہ اس نے شادی نہیں کی ہو گی یا اس کے بچے نہیں ہوں گے اور پھر ساری عمر تو اس نے باہر رہ کر گزاری ہے۔ ارفع

تو ابھی بچی ہے۔ اس کی چکنی چپڑی باتوں میں آ گئی ہے۔ مگر ہم تو اپنی آنکھیں بند نہیں کر سکتے نا۔" دنیا جہاں کی ہمدردی و محبت چہرے پر سجائے وہ اپنے مجازی خدا کے سامنے اپنی فرماں برداری کا ثبوت پیش کر رہی تھیں۔

"تم کہنا کیا چاہتی ہو ارفع کا اس کے ساتھ رابطہ ہے؟" وہ چونک کر سیدھے ہو بیٹھے تھے۔ انہیں تو یہی بتایا گیا تھا کہ یہ رشتہ ارفع کے لیے چچا میاں کے توسط سے آیا ہے۔

"مجھے کہنا تو نہیں چاہیے طارق.... لیکن کل میں نے خود ارفع کو اس سے باتیں کرتے سنا ہے۔ وہ اس سے کہہ رہی تھی کہ اگر میرے گھر والوں نے آپ کے ساتھ میری شادی نہ کی تو وہ زہر کھا کے خود کو ختم کر دے گی۔ مجھ سے تو اس سے زیادہ سنا ہی نہیں گیا۔" طارق بھائی کے چہرے کے بگڑتے زاویوں نے رفیعہ بھابھی کو اس بات کا یقین دلایا تھا کہ ان کا تیر ٹھیک نشانے پہ جا لگا تھا۔

"کمال ہے ہمارے گھر کی عزت اب یوں دوسروں کی خاطر زندگی تیاگ دے گی؟" غصے سے مٹھیاں بھینچتے انہوں نے سوچا تھا۔ ان کا جی چاہا وہ ارفع کا گلا دبا دیں۔ ان کی پیٹھ پیچھے وہ یہ گل کھلاتی رہی تھی۔

"ارفع ہماری لاڈلی بیٹی ہے۔ ہم اس کی خاطر یہ کڑوا گھونٹ بھر بھی لیں تو بھی اس نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی۔ یہ ایک سوال تو لوگوں کے ذہن میں آئے گا ہی.... ہم لوگوں کو کیا جواب دیں گے، اگر انہیں یہ پتا چل گیا کہ ارفع نے اپنی پسند کا لڑکا ڈھونڈا ہے۔ جبکہ ہمارے خاندان کے تو مرد بھی پسند کی شادی نہیں کرتے۔" لوہا گرما تھا اور رفیعہ بھابھی کی ضرب بے حد سخت اور ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ طارق بھائی جیسے زن مرید ان کی بات کا یقین نہ کرتے۔

"میں ارفع کا گلا دبا دوں گا۔ اگر ایسی کوئی بات ہوئی تو....؟" غصے سے پھنکارتے طارق بھائی نے رفیعہ بھابھی سے کہا تھا۔

"اب دیکھتی ہوں ارفع میڈم.... کیسے تم قسمت کی دھنی بنتی ہو۔ ساری زندگی بھائیوں کی ہتھیلی کا چھالا بنی رہو اور شادی کے بعد جان نثار کرنے والے شوہر کی دنیا تمہاری مٹھی میں ہو، تم عرش کی شہزادی بنو اور ایسا تو میں کبھی ہونے نہیں دوں گی۔" ان کے اندر کی عورت نے نفرت سے پھنکارتے ارفع کے تصور سے کلام کرتے کہا تھا۔



رفیعہ بھابھی کے حسب توقع طارق بھائی نے ناشتے کی ٹیبل پہ امی جان کو ان لوگوں سے معذرت کرنے کو کہا تھا۔ ناشتا کرتی ارفع کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ رفیعہ بھابھی نے فاتحانہ نظروں سے ارفع کا دھواں دھواں چہرہ دیکھا تھا۔

"مگر برائی کیا ہے آخر؟" ابتسام بھائی کو اعتراض کی سمجھ نہیں آئی۔ "عمروں کا فرق؟" طارق بھائی نے تحمل سے جواب دیا تھا۔

"یہ تو کوئی اتنی بڑی بات نہیں طارق بھائی کہ آپ اتنے اچھے رشتے کو ٹھکرا دیں؟" ابتسام بھائی کو ان کا اعتراض ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔

"میرے لیے ہے، کیونکہ میں ارفع کا بھلا چاہتا ہوں؟" انہوں نے سرد سے لہجے میں وضاحت کی تھی۔

"اس نے شادی کیوں نہیں کی ابھی تک.... کیا وجہ ہو سکتی ہے اس کی تم میں سے کسی نے سوچا یہ؟"

"اپنا کیریر بنانے کی تگ ودو میں کچھ لوگ شادی دیر سے کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ خود کو معاشی طور پر مستحکم کرنے کے بعد وہ شادی جیسے اہم فریضے کو انجام دیتے ہیں۔ تاکہ اچھی زندگی گزار سکیں۔" غفور بھائی نے بھی اس مرتبہ گفتگو میں حصہ لیا تھا۔ امی جان البتہ خاموش تھیں۔ ارفع کو الجھن ہوئی، وہ کچھ بول کیوں نہیں رہی تھیں۔ ارفع کا دل ڈوب رہا تھا۔ آنکھیں الگ نوحہ کناں تھیں۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔

طارق بھائی کے انکار کا مطلب تھا پورے گھر کا انکار، ان کی نا کبھی ہاں میں نہیں بدلتی تھی فیصلے کے

بعد۔۔۔ اس نے فوراً" شبیر جان کو کال کر کے روتے ہوئے طارق بھائی کا اعتراض بتایا تھا۔ شبیر نے اسے ہر طرح سے تسلی دی تھی۔ دوسرے ہی روز طارق بھائی کو کوریئر کے ذریعے شبیر جان کی میڈیکل چیک اپ کی تمام رپورٹس ملی تھیں۔ جس میں ایسی کسی بھی بیماری کا خدشہ تک نہیں تھا جو شبیر جان کی دیر سے شادی کرنے کی وجہ بنتی۔۔۔ گھر میں ایک بھونچال آگیا تھا۔ طارق بھائی بے حد برہم تھے۔

"اسے کس نے بتایا کہ ہم کس بات پہ معترض ہیں۔ اس نے کیوں اپنی میڈیکل رپورٹس بھیجیں ہمیں؟" وہ غصے میں دھاڑتے ارفع کو کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے تھے۔

"طارق۔۔۔ پلیز حوصلہ کریں۔ آرام سے بات کریں۔ بچی پہ کیوں چلا رہے ہیں؟" ارفع کی غیر ہوتی حالت کو کینہ توز نظروں سے گھورتے رفیعہ بھابھی لپک کے طارق بھائی کے غصے کو ٹھنڈا کرنے آگے بڑھی تھیں۔ ارفع دوڑ کر اپنے کمرے میں بھاگی تھی۔ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا سارا معاملہ' طارق بھائی اتنا غصہ کیوں کر رہے تھے۔ اس کے خیال میں تو وہ ان کی بے حد لاڈلی تھی اور وہ اس کی ہر فرمائش پوری کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔

"اس سے پوچھیں امی جان۔۔۔ یہ کیوں ہمارے سروں میں خاک ڈالنے پہ تلی ہوئی ہے۔" وہ دھاڑے تھے۔ امی جان کی آنکھوں سے بے بسی کا سیل رواں جاری ہو گیا۔

"جس گھر بیری ہو اس گھر پتھر تو آیا ہی کرتے ہیں' تم اتنے خفا کس بات پہ ہو؟" امی جان نے تھوڑی دیر بعد طارق بھائی سے پوچھا تھا۔ انہوں نے امی جان کو یوں دیکھا گویا ان کی ذہنی حالت پہ شبہ ہو۔

"آپ واقعی میں بے خبر ہیں؟" انہوں نے حیرت زدہ سا سوال کیا۔

"مجھے سچ سننا ہے طارق۔۔۔ حقیقت جو ہے اسے دیکھو اور سمجھو۔" امی جان نے قدرے دبنگ لہجے میں طارق بھائی کو مبہم سا اشارہ دیا تھا۔

"تو پھر آپ اپنی بیٹی سے پوچھیں کہ کیا' کیا گل کھلاتی رہی ہے وہاں؟" طارق بھائی نے میز کو ٹھوکر مارتے ہوئے غصے سے کہا اور باہر نکل گئے۔ جبکہ امی جان سن سی وہیں بیٹھی رہ گئی تھیں۔

"اپنی بیٹی۔" طارق نے کہا "اپنی بیٹی" سے پوچھوں۔ ایک لمحے میں وہ باپ و بڑے بھائی کے منصب سے بری الذمہ ہو گیا اور اجنبی کی طرح سے بولا۔ اپنی بیٹی انہیں لگا وہ آج بیوہ ہوئی ہیں اور ارفع یتیم۔۔۔ اپنے مجازی خدا کے بعد انہیں ان کی کمی کبھی اس لیے بھی زیادہ محسوس نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ طارق نے انہیں کبھی احساس ہونے ہی نہیں دیا تھا۔ مگر آج طارق میں انہیں بیٹا بھی نہیں نظر آیا تھا۔ ایسی باتیں تو پرائے لوگ کرتے ہیں۔ وہ کب سے ان لوگوں میں شامل ہو گیا۔ وہ خود کو بے جان ہوتا محسوس کر رہی تھیں۔



"میری سمجھ میں نہیں آرہا' آخر میرے اپنے ہی میرے اس قدر مخالف کیوں ہو رہے ہیں۔ ایک بات کہے دیتی ہوں' یہ لوگ جو چاہے مرضی کر لیں' مگر میرے لیے آپ کو بھلانا ممکن نہیں ہے؟" رات کی تاریکی میں ٹیرس کی گرل پہ جھکے وہ روتے ہوئے شبیر سے کہہ رہی تھی۔

"ارفع پلیز۔۔۔ ہمت و حوصلے کے ساتھ سارے معاملات ہینڈل کرو' آہستہ آہستہ ان سب کو کنوینس کرو' انہیں سمجھاؤ کہ زندگی تم نے گزارنی ہے' وہ لوگ تمہاری مرضی و خوشی میں خوش ہوں' تاکہ دنیا والوں کی پروا کریں' دنیا تو ہمیشہ باتیں کرتی ہے۔" انہوں نے اسے رسان سے سمجھایا تھا۔ ارفع کے آنسوؤں میں روانی آگئی۔

"وہ لوگ کبھی نہیں مانیں گے' میں نے ہر کوشش کر کے دیکھ لی ہے مسٹر شبیر۔۔۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی آخر طارق بھائی کو اعتراض کیوں ہے۔ باقی سب گھر والے تقریباً" راضی تھے۔ مگر طارق بھائی کی

وجہ سے سب پیچھے ہٹ گئے ہیں۔"

"محبت کرنے والوں کے راستے میں ایسی چھوٹی چھوٹی رکاٹیں آیا ہی کرتی ہیں ارفع۔۔۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تمہیں ایسا لگتا ہے کہ مجھے اس سب سے کوئی فرق نہیں پڑتا' تو تمہاری بھول ہوگی' مجھے ہی تو سب سے زیادہ اس بات سے فرق پڑتا ہے۔ میں روز اللہ سے تمہارے ساتھ کی دعا مانگتا ہوں ارفع' مجھے یقین ہے وہ میری دعا ضرور قبول کرے گا۔"

شبیر جان کے لہجے کے یقین کو محسوس کرتے ارفع کو ان پر رشک آیا تھا۔ وہ ہر حال میں کیسے کمپوز رہا کرتے تھے۔

"اور اگر یہ لوگ پھر بھی نہ مانے تو؟" ارفع کے لہجے میں خدشات کے اژدھے تھے۔

"اپنے رب پہ کامل یقین و بھروسا رکھو۔ وہ لوگ ضرور مانیں گے۔"

"اگر ہم کورٹ میرج کریں تو۔۔۔" ارفع نے اٹکتے ہوئے کہا تھا۔

"نو نیور۔۔۔ بے بی۔۔۔ ایسا سوچنا بھی مت۔۔۔ میں محبت کو رسوا نہیں کرنا چاہتا۔ میں نے تم سے سچی اور پاکیزہ محبت کی ہے اور تمہیں عزت سے ہی اپنی زندگی میں شامل بھی کروں گا۔ زندگی کو کبھی بھی نہ تمہارے لیے طعنہ بناؤں گا' نہ ہی اپنی آئندہ آنے والی نسل کے لیے۔۔۔ اگر یہ لوگ مانتے ہیں تو ٹھیک' ورنہ محبت تو میں ہمیشہ ہی تم سے کرتا رہوں گا۔" انہوں نے اسے سختی سے ٹوک دیا تھا۔ ارفع کو اپنی ہی کہی بات پہ بے حد شرمندگی محسوس ہوئی تھی۔

"آئی ایم سوری مسٹر شبیر۔۔۔ میں نہیں جانتی یہ محبت کے سلسلے کیا ہوتے ہیں۔ مگر میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ میں آپ کو کھونا نہیں چاہتی کسی بھی قیمت پر۔۔۔ کبھی بھی نہیں اور میں یہ بھی نہیں جانتی کہ تقدیر کیا فیصلہ کرتی ہے' مگر میں ہمیشہ آپ کی منتظر رہوں گی۔"

"میرا ہر راستہ تمہاری جانب آتا ہے ارفع۔۔۔ اپنے خاندان کی بقا کی خاطر محبت کی قربانی اگر دینی بھی پڑے تو بھی دے دو۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ کبھی ہماری محبت تمہارے لیے طعنہ بنے میرے ساتھ ایک وعدہ کرو ارفع۔" اچانک انہوں نے اس سے کہا تھا۔

"جی۔۔۔" ارفع نے اپنے آنسو ہتھیلی کی پشت سے رگڑتے پوچھا تھا۔

"بولو میرا وعدہ ہمیشہ نبھاؤ گی نا؟" وہ بہت آس سے پوچھ رہے تھے۔ ارفع سے تو وہ اس کی جان بھی مانگتے تو وہ دے دیتی۔

"آپ کہہ کے تو دیکھیں۔۔۔ مگر میں آپ کو بھول نہیں سکتی؟" دوسری جانب وہ ہلکا سا مسکائے تھے۔ مگر اس مسکان میں خوشی نہیں درد تھا' آنسو تھے' بے بسی تھی۔

"نہیں میں ایسا کوئی بھی وعدہ تم سے نہیں لے رہا۔ میں بس تم سے اتنا کہوں گا کہ کبھی بھی ہماری محبت کے لیے مت رونا۔ مجھے تمہارے آنسو تکلیف دیتے ہیں۔ میں ٹوٹنے لگتا ہوں' اگر میں چاہوں تو ایک لمحے میں تمہیں اپنا سکتا ہوں' مگر میری محبت کی پاکیزگی و سچائی مجھے ایسا کرنے سے روکتی ہے۔ ہماری محبت کو کبھی بھی رسوا مت ہونے دینا۔ ارفع ہمیشہ صبر کا دامن تھامے رکھنا۔" انہوں نے پیار سے اس سے وعدہ لیتے ہوئے کہا تھا۔

"اب رکھتا ہوں بہت رات ہو گئی ہے' کل بات کریں گے؟" مگر وہ کل کبھی آہی نہیں پائی۔



"تمہارا اس لڑکے سے رابطہ ہے ارفع؟" دوسری صبح امی جان نے اس سے آکر پوچھا تھا۔ ارفع کو لگا اس کے پیروں تلے زمین ہے' نہ ہی سر پہ آسمان۔

"کون سا لڑکا امی جان۔" وہ گڑبڑائی تھی۔ اس نے تو کبھی سوچا تک نہیں تھا کہ یوں امی جان کی عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر جوابدہ ہونا پڑے گا۔

"کیا شبیر جان کے علاوہ بھی کسی لڑکے کو جانتی ہو تم؟" امی جان نے بے حد ٹھنڈے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس سے پوچھا تھا۔ ارفع نے کوئی جواب نہیں

دیا۔ دفعتاً" وہ دوبارہ گویا ہوئی تھیں۔

"مجھ سے جھوٹ مت بولنا ارفع۔۔۔ یہ ایک ماں کی التجا ہے تم سے۔۔۔ بیٹی پیدا ہونے پہ لوگ کیوں دکھی ہوتے ہیں یہ بات آج میں نے سمجھی ہے' جب میرا اپنا بیٹا تجھے طعنہ دے کر گیا ہے۔"

"ایسا کچھ نہیں کیا میں نے امی جان۔۔۔ جو میرے بیٹی ہونے پہ آپ شرمندہ و دکھی ہوں۔" ارفع تڑپ کے ان کے قدموں میں آن بیٹھی تھی۔

"تو پھر۔۔۔ سچ کیا ہے ارفع۔۔۔" وہ بے بسی سے چلائیں۔

"وہ جو تمہارا بھائی ابھی کہہ کے گیا ہے یا وہ جو جمال اور دیبا نے بتایا ہے؟" ارفع سے ان کی دگرگوں حالت دیکھی نہیں گئی۔ جب ہی سارا قصہ من و عن دہرا دیا۔

امی جان سب سن کر نڈھال سی ڈھے گئیں۔ ایک طرف بیٹی کی زندگی بھر کی خوشیوں کا سوال تھا تو دوسری جانب بڑے بیٹے کی ناراضی کا ڈر اور پھر بہویں چاہے جتنی بھی اچھی ہوں' بیٹی کا نعم البدل تو نہیں ہو سکتیں رفیعہ تو خیر پہلے ہی رشتہ آنے پر اٹھتے بیٹھتے کوئی نہ کوئی دلخراش بات کر ہی دیا کرتی تھیں اور جو اگر وہ بیٹی کا ساتھ دیں تو پھر خاندان بھر میں کیا عزت رہ جائے گی ان کی۔ کیونکہ کتنے قصے کہانیاں بنیں گی اس کا بھی انہیں خوب اندازہ تھا۔

"آپ کی بیٹی نے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا امی جان۔۔۔ جو آپ کے اور میرے مرے ہوئے باپ کے نام کو بٹا لگائے؟" ان کے قدموں میں بیٹھتے ان کے پاؤں پکڑتے ارفع نے روتے ہوئے یقین دلایا تھا۔

"تو پھر میری بات مان لو؟" امی جان نے اس کے آنسو پونچھتے کہا تھا۔ ارفع نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔

"حکم کیجیے امی جان' آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔" اس نے تڑپ کے کہا تھا۔

"کچھ چیزیں زندگی میں صرف خواہش کرنے کے لیے ہوتی ہیں ارفع۔۔۔ بعض دفعہ ان کا حصول ہمارے لیے ممکن سہی' مگر ہمارے لیے بہتر نہیں ہوتا' کسی ایک رشتے کو بنانے کے لیے کئی رشتوں کو کھونا عقل مندی نہیں ہوتی۔۔۔ کبھی کبھار خود کو تقدیر کے حوالے کر دینا چاہیے۔ وہ جیسا چاہے آپ کے ساتھ سلوک کرے' اچھا یا برا' مگر وہ آپ کو اکیلا کبھی بھی نہیں ہونے دیتی۔ آپ کے ساتھ چاہنے والے ہمیشہ کھڑے رہتے ہیں؟" ارفع کو لگا امی جان اسے موت کا مژدہ سنا رہی ہیں۔

اے کاش وہ اسے مرجانے کو کہہ دیتیں' ارفع کے لیے ان کا حکم ماننا آسان ہوتا' بجائے اس کے جو وہ ابھی اس سے ماننے کو کہہ رہی تھیں۔ اسے شبیر جان کا یقین میں ڈوبا لہجہ یاد آیا التجا یاد آئی تھی۔ وہ واقعی میں بہت مجبور اور سمجھ دار تھے۔ جیسے کہیں نہ کہیں تمام حالات سے باخبر تھے۔ اسی لیے اسے محبت کو رسوا نہ ہونے کو کہہ رہے تھے۔ محبت کی قربانی مانگ رہے تھے۔ اپنے دل کو ویران کر کے بھی ارفع کے لیے راہیں ہموار کر رہے تھے۔ ارفع کا دل چاہا دھاڑیں مار مار کے رو دے' وہ کتنے مخلص تھے۔ اس کے ساتھ کسی بھی قیمت پہ انہیں ارفع کی رسوائی' بے عزتی گوارا نہیں تھی۔ محبت کا یہ کون سا مقام تھا۔ انسانیت کے کس اعلا منصب پہ فائز تھے وہ۔۔۔ اور ارفع کے گھر والوں کو لگتا تھا کہ وہ اس کے لیے کسی طور پہ بھی بہتر انتخاب نہیں تھے۔ انہیں کیا معلوم کہ ارفع خود کو ان جیسے عظیم آدمی کے قابل نہیں سمجھ رہی تھی۔ ارفع' امی جان کی بات سننے کے بعد خاموشی سے اٹھی اور الماری سے اپنا موبائل فون نکال کر ایک میسج لکھ کر موبائل کی سم نکال کر اسے دو ٹکڑے کیا اور موبائل لا کر امی جان کے حوالے کر دیا تھا۔ انہوں نے اس کا ماتھا چوم کر اسے ہمیشہ خوش رہنے کی دعا دی تھی۔ جس کے اب کبھی بھی قبول ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔

"میں نے ہماری محبت کو رسوا ہونے سے بچا لیا ہے۔ مجھے صبر کرنا آجائے۔ میرے لیے دعا کیجیے گا۔" میسج پڑھتے ان کی آنکھ سے ایک موتی ٹوٹ کے گرا تھا۔ بے دلی سے سگار ایش ٹرے میں پھینک کر انہوں

نے اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا تھا۔

"تو پھر یہ طے ہوا کہ زندگی میں ان کی قسمت میں محبت کے علاوہ باقی سب کچھ ہے؟" اپنی آنکھیں موند۔تے انہوں نے کرب سے سوچا تھا۔

عزت' دولت' شہرت' حسد' نفرت سب کچھ تھا' مگر محبت نہیں تھی۔ نہیں تھا تو اعتبار' وفا' یقین اور محبت نہیں تھی اور اب۔۔۔ اب تو انتظار بھی ختم ہو گیا تھا۔ آس بھی ٹوٹ چکی تھی' خود کو ہر حالات میں کمپوز رکھنے کی ایسی عادت سی پڑ گئی تھی کہ اب تنہائی میں بھی اپنے دکھوں پہ رونے سے ڈر لگنے لگا تھا انہیں۔۔۔ کاش وہ ایک کمزور انسان ہوتے' کم از کم اپنے دکھ' اپنے نقصان پہ چیخ چلا کر رو تو سکتے' اندر کی تپش تو مٹا سکتے۔۔۔ درد حد سے سوا تھا۔ جدائی برداشت سے باہر' مگر آنکھیں کسی بنجر و خشک سوتے کی مانند۔۔۔ ان کی ساری زندگی دکھوں و غموں کی عبارت رہی تھی۔ اتنا دکھ تو انہیں تب بھی نہیں ہوا تھا جب پندرہ سال کی عمر میں باپ کی جائیداد میں سے اپنا حصہ مانگنے پہ بڑے بھائی کے ہاتھوں پٹے تھے۔ جب وہ چھوٹی سی عمر میں رات کو انتہائی بھوک کے باوجود بھی بھوکے سو جایا کرتے تھے۔ ٹھنڈا فرش اور ٹھنڈ سے بچنے کو ایک پرانا خستہ حال کھیس ان کی ٹھنڈ کو روک نہیں پاتا تھا۔ ساری رات وہ سکڑے سمٹے سے لیٹے رہتے۔ انہیں نیند نہ آیا کرتی' آنکھیں دکھنے لگتیں اور صبح ہوتے ہی بڑے بھیا کے بچوں کو اسکول لے جانے کی ذمہ داری و تیاری میں ناشتا بھی اکثر گول کرنا پڑ جاتا۔ زندگی میں بے تحاشا اور ان تھک محنت سے وہ آج اس مقام تک پہنچے تھے' مگر انہوں نے کبھی بھی کسی بھی لمحے اپنی محرومیوں کا رونا نہیں رویا تھا۔

ان کی ہر محرومی نے انہیں ہمت اور استقامت عطا کی تھی۔ ہر دکھ نے ان میں آگے اور آگے بڑھنے کی لگن بڑھائی تھی۔ آج وہ بزنس کی دنیا کے ٹائیکون تھے۔ مگر ظاہری طور پر اندر سے وہ آج بھی ویسے ہی تنہا اور دکھی تھے۔ بچپن میں ٹھنڈے فرش پہ سکڑے سمٹے بچے کی مانند۔۔۔ ان کا صرف ایک خواب تھا۔ ایک اچھے سے خوب صورت گھر کا خواب۔۔۔ ایک سلیقہ شعار محبت کرنے والی بیوی اور پیارے پیارے سے بچوں کا خواب۔۔۔ بہت بچپن میں انہوں نے سوچ لیا تھا کہ وہ کبھی بھی یہ سب اپنے بچوں کی زندگی میں نہیں ہونے دیں گے۔ وہ ان پر کبھی کسی بھی دکھ کا سایہ بھی نہیں پڑنے دیں گے جو سب انہوں نے اکیلے خود پر سہا ہے۔ گھریلو گرہستی میں ڈوبی محبت کرنے والی بیوی کا خواب ہی انہیں اب تک بھٹکائے ہوئے تھا۔ ارفع ان کے خواب کی تعبیر تھی' جو کہ پوری نہیں ہوئی تھی' ضروری تو نہیں کہ ہر خواب ہی سچا ہو اور ہر خواب ہی کی تعبیر بھی ملے۔ رات شام سے گہری تھی اور انہیں وہ تاریکی اپنی زندگی پہ محیط ہوتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ یہاں سے چلے جائیں گے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ اس شہر نے انہیں بہت سے انمٹ دکھ دیے تھے۔ انہیں پہلے سے زیادہ دکھی و تنہا کر دیا تھا۔ محبت نہیں تھی' مگر امید تھی۔ مگر اب وہ بالکل تہی داماں تھے' نہ محبت تھی' نہ امید' نہ آس' نہ انتظار۔۔۔



محبت روح کے قفس سے اڑان بھرنے پہ راضی نہ تھی۔ تڑپ عروج پہ تھی۔ ستم یہ کہ رونا بھی محال تھا۔ وعدے کی کیسی زنجیر میں باندھ دیا تھا۔ مسٹر شبیر نے ارفع کو۔۔۔ محبت کی رسوائی مقصود نہ تھی۔ آنسو تو رسوائی کا ہی سبب بنتے نا۔ ارفع کو اس بات کی سمجھ تھی۔ مگر وہ اس دل کا کیا کرتی جو کرب نارسائی کی آگ میں جل رہا تھا۔ جلن ایسی شدید کہ کسی کل چین نہ پڑتا تھا۔ خود کو کمپوز رکھنے کی کوشش میں وہ صبح سے شام کر دیتی' مگر دل ہلکان و پریشان کیے رکھتا محبت الگ تڑپاتی رہتی۔

امی جان اس کی خاموشی میں چھپے احتجاج و درد محسوس کر رہی تھیں' مگر مجبور تھیں کچھ کر نہیں سکتی تھیں۔ "اگر زندگی کے کسی مقام پہ دنیا داری اور دل کی خواہش میں سے کسی ایک کو چننا پڑے تو ہمیشہ دل کو مارنا چاہیے' کیونکہ دل تو پھر بھی صبر کر لیتا ہے۔ مگر دنیا والے تو جینے کی امنگ تک چھین لینے کے درپے ہو جایا

کرتے ہیں۔" وہ اکثر ارفع کو خود سے لپٹا کے سمجھایا کرتیں۔ حیرت کی بات تھی، رشتے کی بات ختم ہوتے ہی رفیعہ بھابھی کا رویہ اس کے ساتھ بے حد اچھا ہو گیا تھا۔ طارق بھائی پہلے کی طرح سے اس کے لاڈ اٹھانے لگے تھے، مگر اس کا دل مر گیا تھا شاید تب ہی ہر احساس سے عاری ہو گیا تھا۔ کسی کی محبت نظر آتی ہی نہ تھی اسے، جانے کیوں؟

"شکر ہے سارا معاملہ نبٹ گیا۔ ارفع تو ناک کٹوانے پہ تلی تھی، ہماری، وہ تو مجھے سارے معاملہ کی بھنک پڑ گئی، ورنہ تو....." بھابھی کے کمرے کے پاس سے گزرتے ارفع نے سنا تو وہ وہیں ٹھہر سی گئی۔

"ارے طارق تو ہیں ہی چغد سے..... اسے کیا معلوم، وہ تو بہن کی محبت میں کر گزرتا اس بڈھے امیر کے ساتھ رشتہ پکا، مگر میں ایسا کرنے دیتی بھلا، وہ ارفع ہے کیا، اس کے پاس جو سب اس کے پیچھے دیوانے ہوئے جاتے ہیں۔ پہلے یاد ہے، مظہر کیسے مشکل سے جان چھڑائی تھی، اف اللہ جانے کیا جادو کرتی ہے یہ چلتر مردوں پہ، سارے ہی مرنے مارنے پہ تل جاتے ہیں۔" ارفع کو اپنا آپ پاتال میں گرتا محسوس ہوا تھا۔ کوئی کسی سے اس قدر نفرت کیسے کر سکتا ہے؟

"طارق تو اسے مارنے پہ تل گئے تھے۔ پورا گھر ایسے مخالف ہو گیا تھا امی جان تک شکوک ہو گئی تھیں۔" دوسری جانب کیا کہا گیا، وہ لحہ بھر کو ذرا خاموش ہوئیں، پھر بولی تھیں۔

"ارے نہیں، نہیں کیسی باتیں کرتی ہو، مجھ پہ کسی کو شک کیوں ہو گا بھلا۔ میں نے بھی کبھی کچی گولیاں نہیں کھیلیں فرنٹ پہ تو ہمیشہ طارق ہی کو رکھتی ہوں ہاں ہاں میں سمجھ رہی ہوں؟" ارفع کو سارا معاملہ سمجھ میں آ گیا تو طارق بھائی کے انکار کی وجہ رفیعہ بھابھی اور ان کے من گھڑت قصے، کہانیاں تھے۔ وہ دروازہ کھول کے اندر داخل ہو گئی رفیعہ بھابھی فون میں گم تھیں آہٹ پہ چونکیں تو موبائل ہاتھ سے چھوٹ کے نیچے جا گرا، ارفع ایک ایک قدم ناپ کر چلتی ان کے مقابل آ کھڑی ہوئی تھی۔

"ارے ارفع..... تم کب آئیں، تمہارے آنے کا پتا ہی نہیں چلا؟" رفیعہ بھابھی ایک لمحے کو ذرا گڑبڑائیں، پھر سنبھلتے ہوئے بولی تھیں۔ ارفع خاموش بغور بھابھی کو دیکھتی رہی۔

"بیٹھو نا کھڑی کیوں ہو؟" وہ خود پہ اس کی نظروں کے بے جا ارتکاز سے خائف ہوئیں۔

"میں یہاں بیٹھنے نہیں آئی بھابھی بس اتنا کہنے آئی ہوں کہ میں نہیں جانتی آپ کو مجھ سے کیا پرخاش ہے، میں نے کیا بگاڑا ہے آپ کا، مگر میں آج صرف اتنا کہوں گی کہ اللہ آپ کو ایک بیٹی ضرور دے جو بالکل ارفع جیسی ہو، اس ارفع جیسی جس سے آپ کو نفرت ہے۔" وہ کہہ کے بھاگتے اور روتے ہوئے کمرے سے نکلی تھی۔ ہمیشہ رفیعہ بھابھی کے آگے پیچھے پھرنے والی ارفع آج حیران تھی۔ اس کے دل کو ویران کرنے والی اسے بھائی کی نظروں سے ________ گرانے والی رفیعہ بھابھی تھیں۔ اس نے بس روتے تڑپتے، چچا میاں سے ایک التجا کی تھی کہ جو بھی کریں جیسے بھی کریں، بس اسے آ کر یہاں سے لے جائیں۔ امی جان نے بہتیرا اسے روکنے کی کوشش، مگر اس نے فقط اتنا کہا تھا۔

"ایک بات میں نے آپ کی مانی تھی، اب یہ بات میری آپ کو ماننی پڑے گی۔ مجھے معاف کر دیجیے گا امی جان، مگر میرا یہاں سے چلے جانا ہی بہتر ہو گا؟" اس نے روتے ہوئے امی جان کے آگے ہاتھ جوڑتے التجا کی تھی۔

"مگر ارفع! تمہارے بھائی کیا سوچیں گے، تمہارے جانے پہ اور پھر بھابھیوں کو تو جانتی ہی ہو، کیا، کیا نہ باتیں ہوں گی۔" امی جان کو ہمیشہ کی طرح دنیاداری کا جگ ہنسائی کا خدشہ تھا۔

"جو میرے یہاں رہنے سے ہو گا، اس سے بہت کم ہو گا، وہ سب جو بھابھیاں یا دنیا والے میرے بارے میں کریں گے مجھے جانے دیجیے امی جان۔" امی جان کو لگا کہیں کچھ غلط ہوا ہے۔

"ارفع کیا ہوا ہے؟" انہوں نے سرسراتی آواز میں

دہلتے دل کے ساتھ پوچھا تھا۔
"کچھ نہیں..... بس ارفع مر گئی ارفع کا قتل ہو گیا؟"
اس نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہا تھا۔
پھر وہ چلی آئی تھی، چچا میاں کے ہمراہ..... طارق بھائی نے روکا بھی وجہ بھی پوچھی، مگر چچا میاں نے ٹال دیا۔ دیبا چچی اسے دیکھ کر بے حد خوش تھیں ارفع ان کی گود کی حدت ملتے ہی ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گئی۔ ارفع کی زبانی ساری کہانی سننے کے بعد انہوں نے وہ سب چچا میاں سے کہا تھا۔
"حیرت ہے بھابھو نے بھی تمہارا ساتھ نہیں دیا؟" چچا میاں کو امی جان پہ سخت حیرانی تھی۔
"بیٹی کی ماں کر بھی کیا سکتی ہے، جسے دنیا والوں کا ڈر بھی ہو؟" ارفع نے امی جان کی بے بسی یاد کرتے جواب دیا تھا۔
"خیر تم فکر مت کرو، تم ہماری بیٹی ہو، ارفع ہم کروائیں گے تمہاری شادی شبیر کے ساتھ؟" دیبا چچی نے اسے دلاسا دیا تھا ارفع تڑپ اٹھی۔
"نہیں چچی..... جس کی خاطر میں نے خونی رشتوں کو کھویا۔ اسی کی خاطر میں مزید رسوا نہیں ہو سکتی ابھی تو چہرے کے نقاب ہٹے ہیں پھر بھرم بھی ٹوٹ جائیں گے اور جس متوقع جگ ہنسائی کا ان لوگوں کو ڈر تھا۔ اس کو میں سچ کیسے کر سکتی ہوں؟" دیبا چچی خاموش ہو گئی تھیں۔
دن مہینوں میں بدلتے رہے تھے وہ پلٹ کر دوبارہ گھر نہیں گئی تھی طارق بھائی کے گھر اللہ تعالیٰ نے شادی کے دس سال بعد خوشخبری سنائی تھی طارق بھائی خوش خوش مٹھائی کا ڈبا لے کر..... مبارک باد دینے آئے۔
"مبارک ہو ارفع پھپھو بننے والی ہو؟" انہوں نے جوش و جذبات سے اسے گلے لگا لیا تھا ارفع پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔ طارق بھائی نے اس کا رونا خوشی پہ محمول کیا اور خود بھی رو دیے۔
"گھر چلو ارفع؟" انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے کہا تھا۔
"آپ کا بچہ دیکھنے آؤں گی بھائی جان۔" اس نے نرمی سے ٹال دیا تھا۔
"وعدہ کر رہی ہو نا؟" انہوں نے آس سے پوچھا ارفع کو کوئی اور یاد آ گیا ایسا ہی یقین آس تو کسی اور کے بھی لہجے میں ہوا کرتی تھی۔ اس نے دھیرے سے سر اثبات میں ہلا دیا تھا کہ دل توڑنا تو اسے آتا ہی نہ تھا اور پھر طارق بھائی کا قصور بھی کیا تھا فقط اتنا کہ وہ رفیعہ بھابھی پہ آنکھیں بند کر کے اعتبار کرتے تھے انہوں نے اپنی تربیت اور خون پہ اعتبار نہیں کیا تھا اور یہی بے اعتباری ارفع کا جگر چھلنی کر دیتی تھی۔ ایک سال ہو گیا تھا اسے چچا میاں کے ہاں آئے ہوئے امی جان اکثر آ کر اس سے مل جایا کرتیں۔
"عندلیب کتنی مرتبہ راول کے لیے تمہارا کہہ چکی ہے اب تو روز بروز اس کا اصرار بڑھتا ہی جا رہا ہے تمہارے بھائیوں کو بھی فکر ہے تمہاری۔ تم ہی بتاؤ کیا جواب دوں میں ان سب کو؟" امی جان فون پہ اس سے کہہ رہی تھیں عندلیب آنٹی رفیعہ بھابھی کی ممانی تھیں۔
"مجھے ابھی پڑھنا ہے امی جان اپنے پیروں پہ کھڑا ہونا ہے آپ انہیں کہہ دیجیے انتظار کر سکتی ہیں تو ٹھیک ورنہ جہاں دل چاہے اپنے بیٹے کا رشتہ طے کر سکتی ہیں؟"
"اتنا اچھا رشتہ ہے ارفع روز روز آسانی سے نہیں ملا کرتے؟" امی تذبذب کا شکار تھیں۔
"مجھے کسی بھی اچھے رشتے کی ضرورت نہیں امی جان کیونکہ مجھے شادی ہی نہیں کرنی۔" فون بند کرتے اس نے دل گرفتی سے سوچا تھا پھر ایک روز طارق بھائی کا فون آیا ان کے ہاں بیٹی ہوئی تھی ارفع کو سمجھ نہ آئی وہ خوش ہو یا روئے۔ اس نے جذبات میں آ کے بھابھی کو بددعا تو دے دی تھی مگر اس کے بعد ہر لمحے اس کے قبول نہ ہونے کی ہزاروں دعائیں مانگی تھیں۔
"بالکل تمہارے جیسی ہے ارفع۔ وہی ناک وہی نقشہ۔" طارق بھائی پر جوش سے اسے فون پر بتا رہے تھے "اس کے نصیب میرے جیسے نہ ہوں بھائی جان یہ

دعا کیجیے بس۔" اس نے دل ہی دل میں طارق بھائی سے مخاطب ہوتے کہا تھا۔

"بہت بہت مبارک ہو بھائی جان اللہ نے ہم سب کی سن لی؟" اس نے دل کی بات ہونٹوں پر نہیں آنے دی تھی۔

"تم کب آرہی ہو اسے دیکھنے کے لیے۔ میں نے سب سے کہہ دیا ہے کہ نام تو ارفع ہی رکھے گی؟"

"میں جلد آؤں گی بھائی جان۔" اس نے فون رکھتے دھاڑیں مار مار کے رونا شروع کردیا تھا۔

کس کس بات کا رونا روتی' محبت کا' بے اعتنائی کا بے اعتباری کا وہ کس دل سے رفیعہ بھابھی کا سامنا کرپائے گی کس دل سے انہیں مبارک باد دے پائے گی خصوصا" تب جب دل جذبات سے عاری تھا۔ مگر کچھ کام دنیاداری کے لیے بھی کرنے پڑتے ہیں سو اس نے بھی اس گزرے ایک ڈیڑھ برس میں کچھ نہ کچھ دنیا داری سیکھ ہی لی تھی چچی کے ساتھ جاکے بچی کے لیے ڈھیر ساری شاپنگ کی اور دوسرے ہی روز ان سب کے ساتھ لاہور چلی آئی۔

گھر میں اس کا پرتپاک استقبال ہوا تھا وہ اپنے ہی گھر میں ڈیڑھ برس بعد لوٹی تھی۔ گھر آکے جو روح فرسا خبر اسے سننے کو ملی تھی وہ اس کے لیے جان لیوا تھی طارق بھائی کی بیٹی پیدائشی طور پر گونگی اور بہری تھی۔ ارفع تڑپ کے بچی کے پاس گئی تھی طارق بھائی نے سچ کہا تھا وہ سچ میں ارفع جیسی ہی تھی وہی ناک نقشہ اور اس کی طرح زبان ہونے کے باوجود بھی گونگی اور بہری۔ وہ بچی کو لپٹائے ہوئے تھی جب اسے اپنے پیروں پہ نمی کا احساس ہوا تھا اس نے دیکھا رفیعہ بھابھی اس کے پیروں میں جھکی روتے ہوئے اس سے معافی مانگ رہی تھیں وہ تڑپ کر انہیں سیدھا کرنے لگی تھی۔

"یہ کیا کررہی ہیں بھابھی!"

"مجھے معاف کردو ارفع ہر چند کہ میں معافی کے لائق نہیں میں مانتی ہوں کہ میں تمہاری قصوروار ہوں مجھے تمہاری دعا بددعا بن کے لگی ہے۔" ارفع نے دیکھا وہ پورے گھر کے سامنے اس سے معافی مانگ رہی تھیں وہاں سب کھڑے تھے امی جان 'طارق بھائی' ابتسام 'اسما بھابھی' چچا میاں' چچی تو کیا وہ سب جانتے تھے۔

"یہ مت سمجھنا ارفع کہ اپنی معذور بیٹی کی خاطر مجھے اپنی زیادتی کا احساس ہوا ہے بلکہ تمہارے جانے کے بعد ہی مجھے اپنی ہر غلطی کا ادراک ہوگیا تھا تم نے صحیح کہا تھا کہ تم نہیں جانتیں کہ مجھے تم سے کیا پرخاش ہے سچ پوچھو تو مجھے خود خبر نہیں تھی کہ میں تم سے اتنی نفرت کیوں کرتی ہوں میرے اندر کی حاسد عورت اپنی ذات کے آگے کسی کو کچھ نہیں گردانتی ارفع ہر بات میں اہمیت و مقام و مرتبہ کو میں اپنا حق سمجھتی مجھ سے برداشت نہیں ہوتا تھا جب سارے گھر والے خصوصا" طارق تمہیں اتنی محبت و توجہ دیتے تھے تو.... میرا دل چاہتا کہ تم کچھ ایسا کرو جس کی وجہ سے تم سارے گھر والوں کی نظروں سے گرجاؤ۔ تم نے تو ایسا کچھ نہیں کیا مگر پھر مجھے وہ موقع ملا میں نے تمہیں رسوا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ میں حسد کی آگ میں اتنی اندھی ہوگئی تھی کہ یہ بھول گئی تھی کہ مارنے والے سے بچانے والی ذات سب سے بڑی ہے' جس کی لاٹھی بے آواز ہے' جس کا عدل مشہور ہے جب تم خاموشی سے کسی سے بھی کچھ بھی کہے بغیر چلی گئیں تو مجھے احساس ہوا کہ میں کتنی غلط تھی تم تو جاتے جاتے بھی میرے ساتھ بھلا کر گئیں جبکہ مجھے ایسا لگا تھا تم میری ساری حقیقت جاننے کے بعد سب کو میری اصلیت بتا کر جاؤ گی طارق مجھے چھوڑ دیں گے یہ تصور ہی میرے لیے سوہان روح تھا میری راتوں کی نیندیں حرام ہو گئی تھیں مجھے اس وقت احساس ہوا کہ میں نے حسد اور نفرت کی آگ میں جلتے خود اپنے ساتھ ہی کتنی بڑی زیادتی کی تھی اپنے پیروں پہ خود اپنے ہاتھوں سے کلہاڑی ماری تھی۔

میں نے طارق کو ساری بات شروع سے آخر تک بتائی تھی اور جانتی ہو ارفع میں نے اپنے گھر کو

بچانے کے لیے طارق کو کس کا واسطہ دیا تھا۔ اس محبت کا جو طارق تم سے کرتے ہیں اس محبت کا جو ایک بھائی ایک بہن سے کرتا ہے اس محبت کا جو ایک باپ اپنی بیٹی سے کرتا ہے۔ تمہارے جانے کے بعد میں نے ہر لمحہ یہ دعا کی تھی کہ مجھے اللہ بیٹی دے اور وہ ہو بہو تمہارے جیسی ہو بالکل تمہارے جیسی۔" کمرے میں موجود تمام نفوس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔

"میں نے آپ کو معاف کیا بھابھی آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا میرے لیے یہ ہی بہت ہے۔" اس نے رفیعہ بھابھی کو کندھوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا وہ ابھی تک اس کے قدموں میں بیٹھی تھیں۔

"میں نے اپنے طور اپنی غلطی سدھارنے کی کوشش کی ہے ارفع ساری حقیقت جاننے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ اچھی بیٹی خدا کی کتنی بڑی نعمت ہوتی ہے مجھے خود سے نفرت محسوس ہوئی کہ میں تم سے بدگمان کیسے ہو گیا جبکہ میں نے تو تمہیں گود میں کھلایا تھا انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا تھا تم تو میرے بتائے ہوئے راستوں پہ ہی چلتی رہی تھیں میں ہر مرتبہ جب تم سے ملنے جاتا تو میرا دل چاہتا تم مجھ سے کچھ تو کہو کوئی شکوہ کوئی گلہ مگر تم اتنی عظیم ہو کہ ماتھے پہ شکن تک نہ ڈالتی تھیں میں خود کو پاتال میں گرتا محسوس کرتا تھا۔" طارق بھائی اسے گلے لگائے روتے ہوئے معافی مانگ رہے تھے۔ ارفع کو لگا محبت میں دی گئی قربانی نے اسے گھر والوں کی نظروں میں سرخرو کر دیا ہے۔

"جو ہوا اس سب کو بھول جائیں پلیز اور سوچیں کہ بچی کا نام کیا رکھنا ہے؟" دیبا چچی نے ماحول کے تناؤ کو کم کرنے کی خاطر موضوع ہی بدل دیا تھا۔

"ارفع بتائے گی کہ اس کا نام کیا ہونا چاہیے بتاؤ؟" طارق بھائی نے بچی کو ارفع کی گود میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "اس کا نام ہم خوشی رکھیں گے ٹھیک ہے نا؟" ارفع نے سوچتے ہوئے کہا تھا سب کو نام بے حد پسند آیا۔



اسے یہاں آئے آج تیسرا روز تھا کل صبح دیبا چچی اور چچا میاں کو واپس چلے جانا تھا۔ اس لیے وہ کچھ دیر دیبا چچی کے پاس بیٹھی تھی خوشی اس کی گود میں ہی تھی۔ ڈرائنگ روم میں طارق بھائی کے کچھ مہمان آئے تھے چچا میاں ان کے ساتھ مصروف تھے۔

"دیبا ذرا باہر آؤ گی؟" امی جان عجلت میں کمرے میں آتے ہی دیبا چچی کو بلا کر واپس چلی گئی تھیں۔

"کیا بات ہے چچی جان؟" ارفع کو ذرا حیرت ہوئی۔

"پتا نہیں دیکھتی ہوں جا کے ابھی؟" وہ چپل پاؤں میں اڑستی جاتے ہوئے بولیں ارفع خوشی پہ جھک گئی نرم نرم گلابی گالوں والی خوشی بہت پیاری سی بچی تھی۔ تھوڑی دیر بعد دیبا چچی افتاں و خیزاں سی واپس کمرے میں لوٹی تھیں ان کے ہاتھ میں کچھ کپڑے تھے۔

"ارفع.... جلدی سے یہ پہن لو وہ لوگ بس نکاح کے لیے آتے ہی ہوں گے؟" ارفع اگر خود کو نہ سنبھالتی تو یقیناً" خوشی اس کے ہاتھوں سے پھسل جاتی۔

"کس کا نکاح چچی جان؟"

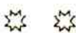
"تمہارا میری جان اور کس کا؟ اللہ میری بچی کے نصیب اچھے کرے بس۔" انہوں نے آگے بڑھ کر اسے دعا دی ارفع ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے چچی جان۔ یہ لوگ میرے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے۔"

"تم نے ہمیشہ باپ بھائی کی عزت کا مان رکھا ہے ارفع۔ اب بھی رکھ لو۔" انہوں نے پیار سے اسے منایا۔ ارفع کا دماغ سائیں سائیں کرنے لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی مزید بات کرتی دروازہ کھول کے کوئی اندر آیا تھا چچی اسے دیکھتی باہر نکل گئی تھیں ارفع نے مڑ کے نہیں دیکھا جانتی تھی اسے راضی کرنے کوئی نہ کوئی آیا ہو گا۔

"کیسی ہو؟" خوشبوؤں میں بسا لہجہ آس پاس کہیں مہکا تھا ارفع نے مڑ کے دیکھا تو پتھر کی ہو گئی اپنی تمام تر وجاہت سمیت شبیر جان اس کے سامنے ہنستے

مسکراتے کھڑے تھے وہ ہلکا سا کھنکارے ارفع کا ارتکاز پھر بھی نہیں ٹوٹا اسے لگا وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔
"کیا بہت ہینڈسم ہو گیا ہوں؟" وہ شرارت سے اس کی جانب جھکے۔
"مسٹر شبیر آپ.... یہاں کیسے؟" وہ سخت متعجب تھی۔
"اپنی امانت لینے آیا ہوں پورے عزت و احترام کے ساتھ؟" ارفع اس کایا پلٹ پہ حیران تھی ناممکن ممکن کیسے ہوا تھا اور انہوں نے یہ سب کیسے کیا تھا۔
"اچھا تو آپ یہاں میرے اچانک ہونے والے نکاح میں شرکت کرنے کے لیے آئے ہیں؟" حقیقت سمجھتے ہی اس نے ان پر دھونس جمائی۔
"جی نہیں بلکہ آپ کو اپنے اچانک ہونے والے نکاح میں شرکت کے لیے مدعو کرنے آیا ہوں؟" وہ بھی فوراً بولے تھے۔ ارفع ایک دم ان کے نزدیک آگئی پھر کندھے سے چھو کر ان کے وجود کو محسوس کیا۔
"آپ سچ میں آگئے ہیں نا مسٹر شبیر؟" ارفع کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔
"ہاں ارفع۔ میں نے کہا تھا نا کہ محبت کو کبھی رسوا نہیں ہونے دوں گا اچھے وقت کا انتظار کروں گا اور میں نے اچھے وقت کے لیے ہمت صبر کی دعا کی اور مجھے خوشی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول کرلی۔"
"آپ مجھے چھوڑ تو نہیں دیں گے نا؟" ارفع ان سے یقین چاہ رہی تھی۔
"کبھی نہیں۔ میں تو ایسا سوچوں بھی تو ایسا لگتا ہے جیسے گناہ کا مرتکب ہو جاؤں گا۔ تم نے میرا وعدہ نبھایا تھا کہ نہیں؟" انہوں نے خوشی سے کھلتے اس سے پوچھا تھا۔ ارفع نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔
"تو پھر اب کیوں بھول گئی وہ وعدہ اب کیوں رو رہی ہو؟" ارفع کو ایک دم احساس ہوا کہ وہ رو رہی ہے فوری بات بنائی۔
"ارے یہ تو خوشی کے آنسو ہیں مسٹر شبیر؟"
"اب کبھی مت رونا ارفع چاہے آنسو خوشی کے ہوں یا غم کے میں ان آنکھوں کو کبھی بھی نم نہیں دیکھ سکتا۔"
"نہیں اب کبھی نہیں روؤں گی مسٹر شبیر اگر آپ میرے ساتھ رہیں گے تو" وہ پھر رو دی۔
"ایک بات تو بتائیں مسٹر شبیر؟" اچانک یاد آنے پر اس نے پوچھا تھا ہتھیلی کی پشت سے آنسو پونچھے۔
"ان لوگوں نے آپ کو ڈھونڈا کیسے؟" وہ ہنس دیے انہیں ارفع کی بہت پرانی بات یاد آئی تھی۔
"حالانکہ یہ سوال تمہیں سب سے پہلے پوچھنا چاہیے تھا؟" انہوں نے اسے چھیڑا تھا۔
"بتائیں نا پلیز؟"
"لمبی کہانی ہے کبھی فرصت سے بتاؤں گا بلکہ اب تو فرصت ہی فرصت ہے جی بھر کے اس گزرے ڈیڑھ برس کے حالات سناؤں گا۔ بولو میرا ساتھ قبول ہے نا؟" وہ ہاتھ پھیلائے اس کی جانب منتظر نگاہوں سے دیکھ رہے تھے ارفع نے ایک پل کی دیر کیے بغیر ان کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا انہوں نے اس کے ہاتھ کو یوں تھاما جیسے کوئی اپنی قیمتی متاع حیات سنبھالتا ہے۔ اور ارفع ان کے لیے کسی متاع حیات سے کم تھی بھی نہیں وہ ان کی پوری زندگی کا حاصل تھی۔
نکاح کے بعد یہی بات انہوں نے سب کے سامنے دہرائی تھی ارفع کو وہ ہمیشہ خوش رکھیں گے اس کا خیال رکھیں گے ایسی کسی بھی بات کی وعدے یا قسم کی ضرورت ہی نہیں پیش آئی تھی کیونکہ سب جانتے تھے کہ ارفع شبیر جان کے ہمراہ بہت خوش رہنے والی تھی۔ نکاح کے بعد ارفع کو پتا چلا کہ اس کے گھر والوں اور شبیر کا پورے ایک سال سے رابطہ ہے اور رابطہ کرنے والی خود رفیعہ بھابھی تھیں ارفع اور شبیر خوش تھے کہ اتنی کٹھنائیوں کے بعد انہیں ایک دوسرے کا ساتھ نصیب ہو گیا تھا جبکہ دوسری جانب رفیعہ بھابھی اپنے رب کی شکر گزار تھیں جنہوں نے انہیں لمحہ فکریہ بخشا تھا تاکہ وہ اپنی دنیا و آخرت کو سنوار سکیں۔



فرگانہ ناز ملک



عقیدت اپنی اماں اور جمیلہ کے ساتھ اپنے آبائی شہر کو چھوڑ کر لاہور شفٹ ہو گئی ہے۔ اس بات سے، عقیدت کے بہن بھائی تحریم اور شہریار سخت ناراض ہیں۔ عقیدت ایک کم ہمت، کم گو اور اپنی ذات میں بند رہنے والی لڑکی ہے، اس کی اماں بے حد حسین ہیں۔ سنعان ماں، باپ کی توجہ کو ترسا بکھرا ہوا نوجوان ہے۔ اس کے گھر میں دولت کی ریل پیل ہے۔ وہ اکلوتا ہے، مگر محبتوں سے محروم ہے۔ اس کی ماں فائزہ شوہر کی بے رخی اور تظلم کی وجہ سے نفسیاتی مریضہ بن چکی ہیں۔ ''غوری منزل'' میں تین پورشنز ہیں۔ جہاں گرینی تین بیٹوں، بہوؤں اور پوتے، پوتیوں کے ہوتے بھی تنہا ہیں۔ نورین اور سلمان صاحب کی بیٹی حبہ سلمان ٹی وی پر اینکر ہے۔ اس کے چچا کا بیٹا حارث اسے پسند کرتا ہے۔ لیکن حبہ شادی کرنے کے حق میں نہیں۔ عالم صاحب ایک مشہور و معروف جاگیردار ہیں۔ زندگی کی تمام عیاشیوں کے مزے لوٹنے کے بعد وہ اب احتسابی دور سے گزر رہے ہیں۔ ان کا ایک مفلوج و اپاہج بیٹا جلال بھی ہے۔ جو ان کی بہو سحر کی آنکھوں میں کھٹکتا ہے۔ عالم صاحب کو جلال کی فکر ہے۔

ساتویں قسط



رات گہری ہو رہی تھی۔ اور وہ گرد و پیش سے اتنی بے خبر تھی کہ جمیلہ کے آنے پر بھی نہ چونکی۔ یوں بھی جمیلہ بلی کی سی چال کے ساتھ آئی تھی چائے کا کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کے کچھ دیر خوامخواہ اسے واری صدقے نظروں سے دیکھتی رہی جو آنکھیں میچے خاصی زوردار آواز میں اناٹومی رٹنے میں مصروف تھی۔ وہ لڑکی جس کے گلے سے لفظ سوچ سوچ کر نکلتے تھے۔ نکل بھی جاتے تو اٹک اٹک جایا کرتے تھے۔ وہ جب یوں زور و شور سے بول بول کر لیکچر یاد کرتی تو جیسے جمیلہ کا دل لوٹ لیتی۔ ابھی اگرچہ اس کی اس باضابطہ پڑھائی نے جمیلہ کی بولتی قدرے بند کر دی تھی۔ پہلے والا ہنسی ٹھٹھول بھی بند ہو گیا تھا۔ پڑھائی کے اس سخت شیڈول نے اس پر تو جو اثر کیا سو کیا۔ اماں اور جمیلہ کی مشہور زمانہ بے تکلفی بھی متاثر ہو کر رہ گئی۔ اب اماں کا قہقہہ نکلتا تو جمیلہ کے آنکھوں ہی آنکھوں میں تنبیہی اشارے پر آدھا واپس مڑ جاتا۔۔۔ جمیلہ اونچی آواز میں کوئی کہانی سنانے پر جوش میں آتی تو اماں کی گھرکی پر سارے الفاظ اندر ڈکار لیتی۔ پھر بھی عادت کہاں جاتی ہے، دونوں اس کی پڑھائی کے وقت بھی دھیمی دھیمی کھسر پھسر میں ضرور لگی رہتیں۔

عقیدت نے آنکھیں کھول کر ذرا کی ذرا دیکھا۔ اس کی پڑھائی کے دوران چائے بنانے کا فرض جمیلہ بخوبی نبھاتی تھی۔

"پڑھتی رہو۔۔۔ پڑھتی رہو۔۔۔ ابھی ہم جاگ رہے ہیں۔" پھر منہ ہی منہ میں کہتی حوصلہ دیتی کمرے سے باہر چلی گئی۔ ابھی بارہ بجنے میں کچھ دیر تھی۔ اماں چند لمحوں بعد کمرے میں آجاتیں۔ اب پہلے کی طرح عقیدت سوئی نہیں ملتی تھی۔ اماں کتنی ہی دیر تک اسے وارفتگی سے دیکھتی رہتیں۔ انہیں اس کے حسین مستقبل کی بازگشت کہیں قریب سنائی دینے لگی تھی۔ وہ ساری تلخ باتوں کو جھٹک کر آنکھوں پر دوپٹا رکھ کر سو جاتیں۔ انہیں روشنی میں کبھی بھی نیند نہیں آتی تھی۔ اور انہیں معلوم تھا، عقیدت اتنی رات کو الگ بیٹھ کر نہیں پڑھ سکتی وہ تو بھرے دن میں بھی کتابیں لیے کبھی کچن میں تو کبھی لاؤنج کی سیڑھیوں پر بیٹھی پڑھتی ملتی۔ آس پاس اماں اور جمیلہ کے ہوتے ہوئے بھی۔۔۔!



ابھی وہ کمرے میں آئیں تو عقیدت کتابیں سمیٹ چکی تھی۔

"بس۔۔۔ ہو گئی پڑھائی۔۔۔" انہیں بے ساختہ پیار آیا۔

"جی اماں۔۔۔" وہ چائے پی رہی تھی۔ اماں نے بیڈ پر پڑا اس کا کالج بیگ اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ خود اس کے قریب بیٹھ گئیں۔

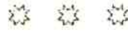
"جمیلہ سو گئی؟" اس نے ایسے ہی پوچھ لیا۔

"ہاں سو گئی۔۔۔ بے چاری سارا دن کاموں میں لگی رہتی ہے۔ اس ٹائم میری وجہ سے بیٹھ جاتی ہے ورنہ آنکھیں بند ہو رہی ہوتی ہیں اس کی۔۔۔ اللہ خوش رکھے بڑا آرام ہے اس کی وجہ سے۔" جمیلہ کے لیے اماں کا رواں رواں دعا گو رہتا تھا۔ انہیں کبھی کبھی لگتا وہ انہیں کسی نیکی کے بدلے ملی ہے۔ جمیلہ کی اس بے مول خدمت کی عقیدت بھی معترف تھی لیکن ابھی اس کا دھیان کسی اور جانب تھا۔

"اللہ کے ہر کام میں اس کی اپنی مصلحت ہوتی ہے۔ جمیلہ اور مجھے ایک دوسرے سے ملانے کے لیے۔ شاید اس لیے بہت سوں سے دور کیا۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے کا سہارا بنانے کے لیے، ہماری زندگی میں مادی چیزوں کی طرح رشتوں میں کمی بیشی ہو جائے تو اس کی کمی کو دور کرنے کا اہتمام وہ کسی نہ کسی طرح ضرور کر دیتا ہے اور ہمیں بہت بعد میں پتا چلتا ہے کہ یہ اس نے ہمارے ساتھ بہت اچھا کیا مجھے بھی اب احساس ہوتا ہے۔ جمیلہ کا ہونا اللہ

کی طرف سے ایک مدد ہی تھی جمیلہ نہ ہوتی تو شاید زندگی اتنی سہل نہ ہوتی۔"
"اماں!" یوں تو عقیدت بھی جمیلہ کی عقیدت مند تھی۔ مگر فی الوقت اماں اس کی دلچسپی کھینچنے میں ناکام رہیں۔ اسے اپنا مطلب نکلوانے کی جلدی تھی۔
"بولو اماں کی جان۔۔۔"
"اماں۔۔۔ مجھے کل مائدہ لوگوں کے ساتھ ہاسٹل جانا ہے۔" قدرے ہچکچاتے ہوئے اس نے مطلب کی بات کہی۔
"پھر جانا ہے؟" اماں کی حیرت بجا تھی۔ ابھی ہفتہ پہلے ہی تو وہ اور رجا گئی تھیں اور وہ والا وزٹ اس لیے تھا کہ مائدہ' زنوبیہ انہیں اپنا ہاسٹل دکھانا چاہ رہی تھیں۔ اس دن رجا اپنی گاڑی نہیں لائی تھی۔ ان سب کو رکشا میں جانا پڑا تھا۔ واپسی پر اماں اور جمیلہ اسے خود لائی تھیں جبکہ رجا کو اس کا بھائی لے گیا تھا۔
ہاسٹل میں گزارے وہ لمحے بڑے شاندار تھے ان کی آمد کے فوراً" بعد فرسٹ فلور کی لڑکیاں مائدہ کے کمرے میں آآکر جھانکتی رہی تھیں۔ سب کے لبوں پر ایک ہی سوال تھا۔
"کون ہے وہ لڑکی جس کی آنکھیں بہت پیاری ہیں؟" اور وہ سب کی سب پیاری آنکھوں والی عقیدت کو گھورے جارہی تھیں۔
"نازش نے آکر بتایا مائدہ کے کمرے میں ایک لڑکی آئی ہوئی ہے۔ اس کی آنکھیں بہت خوب صورت ہیں واقعی کیا مثالی آنکھیں ہیں کیا تم ہماری کلاس کی ہو۔ میں نے تو آج تک غور ہی نہیں کیا۔" جو بھی آرہی تھی کم و بیش اس سے ملتے جملے کہہ رہی تھی اور وہ سرخ ہوئی جارہی تھی۔ مرکز محفل بن جانا بھی کتنا مشکل ہوتا ہے۔۔۔
گھر جاکر اس نے ہر ہر زاویے سے آئینہ تکا تھا۔۔۔ وہاں وہی آنکھیں تھیں جو وہ روز دیکھتی تھی۔۔۔ تھک ہار کر جمیلہ کے آگے جا بیٹھی۔
"میری آنکھیں کیسی ہیں۔"
"اماوس کی رات جیسی۔۔۔ وہ کیا کہتے ہیں آہو چشم۔۔۔ غزالی۔۔۔ چمکدار روشن۔ پتا نہیں تمہاری آنکھیں کس پہ چلی گئیں' باجی اور تحریم باجی ہوراں کی تو سبز شیشے جیسی آنکھیں ہیں۔۔۔ ہرا سوٹ پہنیں تو ہری آنکھیں لگنے لگتی ہیں اور نیلا پہنیں تو نیلی۔۔۔" جمیلہ سے پوچھنا اپنے آپ میں صبر آزما ثابت ہوا وہ اس سے شروع ہوئی تحریم تک جا پہنچی۔
باقی کی رات اس نے یہی سوچتے گزاری کہ "میری آنکھیں کالی کیوں۔۔۔ اماں لوگوں جیسی کیوں نہیں؟" ہاسٹل میں ہوئی ساری تعریف پر پانی پھیر دیا تھا جمیلہ نے۔۔۔
"عقیدت میں پوچھ رہی ہوں پھر کیوں جانا ہے؟" وہ ہاسٹل میں گزارے اسی پہلے دن میں کھوئی ہوئی تھی جب اماں نے سوال دہرایا۔
"زنوبیہ کی سالگرہ ہے اماں' وہ ضد کررہی ہے میں اور رجا ہاسٹل آجائیں۔"
"اچھا۔۔۔" اماں سوچ میں گم ہوئیں۔
ماشاءاللہ سب اچھے گھر کی تھیں۔ زنوبیہ تو سب سے زیادہ ملنسار تھی۔۔۔ اماں پر بھی زنوبیہ کا جادو چل گیا تھا۔ اس دن وہ اماں سے کسی بچھڑی سہیلی کی طرح ملی تھی۔ آنٹی آنٹی کرتے زبان نہیں تھک رہی تھی اس کی۔ اماں کی وہاں موجودگی کے دوران ہی اس نے کئی بار تو عقیدت کو غیرت دلائی کہ وہ اپنی اماں جیسی کیوں نہیں۔ زندہ دل' شاداں و فرحاں۔۔۔
"پھر تو اس کو تحفہ بھی دینا ہوگا؟" اجازت دینے سے پہلے اماں فکرمند ہوئیں۔

"وہ تو اماں، ہم ساری دوستیں پیسے ملا کر کوئی ایک اچھی سی چیز لے لیں گے۔"
"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" اماں فوراً "مطمئن ہوئیں۔
"پھر میں جاؤں کل؟" عقیدت ابھی بھی ہاں سننے کی منتظر تھی۔
"جاؤ گی کیسے تم؟"
"کل رجا اپنی کار لے آئے گی ہے۔"
"پھر رات کو تم دونوں اکیلی واپس آؤ گی؟" اماں کی آنکھیں پھیل گئیں۔
"رات نہیں کریں گے اماں۔۔۔ جلدی واپس آئیں گے۔" اس نے جلدی جلدی کہا مبادا اماں نئی پریشانی بتا دیں۔
"چلو۔۔۔ ٹھیک ہے۔" اور وہ خوش ہو گئی۔ وہ بے شک اپنے گروپ کی لڑکیوں کی ہم مزاج نہیں تھی۔ لیکن اسے بھی یہ ہلا گلا، ملنا ملانا خوش کرنے لگا تھا۔
واش روم سے ہو کر وہ جب واپس آئی۔ اماں بستر پر دراز سوچوں میں گم تھیں۔ اس نے لائٹ گل کر کے زیرو پاور کا بلب جلایا اور ماں کے پہلو میں جا لیٹی اماں نرمی سے اس کے بالوں میں انگلیاں چلانے لگیں۔
"عقیدت۔۔۔ میری جان۔۔۔" آج شاید وہ سونے کے موڈ میں نہیں تھیں۔
"جی اماں۔۔۔" ہاسٹل جانے کے خیال سے اس کی بھی نیند قدرے اڑ گئی تھی۔
"تم زندگی کا یہ چہرہ پہلی بار دیکھ رہی ہو یہ رنگ تمہارے، لیے قطعی اجنبی ہیں۔ تم اس سب کا حصہ ضرور بنو لیکن عادی مت ہو۔ پہلی بار گھر سے نکلی ہو پہلی بار اتنے لوگوں کا سامنا کر رہی ہو۔۔۔ رنگ برنگے لوگ، کوئی کیسا، کوئی کیسا کوئی اچھا اور کوئی غلط اچھائی میں لپٹا۔ بظاہر تمہیں یہ سب لبھا رہا ہو گا اپنی طرف کھینچ رہا ہو گا۔ تمہیں اپنی زندگی کو سہل بنانے کے لیے اس نظام کا حصہ بھی بننا ہو گا کیا مرد، کیا عورت۔۔۔ تمہیں اپنی پڑھائی کے لیے کسی سے بھی مدد لینے کی ضرورت پڑے گی اور اس کے لیے شرم اور ہچکچاہٹ کی جگہ نہیں، لیکن پھر بھی میرا بچہ اتنا یاد رکھو دنیا ایک جنگل کی طرح ہے جس طرح انسان جنگل سے گزرتے ہوئے اپنے کپڑے، اپنا آپ، جھاڑیوں، کانٹوں، جانوروں سے بچا کر چلتا ہے۔ ایسے ہی دنیا میں بھی محتاط رہنا پڑتا ہے۔ یہاں بھی جگہ جگہ انسان نما درندے ملتے ہیں جگہ جگہ کانٹے بکھرے ہوتے ہیں۔ ان سے بچاؤ اختیار کرنا ہمارے اپنے بس میں ہوتا ہے۔ اسی لیے میرا بچہ تم بے شک دوستیاں بناؤ بے شک تعلقات بڑھاؤ لیکن اپنا وقار، اپنی عزت نفس سب سے پہلے رکھو خود کو کسی بھی موقع پر کمزور مت پڑنے دینا۔ تمہارا وقار تمہارے لیے سب کچھ ہونا چاہیے۔"
اماں کا ایک ایک لفظ اس کے دماغ میں نقش ہوتا جا رہا تھا۔ وہ سانس روکے اماں کی آواز کے زیر و بم محسوس کرتی رہی۔ یہاں تک کہ آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں اماں کی نصیحت کے آخری فقرے اسے کہیں دور سے باز گشت کرتے محسوس ہوئے۔



بائیو کیمسٹری کے خشک ترین لیکچر کے دوران جمائیاں لے لے کر سب کے جبڑے دکھنے لگے۔ آخری دس منٹ میں تو زنوبیہ کھڑکی سے باہر کودنے کی کرنے لگی۔
"شرافت سے کرسی کے ساتھ چپکی رہو۔" رجا نے آنکھیں نکال کر دھمکایا تو اسے یہ تخریب کاری منسوخ کرنی پڑی۔ فوراً" بعد لیکچر ختم بھی ہو گیا۔
"ہم لوگ ایف ایس سی میں ایسا ہی کرتے تھے۔ کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ کے جیسے دیکھتے میڈم کہیں اور

متوجہ ہیں۔ ہم برآمدے میں کود جاتے۔" لیکچر روم سے باہر آتے آتے زنوبیہ ماضی کے کارنامے بتاتی رہی۔
"یہ میڈیکل کالج ہے تمہارے شہر کا ڈگری کالج نہیں۔" رجا نے گویا مذاق اڑایا تھا۔ زنوبیہ کا منہ بن گیا۔
"تم لوگ ابھی مارکیٹ بھی جاؤ گی؟" وہ سب اب ہاسٹل جانے کے چکروں میں تھیں جب اچانک زنوبیہ نے پوچھا۔
"مارکیٹ کیوں؟"
"گفٹ۔۔۔ نہیں لو گی؟"

کمال کا بھولپن تھا زنوبیہ کے انداز میں۔
"زنوبیہ میڈم۔۔۔ آپ پہلے کیک کھلائیے گفٹ کی بعد میں سوچیے گا۔"
"بدتمیز۔۔۔" زنوبیہ نے پھر سے منہ پھلایا۔
"اچھا اب چلو بھی مجھے بھوک لگ رہی ہے شدید۔" مائدہ صبح ناشتا کیسے بنا آئی تھی۔ اب حشر خراب ہو رہا تھا۔
"اور نیند بھی آ رہی ہے۔" حمنی کا دن نیند کے لیے اور رات ساری پڑھائی کے لیے مخصوص ہوتی تھی۔
"خبردار جو آج کسی نے سونے کی بات کی تو۔" باریک سی آواز میں زنوبیہ کی چیخ پھر سے بلند ہوئی۔
"بات سنو۔۔۔ بات سنو۔" وہ ساری پیچھے گھومیں۔ "رانی مکرجی" ہانپتی کانپتی ان کی طرف بھاگتی نظر آئی۔
"خدا خیر کرے۔۔۔ آج اکیلی نظر آ رہی ہے۔۔۔ مرید ساتھ نہیں اس کے۔" مائدہ نے زیر لب کہا تھا' پورے کالج میں رانی مکرجی کا شہرہ ہو گیا تھا۔ جہاں دس لڑکوں کے بیچ لڑکی نظر آئے سمجھ جاؤ وہی ہے۔
"تم لوگ جا رہی ہو؟"
"ہاں۔۔۔"
"تمہیں معلوم ہے نا گیمز ہو رہے ہیں۔" وہ اپنی پھولی سانس کے ساتھ جلدی جلدی پوچھ رہی تھی۔
"سنا تو ہے۔"
"اور میں بیڈمنٹن ریپ ہوں۔ یہ بھی معلوم ہو گا۔"
"نہیں یہ معلوم نہیں۔" حمنی نے صاف گوئی سے کہا۔ سب پر کوفت سوار ہو رہی تھی۔
"ہمارے پروف کی لڑکیاں اتنی ست ہیں کوئی بھی پارٹی سپیٹ کرنے کے لیے آگے نہیں بڑھ رہی۔ حالانکہ بیڈمنٹن کھیلنا کون نہیں جانتا۔۔۔"
"اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"
"مائنڈ مت کرنا۔ میں نے پوچھے بنا مائدہ اور عقیدت کا نام لکھوا دیا ہے۔"
"ہائیں۔" عقیدت کو چکر آ گیا۔
"یہ تم کیسے کر سکتی ہو؟" اس نے بے ساختہ پوچھا تھا۔
"بس میں نے کر لیا۔ اصل میں اسپورٹس کی ڈیٹ قریب آ رہی ہے۔ اور میم عائشہ ناراض ہو رہی تھیں کہ ابھی تک ڈبلز اور سنگلز مقابلوں کے لیے لڑکیاں نہیں سلیکٹ ہوئیں۔ تو میں نے اپنی مرضی سے تم دونوں کا بھی نام دے دیا۔"
"تم نے غلط کیا۔۔۔" مائدہ کو غصہ آ گیا تھا۔
"بنا پوچھے تم ایسا نہیں کر سکتیں۔" عقیدت کے چہرے سے بھی ناراضی عیاں تھی۔
"اب کیا ہو سکتا ہے۔ اب تو کر دیا نا۔" عجیب ڈھیٹ پن کا مظاہرہ تھا۔

"تم پلیز میرا نام کٹ کرو۔ مجھے بیڈمنٹن نہیں آتا۔" عقیدت کی گھبراہٹ حد سے سوا ہو گئی۔
"دیکھو اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں نے نام میم عائشہ تک پہنچا دیے ہیں۔ تم کو اعتراض ہے تو ان کے سامنے جاؤ اور بیڈمنٹن اتنا ازی گیم ہے۔ کون نہیں کھیل سکتا۔"
"کھیلنے نہ کھیلنے کی بات نہیں۔ بات ہے اخلاقیات کی۔ انسان میں کچھ مینرز ہونے چاہئیں۔ تمہیں پوری کلاس میں ہم ہی نظر آئی تھیں؟"
"توبہ ہے یار تم لوگوں نے تو ایشو بنا لیا اینی وے اب تم لوگ آگے کی سوچو۔" وہ ہاتھ لہراتی واپس چلی گئی۔ مائدہ کا خون کھول رہا تھا اور عقیدت کی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔
"اس سے ثابت ہوا۔ زیادہ شریف ہونا بھی نقصان دہ ہے۔" رجا کی بات نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔
"جو بھی ہے۔ اس نے برا کیا۔۔۔۔" حمنی کو بھی اس کی دھونس بری لگی تھی۔
"اور وہ بتا گئی ہے۔ ڈبلز مقابلوں کے لیے بھی تم لوگوں کا نام دیا۔ مطلب پارٹنر میل۔۔۔ فی میل ہوں گے۔" زنوبیہ کا جوش دیدنی تھا۔
"اب کیا ہو گا؟" عقیدت کے ہاتھ پیر پھول گئے۔
"جو منظور خدا ہو گا۔" مائدہ نے اتری شکل کے ساتھ کہا تھا۔
"Chill کرو یار۔۔۔۔ کوئی مسئلہ نہیں۔ بلکہ دعائیں مانگو ہینڈسم پارٹنر ملے۔"
"اور اب چلو بھی بھوک سے آنتیں سکڑ گئی ہیں۔" عقیدت مرے مرے قدموں کے ساتھ ان کے ہمراہ ہوئی۔



دروازہ کسی دھاڑ کے ساتھ کھلا۔ اور آگ بگولا ہوئے "ہارون صاحب" آگے آگے تو حواس باختہ نعیم صاحب پیچھے پیچھے اندر داخل ہوئے۔
"یہ کیا بدتمیزی ہے۔۔۔۔" سنعان کو ایک دم سے غصہ آیا تھا۔ جب کہ اندر آنے کے بعد ہارون نے یہاں وہاں ٹہل کے اوپر نیچے، آگے پیچھے ہر جگہ اچک اچک کر دیکھا۔۔۔۔ پھر باقاعدہ دانت پیستے ہوئے پوچھا۔
"میٹنگ کیا اپنے فرشتوں سے کر رہے تھے۔ تیرے جیسا دوسرا کیوں نہیں نظر آ رہا؟" سنعان نے اسے مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے تادیبی نظروں سے نعیم صاحب کو دیکھا۔
"سر میں نے بہت کوشش کی، بہت روکا، بہت منع کیا، مگر یہ۔۔۔۔" نعیم صاحب نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ بے چارگی دیکھنے کے لائق تھی۔
"نہیں تو مجھے بتا۔۔۔۔ تو نے جرات کیسے کی۔ تو نے کیا سوچ کر مجھے باہر روکا، میں کوئی بھکاری تھا، کوئی ادھار مانگنے والا تھا۔۔۔۔ نہیں تو مجھے بتا تو نے یہ حرکت کی کیسے۔۔۔۔؟" گرجتے، برستے ہارون کی حالت خراب ہو رہی تھی۔ ادھر سنعان کا اطمینان اور سکون قابل رشک تھا۔
"غضب خدا کا تو نے مجھے۔۔۔۔ اپنے بچپن کے دوست، اپنے بھائی کو چار گھنٹے انتظار کروایا۔۔۔۔ حد ہوتی ہے تو تا چشمی کی۔"
"تو تم سے کس نے کہا تھا انتظار کرتے۔ اٹھ کر چلے جاتے۔"
"تیرے جتنی عقل کہاں۔۔۔۔" وہ کاٹ کھانے کو آیا۔
"میں بڑی تھا ابھی ابھی ہوں۔" سنعان نے حد ہی کر دی۔ باقاعدہ فائل کھول کر بیٹھ گیا۔ ہارون نے تڑپ کر

فائل چھپٹی۔

"تیری مصروفیت کی ایسی کی تیسی۔ جو تو نے آج کیا یہ میں سات پشتوں تک نہیں بھولوں گا۔"

"بھولنا بھی مت۔" سنعان نے گویا دھمکایا۔ "آئندہ کے لیے سبق ہے۔"

"اللہ پوچھے گا۔" ہارون کی شکل صحیح معنوں میں رو نکمی ہو گئی۔ "کوئی اپنوں کے ساتھ بھی ایسے کرتا ہے۔"

"جو تو نے کیا اس کے بدلے یہ کچھ بھی نہیں۔"

"میں نے تو نیکی کی۔" سنعان نے بے ساختہ گھورا۔

"پتا نہیں کس جنم کی دشمنی چکائی ہے تو نے۔۔۔ بیٹا بھولوں گا نہیں۔۔۔ زمانے بیت جائیں پھر بھی یاد رکھوں گا۔۔۔"

"خاموش ہو گئے ہو؟" سنعان نے اب کے سوالیہ کہا۔

"نہیں تو پہلے بتا تو نے کیوں کیا ایسا؟"

"تو چپ نہیں ہوا تو اٹھا کر باہر پھنکوا دوں گا۔" سنعان کے تیور خطرناک تھے۔ ہارون کی زبان لحہ بھر کو لڑکھڑائی۔

"جانتا ہوں بے دید انسان۔۔۔" پھر وہ رنجیدگی سے بولا۔

"تو جب مجھے چار گھنٹے انتظار کروا سکتا ہے۔ تو باہر بھی پھنکوا سکتا ہے۔"

"تو چپ نہیں ہوا تو میں ایسا کر بھی لوں گا۔"

"ظالم۔۔۔" ہارون بدقت تمام منہ ہی منہ بڑبڑایا۔ اس دوران نعیم صاحب ہونقوں کی طرح کبھی اسے تو کبھی سنعان کو دیکھتے رہے۔۔۔ لگتا تھا دونوں ہی ان کی موجودگی فراموش کر چکے تھے۔

"بیٹھ جاؤ۔۔۔ اور آپ جائیے نعیم صاحب۔۔۔" مگر سنعان شاید ان کی موجودگی سے بے خبر نہیں تھا۔ ہارون کو بیٹھنے کا اشارہ کرنے کے بعد اس نے نعیم صاحب سے کہا تھا۔

"میں چائے کا کہوں سر۔۔۔" نعیم صاحب نے جاتے جاتے مہمانداری نبھانی چاہی۔

"نہیں۔۔۔" سنعان نے دوٹوک منع کیا۔ مارے صدمے کے ہارون کا منہ کھل گیا۔

"بات سنئے نعیم صاحب چائے تو ہو ساتھ میں کچھ اور بھی بھجوائیے گا۔۔۔ میرا بی پی لو کر دیا اس نے۔" نعیم صاحب سرہلاتے باہر چلے گئے۔ وہ جانتے تھے دونوں میں دانت کاٹے کی دوستی ہے۔ یہ جو آج سنعان نے ہارون کو چار گھنٹوں کا انتظار کروا کے خوار کیا تھا۔ اس کی وجہ جو بھی ہو۔۔۔ نہ ہارون نے برا منانا تھا اور نہ سنعان نے دوستی ختم کرنی تھی۔ دونوں کے تعلقات پر آنچ بھی نہ آتی۔

"یہ میرے بھیجے پھول۔۔۔" بیٹھنے کے بعد ہارون کی نظر صوفے پر لاوارثوں کی طرح پڑے اس بکے پر پڑی جو اس نے صبح بھجوائے تھے۔ جب سے معلوم ہوا تھا سنعان ناراض ہے۔ اس نے منانے کے کئی طریقے کیے تھے۔۔۔ پھول تو بلاناغہ بھجوا رہا تھا۔

"تو نے سب کا یہی حال کیا ہو گا؟" ہارون کی حالت قابل رحم ہو گئی۔

"تو دوستی نام پر دھبا ہے۔ وہ بھی کالا سیاہ۔۔۔"

"اور اپنے بارے میں کیا خیال ہے۔"

"میں نے تو نیکی کی تھی۔" ہارون کا منہ لٹک گیا۔

"یار مجھے اپنی نیکیوں سے بخشو۔"

"تیرے ساتھ کون کر رہا تھا۔۔۔ یہ تو میں نے حسبہ سلمان کے ساتھ کی تھی۔" ہارون کے چمک کر کہنے پر سنعان

نے ہونٹ بھینچ لیے وہ کہنا چاہتا تھا اسے حبہ پر کی گئی نیکی بھی مہنگی پڑی۔ مگر چپ رہا۔

"یار وہ لڑکی پیچھے ہی پڑ گئی تھی۔ تیرے سوئٹزر لینڈ جانے کے بعد تو اس نے کالیں کر کر کے میرے کان بند کردیے۔ دوبار ہوٹل بھی آئی۔ پھر جب تو واپس آگیا۔ تب بھی اس کے فون پہ فون یقین مانو بہت ٹالا۔ مگر اس کو تو جیسے تیری آمد کی بو پہنچ چکی تھی۔ متواتر پیچھے پڑی رہی۔ مجبوراً مجھے ملاقات کا اہتمام کرنا پڑا۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ہارون نے گویا اپنی پوزیشن صاف کرنی چاہی۔

"یہ معمولی بات نہیں تھی..." سنعان نے زور دے کر کہا۔ "تو جانتا ہے وہ غوری منزل کی فرد ہے اور وہاں سے ہمارا ناتا برسوں ہوا ٹوٹ چکا..." اس کے چہرے پر پرانی یادوں کا عکس تھا۔

"یار... تعلقات اتنی آسانی سے نہیں ٹوٹا کرتے خاص طور پر رشتے..."

"ہمارے ٹوٹ گئے... محترم زکریا آفندی کی مہربانی سے دنیا میں وہ سب کچھ ہو جاتا ہے جو نہیں ہوتا۔ ان کی صلاحیتوں کا تمہیں پتا ہونا چاہیے۔" اس نے انتہائی تمسخر کے ساتھ یہ سب کہا۔ ہارون گہری نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

"ہماری فیملی جیسی رہ رہی ہے رہنے دو ہمیں ماضی کے سبق مت پڑھاؤ۔ میری ماں پاگل ہو چکی ہے زکریا آفندی کو غوری منزل کے کسی فرد کی یہاں آمد کا پتا چل گیا تو وہ بھی پاگل ہو جائیں گے اور ان کا پاگل پن مما کے لیے خطرہ ہے۔" **سنعان** کے لہجے کی تلخی ماحول پر حاوی ہو گئی۔ ہارون خوامخواہ پیپر ویٹ گھماتا رہا۔

"میں کسی حبہ سلمان سے ملاقات کا متحمل نہیں ہو سکتا... آئندہ کے لیے احتیاط کرنا۔" ہارون مسلسل خاموش رہا تو **سنعان** نے آخر میں جیسے وارننگ دینی چاہیے۔

"ٹھیک ہے میرے باپ جو تیری مرضی" اس دوران چائے بھی آگئی۔ ہارون نے دو چار گھونٹ خاموشی کے ساتھ پیئے کن انکھیوں سے **سنعان** کو بھی دیکھتا رہا۔

"ویسے..." ہو ہی نہیں سکتا تھا ہارون دو منٹ سے زیادہ دیر تک خاموشی اختیار کرتا۔

"لڑکی بری نہیں..."

"خوبصورت بھی بہت ہے۔"

"سب سے بڑی بات کماؤ ہے اتنی مشہور ٹی وی **اینکر** ہے تُو فائدے میں رہے گا۔"

"تو نہیں سدھرے گا۔" **سنعان** نے زیر لب کہا اور ریسیور کان سے لگالیا۔ ہارون نے اس جملے پر فخریہ سر دھنا تھا۔

"توفیق... اور دلاور کو بھیجو..." **سنعان** نے کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

"اور پھر بڑے بوڑھے کہتے ہیں خوش بختی ایک بار دستک دیتی ہے۔ اس دستک پہ دروازہ نہ کھولا جائے تو پھر خوش بختی منہ موڑ جاتی ہے۔" توفیق اور دلاور آگئے تھے۔

"اسی لیے بیٹا میں تو کہتا ہوں..." آنے والوں پر دھیان دیے بغیر ہارون کی تقریر جاری رہی۔

"اسے اٹھا کر باہر پھینک آؤ۔" اور جب **سنعان** نے بنا کسی لحاظ کے اس کی طرف اشارہ کرتے حکم سنایا تو جیسے ایک لمحے کے لیے اس کا دماغ ہی بند ہو گیا۔

"ہائیں..." وہ ہونقوں کی طرح ہٹے کٹے توفیق اور دلاور کی طرف متوجہ ہوا۔ دونوں اس کی طرف بڑھ رہے۔

"مم... مطلب... تو مجھے... تو اپنے یار کو... یعنی مجھے..." اس کے **سنعان** کو غیرت دلاتے جملے منہ میں ہی رہ گئے۔ توفیق اور دلاور نے اسے دبوچ کر کسی بچے کی طرح اٹھالیا۔

"ابے مسٹنڈو۔ چھوڑو چھوڑو..." اس سے ہاتھ پاؤں مارنے کی اپنی سی کوشش کی۔ مگر توفیق اور دلاور کے تن و

نوش کے سامنے اس کی ذرا نہ چلی۔
''سنی یہ بہت زیادہ ہے۔ تیرے دل کو کچھ نہیں ہو رہا۔''
''پھینک آؤ' پھینک آؤ۔۔۔ آفس والے روڈ کو کراس کر کے ذرا آگے پھینکنا۔ کہیں واپس نہ آجائے۔''
سنعان کے اطمینان کا عالم ہی اور تھا۔ہارون کے واویلے دیر تک اور دور تک سنائی دیتے رہے۔



اتوار کی شام اس کی ٹینس کورٹ میں گزرتی تھی۔ وہیں اسے کسی کی آمد کی اطلاع ملی۔ وہ اپنی کٹ سنبھالتا تولیے سے ہاتھ منہ رگڑتا گھاس کے اس قطعے کی طرف گیا جہاں رکھی کرسیوں میں ایک پر ہارون دانت نکوس رہا تھا۔ اسے قریب کی کرسی پر موجود حبہ نظر ہی نہ آئی۔ یا اس نے عادت کے مطابق صرف مطلب کے بندے پر ہی توجہ دی۔
''خیریت۔۔۔'' اسے ہارون کو وہاں دیکھ کر حیرت ہوئی جو کہ عجیب کھسیانا سا ہو رہا تھا۔
''بیٹا۔۔۔ میں تو خیر سے ہوں۔۔۔ تیری خیریت مشکوک ہے۔'' ہارون اٹھ کر اس کے قریب آکھڑا ہوا تھا۔ سرگوشی کے انداز میں یہ سب کہا۔سنعان کو مزید الجھن ہوئی۔
''آنا چاہتے تھے تو فون کر لیتے۔ ہم ایک ساتھ آجاتے۔'' اس نے یوں ہی کہا۔
''نہیں مجھے یہاں آکر بور نہیں ہونا تھا۔ اصل میں تو میں ان کی وجہ سے آیا۔'' سنعان نے پہلی بار حبہ کی طرف توجہ مبذول کی۔ وہ کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کی پتلیاں سنعان پر ساکت ہو گئی تھیں۔ اس کے چہرے پر عجیب جوش چھایا تھا۔ سنعان کو سمجھنے میں مشکل نہیں ہوئی کہ وہ حبہ سلیمان ہے۔ ہارون جس جانفشانی سے گزشتہ کئی دن سے اس کے سامنے حبہ' حبہ کی راگنیاں گا رہا تھا۔ اسے کامل یقین تھا وہ ایک دن حبہ سمیت اس کے سامنے آموجود ہو گا۔ اور وہ آبھی گیا۔
''کیسے ہو؟'' سنعان کی زبان شاید گنگ ہو چکی تھی۔ کچھ دیر اس کی طرف سے خیر سگالی کلمات کی منتظر حبہ سلیمان نے دھیمی آواز میں آغاز گفتگو کیا۔
''میں ٹھیک ہوں۔'' سنعان کی کچھ دیر کے لیے سمجھ بوجھ ختم ہو گئی جیسے۔۔۔
''وہی پہلے والے ہو۔۔۔ روڈ۔۔۔'' حبہ بدستور اس پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔
''نہیں نہیں۔۔۔ آپ کہہ سکتی ہیں اچیاں مجاجاں والا۔'' حبہ کو ہنسی آگئی۔ کہہ کر ہارون نے زبان دانتوں تلے دبالی کہ سنعان نے دیکھا ہی ایسی ــــــ نظروں سے تھا۔
''میرا خیال ہے۔۔۔ مجھے چلنا چاہیے۔ آپ ایزلی بات کریں۔ ٹینشن فری ہو کر۔'' ہارون کو فی الحال یہاں سے چلے جانے میں عافیت نظر آئی۔۔۔ اس کے منظر سے غائب ہوتے ہی حبہ نے کہا۔
''کہیں چل کے بیٹھتے ہیں۔'' نا چاہتے ہوئے بھی سنعان کو ماننی پڑی۔ وہ اسے اسی ایریے کے ایک ریسٹوران لے گیا۔ اور اب دونوں ہی سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ گفتگو کا آغاز کیسے اور کہاں سے شروع کیا جائے۔ سنعان اس لیے خاموش کہ وہ اس صورت حال کے لیے تیار نہیں تھا اور حبہ کسی حد تک مرعوب ہوئی بیٹھی تھی۔۔۔ اس کا وہ مشہور زمانہ اعتماد جس کے بل بوتے پر وہ میڈیا کی من پسند شخصیت تھی۔ اس وقت ڈانواڈول ہو رہا تھا۔ شاید یہ سنعان آفندی کی جادوگری تھی۔
''تم مجھے گھر بھی لے جا سکتے تھے۔'' حبہ کے انداز میں شکایت تھی۔ سنعان کے چہرے پر مبہم مسکراہٹ نے قبضہ جما لیا۔۔۔ تلخ اور افسردہ سی۔

"تم کیسی ہو... سب کیسے ہیں؟" وہ سرے سے حبہ کی شکایت نظرانداز کر گیا تھا گہری سانس لیتے ہوئے حبہ نے اس پر قناعت کرلیا۔ کم از کم وہ جاننا تو چاہ رہا تھا۔

"سب ٹھیک ہیں' سیٹ ہیں' بڑے بزرگ ریٹائر ہونے کو تیار کہ نیو جنریشن اب بزنس سنبھالنے کے لائق ہو گئی۔ میرا مطلب عاشر اور حارث سے ہے۔ کشف کی اسٹڈی کمپلیٹ ہونے کے قریب۔ شانزے اور علیزہ ایک ساتھ کوئی کورس کر رہی ہیں۔ ملیکہ کا اس سال میڈیکل میں ایڈمیشن ہوا۔ معیز 10th گریڈ میں ہے۔ اور میں تمہارے سامنے ہوں۔" سنعان نے اس پر نظریں جمائے یہ سب سنا... اسے کسی کے بارے میں بھی جاننے کی خواہش نہیں ہو رہی تھی۔ مگر پھر بھی وہ بغور سننے پر مجبور ہوا۔

"اور تم..." فوراً" سب کے بارے میں بتانے کے بعد حبہ نے اچانک پوچھا۔ "اپنے بارے میں بتاؤ نا۔" سنعان نے جوس کا آخری سپ لینے کے بعد کندھے اچکا کر لاپروائی سے کہا۔

"میں بھی تمہارے سامنے ہوں۔" حبہ کو جیسے پہلے سے یقین تھا وہ یہی کچھ بولے گا۔ پھر بھی اس کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ اسے سمجھنے میں دشواری نہیں ہو رہی تھی کہ وہ سنعان کے لیے ان چاہی مہمان تھی۔ وہ اس کے ہمراہ یہاں آ بیٹھا تھا مگر چہرے پر واضح اکتاہٹ لیے۔ اصولاً" حبہ کو چلے جانے چاہیے تھا۔ سنعان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ یقیناً" ایسا کرتی بھی کہ سراسر ہتک محسوس ہوئی۔ مگر اس وقت تو جیسے دل دماغ پر حاوی تھا۔ وہ ایک بے بسی کے عالم میں تھی۔

"مجھے اس کہاوت پہ تو سو فیصد یقین آگیا ہے کہ دنیا گول ہے۔" وہ جیسے یہاں دیر تک بیٹھنے کے بہانے تراش رہی تھی۔ سنعان نے اسے نافہمی سے دیکھا تھا۔

"سوچا بھی نہیں تھا ہم یوں اچانک مل جائیں گے۔" اس کی بات پر سنعان مسکرایا تھا۔ "ہم نے تو سمجھ لیا تھا اب بس ختم... اب شاید ہی کبھی ملنا ہو۔"

"اس ملاقات کے لیے دنیا کا گول ہونا ضروری نہیں تھا۔" جوس کے خالی گلاس کو گھماتا وہ دھیمی آواز میں بولا تھا۔

"ہم لوگ وہیں ہیں جہاں پہلے تھے' تم بھی اسی غوری منزل میں... میں بھی اسی آفندی پیلس میں ہم تو جانتے بوجھتے نہیں مل رہے تھے۔" حبہ کی مسکراہٹ فوراً" غائب ہوئی وہ سچ کہہ رہا تھا۔ وہ تو ایک دوسرے کے ٹھکانوں سے واقف تھے۔

"میں اگر تمہیں بائے چانس نہ نظر آتا تو تمہیں شاید ہی سنعان کبھی یاد آتا۔ میرا تو خیال ہے تم لوگ میرا یا میری مما کا اپنے گھر میں نام بھی نہیں لیتے ہو گے۔"

"ہم تم سب کو کبھی نہیں بھولے۔" حبہ نے کمزور سی تاویل پیش کرنی چاہی۔ سنعان کی طرف سے ایسا رد عمل آیا جیسے اس نے سنا ہی نہ ہو۔

"سنعان... رشتے اتنی آسانی سے ختم نہیں ہوتے اور ہم جتنے بھی ایڈوانس ہو جائیں' جتنے بھی مغرب زدہ ہو جائیں خاندان اور خاندان والوں کے بغیر نہیں رہ سکتے' ہمیں ہر صورت' ہر قدم پر ہمیشہ اپنوں کی ضرورت رہتی ہے۔" تھوڑا سا توقف لے کر حبہ نے سنعان کی طرف دیکھا تھا اس کے تاثرات ہنوز سپاٹ تھے۔

"سنعان..." اس کی خاموشی سے خائف ہوتی وہ جھجک کر مزید کچھ کہنے لگی تھی۔

"میں... آؤں تمہارے گھر؟" اور یہ ابھی ممکن نہیں تھا سنعان کو ایسی کوئی کوشش کرنی بھی نہیں تھی۔

"مناسب موقع دیکھ کر میں تمہیں لے جاؤں گا۔" اس نے نپے تلے انداز میں جواب دیا۔ حبہ اسی پر خوش ہو گئی۔

"یہ ٹھیک ہے۔ مجھے لگتا ہے حالات پہلے جیسے ہو جائیں گے۔ ہم ایک دوسرے کے گھر آنے جانے لگیں گے۔" وہ جوش میں آگئی تھی۔ سنعان نے اسے گہری نظروں سے دیکھا تھا وہ کہنا چاہتا تھا حالات اور وقت اختیار سے باہر ہو جائیں تو اپنی مرضی کی سمت اختیار کر لیتے ہیں انہیں موڑ کر پیچھے لے جانا یا پہلے جیسا بنانا ناممکن ہوتا ہے 'مگر وہ چپ چاپ ویٹر کی تلاش میں یہاں وہاں دیکھتا رہا۔

حبہ سلمان کے ساتھ ہوئی یہ ملاقات قطعی غیر متوقع تھی اسے پرانے رشتے پھر سے استوار کرنے کی خواہش تھی نہ عادت 'سو وہ نارمل رہا 'مگر ہارون ایسی کوئی کوشش دوبارہ نہ کرے اس کے لیے اس نے اسے تانی ضرور یاد دلا دی تھی۔ ہارون کے اگلے کئی دن دہائی دیتے گزرے تھے۔ حبہ سے ہمدردی مہنگی پڑی تھی اسے۔ کبھی ناراض نہ ہونے والا دوست ناراض ہو گیا تھا۔



فروغ ماہ کی آمد انہیں کبھی بھی خوش نہیں کرتی تھی۔ یہ دن ان کے لیے تحمل اور برداشت کا امتحان بن جایا کرتے گو کہ شادی کو آٹھواں سال ہو رہا تھا وہ دو بچوں کی ماں بن چکی تھیں 'مگر فروغ ماہ سے بدکنے کا وہی عالم تھا وہ ان کے لیے گھٹن 'قید اور بے بسی کے سوا کوئی پیغام نہیں لاتی تھی۔ ماں باپ نے انہیں بڑا بے فکر ہو کر یحییٰ کے عقد میں دیا تھا یہ سوچ کر کہ فیملی چھوٹی ہے تین بھائی اور ایک بہن 'آج یاسمین بیاہ کر جا رہی ہیں کل کو باقی دو بھائی بھی شادی شدہ ہو جائیں گے کوئی اضافی ذمہ داری یاسمین پر نہیں آنی تھی۔ خاندان بھی خاصا متمول تھا۔ یاسمین خود بھی جب دلہن بن کر آئیں تو تمام تر خدشات سے آزاد تھیں 'مگر یہاں شادی کی پہلی رات ہی وہ بھونچکا رہ گئیں۔

فروغ ماہ کی چوڑیاں ٹوٹنے کی وجہ سے کانچ اس کی کلائی کو زخمی کر گیا تھا اس نے رو رو کر وہ واویلا مچایا کہ یحییٰ سمیت تینوں بھائی اس کے ارد گرد اسے بہلانے 'چپ کرانے میں لگے رہے اور نئی نویلی دلہن حیران پریشان یہ سب دیکھتی رہی بعد کے دنوں نے ثابت کر دیا گھر میں فروغ ماہ کا سکہ چلتا ہے فروغ ماہ ہنستی ہے تو بھائی بھی ہنستے ہیں۔ فروغ ماہ روتی ہے تو بھائی ساتھ روتے ہیں بھائی گھر سے باہر جاتے ہیں تو فروغ ماہ کے پیر چھو کر۔۔۔۔ گھر آتے ہیں تو بھی سب سے پہلی قدم بوسی فروغ ماہ کی کرنا فرض سمجھتے۔

یاسمین سسرال کے ہم پلہ خاندان سے آئی تھیں۔ فروغ ماہ اگر تین بھائیوں کے لاڈ کی شہ پر گھر کی مالکن بنی بیٹھی تھیں تو یاسمین بھی اپنے ماں باپ کی چہیتی تھیں ان سے بڑے دو بھائی اور ان کے بعد ایک بھائی اور بہن تھیں 'لیکن یاسمین کا لاڈ پیار اپنی جگہ برقرار ایک تو وہ دو بھائیوں کے بعد منتوں 'مرادوں سے پیدا ہونے والی بہن اور بیٹی دوسرا ان کا مزاج بھی ایسا تھا خاصے کر وفر اور شاہانہ مزاج کی مالک تھیں ان کے وقار اور تمکنت کی مثالیں دی جاتی تھیں 'مگر یہ سب ماں باپ کے ہاں ہی چل سکا ہے سسرال وہ جگہ ہے جہاں بہت کچھ بھولنا 'سہنا اور کھونا پڑتا ہے۔

یاسمین کو بھی لاڈ بھلانے پڑے 'مزاج بدلنے پڑے 'وہ یحییٰ کی وجہ سے فروغ ماہ اور اس کی حرکتوں کو برداشت کرنے پر مجبور ہو گئیں۔ شادی کی رات جو تماشا اس نے کیا تھا وہ یاسمین کو باور کرا گیا تھا کہ انہیں آگے کن امتحانوں سے گزرنا پڑے گا 'مگر فروغ ماہ ان کی سوچ سے بھی زیادہ ناقابل برداشت ثابت ہوئی۔ وہ اس گھر میں کسی آسیب کا درجہ رکھتی تھی۔ آدم بو آدم بو کرتی ہر وقت یاسمین کا سایہ بنی رہتی جب دل کرتا یاسمین کے کمرے میں گھس آتی دن اور رات کی تفریق کوئی معنی ہی نہیں رکھتی تھی جب تک دل کرتا کمرے میں بیٹھی رہتی مرضی سے الماریاں کھولتی۔ یاسمین کے نئے نکور 'قیمتی کپڑوں میں۔سے جو پسند آتا اٹھا کر چلتی بنتی جس جیولری پر دل آتا اس پر

ہاتھ صاف کرلیتی یا سمین کے قیمتی کاسمیٹکس کے سامان کو اس بے دردی سے استعمال کرتی کہ اکثر گر گرا جاتیں یا ٹوٹ جاتیں۔

یا سمین کا بس نہیں چلتا تھا اس بدتہذیب کو تھپڑوں سے سجا ڈالیں لیکن وہی سسرال اور سسرال کے اصول وہ خون کے گھونٹ بھرتی فروغ ماہ کو دیکھتی رہ جاتیں ان کے جہیز کا ٹی وی فروغ ماہ کی خواہش پر لاؤنج میں سج گیا تھا۔ اسے دیکھنے کی اجازت تب ملتی جب فروغ ماہ چاہتی اور جب اکیلے بیٹھ کر دیکھنا چاہتیں فروغ ماہ فوراً" ساتھ آبیٹھتی۔

نوکروں کے ہوتے ہوئے کچن اور دیگر کام یا سمین کے کندھوں پر آگئے تھے۔ فروغ ماہ اس دوران بھی ان کے سر پر سوار رہتی ایسی ایسی نظروں سے گھورتی کہ یا سمین کا سیدھا کام بھی الٹا ہو جاتا ایک بلا وجہ کا بیر اس نے شروع رات سے باندھ رکھا تھا وہ اگر ان کو کچھ نہ بھی کہہ رہی ہوتی تو بھی انہیں اس سے خوف محسوس ہوتا وہ عجیب زہریلی نظروں سے انہیں ہمہ وقت گھورتی رہتی۔ یا سمین یحییٰ کے سامنے تو خاموش رہتیں، لیکن میکے جاکر ضرور دل کی بھڑاس نکالتیں۔

"مجھے یہ سوچ کر وہاں رخصت کیا کہ ساس نہیں ہے جو ایک نند دی ہے اللہ نے وہ دس ساسوں کے برابر ہے۔" وہ اپنی بھابھیوں کو برملا کہتیں۔

"پاؤں دھودھو کر پیا کریں اپنی ساس کے۔۔۔ اللہ نے ساس نہیں اللہ میاں کی گائے دی ہے آپ کو۔"

انہیں لگتا تھا زندگی پوری فروغ ماہ کے سائے میں گزر جانی ہے، مگر یحییٰ کا تبادلہ جونہی پشاور ہوا انہوں نے اس اعلان کے ساتھ فروغ ماہ کی سٹی گم کردی کہ وہ یا سمین کو اپنے ہمراہ لے جائیں گے۔

"میں تنگ ہو تا ہوں وہاں بچوں کی بھی بہت یاد آتی ہے۔" ان دنوں ان کے دو بچے ہو چکے تھے۔ فروغ ماہ نے حسب عادت شور مچایا مگر حیرت انگیز طور پر اب باقی دونوں بھائی بھی بڑے بھائی کے ہم نوا بن گئے۔ یوں بھی منجھلے بھائی کی شادی متوقع تھی یعنی فروغ ماہ کے زیر سایہ ایک اور بھابھی رہنے آرہی تھی گویا اس کا شغل برقرار رہنا تھا۔

یا سمین اس کے چنگل سے آزاد کیا ہوئیں گویا جنت میں آگئیں یحییٰ فطرتاً" بہترین انسان تھے۔ تینوں بھائیوں میں سب سے زیادہ آزاد خیال انہوں نے یا سمین کو ویسے رکھا جیسے یا سمین نے چاہا وہ ہر طرح سے آزاد تھیں کوئی پابندی، کوئی بندش، کوئی روک ٹوک نہیں۔ وہ حسین تو شروع سے تھیں اب تو جیسے ان پر نظر ٹھہرتی نہیں تھی۔ شادی کے اولین دنوں میں فروغ ماہ کا رویہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، لیکن اب انہیں اندازہ ہو گیا تھا فروغ ماہ ان کی وجہ سے عدم تحفظ کا شکار تو ہوئی ہی تھی لیکن اس کا بڑا مسئلہ حسد کا تھا وہ یا سمین سے، ان کی صورت ان کے کپڑوں، ان کی اسمارٹنیس سے۔۔۔ غرض کس کس چیز سے نہیں حسد کرتی تھی اور ان کی امی کا کہنا تھا حسد کرنے والوں کی نظر سے بچا جائے۔ یہ نظر اندر تک تباہ کرتی ہے۔ یا سمین اللہ کی مشکور تھیں کہ فروغ ماہ کے سائے سے بچ آئی تھیں۔ اتنے سالوں میں فروغ ماہ خاص خاص موقعوں پر ہی ان کے گھر آتی رہی اسی طرح یا سمین بھی عید تہواروں یا بچوں کی چھٹیوں میں سسرال جاتیں۔

اور اب نہ تو کوئی موقع تھا نہ کوئی خاص تہوار۔۔۔ پھر کیوں آرہی تھی وہ؟ یا سمین کے دل میں وسوسے سر اٹھانے لگے تھے۔

"بھابھی طوفان آرہا ہے۔ حفاظتی بند باندھ لیں۔" سیما بھابھی کی کال پر وہ بظاہر ہنس دی تھیں، لیکن اس کے بعد جیسے سکون اڑ گیا وہ حقیقتاً" حفاظتی بند باندھنے پر مجبور ہوئیں۔ اپنے استعمال کی بہت ساری چیزیں، قیمتی کپڑے، زیورات، بیگز یہاں تک کہ میک اپ کی اشیا وہ ایسی جگہ رکھ رہی تھیں کہ جو فروغ ماہ کی پہنچ سے دور ہوں۔ اس سب احتیاط کے پیچھے یہ بات نہیں تھی کہ وہ یہ خرید نہیں سکتی تھیں بس انہیں فروغ ماہ کی دھونس

بھری اجارہ داری بری لگتی ہمیشہ کی طرح اپنا خون جلانے سے بہتر تھا کہ سیما بھابھی کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے حفاظتی بند باندھ لیے جائیں۔

اور اب وہ آئینے کے سامنے کھڑی تھیں۔ ان کی گوری رنگت میں گلاب دمکتے تھے چمکتی آنکھوں میں کانچ دکھتے تھے اور خدوخال بالکل ملکاؤں جیسے...

انہوں نے اپنے استعمال کی چیزیں تو ٹھکانے لگادی تھیں، مگر وہ اپنے اس رنگ روپ کو کہاں چھپائیں کہ جسے دیکھ کر فروغ ماہ کی آنکھوں میں کچھ چبھنے لگتا حالانکہ وہ خود بھی ٹھیک ٹھاک حسین تھی، لیکن حسد تو حسد ہے۔ حسن کو حسن سے بھی ہو جاتا ہے۔



ہاسٹل پہنچتے ہی زنوبیہ تو تیاریوں میں جت گئی۔ رجا حمنی کے کمرے میں گھس گئی تھی جبکہ مائدہ نے اپنی مما کو فون ملالیا۔

"ارے اتنی سی بات..." مسئلہ جان کر اس کی مما نے فی الفور پچکارا۔ عقیدت قریب ہی براجمان تھی چہرے پر یوں آس و امید لیے گویا مائدہ کی مما چھڑی گھمائیں گی اور اس کا نام بیڈمنٹن کھیلنے والی لڑکیوں کی لسٹ سے کٹ جائے گا۔

"یہ اتنی سی بات نہیں ہے مما... ایک تو بغیر پوچھے اس بلیک بیوٹی نے ہمارے نام دیے۔ دوسرے ہماری اسٹڈیز اسٹارٹ ہو رہی ہیں، ہم اسٹڈی کریں گے یا گیمز کھیلیں گے۔ اتنی ٹف پڑھائی ہے۔"

"کوئی نہیں ٹف۔" مما نے جیسے ناک سے مکھی اڑائی ہو "اور تفریح ہر کسی کو چاہیے ہوتی ہے چاہے ٹیچر ہو چاہے ڈاکٹر... میڈیکل کے اسٹوڈنٹ بھی انسان ہوتے ہیں کھیل کو ان کا بھی حق ہے۔"

"مما..." مائدہ نے ٹوکا تو وہ ہنس دیں۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں میری جان... ساری پریشانی بھولو اور انجوائے کرو۔ تم جانتی ہو میں اور تمہارے بابا اپنے کالج میں ان ایکٹوٹیز کی جان ہوتے تھے اور پڑھائی میں بھی کوئی ہم سے آگے نہیں آتا تھا بس ساری بات مینج کرنے کی ہوتی ہے۔ تم بھی اس چیز کو انجوائے منٹ سمجھو پڑھائی تو ساری زندگی کرنی ہے۔" مما نے جب فون رکھا مائدہ کی آدھی سے زیادہ فکر کم ہو چکی تھی اور اب وہ عقیدت کی کم کرنے میں لگی تھی۔

لنچ کے بعد وہ سب کچھ دیر کے لیے سو گئی تھیں۔ شام میں جاگیں تو زنوبیہ نئی زنوبیہ بنی کھڑی تھی۔ لش پش کپڑے، ہونٹ سرخ لپ اسٹک سے رنگین، کانوں میں آویزے۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔" وہ ٹھیک ٹھاک ناراض لگ رہی تھی۔ "تم لوگ میری سالگرہ میں آئی ہو یا سونے؟"

"سچی مچی تمہاری سالگرہ ہی ہے نا؟" پوچھتے ہوئے رجا کے لہجے میں شرارت تھی۔

"نہیں..." وہ خاصا برا مان گئی۔ ہاسٹل کے چپے چپے کو معلوم ہو گیا تھا اس کی سالگرہ کا اور رجا پوچھ رہی تھی تمہاری سالگرہ ہے؟

"سنو تم دونوں... حلیہ ٹھیک کر کے آنا۔ اس حلیے میں آئیں تو کیک نہیں ملے گا۔" کہہ کر وہ چلی گئی۔

مائدہ نے آنکھیں سکوڑ کر عقیدت کو دیکھا تھا اس نے کندھے اچکا ڈالے دونوں نے کپڑے تبدیل کیے، ہونٹوں کو گلوس سے چمکائے جب حمنی کے کمرے میں گئیں زنوبیہ کی چیخ نکل گئی۔

"دیکھا... میں نے کہا تھا نا زنوبیہ پٹ سے بے ہوش ہو جائے گی تمہیں دیکھ کر۔"

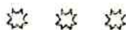
"تم لوگوں کو شرم آنی چاہیے ایسے آتے ہوئے۔" انداز ایسا تھا جیسے وہ دونوں پتا نہیں کس ناقابل اعتراض

حلیے میں چلی آئی ہوں۔

"قسم سے ہمارے پاس لال لپ اسٹک نہیں تھی۔" یہ سیدھی سیدھی زنوبیہ پر چوٹ تھی، مگر جوش جذبات میں وہ سمجھی نہیں۔

باہر شام حاوی ہو رہی تھی جب اس نے کیک کاٹا، ملے گلے اور مستی میں وقت گزرنے کا پتا بھی نہیں چلا پھر یہی شام جب سب کے چہروں پر حاوی ہونے لگی تب وہ پریشان ہو گئی۔

"چلتے ہیں رجا، میں اماں کو جلدی آنے کا کہہ آئی تھی۔" رجا خلاف معمول مان گئی۔ موج اور مستی کا وقت بہت تھوڑا ہوتا ہے وہ جب پھیلتے اندھیرے میں رجا کے ہمراہ گھر کے لیے رواں تھی۔ تب ہاسٹل میں گزرے یہ پل مٹ چکے تھے اور کچھ یاد تھا تو صرف آنے والا وقت اور بے تحاشا اندیشے اور بیڈ منٹن کی گیم۔



اس کا نام "سحاب" تھا۔ گزشتہ کسی ملاقات میں اس نے ناک بھوں چڑھا کر خاصی درشتگی سے فہد سے کہا تھا کہ وہ اس کا پیچھا کر رہا ہے اور اب سر جھکائے شریر سی مسکراہٹ کے ساتھ اقرار کرتے ہوئے وہ خود بھی لطف اندوز ہو رہی تھی کہ ہاں تم نہیں میں تمہارے پیچھے پیچھے تھی۔

"تم کوئی سیکرٹ ایجنٹ ہو؟" فہد نے ازراہ مذاق پوچھا تھا وہ کھل کر ہنس دی۔

"تھا نکس۔۔۔ تم بولنا بھی جانتے ہو۔" وہ شوخی سے بولی۔ تو فہد جزبز ہو گیا۔

"اس میں میری کسی شعوری کوشش کا عمل دخل نہیں۔ اصل میں۔۔۔ میں نیند میں جو کچھ دیکھوں وہ رئیل لائف میں ضرور ہوتا ہے۔ پہلی بار تمہیں دیکھنے کے بعد تم ہر رات میرے خواب میں آنے لگے۔" فہد نے آنکھیں سکوڑ کر اسے دیکھا تھا۔ اس درجہ روانی سے اردو بولتی اس امریکن نظر آتی لڑکی نے اس کے دماغ کی کھچڑی سی پکا دی تھی۔

"ایسے مت دیکھو۔۔۔ میں جھوٹ نہیں بول رہی۔" فہد کی نظروں کا مفہوم بھانپتے ہوئے اس نے معصومیت سے کہا تھا۔

"بلیو می۔۔۔ اس میں بھی میری شعوری کوشش کا ہاتھ نہیں تھا۔ تم خوامخواہ ہر رات میری نیند میں آتے اور اگلے دن مجسم مل جاتے۔" فہد کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نے جھلک دکھائی۔ لڑکی یا تو بہت ہوشیار تھی یا پھر بہت معصوم۔

"لیکن۔۔۔" فہد کی مسکراہٹ کو نظرانداز کرتی وہ کہتے ہوئے قدرے ہچکچائی۔

"معجزے روز روز نہیں ہوتے اور نہ ہی اتفاقات آئندہ کی ملاقاتوں کا شیڈول بنا سکتے ہیں۔ میرا مطلب محض اس بنیاد پر کہ میں تمہیں روز نیند میں دیکھ کے اگلی صبح مل لوں گی۔۔۔ ممکن نہیں۔"

"ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ جو چیز نیند میں دیکھو وہ حقیقت میں رونما ہو جاتی ہے۔" بظاہر فہد کے تاثرات سنجیدگی لیے ہوئے تھے لیکن آنکھوں سے جھانکتی شوخی سحاب سے پوشیدہ نہ رہی۔ وہ ناراض ہو گئی۔

"تم میرا مذاق اڑا رہے ہو۔"

"نہیں۔" فہد نے نفی میں سر ہلایا "میں تمہیں تمہاری بات لوٹا رہا تھا۔" سحاب ہنوز چپ تھی۔

"آگے بولو۔۔۔" فہد کو اسے اکسانا پڑا۔ وہ ہونٹوں کے زاویے بناتی بگاڑتی، سوچ سوچ کر بولی۔

"میرا مطلب تھا ہم روٹین کی ملاقاتیں نہیں کر سکتے؟" وہ ایسے چاہ رہی تھی گویا برسوں کی شناسائی ہو۔

"کیوں۔۔۔ تم اپنے سیکرٹ مشن سے تھک گئیں؟" مسکرا کر کہتے فہد کا اشارہ اپنا تعاقب کرنے والی بات کی

طرف تھا۔

''ہاں۔۔۔ کیونکہ میری واپسی کے دن قریب آرہے ہیں۔'' اس کی آواز دھیمی ہوگئی تھی۔ فہد نے بے ساختہ چونک کر اسے دیکھا۔ وہ اداس نظر آرہی تھی۔ غروب ہوتی پژمردہ کرنوں کا عکس اس کے چہرہ پر بے حد بھلا لگ رہا تھا۔ فہد نے نظروں کا زاویہ فوراً" بدلا۔

''اور میں چاہتی ہوں ہم پراپر پلان کے ساتھ ملیں۔''

''تم کیوں چاہتی ہو؟''

''یہ تو مل کر ہی معلوم ہوگا' میں کیوں چاہتی ہوں۔'' وہ پھر سے شوخ ہوئی۔ فہد سوال پوچھ کر پچھتایا۔

''میں کافی دنوں سے یہاں ہوں۔ میرے ڈیڈ میرے بغیر اداس ہوگئے ہیں کل ہی ان کا پیغام آیا کہ میں واپس آ جاؤں۔ رات تو سوتے ہوئے میں نے بہت شدت سے تمہیں سوچ کر دعا کی تھی کہ صبح تم سے ملاقات ہوجائے اور تم مل گئے۔'' اس کی آنکھوں میں جگنوؤں کی چمک تھی کچھ خاص پالینے کی خوشی۔ فہد سے زیادہ دیر دیکھا نہ گیا اس ریستوران میں شام ڈیرہ ڈال چکی تھی' مگر اس کے چہرے پر روشنیوں کا بسیرا تھا۔ فہد کو ریستوران کا حیرت کدہ' راحت کدہ میں بدلتا نظر آیا۔

''تم۔۔۔ میرا مطلب۔۔۔ میں سحاب ہوں۔'' اس سے کچھ پوچھتے پوچھتے اس نے اچانک ہی اپنا نام بتایا تھا۔

''میں اپنے ڈیڈ کے ساتھ کینیڈا میں ہوتی ہوں' یہاں میری ساری ننھیال ہے میری مام امریکن تھیں۔''

''تھیں۔۔۔؟'' فہد کو پہلی بار گفتگو میں دلچسپی محسوس ہوئی۔

''ہاں۔ وہ میری پیدائش کے کچھ ہی عرصے بعد فوت ہوگئیں۔'' اس کے آنکھوں کے جگنو مدھم پڑے تھے۔ فہد کو افسوس ہوا ضروری تو نہیں تھا وہ اسے ٹوکتا۔

''اینی وے۔۔۔ میں اور میرے ڈیڈ ایک دوسرے کے لیے ہیں نا اور پھر میں یہاں بھی آجاتی ہوں ہر سال ڈیڈی بھیج دیتے ہیں پھر جب ڈیڈی اداس ہونے لگتے ہیں میں واپس چلی جاتی ہوں۔ میرے ڈیڈ دنیا کے عظیم انسان ہیں' میں نے ان جیسا بہادر اور کوئی نہیں دیکھا' انہوں نے مما کے بعد ایک لمبی زندگی تنہا گزاری ہے ابھی بھی گزار رہے ہیں' میری خاطر۔۔۔ مجھے ان کی بہت قدر ہے وہ میرے لیے دنیا کے سب سے قیمتی انسان ہیں۔'' اب کے فہد ٹوکے بغیر بغور اسے سنتا رہا اپنے ڈیڈی کے ذکر پر اس کی لو دیتی آنکھوں میں محبت کا جہاں سمٹ آیا تھا وہ واقعی اپنے ڈیڈی کی محبت اور قدرداں لگ رہی تھی۔

''تم جانتے ہو۔'' اس کے لہجے میں اچانک جوش کا غلبہ ہوا۔ ''میرے ڈیڈی پاکستانی ہیں۔۔۔ تمہاری طرح۔''

''مگر میں نے کب کہا میں پاکستانی ہوں؟'' فہد کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔

''میں نے اندازہ لگایا پاکستانی مرد بڑے پیارے ہوتے ہیں۔'' آنکھ پٹپٹا کر کہتی وہ اپنے بات پر خود ہی ہنسی تھی۔

''اب آگے بتاؤ۔ ایک بات تو پتا چل گئی۔'' وہ کہنی میز پر رکھے ہتھیلی پر چہرہ ٹکائے کسی بے تکلف دوست جیسی لگی۔ گہری سانس' لیتے فہد کو ہار ماننی پڑی۔

''میرا نام فہد ہے اور میں یہاں نیویارک میں ہوتا ہے یہاں میرا اپنا گیس اسٹیشن ہے۔''

تین جملوں میں تعارف سمٹ بھی گیا وہ منتظر رہی شاید آگے بھی کچھ سننے کو ملے' لیکن فہد خاموش رہا تو وہ کندھے اچکا کر کہنے لگی۔

''بس۔۔۔ دی اینڈ۔۔۔'' اس کا انداز ایسا تھا کہ فہد کو ہنسی آگئی۔

''مطلب۔۔۔ تمہارے پیرنٹس۔۔۔ تمہارے رشتے دار اور تم یہاں کیسے۔''

''میری لائف میں کوئی نہیں' میں اکیلا ہوں۔'' فہد کے تلخی سے کہنے پر وہ قدرے چپ رہ گئی۔

"سوری۔" پھر شرمندہ شرمندہ سی کہنے لگی۔ فہد کو اپنے لہجے کی تلخی پہلی بار کھلی۔

"نہیں پلیز ڈونٹ بی سوری۔" اس نے فوراً" کہا وہ خوش ہو گئی۔

"تم یہاں بھی اپنے اس دوست کے ساتھ آئے ہو گے اس کی نئی دلہن کو سیر کرانے؟" فہد مسکرا دیا وہ اس کے بارے میں ٹھیک ٹھاک معلومات لیے ہوئے تھی۔

"نہیں۔۔۔ مجھے یہاں کسی سے ملنا تھا۔"

"او کے۔۔۔ ملاقات ہو گئی؟"

"نہیں۔۔۔ انتظار کر رہا ہوں۔" فہد نے کہہ کر انٹرینس کی طرف دیکھنا شروع کر دیا اکا دکا غیر ملکی آجا رہے تھے' لیکن اس کا مطلوبہ ملاقاتی نظر نہیں آرہا تھا۔

"اور تم یہاں میرے پیچھے آئی ہو۔" اس نے ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔

"نہیں۔۔۔ بالکل نہیں۔" وہ زور دے کر سختی سے انکار کرنے لگی۔ "مجھے اتنے بھی الہام نہیں ہوتے میں بھی اپنی دوستوں کے ساتھ آئی ہوں۔ مجھے یہاں ریسٹورنٹ میں تمہاری جھلک نظر آگئی تو میں یہاں آبیٹھی میری دوستیں ابھی آجائیں گی۔" اپنی بات میں مزید وزن ڈالتی وہ وضاحت دینے پر مجبور ہوئی۔ فہد نے سر جھکا کر گویا وضاحت کو تسلیم کیا۔

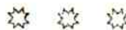
"تو مسٹر فہد۔۔۔ میں تم سے کب اور کہاں ملوں؟" اس کی انٹرینس پر جمی نظروں پر نظریں جمائے اس نے بظاہر سرسری سے لہجے میں پوچھا تھا' مگر اس کی آنکھوں سے شدت عیاں تھی' جو اس کے دل کے راز عیاں کر رہی تھی۔

"میں۔۔۔" فہد کو سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ کیا کہہ کر منع کرے۔ جس گاؤں جانا نہیں اس راستے پر کیا چلنا کے مصداق وہ اپنے قدم یہیں روک لینا چاہتا تھا اس میں کوئی شک نہیں تھا وہ اسے متاثر کرتی جا رہی تھی اس سے مل کر اپنائیت بھری انوکھی کشش محسوس ہونے لگی تھی' لیکن یہ راستے اس کے راستے نہیں تھے۔ وہ بے نام منزل کا مسافر تھا اسے ان راستوں پر چلنا ہی نہیں تھا۔

"ٹھیک ہے۔ تم نہیں چاہتے تو ٹھیک ہے۔" وہ جیسے اس کے اندر کی سوچ پڑھ چکی تھی فوراً" کھڑی ہو گئی فہد کو اس کے چہرے کی سرخی میں مایوسی اور دکھ ہلکورے لیتا نظر آیا' وہ سمجھ نہیں پایا اس کے دل کو کیا ہونے لگا تھا جیسے کسی اتھاہ گہرائی میں ڈوبتا چلا جا رہا ہو کسی میکانکی عمل کی طرح اس نے جیب سے اپنا کارڈ نکال کر میز پر رکھا تھا۔

"یہ میرا کارڈ ہے۔" نظریں چراتے ہوئے اس نے کہنا شروع کیا۔

"اسے رکھ لو جب ملنا ہو تو مجھے فون کر لینا۔" سحاب نے آہستگی سے اس کا کارڈ اٹھا لیا تھا۔ اس پہ لکھا اس کا نام اور رابطہ نمبر وہ گویا یہیں کھڑے کھڑے حفظ کرنے لگی تھی۔



چونکہ جمیلہ بقراطن کے پاس ہر مسئلہ کا حل ہوتا تھا چنانچہ ادھر اماں گہری نیند میں گئیں ادھر وہ جمیلہ کے حضور جا بیٹھی۔

"کیا ہے بلی۔۔۔"

"مجھے تمہاری مدد چاہیے۔" وہ دبی آواز میں کہہ رہی تھی۔ مبادا اماں جاگ جائیں۔

"میں نے نہیں کوئی مدد کرنی۔" جمیلہ پھر سے لحاف میں غڑاپ ہونے کے چکروں میں تھی۔

"کیوں۔" عقیدت نے جھپٹ کر اس کا لحاف کھینچا اور اس کی پہنچ سے دور رکھ دیا' جمیلہ کو اٹھتے ہی۔

"تو نے مجھے سالگرہ کا حال نہیں دیا اور نہ ہی اپنے ساتھ لے گئیں۔"

"اوہو۔۔۔" عقیدت نے دانت پیسے۔ "سالگرہ میں پورے گھر والے اٹھا کر نہیں لے جانے تھے جب کوئی ایسی دعوت دے گا جس میں تمہیں اور اماں کو لے جانا ہو تو میں لے جاؤں گی اور حال دے تو رہی ہوں تم سنو تو۔۔۔" جمیلہ نے پلکیں جھپک جھپک کر گویا نیند کو چلتا کیا اور ہمہ تن گوش ہوئی۔

"سالگرہ بس ٹھیک تھی۔ ہم نے K.F.C سے کیک' پیزا وغیرہ منگوایا تھا اور ہم سب نے پیسے ملا کر زنوبیہ کو ایک اچھا سا بیگ گفٹ کیا اس نے نئے کپڑے پہن رکھے تھے۔ لال لپ اسٹک بھی لگا رکھی تھی۔" عقیدت نے سالگرہ کا حال دیا کم پھینکا زیادہ۔ جمیلہ نے آخر میں منہ بنا لیا۔

"بس ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ اتنا کافی ہے کسی کتاب کے سبق کی طرح بتایا سب۔ اب وہ بتا جس کی وجہ سے تو نے مجھے جگایا۔"

"میری کلاس کی ایک لڑکی ہے اس نے میرا اور مائدہ کا نام گیمز میں لکھ لیا ہم دونوں بیڈ منٹن کی گیم میں ہیں۔"

"اللہ سچی۔۔۔" فرط جوش سے جمیلہ نے تالی بھی بجا ڈالی۔ عقیدت مارے گھبراہٹ کے دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔

"کنٹرول کرو خود کو اور پوری بات سنو۔" جمیلہ قدرے شرمندہ سی پھر سے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر بیٹھ گئی۔

"تم جانتی ہو مجھے لوگوں میں جانا کتنا برا لگتا ہے۔ میں کیسے کھیل پاؤں گی مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟؟"

"تو کیوں کچھ کرے گی اب میں کروں گی۔" جمیلہ نے سینہ ٹھونکا۔ "میں کل ہی بابا جی کے گھر سے چڑی بلا (ریکٹ' شٹل) لے آتی ہوں۔ وہ دونوں میاں بیوی اکثر کھیل رہے ہوتے ہیں یا پھر بازار سے نیا لے آؤں گی' اتنا بھی مہنگا نہیں آئے گا جب تک تیرے مقابلے کی تاریخ نہیں آجاتی روز تیرے ساتھ کھیلوں گی بلکہ بابا جی کے گھر لے جاؤں گی وہ تجھے کھیل کے قانون شانون بتائیں گے۔ دیکھنا تو اس گیم کی پوری "حاجی" ہو جائے گی۔" یقیناً "وہ چیمپئن کہنا چاہتی تھی اس کی اس پوری رام کہانی میں ایک بات عقیدت کے دل کو لگی اور وہ یہ کہ بابا جی کے ساتھ گیم کے قانون سمجھے جائیں۔ وہ مطمئن سی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بس؟" جمیلہ کو شدید حیرت نے ڈبو دیا۔

"ہاں بس۔۔۔ یہی پوچھنا تھا۔"

"لے۔۔۔ میں تجھی پتا نہیں کیا مسئلہ ہو گیا' پھٹا پہاڑ تے نکلا چوہا او وی مرا ہویا (کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا وہ بھی مرا ہوا)۔" جمیلہ کی نیند اڑ چکی تھی اب دنیا کی کوئی لوری اسے دوبارہ نہیں سلا سکتی تھی۔

"تو جا کہاں رہی ہے میری نیند خراب کر کے ادھر بیٹھ لڈو کھیلتے ہیں۔"

"تم اکیلی کھیلو۔ مجھے نیند آرہی ہے۔" لاپرواہی سے کہتی عقیدت دروازہ پھلانگ گئی۔ جمیلہ نقلی جمائیاں لے کر گویا نیند لانے کی کوششوں میں جت گئی۔



رات گہری ہو رہی تھی' غوری منزل میں آج پر اسرار خاموشی کا راج تھا۔ جو اپنے کمرے میں نرگس سے کندھے دبواتی گرینی کو یہاں بیٹھے بیٹھے بھی محسوس ہو رہی تھی کچھ نرگس پر بھی چپ کے بادل چھائے تھے اس کی چلتی زبان نہ جانے آج کیسے سکون میں تھی۔

"کچھ ہوا ہے کیا۔" گرینی کو ٹوہ لینے کی عادت نہیں تھی' لیکن انہیں عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔

"کوئی بات نہیں گرینی۔" حالانکہ دو باتیں تو ضرور ہی ہوئی تھیں۔ ایک سنعان سے حبہ کی ملاقات والی اور دوسری آج جس کی میٹنگ نورین کے پورشن میں جاری تھی اور جو کچھ ایسی خوش کن بھی نہیں تھی گھر کے

نوکروں کو سختی سے تنبیہہ کی گئی تھی کہ سنعان یا اس کی فیملی کا نام گرینی کے سامنے بھول کر بھی نہیں لیتا تو جب خوش کن خبر کا ذکر ان کے سامنے نہیں ہو سکتا تھا تو دوسری میٹنگ میں جاری۔۔۔ دماغ کی چولیں وہ بھی نورین کی ہلا دینے والی بات کا تذکرہ کیسے ہو سکتا تھا لیکن گرینی مصر رہیں۔

"میرا دل گھبرا رہا ہے نرگس۔ مجھے لگتا ہے کچھ غلط ہوا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں حبہ پر طوفان آیا ہوا تھا صبح شام میرے کمرے میں آکر میری الماری کی ہر کتاب ہر ڈائری اس نے نکالی۔ اس نے میری کتابوں یا ڈائری میں سے کیا ڈھونڈتا تھا؟" گرینی بات کے آخر میں سوالیہ پوچھنے لگیں۔ نرگس بتا نہیں سکی کہ اس نے جو ڈھونڈتا تھا وہ اسے مل گیا۔ یعنی زکریا آفندی اور سنعان آفندی کا پتا اور وہ ان کے یہاں سے ہو بھی آئی۔

اس کا بڑا دل چاہا گرینی کو بتا دے دیکھے ان کے چہرے پر رنگ پھیلتے ہیں یا نہیں کیا پتا خوشی سے ان کا دل ہی بند ہو جائے اور پھر نرگس کی نوکری پر بھی لات پڑ سکتی تھی۔ وہ ہونٹ سیے بدستور ان کے کندھے دبانے میں مگن رہی۔

"نورین کی طرف کچھ ہوا ہے؟" گرینی جیسے بات کے پہلے سرے تک پہنچ گئیں۔ ایک لمبی گہری سانس لینے کے بعد نرگس نے بتانا شروع کیا کہ یہ بتانے میں نقصان نہیں تھا۔ نہ تو گرینی آپے سے باہر ہو جاتیں اور نہ ہی آگے جا کر نورین تک بات پہنچاتیں۔

"اپنی کشف بی بی ہیں نا۔" گرینی نے اس کے کندھے دباتے ہاتھ روک لیے تھے گویا وہ پوری توجہ سے بات سننا چاہ رہی تھیں۔

"جھوٹ بول کے ایک رات باہر کہیں گزار آئیں۔" گرینی کو لگا انہیں سننے میں مغالطہ ہوا۔

"کہہ گئی تھیں کہ ان کی کسی دوست کے ماموں کو کینسر ہے اور وہ یہاں اسپتال میں ہے۔ ان کا یہاں کوئی نہیں تو کشف بی بی اپنی دوست کے ساتھ اسپتال رہیں گی۔ بڑی بی بی نے اجازت دے دی پھر آج عاشر صاحب کو کہیں سے پتا چلا کہ کشف بی بی دوست کے اسپتال کا جھوٹ بول گئی تھیں اسی بات کو لے کر گھر میں بڑے دھماکے ہوئے۔ کل کشف بی بی پر عاشر صاحب ہاتھ اٹھاتے اٹھاتے رہ گئے۔ سب کو پتا لگ گیا ہے مطلب گھر میں۔" نرگس کا اشارہ زینب اور عفیرہ کی طرف تھا۔

"اب بڑے صاحب کے کمرے میں کشف اور بڑی باجی موجود ہیں۔ عاشر صاحب بھی۔ بڑی چھوٹی چھوٹی آوازیں آ رہی ہیں سمجھ نہیں آ رہا کیا باتیں کر رہے ہیں بس کبھی کبھی کشف بی بی اور عاشر صاحب کے چیخنے کی آواز آجاتی ہے۔" پوری بات تفصیل سے بتانے کے بعد نرگس آخر میں اپنے جوہر بھی کھول بیٹھی دروازوں سے کان لگا کر سننے والے۔

گرینی نے شدت سے چاہا نرگس اب چپ ہو جائے وہ نہ بتائے کہ کشف اسپتال نہیں تو کہاں تھی۔ ان کا دل بند ہو جائے گا۔ وہ سہ نہیں پائیں گی لیکن نرگس کو اب روکنا محال تھا۔

"سنا ہے بہت عرصے سے کسی چکر میں ہیں۔ پوری بات نہیں پتا لیکن کشف بی بی کے رنگ ڈھنگ اور ہو گئے ان کی شکل بھی اب اور اور سی لگتی ہے' بڑی باغی سی۔"

"بس نرگس۔۔۔ تم جاؤ۔" ان کا دل واقعی بند ہونے لگا تھا۔ انہوں نے بمشکل تمام نرگس کو کہا۔

"مجھے نیند آرہی ہے۔ تم بھی جاؤ سونے۔" نرگس کو ہلکی ہلکی سی خفت نے گھیر لیا۔ گرینی کپکپا رہی تھیں ان کے ہونٹ سفید ہو رہے تھے۔

"گرینی آپ ٹھیک تو ہیں۔" ڈرتے ڈرتے نرگس نے پوچھنا چاہا لیکن گرینی نے ہاتھ کے اشارے سے جانے کا کہہ کر اسے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ ان پر ترحم بھری نظریں ڈالتی کمرے سے نکل گئی۔ پیچھے گرینی کے زخم درد کرنے

لگے۔ کوئی تکلیف سی تکلیف تھی۔



وہ جم میں تھی جب شہریار کی کال آئی۔ تحریم نے بے تابی سے سیل کان سے لگایا تھا۔
"مجھے لگتا ہے تم مجھے بھی بھولتے جارہے ہو؟" چھوٹتے ہی اس نے گلہ کیا۔ دوسری طرف شہریار ہنس رہا تھا۔
"تمہاری بیٹی تمہارے برابر ہوگئی ہے لیکن تم ابھی بھی بچوں جیسی ہو کوئی سلام کوئی حال احوال نہیں اور سیدھی گولیاں ٹھاہ ٹھاہ۔" ہلکے پھلکے انداز میں بولتا وہ تحریم کے چہرے پر بھی مسکراہٹ بکھیر گیا اگر اماں اسے یوں بولتے دیکھ لیتیں تو شاید یقین ہی نہ کرپاتیں کہ یہ ان سے بات کرنے والا ان کا اکلوتا بیٹا شہریار ہے۔ وہ شاید بیٹا اچھا نہیں تھا مگر بھائی بہت اچھا تھا اور صرف تحریم کے لیے اچھا تھا۔
"میں کیا کروں۔ میرے لیے تمہاری فون کال بہت ضروری ہے اور آج کل تم اتنے بزی کہ نہ میری کال اٹینڈ کرتے ہو نہ خود کرتے ہو۔ اسکائپ پہ بھی نہیں آرہے۔"
"بزی تھا سوئٹ ہارٹ..."
"اتنے بزی... مجھے ہی بھول گئے؟" تحریم سے آسانی کے ساتھ جان نہیں چھڑائی جاسکتی تھی۔
"نہیں تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں بس کچھ مصروفیت ایسی آگئی کہ مجھے فون کال کرنے کا بھی ٹائم نہیں ملا۔"
"اچھا بتاؤ۔ کیسے ہو۔ بچے ٹھیک ہیں۔"
"سب ٹھیک ہیں۔ تم کہاں ہو اس وقت؟" شہریار کا انداز قدرے پراسرار تھا۔ تحریم کو الجھن ہوئی۔
"جم... کیوں؟"
"میں سمجھا۔ مما کی طرف..."
"میں وہاں نہیں جاتی۔" اس نے شہریار کی بات بھی پوری نہیں ہونے دی تھی۔ شہریار کافی دیر تک نہ بول پایا۔
"کیا ہوا۔ کوئی مسئلہ ہے کیوں پوچھا تم نے؟" اب تو تحریم تشویش زدہ ہوئی۔
"کوئی مسئلہ نہیں۔" شہریار کی آواز بھاری ہوگئی تھی۔ "میں سوچ رہا تھا کوئی ہماری مما کے جیسا بھی ان لکی ہوسکتا ہے کیا؟"
"اگر تم نے یہ سب لیکچر دینے کے لیے فون کیا ہے تو بند کردو۔" تحریم کی عادت تھی بہت جلد ہتھے سے اکھڑ جاتی تھی۔
"سوری... میں نے یہ سب ایسے ہی کہہ دیا۔" شہریار کا لہجہ مدھم تھا۔ تحریم نے کچھ نہ کہا۔ متواتر خاموشی رہی۔ عجیب زندگی تھی ان بہن بھائی کی۔ ماں کا ذکر ان کی گفتگو میں اول تو آتا نہیں تھا۔ آتا بھی تو پھر جیسے سب باتوں کو سب آوازوں کو نگل جاتا وہ مزید کچھ کہنے کے قابل نہ رہتے لیکن ابھی یہ فون کال بہت ضروری تھی۔ شہریار کے پاس کچھ تھا بہن کو بتانے کے لیے وہ ابھی کال نہیں بند کرسکتا تھا۔
"میں نے تمہیں بتانا تھا کہ میں ڈیڈی سے ملا تھا۔" اور اس نے جو بتایا سن کر تحریم کے آس پاس جیسے دھماکے ہونے لگے ہوں۔
"سن رہی ہو نا... میں کہہ رہا ہوں میں ڈیڈی سے ملا تھا۔" شہریار کے لہجے میں جوش تھا اور وہ واقعی سن رہی تھی۔ شہریار کہہ رہا تھا وہ ڈیڈی سے ملا تھا وہ کیسے نہ سن پاتی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

عفیرہ مظفر

مکافاتِ عمل



بات اتنی بڑی نہیں تھی مگر بنادی گئی تھی۔ عزیزی ہما نے "پزا" منگوایا تھا بڑے ماموں سے' ٹھنک کر فرمائش کرکے اور وہ بڑے ماموں تھے' جن کا دل بھی بڑا تھا۔ جو سخی مشہور تھے خاندان بھر میں۔ مگر صرف خاندان یا اس سے باہر سخاوت دکھائی جاتی یا ماں بہنوں اور بھائی پر۔ بات جب اپنی بیوی اور بچیوں پر آتی تو ان کی یہ سخاوت سرمنہ لپیٹ کہیں او جھل ہو جاتی۔ پھر مہنگائی کے رونے روئے جاتے اور کم تنخواہ کا واویلا کیا جاتا تو کبھی بیماری کا بہانہ کرکے خرچا بالکل بند کر دیا جاتا۔

ایسے ڈرامے سال میں اکثر و بیشتر کیے جاتے۔ کبھی کسی بہنوئی کی فرمائش پوری کرنے کے لیے تو کبھی ننھے بھائی کو نئی کار موٹر سائیکل خرید کر دینے کے لیے۔ ننھے میاں خیر سے اتنے بھی ننھے نہیں تھے۔ شادی شدہ بال بچوں والے تھے۔ مگر چونکہ گھر کے سب سے چھوٹے بچے تھے تو لاڈ پیار بھی حد سے زیادہ سمیٹا پھر ایسے لاڈ پیار اور بیٹھ کر کھانے کے عادی ہوئے کہ آج تک بغیر نوکری کیے بڑے بھیا کے خرچے پہ پلے اور ایسے عیاشی سے گزارہ کیا کہ شادی ہوئی' بال بچے ہوئے اور سر میں کہیں کہیں سفید چاندنی چمکنے لگی مگر ننھے میاں ننھے ہی رہے۔

خیر تو بات ہو رہی تھی عزیزی ہما کے پزے کی۔ وہ پزا رکھ کر کسی کام سے کچن سے باہر چلی گئی۔ بڑے ماموں کی چھوٹی بیٹی اندر داخل ہوئی۔ پانی پی کے پلٹی تو سلیب پر پڑے ڈبے پر نظر جا پڑی۔ اس کی آنکھیں اشتیاق سے پھیل سی گئیں۔ وہ آگے بڑھی' پزے کے ڈبے کو دیکھا اور پھر کچن کے دروازے کو۔ ہاتھ آگے بڑھا کے پزا کا ٹکڑا اٹھایا اور مزے سے کھانے لگی۔ دہلیز پر کھڑی ہما کی نظریں پھٹنے کی قریب تھیں حلق کے بل چلائی۔

"میرا پزا....." آواز اتنی تھی کہ کمروں میں دبکے نفوس کے کانوں تک بخوبی پہنچی۔ بڑے ماموں نے جب بھانجی کی دلدوز چیخ سنی تو الٹے جوتے پہن کے سر پٹ باہر بھاگے۔ دادی محترمہ اور منجھلی پھوپھو بھی لپک جھپک' چپل گھسیٹ باہر کو لپکیں۔ غرضیکہ سارا گھر کچن میں جمع ہو گیا۔ منظر بہت دردناک تھا۔ ہما ذکری کا کان بے دردی سے مروڑتی اسے کچا چبانے کے درپے تھی۔ ذکری کی موٹی موٹی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔

"کیا ہوا؟ کیا بات ہے ہما بیٹے؟" بڑی محبت سے بھانجی سے دریافت کیا۔ بیٹی کی بلبلاہٹ کو نظرانداز کرتے ہوئے۔

"ماموں اس نے میرا پزا ہڑپ کیا ہے' میں اسے چھوڑوں گی نہیں۔" خونخوار نظروں سے اسے گھورا۔ کان مروڑنا اب ترک کر دیا تھا۔ ذکری سہم کے دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"ارے تو اس میں اتنا غصہ ہونے کی کیا ضرورت ہے' ہم اپنی بیٹی کے لیے اور پزا لے آئیں گے..... چلو ذکری ہما آپی سے معافی مانگو' کتنی گندی حرکت کی تم نے۔ زرینہ بیگم یہی تربیت کر رہی ہو تم بچیوں کی' آج چھپ کے پزا کھا رہی تھی' کل کو چھپ کے کوئی اور چیز اڑا لے گئی تو کیا عزت رہ جائے گی میری۔" نتھنے پھلائے ہوئے بیگم پر برہم ہوئے۔ زرینہ بیگم کا ضبط کے مارے برا حال تھا۔

"بچی ہی تھی احسان صاحب! کوئی چوری تو نہیں کی اس نے' ایک ذرا سا پزا ہی کھایا ہے نا۔ آئندہ ایسا نہیں کرے گی۔" وہ ذکری کا ہاتھ تھام' اسے گھسیٹ کر باہر جانے لگی تھیں کہ احسان صاحب راہ میں حائل ہو گئے۔

"ذکری ہما کے پاؤں میں بیٹھ کے معافی مانگے گی۔ تب ہی اسے تم لے جاسکو گی' اسے اس کی غلطی کا سبق ضرور ملنا چاہیے۔" ذکری کا ہاتھ ان سے چھڑا کے ہما کے سامنے جا کھڑا کیا۔

"معافی مانگو ہما آپی سے۔" مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اس کا ذہن ابھی تک سوچوں کے بحر میں ڈبکیاں لگا رہا تھا کہ آخر اس سے کون سا اتنا بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے کہ جس کی اسے معافی مانگنا ہے۔ ایسے ہلتے نہ دیکھ کے احسان صاحب نے کھینچ کے ایک تھپڑ اس کے

پھول سے رخسار پر دے مارا۔ وہ سسکتی ہوئی ہما کے قدموں پر جا بیٹھی۔

"ہما آپی مجھے معاف کر دیں۔" وہ زارو قطار رو رہی تھی۔ ہما کے چہرے پر تفاخر کے رنگ پھیل گئے۔

دادی محترمہ اور منجھلی پھوپھو(ہما کی ماں) کے لبوں پر مسکراہٹ چمکی۔ اس میں کیا شک تھا کہ ہما کی اس گھر میں حیثیت مسلم تھی۔ وہ جو کہتی تھی اسے پورا کرنا احسان صاحب نے اپنا فرض سمجھ لیا تھا۔ آخر بن باپ کی بیٹی تھی۔ اس کی فرمائش کیسے ٹال سکتے تھے۔ زرینہ بیگم آنسو پیتی ذکری کو ساتھ لے کر باہر نکل گئیں۔



دادی محترمہ 99 فیصد ساسوں کی طرح ایک ظالم و جابر ساس تھیں۔ دادا محترم نے اپنی جوانی میں کبوتر اڑانے اور تاش کھیلنے کے سوا کوئی خاص کام نہیں کیا تھا۔ اور دادی محترمہ کو شوہر کے بدلنے کی کوئی امید نظر بھی نہیں آتی تھی روکھی سوکھی کھا کر اور بچوں کو کھلا کر زندگی کی گاڑی چلا رہی تھیں بلکہ چلا بھی کیا گھسیٹ رہی تھیں۔

بچے ذرا بڑے ہوئے تو ان کی آنکھیں نئے سپنے بننے لگیں۔ بیٹیوں کو سلائی کڑھائی سیکھنے میں کھپایا' بڑے بیٹے کو گورنمنٹ اسکول میں جا گھسایا اور ننھے میاں کو سینے سے لگائے رکھا۔ چھ سال کے ہو گئے تھے مگر دادی محترمہ اتنی سی عمر میں ہی اسکول میں کھپا کر انہیں کملانا نہیں چاہتی تھیں سو ننھے میاں اماں کا پلو پکڑے انگوٹھا چوس بچے بنے رہے۔ وقت نے کد کڑا لگایا اور بڑے بیٹے نے میٹرک پاس کر لیا۔ تینوں بیٹیاں بھی سلائی کڑھائی میں خاصی مشاق ہو گئیں۔ ننھے میاں بھی بالآخر تیجی جماعت پاس کر کے چوتھی میں اٹک ہی گئے۔

اب دادی محترمہ کو اپنے خوابوں کی تکمیل احسان کی صورت میں نظر آ رہی تھی۔ احسان کے ماموں اور چچیرے بھائیوں کو کہہ سن کے سفارش کروا کے انہیں فوج میں بھرتی کروا دیا مگر فوجی کی ٹف لائف احسان صاحب کے چھکے چھڑا گئی۔ سونے پر سہاگہ ان کی پوسٹنگ سیاچن محاذ پہ کر دی گئی۔ اب تو احسان صاحب کو جان کے لالے پڑ گئے۔ جھٹ پٹ اماں حضور کو خط پتر لکھا۔ اور سیاچن کے دردناک موسم اور برف باری کا بتایا۔ پھر آخر میں لکھا۔

"اماں جان وہاں سے کوئی کوئی ہی واپس آتا ہے مجھے شہادت کی موت کی خوشی ہو گی مگر پیچھے تین جوان بہنیں ہیں انہیں بھی اپنے گھر کا کرنا ہے پھر میرا ننھا بھائی۔۔۔ اس کا بھی تو میرے علاوہ کوئی نہیں' آپ ہی بتایئے میں کیا کروں۔" اماں حضور کو تو دن میں تارے نظر آنے لگے۔ پھر بہتیری کوششیں کر' سفارش کروا' بیٹے کو فوج سے نکلوایا اور باہر بھیجنے کے لیے سرگرداں ہو گئیں۔ آباؤ اجداد نے زمین کافی چھوڑی تھی تھوڑی بہت بیچ کے پاسپورٹ ویزے کے پیسے حاصل کیے اور بڑے بیٹے کو الوداع کیا۔

"دیکھ اب تو ہی ہماری آخری امید ہے۔ جو بھی محنت مزدوری کرنی پڑے کر لینا۔ مگر خالی ہاتھ نہ بیٹھنا۔ پیچھے ہمارا تیرے سوا ہے ہی کون؟ پھر میں نے سوچا ہے کہ تجھے تو اعلا تعلیم دلا نہ سکی مگر ننھے کو میں بہت سا پڑھاؤں گی' ڈاکٹر بناؤں گی ڈاکٹر۔" ننھے میاں نے ادب سے "جی جی" کی گردان کی۔

مگر بات کچھ یوں تھی کہ ڈاکٹر واکٹر تو خیر کیا بننا تھا' پکے عاشق ضرور بن گئے۔ آٹھویں جماعت میں ہی ایسا زوردار عشق لڑایا کہ کیا ہی رانجھا ہیر' لیلیٰ مجنوں اور سوہنی مہینوال لڑا پائے ہوں گے۔ نسرین ان کی دور پرے کی کزن تھی۔ عشقیہ شاعری و ڈائیلاگز سے خطوط کے تبادلے ہوتے رہے اور ننھے میاں میٹرک میں پہنچ گئے۔ پیپر ہوئے اور کچھ عرصہ بعد نتیجہ بھی آ گیا۔ محترم انگلش' ریاضی چھوڑ اردو اور اسلامیات میں بھی اعلا کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فیل ہو گئے۔ اماں حضور کا ان کا ڈاکٹر بنانے کا خواب مٹی میں مل گیا۔ احسان صاحب نے دوبارہ اچھی تیاری کر کے پیپر دینے پر اکسایا مگر ننھے میاں اب صرف عشق کا امتحان دینا چاہتے تھے جس میں کامیابی انہیں بہت عزیز

تھی۔ ننھے میاں کی لیلیٰ نسرین بیگم کا خط آیا۔ کیا ہی دردناک خط تھا۔ آغاز گانے کے اس بول سے ہوا تھا۔

"ہمیں تیری ہے قسم ہم مر جائیں گے۔" اور ننھے میاں کا ننھا سا دل تڑپ اٹھا۔ آگے لکھا تھا۔

"پیارے عرفان (فانی جانو!)

تمہیں میں نے پہلے بھی اپنے دھڑا دھڑ رشتے آنے کی خبر دی تھی مگر تم کہتے تھے پیپر ہو لینے دو۔ اور تمہارے پیپر ہونے تک ابا کے دوست کے بیٹے کا رشتہ آ گیا۔ رشتہ خاصا معقول تھا سو ابا حضور انہیں ہاں کہنے کے لیے بالکل تیار تھے مگر میں نے شرم و حیا کو لات مارتے ہوئے تمہارا نام لے کر شادی سے انکار کر دیا ہے اب آگے کا کام تمہارا ہے۔ تم فورا" سے بیشتر اپنی اماں کو ہمارے گھر بھیجو۔ اکلوتی بیٹی ہوں، ابا مان ہی جائیں گے، دیکھو اگر ذرا سی بھی تاخیر ہوئی تو قیامت آجائے گی، میں جان دے دوں گی مگر کسی اور کا ساتھ قبول نہیں کروں گی۔ یہ خط میں اپنے خون سے لکھ رہی ہوں۔ بڑی مشکلوں سے نکال کے پین میں بھرا ہے۔ مگر خیر پیار سے بڑھ کر کوئی چیز اہم نہیں۔

والسلام تمہاری ادھوری (نسرین)۔"

ننھے میاں نے ساری روداد اماں کے گوش گزار کر دی۔ کچھ کوسنے گالیاں دیں اور راضی ہو گئیں کہ ننھے میاں کی خوشی سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں تھی۔ خوشی خوشی بہو لے آئیں۔ مگر شادی کے بعد بے چارے ننھے میاں یہ انکشاف نسرین کے منہ سے سن کے ڈھے سے گئے کہ اس دن جو خط لکھا تھا وہ مرغی کے خون سے لکھا تھا۔ خیر احسان صاحب نے ایک ایک کر کے تینوں بہنیں بھی ذات برادری میں بیاہ دیں۔ اب ان کے سر پر سہرا سجانے کی باری تھی اور اماں حضور چوکنی ہو گئیں۔ معاملہ بڑے بیٹے احسان میاں کا تھا جو ان کے لیے ہیرا ثابت ہوئے تھے۔ اس ہیرے کی چمک دمک کی وجہ سے ہی تو وہ آج بیٹیوں کو اعلا جہیز دے کے بیاہ پائی تھیں۔ گھر کی حالت بھی تبدیل ہو گئی تھی۔ خود اماں محترمہ کی حالت میں بھی زبردست تبدیلی آئی تھی۔ اعلا لباس کا شوق۔ جو غربت میں پورا ہونے کے چانس نظر نہیں آتے تھے۔ اب اعلا سے اعلا سوٹ پہنتیں۔ باٹا اور سروس کی جوتی سے کم جوتی لینے پہ وہ آمادہ نہیں تھیں۔ اور کوئی شک نہیں اس کا کریڈٹ احسان صاحب کو ہی جاتا تھا انہوں نے بھی تو ماں کے کہے پر عمل کر کے رات دن کا فرق بھلا کے کام کیا تھا جب ہی تو حالات نے پلٹا کھایا تھا۔

تبدیلی ___ صرف ابا محترم کی ظاہر حالت میں نہیں آئی تھی۔ وہی سفید ڈھیلا ڈھالا کرتا اور دھوتی۔ ہاں اب کبوتر اڑانا اور تاش کھیلنا وہ ترک کر چکے تھے کہ اللہ کے گھر میں اپنی زوجہ محترمہ کے ساتھ حاضری لگوا کے آئے تھے۔ پانچ وقت کی نماز ان کا معمول بن گئی اور عبادت کا رنگ ان پہ خوب چڑھنے لگا۔

احسان صاحب کے لیے دلہن ڈھونڈنے کی مہم شروع کی گئی اماں محترمہ کی بہن شکوہ کرنے لگیں کہ جب خاندان میں رشتے موجود ہیں تو تم باہر منہ ماری کیوں کر رہی ہو۔ درحقیقت وہ اپنی اکلوتی بیٹی کے لیے احسان میاں کو سوچے بیٹھی تھیں مگر بھلا ہو بہن کا فٹ سے جواب دیا۔

"نہ ذات برادری میں ہے کوئی میرے احسان کے ہم پلہ ؟ کیا گھبرو جوان ہے میرا بیٹا۔ اس کے لیے تو میں ایسی خوبصورت دلہن لاؤں گی کہ چاند بھی شرما جائے۔" بہن منہ لٹکائے واپس پلٹ گئیں۔ اب سچ تو یہ تھا کہ اماں محترمہ اپنی برادری کی ساری لڑکیوں کے گنوں سے خوب واقف تھیں۔ ایک سے بڑھ کے ایک چلتر خاندان میں موجود تھی۔ اب ایسی چالباز بہو لا کے انہیں اپنا ہیرا ہاتھ سے گنوانا تھوڑی تھا۔ وہ تو کوئی بھولی بھالی، مسکین یتیم سی لڑکی احسان کے لیے ڈھونڈ رہی تھیں جسے وہ دبا کے رکھ سکیں اور ان کے آگے زبان کھولنے کی جرات نہ کر سکے۔ جو اللہ میاں کی گائے ہو۔ آخر ان کی مہم اختتام کو پہنچی اور اللہ میاں کی گائے دریافت ہو ہی گئی۔ لڑکی ان کی سہیلی کی بھتیجی تھی بے چاری چچا چچی کے کام نوکروں کی طرح کرتی تھی، ان کے بچے پالتی تھی اور روٹی کھا لیتی تھی۔ اب ایسی فل ٹائم ملازمہ کو گھر سے نکالنے کا کس کافر کا دل

چاہتا ہے؟ مگر اماں محترمہ کی سہیلی نے لڑ جھگڑ چچا چچی کو راضی کر ہی لیا۔ بڑی بے دلی سے چچا‘ چچی نے مہمانوں کا استقبال کیا اور صرف چائے بسکٹ پر ہی ٹرخا دیا۔ مگر اماں محترمہ کو پروا نہ تھی لڑکی ذرا شرمیلی تھی اس لیے چائے چچی محترمہ نے ہی سرو کی تھی۔ مگر اماں محترمہ لڑکی دیکھے بغیر تو جا نہیں سکتی تھیں اس لیے لڑکی کو ایک نظر دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ چچی محترمہ منہ بناتی اندر جا گھسیں۔ اور تھوڑی دیر بعد لڑکی کے ساتھ واپسی ہوئی۔ اماں نے جو نظریں اٹھائیں تو پھر ساکت ہی ہو گئیں۔ واقعی لڑکی ایسی تھی کہ چاند بھی شرما جائے۔



چاند جیسی دلہن تو مل گئی تھی مگر اب مسئلہ یہ تھا کہ کہیں وہ اپنے توبہ شکن حسن سے احسان صاحب کو اپنے جال میں نہ پھنسا لے۔ بیٹیوں سے صلاح مشورہ کیا۔ ”ہائے اماں اتنی گوری چٹی ہے وہ مجھ سے بھی گوری؟“ منجھلی بیٹی کو اپنی گوری چمڑی پر بڑا ناز تھا اب جو اماں سے اس کے حسن کے قصیدے سنے تو تشویش سے پوچھا۔

”اری کم بخت کشمیری لگتی ہے۔ یہ موٹی موٹی گھور سیاہ آنکھیں‘ ستواں ناک‘ اور چاند کو شرماتی سرخیاں چھلکاتی گوری رنگت۔ سچ پوچھو تو میرا دل نہیں مان رہا اسے بہو بنانے کو۔“ اماں نے نخوت سے ناک چڑھائی۔ بیٹیوں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ مگر اماں کی سہیلی نے دلائل سے اماں کو راضی کر ہی لیا۔

”ارے میری بھتیجی ہے مجھ سے بہتر کون جانتا ہو گا اسے‘ منہ میں زبان تو ہے ہی نہیں۔“ ان کی بات پر اماں کو کرنٹ لگا۔ ”ہائیں گونگی ہے‘ اری میری توبہ میں گونگی کو کاہے کو بہو بناؤں۔“ سہیلی نے سر پیٹ لیا۔

”اوہو رجو! منہ میں زبان نہیں ہے سے یہ مطلب ہے کہ تیرے آگے چوں چرا بھی نہیں کرے گی۔ مٹی کا مادھو ہی سمجھ لے‘ اور سلیقہ ایسا ہے کہ ہماری برادری کی کوئی لڑکی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ارے تیرا گھر جنت بنا دے گی۔“ وہ تمسخر سے ہنسیں۔

”اچھا!! تو پھر تو نے کیوں نہیں اسے بہو بنا لیا اگر ایسی ہی گنوں سے پر تھی۔“ وہ برا مان گئیں۔ ”میں نے اسے اپنے بیٹے کے لیے ہی سوچ رکھا تھا مگر آج کل کے لڑکے اتھرے گھوڑے ثابت ہوتے ہیں‘ لو میرج کرنی ہے اس نے۔ بھئی آخری بات بتا۔ تجھے پسند ہے تو ٹھیک ورنہ میں کوئی اور اس کے لیے ڈھونڈتی ہوں۔ کیوں تو اپنا اور میرا بھی وقت برباد کر رہی ہے۔“ انہوں نے بھی بالکل لحاظ نہ کیا۔ رضیہ بیگم گڑبڑا گئیں۔

”ارے نہیں! اب میں نے یہ تھوڑی کہا ہے کہ مجھے پسند نہیں۔ بس یونہی تجھ سے پوچھ گاچھ کر رہی تھی۔ اپنے ہیرے بیٹے کے لیے آنکھیں بند کر کے تو بیوی نہیں لانی میں نے۔ ٹھیک ہے تو تیاری کر۔“ انہوں نے رضامندی کا عندیہ دے دیا تو سہیلی مبارک باد دے کے جھٹ پٹ دوسرے معاملات طے کرنے لگیں۔ ”تاریخ کوئی نزدیک کی ہی رکھ لیتے ہیں‘ سادگی سے رخصت کروا لینا۔ جہیز کا تو تجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ امید مت رکھنا۔ ہاں اس کی ماں کے زیورات ہیں جو اسی کے ہیں دونوں احسان میاں اور زرینہ بعد میں چیزیں بناتے رہیں گے۔ ہاں ولیمہ پہ تم سارے ارمان نکال لینا۔“

وہ خاموشی سے سنتی رہیں۔ جہیز کا سن کے رنگ تو پھیکا پڑا مگر مطمئن کر لیا خود کو آخر کو کل کو زرینہ کو انہوں نے باندی کی حیثیت ہی تو دینی ہے اور ارمان تو خیر انہوں نے سارے ننھے میاں کی شادی پر ہی نکال لیے تھے۔ اب اس مہنگائی کے دور میں فضول خرچیاں کون پاگل کر سکتا ہے۔ جھٹ پٹ احسان میاں کو بلوایا۔ دو چار گھٹیا سے گھٹیا بھڑکیلے رنگوں اور چبھتے ستاروں والے کپڑے بری میں رکھے۔ دو اڑھائی سو والی جوتی کے دو جوڑے اور کانچ کے چوڑیوں کے دو چار سیٹ۔ یہ تھی بری ان کے ہیرے بیٹے احسان میاں کی بیوی کی۔ احسان صاحب بے چارے شوق میں ایویں وہاں سے دو چار چیزیں لے آئے۔ برانڈڈ میک اپ‘ نازک اور نفیس سا گولڈ کا نیکلس‘ ہیئر بینڈ اور گھڑی۔ اب جو ماں بہنوں نے یہ سب دیکھا تو کلیجے پھٹنے کے قریب

تھے۔

"اوئے شاباشے پتر! ایسی کون سی حور پری ہے تیری بیوی کہ جس کے لیے تونے اپنے محنت سے کمائے ڈالر فضول میں ضائع کردیے۔" وہ خجل سے ہوگئے۔ منجھلی بہن کا دل برانڈڈ میک اپ دیکھ کے للچا گیا۔

"ہاں بھائی اماں ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے کیا ضرورت تھی اس کی، یہیں سے اڑھائی تین سو کی کٹ لے لیتے بھابھی کے لیے۔ وہ کونسی محلوں کی رہنے والی شہزادی ہے۔ ایسا کرو تم یہ میک اپ تو مجھے ہی دے دو۔ بہنوں کا بیوی سے زیادہ حق ہوتا ہے۔" کہتے ہوئے اس نے جھٹ سے میک اپ اور گھڑی اٹھالی۔ بڑی بہن کیوں پیچھے رہتی۔

"ہائے اتنا قیمتی نیکلس۔ یہ تو مجھے ہی دے دو۔" جھپٹا مار کے اٹھا لیا اور اپنی شتر مرغ کی سی گردن سے لگا کے دیکھنے لگی چھوٹی بے چاری کے لیے پنیں ہی بچی تھیں۔ اس نے بھی کار خیر میں حصہ لینا اپنا فرض سمجھا۔

"اور یہ پنیں۔۔۔ یہ تو بچیاں لگاتی ہیں۔ میری سوہنی پہ بہت سوٹ کریں گی۔" بھائی صاحب بے چارے نکو سے ہوگئے۔ بارات جانے کے لیے تیار تھی۔ منجھلی بہن کو بھائی اور اماں کے ساتھ کرولا میں بیٹھ کر جانا تھا مگر اس کا میک اپ ہی ختم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔ وہ رگڑ رگڑ کے فاؤنڈیشن اور پھر فیس پاؤڈر لگایا کہ چہرے کی سفیدی مائیکل جیکسن کو بھی مات دینے لگی۔ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کے فخر سے گردن تن گئی۔ "ہم ساہو تو سامنے آئے۔" گنگناتے ہوئے اب گہری میرون لپ اسٹک رگڑی جارہی تھی۔ پھر برانڈڈ میک اپ میں سے بلش آن نکال کے لگایا تھا مگر لگانے کا ڈھنگ نہیں آتا تھا۔ گالوں پر انگلی کے ساتھ گول گول دائرے کی شکل میں لگایا۔ ایک پہ مقدار زیادہ اور دوسری پہ کم۔ اب آنکھوں کے میک اپ کی باری تھی۔ بھائی جان کے لائے میک اپ میں سے ہی مسکارا نکالا۔ پہلے کبھی لگایا تو نہیں تھا مگر ٹی وی پر لڑکیوں کو لگاتے ضرور دیکھا تھا گہرا جامنی کلر کا مسکارا نکال کے پلکوں پر ٹھونسا اور تیز چنگھاڑتی خوشبو والے پرفیوم کا اسپرے کر کے موتیوں والا پراندہ جھلاتی باہر نکل گئی۔ اپنے شوہر محترم سے برآمدے میں ہی ٹاکرا ہوگیا۔

"شمیم بیگم!" انہیں چھمک چھلو بنی بیگم کو دیکھ کر جلال آگیا۔ شمیم بیگم نے دوپٹے کو انگلی پہ لپیٹ کے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے انہیں معصومیت سے دیکھا۔ ہزار کوشش کے باوجود معصومیت اوپری اوپری سے لگ رہی تھی۔

"یہ لچھن شریفوں کے نہیں ہیں۔ یہ کیا کچھ تھوپ رکھا ہے تونے' بے غیرت' بے حیا' وہاں شادی میں ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کی نظریں تجھ سے ہٹیں گی نہیں۔ چل بو تھی دھوکے آ۔"

ہائیں۔ وہ ہق دق رہ گئی۔ وہ تو تعریفی جملوں کی منتظر تھی مگر شوہر تو گولہ باری کررہا تھا۔ خیر گولہ باری میں بھی تعریف تو ہوگئی تھی۔ اب ظاہر سی بات ہے کہ وہ اتنی "خوبصورت" لگ رہی تھی کہ لوگوں کی نظریں اس پر سے ہٹنا مشکل ہوجاتی تھیں۔

"اونہہ! تم تو سڑتے ہی رہنا مجھ سے' جل ککڑے۔ جاؤ نہیں دھوتی میں منہ' کیا کرلوگے' آئے بڑے آرڈر کرنے والے۔ جب کما کر کوئی دھیلا ہاتھ پہ رکھوگے نا تب تمہارے حکم مانوں گی۔ مجھے میرا بھائی کھلاتا ہے خرچہ پانی وہی دیتا ہے۔ اور یہ جو تم پشاوری چپل اور لٹھے کے کپڑے پہن کے اینٹھ رہے ہو نا یہ بھی اس کی ہی مہربانی ہے ہونہہ۔" وہ اسے آئینہ دکھاتی۔ پراندہ جھٹکے سے پیچھے کرتی آگے بڑھ گئی۔ اور محمد اشرف بے چارے کا مونچھوں کو تاؤ دیتا ہاتھ پہلو میں آگرا۔ بات تو سچ ہی تھی۔ اس کی مونچھیں بھی دلی جذبات کی عکاسی کرتی مرجھا سی گئیں۔ بے چارہ مرے مرے قدم اٹھاتے باہر کو لپکا۔ مبادا سالے میاں کرولا میں بیٹھنے اور شہ بالا بننے کا شرف ان سے چھین نہ لیں۔



زرینہ آنکھوں میں نت نئے خواب سجائے چچا چچی

کی دہلیز پار کر گئی۔ چچا چچی نے بھی جھوٹ موٹ کے ٹسوے بہا ہی لیے۔ اور جہیز کے نام پر سوئی تک نہ دی۔ زہ تو بھلا ہو پھوپھو بیگم کا چچی جان کے وہ لتے لیے کہ وہ ہاتھ جوڑتی کوٹھری میں جا گھسیں اور اس کی ماں کے زیورات کی پوٹلی ان کے ہاتھ میں پھینکنے کے سے انداز میں دی۔

"ہمیں یہاں سے جہیز کی توقع تو تھی نہیں اور نہ ہی ضرورت ہے۔ ماشاء اللہ سب کچھ گھر میں موجود ہے۔ بس عقل مند اور سلیقہ شعار بہو کی ضرورت تھی۔ بہو بیگم کے سلیقے کی داستانیں تو بہت سنی ہیں اب دیکھتے ہیں کس قدر سچائی ہے ان باتوں میں۔" اماں محترمہ جتائے بغیر نہ رہ سکیں۔ پھوپھو بیگم ہلکے سے مسکرائیں۔

"تم دیکھ لینا رضیہ، تم اس کے گن گاتی نہیں تھکو گی۔" انہوں نے یوں منہ کے زاویے بگاڑے جیسے کہہ رہی ہیں۔

"چلو دیکھ لیں گے۔" زرینہ رخصت ہو کے آگئی۔ گاڑی سے اتری تو منجھلی نند آگے بڑھ کے بازو پکڑ کے ساتھ ساتھ گھسیٹنے لگی۔ ہائی ہیل کی وجہ سے تیز تیز چلنا دشوار تھا مگر نند محترمہ ریسنگ موڈ میں تھیں۔ برآمدے میں جا کے دھپ سے صوفے پہ بٹھایا۔ وہ بے چاری ایسے جاہلانہ انداز پہ حیران سی تھی۔

ذرا پیچھے ہٹو۔ بھئی ہمیں بھی موودی شوودی بنانے دو۔" بڑی نند اپنے چار شیطان بچوں کو لیے دھپ سے پہلو میں آ بیٹھی۔ ایک بچے کو ایک گھٹنے پہ بٹھایا، دوسرے کو دوسرے پر، تیسرے کو دلہن کے بائیں سائیڈ پہ اور چوتھے کو بھابھی کی گود میں ٹھک کر کے بٹھایا۔ زرینہ کو گھٹن سی ہونے لگی مگر کوئی پرسان حال نہ تھا۔ تین گھنٹے کے طویل پریڈ کے بعد اسے کمرے میں لے جایا گیا۔ ایک گھنٹے بعد احسان صاحب کمرے میں داخل ہوئے ابھی دروازہ بند کرنے ہی لگے تھے کہ منجھلی بہن شمیم حواس باختہ چہرے کے ساتھ آدھمکی۔

"بھائی اماں کا بلڈ پریشر بڑا لو ہو گیا ہے۔ جلدی سے آؤ۔" احسان صاحب فراٹے بھرتے اماں کے کمرے میں جا پہنچے۔ اور اماں پورا سیٹ تیار کیے بیٹھی تھیں بس احسان کے آنے کی دیر تھی کہ ایکشن لیا۔ "آئے ہائے مجھے تو ہول اٹھ رہے ہیں اگر احسان بھی بیوی کے کہنے میں آگیا تو میرا کیا ہو گا۔ میری تو لٹیا ہی ڈوب جائے گی، تم سب جانتے ہو کیسی کیسی مشکلات برداشت کر کے میں نے تم سب کو پالا۔ پھر سب سے بڑھ کے احسان کا کتنا خیال کیا، اسے دسویں پاس کرائی۔ پھر سفارشیں کروا دوسروں کی خوشامدیں کر اسے فوج میں لگوایا۔ پھر تم لوگوں کے حصے کی زمین بیچ باچ اسے باہر بھیجا۔ خود پیٹ کاٹ اس کا پیٹ بھرا اور اگر وہ ہی بدل گیا تو میں کہیں کی نہیں رہوں گی۔" نادیدہ آنسو پونچھتے ہوئے گلوگیر لہجے میں بولیں۔

"اماں مجھے یقین ہے کہ بھائی جان ایسا کبھی نہیں کریں گے۔ بیوی کی محبت ہم سب کی محبتوں سے زور آور بالکل نہیں ہو گی۔ پھر بھائی جان کانوں کے کچے یا آنکھوں کے اندھے تھوڑی ہیں کہ بھابھی بیگم کے کہے میں لگ جائیں گے۔ اور ویسے بھی اتنا تو وہ جانتے ہیں نا کہ ماں باپ، بہن بھائیوں کا حق بیوی بچوں سے زیادہ ہوتا ہے وہ آپ کو ناراض کر کے خدا کے قہر کو آواز دیں گے۔"

ننھے میاں نے ایک بات درست کی اور باقی سب میں اپنی طرف سے ملاوٹ کر کے احسان صاحب کو مسمرائز کر دیا تھا۔ وہ مغلوب ہو کے اماں کی طرف لپکے۔

"اماں... اماں۔ آپ نے سوچ بھی کیسے لیا کہ میں آپ کی نافرمانی کا مرتکب ہوں گا۔ میری تو جنت ہیں آپ۔ آپ مجھے اپنا سر کٹوانے کا حکم دیں۔ میں اف نہیں کروں گا مجھے دوزخ میں جانے سے بہت ڈر لگتا ہے۔ آپ ہی ہیں جو مجھے دوزخ سے بچا سکتی ہیں۔ آپ حکم کریں، جو آپ کہیں گی میں وہی کروں گا زرینہ کی کیا مجال کہ آپ کے سامنے پر بھی مار سکے۔ بس مجھ سے راضی ہو جائیں۔"

وہ ان کے ہاتھ پیر چومتے ان کے مرید لگ رہے

تھے۔ اماں جان نے فاتحانہ نظروں سے بیٹیوں اور ننھے میاں کو دیکھا۔ اور ہاتھ کی شہادت کی انگلی اور انگوٹھا گول انداز میں جوڑ کے ننھے میاں کو داد دی کہ آئیڈیا ان کا ہی تھا۔ بہنیں جھوٹ موٹ کے ٹسوے صاف کرنے لگیں۔ اب کاہے کی ٹینشن بھائی صاحب ابھی بھی مٹھی میں تھے۔ خسارہ انہیں بالکل نہیں ہوا تھا۔ ہو ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ چال ہی ایسی چلی تھی مات تو زرینہ کے حصے میں آئی تھی۔ اسے ان کی کنیز بن کے رہنا تھا۔

بے شک ان کی منصوبہ بندی پرفیکٹ تھی۔



پہلے بھی زندگی پھولوں کی سیج نہیں تھی، مگر اتنی دشوار بھی نہیں تھی۔ چچی کے ہاں کام بے شک وہ سارے کرتی تھی، مگر چچی روک ٹوک نہیں کرتی تھیں، پھر گھر بھی اتنا بڑا نہیں تھا اور گھر کے افراد بھی کم تھے۔ جن کے کپڑے دھونا، کھانا بنانا اتنا مشکل نہیں تھا۔ جبکہ یہاں تو بیس مرلے گھر کی صفائی میں ہی وہ مر کھپ جاتی تھی کہ ہاتھ بٹانے والا کوئی نہیں تھا۔ بڑی نند قریب ہی بیاہی گئی تھی۔ روز اپنا کنبہ ساتھ لیے آ دھمکتی۔۔۔ اور منجھلی نند تو رہتی ہی یہاں تھی کہ اس کا میاں نکھٹو تھا اور اسے گھر داماد رکھا گیا تھا۔ رہ گئی چھوٹی تو اس کی طرف سے یہ سکون تھا کہ وہ لاہور بیاہی گئی تھی اور لاہور سے کھاریاں کا سفر اتنا کم تو تھا نہیں کہ وہ روز، روز میکے کے چکر لگاتی، پھر دو، دو مردوں کے روز کپڑے دھونا اور خواتین کے بھی۔ نسرین کو بننے سنورنے سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی کہ گھر یا شوہر کے کاموں میں دلچسپی لیتی اور اماں محترمہ بھی اسے کچھ کہنے سے ڈرتی تھیں کہ اکلوتی بیٹی تھی اپنے والدین کی اور والدین بھی خاصے امیر۔ انہوں نے دب کر تو رہنا ہی تھا۔ احسان صاحب نے تو شادی کے ایک ماہ بعد ہی زرینہ کو خاصا دھمکا دیا۔

''ماں کی نافرمانی کی تو چٹیا سے پکڑ دو بول طلاق کے بول کے نکال باہر کروں گا۔'' وہ بے چاری تو بالکل ہی سہم گئی۔ ان کی جائز، ناجائز سب سہتی گئی کہ اس گھر کے علاوہ اب کوئی جائے پناہ نہیں تھی۔ گھر کے کام کاج میں رل کے اس کی ذات مٹی ہو کر رہ گئی تھی۔ ان ہی بے کیف دنوں میں اسے پاؤں بھاری ہونے کی خوش خبری ملی۔ اب وہ پھر سے خواب دیکھنے لگی۔ شدت سے دعائیں کرتی کہ بیٹا ہی ہو۔ اندر کہیں امید تھی کہ شاید اولاد کی وجہ سے ہی اس کی حیثیت اس گھر میں مستحکم ہو جائے۔ مگر یہاں بھی اس کی حرماں نصیبی نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ یکے بعد دیگرے دو بیٹیوں کی پیدائش پہ تو وہ بالکل ہی ڈھے گئی۔ پھر تیسری بیٹی کی پیدائش پہ اس کی حیثیت دو کوڑی کی ہو کر رہ گئی۔ وہ اللہ سے شکوہ کرنے لگتی۔

''کیا تھا جو تو آخری کو بیٹا ہی بنا دیتا۔'' لیکن پھر جب بچیاں بڑی ہونے لگیں تو ان کی اچھی پرورش کے لیے وہ سرگرم ہو گئی۔ بڑی بیٹی ثمرہ، منجھلی نند کی اکلوتی بیٹی ہما کی ہم عمر تھی۔ ہما شوخ و چنچل زندگی کے رنگوں سے خوشیاں کشید کرنے والی لڑکی تھی۔ ذرا سا رنگ گورا تھا، اسی پر بہت اٹھلاتی تھی۔ نانی، ماموں، خالاؤں کی لاڈلی تھی اور بڑے ماموں کی تو اس میں جان تھی۔ جب سے محمد اشرف روڈ ایکسیڈنٹ میں فوت ہوا۔ احسان صاحب تو حد سے زیادہ شمیم اور ہما کا خیال رکھنے لگے۔ اپنی بیٹیوں کو پیار ذرا کم ہی کرتے۔ ثمرہ ہما کی اترن پہنتی تھی۔ باپ، ہما کا مرا تھا، مگر یتیمی کی زندگی زرینہ بیگم کی بچیاں گزار رہی تھیں۔

وقت کا کام گزرنا ہے اور یہ گزر ہی جاتا ہے۔ کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ جو کوئی اس کی دوڑ کا مقابلہ کرنے کے لیے ہم قدم ہو جائے تو ہو جائے، یہ رکتا بالکل نہیں۔ زندگی گزر ہی جاتی ہے، اعلا کپڑے پہن کے اعلا کھانے کھا کے بھی اور روکھی سوکھی کھا کے اترن پہن کے بھی۔

مگر زندگی گزارنے اور زندگی گھسیٹنے میں بہت فرق ہوتا ہے اور زرینہ بیگم، ان کی بچیاں زندگی کو گھسیٹ رہی تھیں۔ ثمرہ، ہما کے ساتھ بی اے، حمنہ ایف اے

اور ذکری میٹرک میں تھی۔ تینوں ذہانت، خوب صورتی میں یکتا و بے مثال تھیں، بالکل ماں کا پرتو، زرینہ بیگم کی خوب صورتی کے تو اب مٹے مٹے سے آثار ہی نظر آتے تھے۔ زرینہ بیگم بچیوں کے مستقبل کے حوالے سے خوف زدہ تھیں، اگر جو بیٹیوں کے نصیب بھی ان کی طرح خراب نکلے تو... اور اس تو کے آگے بالکل خاموشی ہوتی تھی۔ خوف، واہمے، وسوسے، ماں تھیں آخر، خود تو جیسے تیسے زندگی گھسیٹ لی، مگر بچیوں کے حوالے سے پھر بھی پرامید تھیں اور کچھ نہ سہی، پڑھائی تو ان کے پاس ہوگی نا، خود تو وہ میٹرک تک ہی پڑھ پائی تھیں، مگر بیٹیوں کے حوالے سے اعلا خواب تھے اور بیٹیوں نے بھی ماں کو بالکل مایوس نہ کیا۔

ثمرہ نے گریجویشن میں ضلع بھر میں ٹاپ کیا تھا۔ سب مبارک بادیں دے رہے تھے۔ ثمرہ کی کلاس فیلوز کے والدین نے فون کرکے احسان صاحب کو مبارک باد دی اور احسان صاحب یوں گردن اکڑا کے بیٹھے جیسے اس سب میں ان ہی کا کمال ہو۔

آج تک جھوٹے منہ تو بچیوں سے پوچھا نہیں تھا کہ اسکول، کالج کی فیسیں کیسے بھرتی ہو؟ یونیفارم یا جوتے تو چلو اترن میں مل جاتے تھے، مگر فیسیں... اور جواب ایک دن مل گیا۔ پورا برآمدہ شام کے وقت بچوں سے بھرا ہوتا تھا اور ثمرہ انہیں ٹیوشن پڑھاتی تھی۔ حمنہ اور ذکری بھی ہیلپ کردیتی تھیں۔ پل بھر کو دل میں عجیب پکڑ دھکڑ سی ہونے لگی۔ پشیمانی سی ہوئی۔ جنت حاصل کرنے کی تگ و دو میں وہ ان معصوموں کا حق تو مار گئے۔ اگلے مہینے بنا کہے خرچ سے زیادہ کچھ پیسے دے دیے۔ زرینہ بیگم کو شک ہوا کہ شاید غلطی سے وہ پانچ ہزار کی بجائے دس دے گئے تھے۔ رات کو پانچ ہزار انہیں واپس کردیے۔

"یہ میں نے غلطی سے نہیں دیے۔ رکھ لو، بچیوں کی فیسیں جمع کروادینا۔" مگر وہ زائد ایک پھوٹی کوڑی لینے کی بھی عادی نہیں تھیں، انکار کردیا۔

"بچیاں اپنی فیسیں خود جمع کروالیتی ہیں، ان کی ضرورت نہیں۔" پیسے رکھ کے وہ اٹھ گئیں، انہیں طیش آگیا۔

"ہونہہ گھمنڈی عورت! بھاڑ میں جائے میری بلا سے، میں خوامخواہ ہمدردی کررہا تھا۔" پھر وہ پانچ ہزار ہما کی عیاشیوں کے کام آئے۔ جب سے ہما نے یونیورسٹی جوائن کی تھی اس کے رنگ ڈھنگ ہی بدل گئے تھے۔ کمر تک پہنچتے بال اب شانوں سے لٹکتے تھے۔ کمان کی طرح آئی بروز اور وائٹنگ کریمز رگڑ رگڑ کر پھیکی سفید رنگت، ٹائٹ ہاف سلیوز شرٹس کے نیچے جینز یا ٹخنوں سے اوپر پہنچتی ٹائٹ پہنا کرتی۔ پھر ثمرہ نے دیکھا۔ وہ آئے روز ایک اوباش سے رئیس زادے کے ساتھ یونیورسٹی میں ہر جگہ پائی جانے لگی۔ اسے تاسف سا ہوا، مگر ہما کو کچھ سمجھانے کا مطلب "آبیل مجھے مار" کے مترادف تھا۔ وہ وہ اسے نظر انداز کرتی اسٹڈیز میں مصروف رہتی۔

ایک دن احسان صاحب نے اسے صبح تیار ہوکر نیچے آتے دیکھ لیا۔ اس کی ہاف سلیوز دیکھ کر ان کی آنکھیں حلقوں سے ابلنے کو تیار تھیں۔

"ہما بیٹے یہ کیا لباس پہن رکھا ہے۔" لہجہ ذرا درشت ہوگیا تھا۔ ہما ماموں کے ایسے لہجے کی عادی نہیں تھی۔ بڑی حیرانی ہوئی۔

"اوہو ماموں جان آج کل یہی فیشن میں ان ہے۔ میں کم از کم آپ کی دقیانوس بیٹیوں کی طرح برقع نہیں اوڑھ سکتی اور پلیز مجھے دیر ہورہی ہے۔ مجھے ڈراپ کردیں۔"

اس کا لہجہ جارحانہ سا تھا۔ وہ دھک سے رہ گئے۔ کچھ کہنے کے لیے بچا ہی کیا تھا۔ خاموشی سے اٹھ گئے۔ گیٹ پہ پہنچے تو ثمرہ بھی وہیں کھڑی تھی۔ بلیک عبایا میں بلیک ہی اسکارف سے نقاب کیے وہ بہت پرنور لگ رہی تھی۔ احسان صاحب کا دل خوشی سے سرشار ہوگیا۔

"آؤ ثمرہ بیٹا! میں تمہیں بھی ڈراپ کردوں گا۔" جانتے تھے دونوں ایک ہی یونیورسٹی جاتی تھیں۔ ہما کے چہرے کے زاویے بگڑ گئے۔

"نہیں... میں بس سے چلی جاؤں گی۔ شکریہ۔"

نرمی سے کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئی۔ احسان صاحب تب بھنبھنیاتے گاڑی کا لاک کھولنے لگے۔

زرینہ بیگم کی پھوپھو صفیہ ایک عرصے کے بعد آج ان سے ملنے آئی تھیں۔ کافی دیر انہیں سینے سے لگائے وہ روتی رہیں۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اتنے ظالم لوگ ہوں گے یہ' رضیہ سخت ضرور تھی' مگر اتنی کمینی اور ظالم ہوگی۔ اس کا مجھے اندازہ نہیں تھا۔ میری بچی مجھے معاف کردے' میں ہی تجھے اس جہنم میں جھونکنے کا سبب بنی۔ میں نے تو سوچا تھا کہ چچی' چچا تجھے کبھی بیاہیں گے نہیں' مفت کی نوکرانی جو ملی تھی۔ تیرا بھلا سوچا' مگر میں نہیں جانتی تھی یہاں تجھ سے نوکروں سے بھی بدتر سلوک کیا جائے گا۔" زرینہ نم آنکھوں سے پھیکے پن سے مسکرائیں۔

"جانے دیں پھوپھو' میری تو گزر گئی جیسی بھی گزری' اب کیا کف افسوس ملنا اب میں اپنی بچیوں کے حوالے سے پریشان ہوں۔ بے شک خوب صورت ہیں' ذہین ہیں' ہر کام میں' میں نے انہیں طاق کر رکھا ہے' مگر سسرال میں ساری ذہانت' سارے گن مٹی میں مل جاتے ہیں' میرے ساتھ بھی تو یہی ہوا' سب کی نوکری چاکری کی' اف تک نہیں کی' مگر سب کے لیے ناقابل برداشت ہوں۔ خیر چھوڑیے میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں' کیا اپنے ہی دکھ لے کر بیٹھ گئی۔" چادر کے پلو سے آنسو خشک کرکے وہ اٹھ گئیں' مگر پھوپھو بیگم نے انہیں بٹھالیا۔

"چائے پانی ہوتے رہیں گے' میرے پاس بیٹھو' مجھ سے باتیں کرو۔" پھر جو پرانے قصے چھیڑے تو ظہر کی اذان پہ ہی اٹھیں۔

"میں ذرا نماز پڑھ لوں' نواسیاں تو جانے کب آئیں گی' ویسے سچ کہوں تو میں گھر سے ایک بات سوچ کر آئی تھی نماز پڑھ لوں تو تم سے مشورہ کرتی ہوں۔" وہ پراسرار انداز میں کہہ کر اٹھ گئیں۔ زرینہ بیگم یہی سوچتی دوپہر کا کھانا بنانے لگیں۔

اب یہ عنایت ان پہ کی گئی تھی کہ کھانا پینا' صفائی ستھرائی وہ صرف اپنے پورشن کی ہی کرتی تھیں۔ مگر پانچ ہزار ہاتھ میں پکڑے وہ سوچ و بچار میں پڑجاتیں کہ کس چیز پہ خرچ کریں اور کس پہ نہیں۔ دانتوں تلے پیسے کھینچ کے خرچ کرتیں' مگر پتا نہیں چلتا تھا کہ پیسے گئے کہاں۔ مہنگائی بھی تو آسمان سے باتیں کررہی تھی۔ لیکن جب سے ثمرہ اور حمنہ نے ٹیوشن شروع کی تھی تو وہ بھی ماں کا ہاتھ بٹانے لگیں۔ کھانا بنا کے اب وہ چپاتیاں بنارہی تھیں۔ جب ساس محترمہ کا نزول ہوا۔

"صفو آئی ہے؟" انہیں گھورتے ہوئے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سرہلادیا۔

"اچھا مجھ سے تو ملنے نہیں آئی' ہاں بھئی اب تو دو دو رشتے بنتے ہیں اس سے آخر سمدھن بھی تو ہے وہ میری۔ جب ہی۔۔۔" طنزیہ کہتے ہوئے فقرہ ادھورا چھوڑ کے اندر چلی گئیں۔ زرینہ گہری سانس بھر کے روٹیاں ہاٹ پاٹ میں رکھنے لگیں۔

رات کو زرینہ بیگم کھانا کھاتے ہوئے گہری سوچوں میں گم تھیں۔ ثمرہ کھانے سے ہاتھ روک کے انہیں دیکھنے لگی۔ کوئی تو بات تھی جو انہیں ڈسٹرب کررہی تھی۔ اس نے ہلکے سے ہنکارا بھرا۔ زرینہ بیگم چونک گئیں۔

"کیا بات ہے۔ آپ کچھ پریشان نظر آرہی ہیں؟" حمنہ اور ذکری بھی کھانے سے ہاتھ روک کے انہیں دیکھنے لگیں۔

"ہاں۔۔۔ نہیں کچھ نہیں۔" وہ ہڑبڑائیں۔

"کچھ تو ہے جو آپ کو ڈسٹرب کررہا ہے۔ آپ کو چاہیے کہ ہم سے شیئر کریں' آخر پہلے بھی تو ہر بات آپ' ہم سے اور ہم آپ سے شیئر کرتی ہیں۔" کہتے ہوئے نرمی سے اس نے ان کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا۔ انہوں نے گہری سانس لی۔

"بات کچھ یوں ہے کہ پھوپھو جان اپنے دونوں پوتوں کے لیے تمہارا اور حمنی کا ہاتھ مانگ رہی تھیں۔ عباد کے لیے تمہارا اور حماد کے لیے حمنہ کا۔ عباد کو انگلینڈ گئے کچھ دن ہی ہوئے ہیں وہاں کسی بینک میں کام کرتا ہے۔ حماد ڈاکٹر ہے۔ دونوں ہی بہت سلجھے ہوئے بچے ہیں' بلی تھیلے سے باہر آگئی تھی۔ ثمرہ

کا چہرہ سپاٹ سا ہو گیا۔

"یہ وہی پھوپھو بیگم ہیں نا جنہوں نے آپ کا رشتہ یہاں طے کیا تھا۔ ان سے آپ اچھائی کی توقع کر رہی ہیں۔"

"ثمرہ۔۔۔" وہ صدمے سے بلند آواز سے بولیں۔

"انہوں نے میرے لیے اچھا سوچا تھا' مگر میری قسمت خراب تھی' پھر تمہارے بابا کی فطرت تھی' بہن' بھائیوں اور ماں کی فرماں برداری میں وہ میرا اور تم لوگوں کا حق تلف کرتے رہے۔ تم انہیں غلط نہیں کہہ سکتیں۔"

"ٹھیک ہے' میں انہیں غلط نہیں کہتی' مگر مجھے وہاں شادی بھی نہیں کرنی۔" قطعیت سے کہتے ہوئے وہ اٹھ گئی۔ زرینہ اس سے مایوس ہو کر پرامید نظروں سے حمنہ کی طرف دیکھنے لگیں۔

"حمنہ بیٹا تم تو مجھے مایوس مت کرنا' دیکھو میں جلد از جلد تم دونوں کے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتی ہوں۔ یہ۔۔۔ یہ میرے ہاتھوں کو دیکھو۔" لاچارگی سے کہتے ہوئے انہوں نے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ حمنہ تڑپ کے اٹھی۔

"امی! خدارا مجھے گناہ گار تو مت کیجیے۔"

"تو تم میرے کہے کا مان رکھ لو' مجھے سرخرو کر دو۔" انہوں نے روتے ہوئے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں تھاما۔

"مگر میری اسٹڈیز۔۔۔" حلق میں آنسوؤں کا پھندا سا اٹک گیا تھا۔

"ہوتی رہیں گی اسٹڈیز۔۔۔ بس تم سب عزت سے اپنے گھر کی ہو جا' مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔ تو پھر تم راضی ہو نا' میں انہیں ہاں کہہ دوں؟"

انہوں نے اس کا چہرہ اونچا کرتے ہوئے قطعیت سے پوچھا۔ اس نے روتے ہوئے سر ہلا دیا۔ زرینہ بیگم نے اس کا چہرہ چوم لیا۔

"مما جانی اب رونا بس کر دیں نا۔" ذکری نے منہ بسورتے ہوئے ان کے گلے میں بازو حمائل کر دیے۔ وہ ہنس پڑیں۔ "پگلی یہ خوشی کے آنسو ہیں۔" آنسو پونچھ کے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

ثمرہ کی نہ نے پھوپھو بیگم کو ذرا سا افسردہ تو کیا تھا' مگر وہ سر جھٹک' خوشی خوشی حمنہ کی رسم کے لیے بہو سمانہ اور بیٹے معظم کو لیے چلی آئیں۔ زرینہ بیگم نے احسان صاحب کو سب بتا دیا تھا انہوں نے کوئی اختلاف نہ کیا تھا۔ بلکہ مہمانوں کی مہمان نوازی ٹھیک سے کرنے کے لیے پیسے نکال کے دیے تھے۔ وہ حیران ہی تو رہ گئیں۔ سمانہ' حمنہ کو بار بار پیار کر رہی تھیں۔ معظم صاحب احسان صاحب سے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ دادی جان منہ کے زاویے بگاڑے دو منٹ ہی بیٹھیں' پھر چلی گئیں۔ ثمرہ یونیورسٹی سے تھکی گھر آئی تو لاؤنج میں اجنبی چہروں کو دیکھ کے ٹھٹک گئی۔ اس نے جھجک کے سلام کیا۔ سمانہ فوراً" اٹھیں اسے پیار سے گلے لگایا۔

"یہ تمہاری بڑی بیٹی ہے نا۔" زرینہ نے سر اثبات میں ہلا دیا۔ وہ کچھ دیر بیٹھ کے ایکسکیوز کر کے اٹھ گئی۔ کپڑے چینج کر کے آئی تو ابو اور معظم صاحب نماز ادا کرنے کے لیے چلے گئے۔ سمانہ نے اسے آتے دیکھ کے اپنے دائیں سائیڈ میں اس کے لیے جگہ بنائی۔ بائیں سائیڈ پر حمنہ بیٹھی تھی۔

"ادھر بیٹھو۔۔۔" وہ جھجکتی ہوئی بیٹھ گئی۔

"مجھے تمہارے انکار کا پتا چلا۔ دل تو دکھا' مگر کوئی بات نہیں' لڑکیاں سسرال اور شادی کے نام سے بہت ڈرتی ہیں۔ مگر ان شاء اللہ تم ہمیں بہت الگ پاؤ گی۔ یہ کوئی لفاظی نہیں ہے۔ میری خود بھی بیٹیاں ہیں' آج کو کسی کی بیٹی کے ساتھ میں کچھ غلط کروں گی تو کل کو میری بیٹیوں کے ساتھ بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ تم نے اپنا حق استعمال کیا' مگر ایک بات۔۔۔ عباد کل کی فلائٹ سے آ رہا ہے۔ تم عباد سے مل لینا۔ مجھے یقین ہے کہ تمہیں اپنا فیصلہ بدلنے میں کوئی دقت نہیں ہو گی۔ میری یہی کوشش ہے کہ میں دونوں کے فرض اکٹھے ادا کر دوں۔" وہ حیرانی سے آنکھیں پھاڑے ان کی باتیں سنتی رہی۔ عجیب خاتون تھیں۔ کیا زعم تھا کہ وہ ان کے بیٹے سے مل لے گی تو اپنا فیصلہ بدل دے گی۔ جیسے بڑا

طرم خان ہے نا ان کا بیٹا۔"

"ایویں میرا فیصلہ بدل جائے گا۔" اس نے جزبز ہو کر سوچا۔ مگر اسے پتا نہیں تھا کہ سمانہ آنٹی کا کہا ٹھیک ہی تھا اور پھر ہوا بھی وہی تھا۔

سمانہ آنٹی نے عباد کے آنے کی خوشی میں چھوٹی سی پارٹی رکھی تھی۔ مقصد صرف اور صرف عباد اور اس کی ملاقات تھا۔ دادی جان بمعہ تینوں پھوپھیوں نے ان سے بائیکاٹ کر رکھا تھا کہ بچیوں کے رشتے بالا ہی بالا طے کر لیے۔ ان سے مشورہ تک لینا گوارا نہیں کیا۔ احسان صاحب کی بھی خاصی برین واشنگ کی گئی۔ مگر اس کے باوجود وہ آج کی پارٹی میں آئے تھے۔ آنکھیں ابھی پوری طرح تو نہیں، تھوڑی تھوڑی کھلی تھیں۔

برتری ابھی بھی ماں بہنوں کو حاصل تھی، مگر حق تلفی بیٹیوں کی اب کم ہو گئی تھی۔ سمانہ آنٹی کے دونوں سپوت گھر پہ نہیں تھے۔ پارٹی اختتام کو پہنچ گئی۔ مگر عباد اور حماد کا دور، دور تک پتا نہیں تھا۔ سمانہ آنٹی نے دونوں کو فون کھڑکایا ایک موصوف کسی دوست کی عیادت کے لیے گئے تھے اور دوسرے ٹریفک جام میں پھنسے تھے۔

احسان صاحب کا خیال تھا کہ رات ہونے والی ہے۔ اس لیے نکل جانا چاہیے۔ مگر سمانہ آنٹی نے محبت بھرے اصرار سے انہیں رات رکنے پر آمادہ کر لیا۔ ثمرہ کا کوفت سے برا حال تھا۔ ایسے کون سے پرنس رہ گئے تھے کہ جن سے ملاقات ضروری تھی اور جب سمانہ آنٹی نے عباد کے آنے کی اطلاع دی تو سب اس سے ملنے کے لیے لاؤنج میں جمع ہو گئے۔ اس کے منہ کے زاویے بگڑ گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد سمانہ آنٹی کی ملازمہ کافی اور چائے کا کپ لیے چلی آئی۔

"آپ کافی لیں گی یا چائے۔" اس نے کافی کا کپ اٹھا لیا۔

"وہ عباد صاحب بالکونی میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ بیگم صاحبہ کہہ رہی ہیں۔ ان سے مل لیں۔" وہ بمشکل اپنی بے زاری چھپاتی اٹھ گئی۔ نوکرانی اسے بالکونی تک چھوڑ گئی۔ موصوف ایک ہاتھ پینٹ کی جیب میں پھنسائے دوسرے میں کپ پکڑے اس کی جانب پشت کیے کھڑے تھے۔ وہ تذبذب سے قدم اٹھاتی اس سے ایک قدم کے فاصلے پر رک گئی۔ وہ بھی آہٹ محسوس کر چکا تھا۔ پلٹے بغیر ہیلو کہا۔

"مجھے آپ کے انکار کا ماما نے بتایا تھا۔" اس نے بات کا آغاز کیا۔

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔" اس کی آواز سماعت کو جانے کیوں مانوس سی لگی تھی۔ "مگر ماما کا اصرار تھا کہ میں اور آپ ایک بار مل لیں۔ پھر ہی کوئی فیصلہ کریں۔" ایک اور طویل وقفہ۔ ساتھ ساتھ کافی کے سپ لینا بھی جاری تھا۔

"آپ کے انکار کی پتا نہیں کیا وجہ ہے، شاید مزید اسٹڈیز یا کچھ اور۔۔۔ مگر میرے انکار کی گمبھیر وجہ تھی۔" وہ ہمہ تن گوش تھی۔ آواز مانوس ضرور تھی۔ مگر وہ پہچان نہیں پا رہی تھی۔

"اسے میں نے یونیورسٹی میں پہلی دفعہ تب دیکھا تھا جب نیو ایڈمیشنز اسٹارٹ تھے۔ وہ ایم کام فرسٹ ایر میں تھی۔ سینئرز جونیئرز کے ساتھ فولنگ کر رہے تھے اور سینئرز میں بھی تھا۔ وہ بہت پر وقار تھی اور خوب صورت بھی۔ وہ چونکہ اکیلی تھی۔ اس لیے فولنگ کے لیے آسان شکار تھی۔ وہ کامرس ڈیپارٹمنٹ ڈھونڈ رہی تھی۔ ہم نے اسے غلط راستہ بتا دیا۔ مگر یقین کریں ہمارے بتائے گئے ایک لفظ پر بھی اس نے یقین نہیں کیا تھا۔ بڑی پر اعتمادی سے خود ڈیپارٹمنٹ ڈھونڈ لیا۔ میں پتا نہیں کیوں اسے بار بار دیکھ رہا تھا اور عجیب فیلنگز محسوس کر رہا تھا۔ پھر میں ہر اس جگہ جاتا جہاں اس کی موجودگی کا شبہ ہوتا۔ وہ زیادہ تر لائبریری یا لان میں ایک کونے میں بیٹھی ہوتی تھی۔ بالکل اکیلی۔۔۔ کسی سے ہیلو ہائے تک نہ تھی۔ بہت سوں نے اس سے کھلنے ملنے کی کوشش کی، مگر اس کا سپاٹ رویہ سب کو اس سے دور رہنے پر مجبور کر گیا۔

میں اگیزیمز دے چکا تھا اور اب صرف اسے دیکھنے کے لیے یونیورسٹی آتا تھا۔ آخر کار میں نے اس سے بات کرنے کی ٹھان ہی لی اور لائبریری میں اسے جا لیا۔

"میں اپنے والدین کو آپ کے گھر بھیجنا چاہتا ہوں۔" بغیر کسی تمہید کے میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں ناگواریت محسوس کی جاسکتی تھی۔

"کس لیے؟"

"آپ کا ہاتھ مانگنے کے لیے، مجھے آپ اچھی لگتی ہیں۔"

"میری طرف سے انکار ہے۔" ہاتھ اٹھا کے اس نے سختی سے مجھے مزید کچھ بولنے سے روک دیا۔

"اور پلیز آئندہ میرے پیچھے مت آیئے گا۔ یہ معاشرہ آپ جیسوں کو تو کچھ نہیں کہتا، مگر ہم لڑکیوں کا جینا ضرور دشوار کر دیتا ہے۔" وہ کتابیں اٹھا کے وہاں سے اٹھ گئی تھی۔ میں اس کے رویے سے بہت مایوس ہو گیا تھا۔ جاب کے لیے میں نے سی وی بھیج دی تھی۔ اپائنمنٹ لیٹر ملا تو میں انگلینڈ چلا آیا۔ پھر ماما نے میرے اور حماد کے رشتے کی بات چھیڑی تو مجھے پھر سے وہ یاد آگئی۔ پتا نہیں کیا نام تھا اس کا، مگر میں ایک کوشش ضرور کرنا چاہتا ہوں۔ یونیورسٹی سے اس کا بائیو ڈیٹا معلوم کر کے میں ماما کو وہاں بھیجنا چاہتا ہوں۔ وہ آج تک میرے دل سے نکلی نہیں۔ پہلے پہل میں نے اسے انسپائریشن کا نام دے کے سر جھٹکنا چاہا، مگر اب مجھے لگتا ہے مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے۔ آپ نے انکار کیا تو میرے لیے آسانی ہو گئی تھی۔ مگر ماما چاہتی تھیں کہ ہم ایک دفعہ ایک دوسرے سے مل لیں۔ اب میں نے ساری بات کھول کے آپ کے سامنے رکھ دی ہے۔ کہیے آپ کیا کہتی ہیں۔" وہ کہتے ہوئے اب اس کی جانب مڑا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔ دونوں کی نظریں ملیں اور پتھرا سی گئیں۔

"آپ۔۔۔؟" ایک ساتھ دونوں کے منہ سے نکلا اور دونوں کے کافی والے کپ ٹھک سے نیچے۔

6 سال بعد۔۔۔

ثمرہ آج ذکری کی شادی میں شرکت کے لیے پاکستان آرہی تھی۔ دونوں شریر بیٹے طلحہ اور عکاشہ بھی ساتھ تھے۔ عباد کی فلائٹ دو دن بعد تھی۔ رات پیکنگ کرتے ہوئے وہ افسردہ ہو گئی۔

"دونوں ساتھ چلتے تو ٹھیک تھا نا۔" سر میں برش کرتا عباد کا ہاتھ ساکت ہو گیا۔ وہ مسکراتے پلٹا۔

"دو دن کی ہی تو بات ہے۔ پھر میں بھی تم لوگوں کے پاس ہوں گا۔ ان شاء اللہ اتنی سی دوری تم سے برداشت نہیں ہوتی۔ ویسے یار مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ تم بھی مجھے چپکے چپکے چاہنے لگی تھیں۔ پتا ہوتا تو ایک پل کی مہلت دیے بغیر تمہیں رخصت کروا لیتا۔ ویسے کتنا فلمی سین تھا نا وہ، جب میں بالکونی میں کھڑا تھا۔ تم میرے پیچھے تھیں اور میں تمہیں اپنی داستان محبت سنا رہا تھا۔ بالکل اندازہ نہیں تھا کہ میری محبت میرے پیچھے ہی کھڑی ہے۔ پھر جب دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور کافی کے کپ نیچے۔۔۔ مائی گاڈ! وہ بھی کیا سچویشن تھی، دونوں ہی بے یقین تھے۔" کہہ کے وہ زور سے ہنسا تھا۔ ثمرہ کی مسکراہٹ بھی اس میں شامل ہو گئی۔

"اوکے پیکنگ ہو گئی ہے تو اب سو جاؤ، پھر ایک بجے نکلنا بھی ہے ویسے تمہیں ریسیو کرنے انکل آئیں گے یا پاپا ڈرائیور بھیجیں گے؟" بیگز کو ایک سائیڈ پہ رکھتا وہ پوچھنے لگا۔

"پاپا ہی ڈرائیور بھیجیں گے۔ اچھا اب آپ بھی سو جائیں۔ کافی ٹائم ہو گیا ہے۔" وہ عکاشہ اور طلحہ کے ساتھ ہی کمبل میں گھس گئی۔ ایک بجے الارم چنگھاڑنے لگا۔ وہ مندی مندی آنکھوں کو بمشکل کھولتی اٹھی۔ الارم آف کر کے اٹھ گئی۔ عکاشہ اور طلحہ کو جھنجوڑ کے اٹھایا۔ کپڑے پہنائے، پھر خود بھی تیار ہو گئی۔ عباد بھی اٹھ گیا تھا۔ وہی ایئرپورٹ چھوڑ کے آیا۔ کتنی ہی دیر وہاں کھڑا رہا۔ پھر جہاز اڑنے پر ہی واپس روانہ ہوا۔ جہاز اب علامہ اقبال ایئرپورٹ کے رن وے پہ تھا۔ عکاشہ اور طلحہ پرشوق نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ رحیم بابا (ڈرائیور) انہیں لینے آئے ہوئے تھے۔ بچوں کو پیار کر کے سامان ڈگی میں رکھا۔

"کیسی ہو بیٹی؟"

"الحمدللہ۔۔۔! آپ سب کیسے ہیں؟ اور بوا؟" اس نے محبت سے دریافت کیا۔

"سب ٹھیک ہیں اور آپ کا انتظار کررہے ہیں۔" سارے راستے عکاشہ اور طلحہ کی نٹ کھٹ باتوں پہ رحیم بابا مسکاتے رہے۔ وہ گھر پہنچی تو حمنہ بھی اپنی بیٹی کے ساتھ موجود تھی۔ دونوں والہانہ انداز میں ایک دوسرے سے ملیں۔ اس کی بیٹی سوہا بہت پیاری تھی۔ جلد ہی عکاشہ اور طلحہ اس کے پکے فرینڈز بن گئے۔ دونوں بہنیں ماضی کی یادیں تازہ کرنے لگیں۔

"پھر ہما کا کچھ پتا چلا؟" اس نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔ حمنہ نے نفی میں سرہلادیا۔

"پھوپھو بھی اسی غم میں پاگل ہوگئی ہیں۔ اب تو گھر پر ان کی موجودگی سے کسی نہ کسی کو نقصان پہنچنے لگا تھا سو مینٹل اسپتال میں داخل کرادیا گیا۔"

اس نے گہرے افسوس سے ایک آہ خارج کی۔ آنکھیں نم سے ہوگئی تھیں۔

وہ اپنے گھر میں داخل ہوئی اور ایک گہری سانس لے کر اپنائیت کے احساس کو محسوس کیا۔ عکاشہ اور طلحہ آتے ہی ذکری آنی کے دوست بن گئے تھے اور اب اس سے فرمائشیں کرکے مزے مزے کی کھانے بنوارہے تھے۔ بابا اور امی سے ملنے کے بعد وہ دادی کے کمرے میں داخل ہوئی۔ بے بسی و محتاجی کا پیکر بنی وہ بستر پہ لیٹی تھیں۔ پچھلے چند سالوں سے وہ بستر پر ہی تھیں۔ بیٹی کے پاگل پن اور عزیز از جان نواسی کی گمشدگی نے انہیں کمزور کردیا تھا اور اس پر فالج کا اٹیک۔ ان کی زبان بھی مفلوج تھی۔ بایاں حصہ بالکل حرکت نہیں کرسکتا تھا۔ وہ آگے بڑھی۔

"دادی جان۔۔۔" نم آنکھوں سے جھک کر ان کا ہاتھ تھاما۔ وہ اسے دیکھنے لگیں۔

"ت۔۔۔ تم۔۔۔ وہ۔" لڑکھڑاتے الفاظ، کمزور لہجہ اور ڈبڈبائی آنکھیں۔ وہ بے بسی کی انتہا پہ تھیں۔ کبھی یہی ان کی زبان انگارے برساتی تھی۔ بارود داغتی تھی، اور آج۔۔۔ امی جان بھی کمرے میں داخل ہوئیں۔

"دادی اماں سے مل چکیں۔" اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے پیار سے دریافت کیا۔ وہ بے بسی سے رودی۔

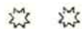
"امی یہ کیا ہوگیا؟" انہوں نے اس کے شانوں پہ ہاتھ رکھ کے دبایا۔

"بس اللہ کی مرضی۔" دادی بچوں کی طرح رو رہی تھیں۔

"زری۔۔۔ زرینہ۔۔۔ مے۔۔۔ مجھے۔۔۔ معا۔۔۔ ف۔" بہت مشکلوں سے الفاظ سمجھ میں آتے تھے۔ منہ ٹیڑھا سا ہوگیا تھا۔ زرینہ ان کا ہاتھ دبانے لگیں۔

"میں نے کہا نا اماں میں نے آپ کو معاف کردیا۔ ثمرہ نے بھی کردیا۔ ہم سب نے کردیا۔ ان شاء اللہ آپ ٹھیک ہوجائیں گی، آپ کو بھوک لگ رہی ہوگی میں سوپ لاتی ہوں۔" کہتے ہوئے وہ اٹھ گئیں۔ دادی جان نے اب آنکھیں بند کرلی تھیں۔ پوتی سے نظریں ملانا بہت مشکل تھا۔ وہ اٹھ کر باہر آگئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا ایسے بھی ہوجاتا ہے۔ یہ وہی دادی جان تھیں جنہوں نے ایک عرصہ ظالم و جابر حکمران کی طرح ان پہ حکومت کی تھی انہیں ڈرا دھمکا کر رکھا تھا۔ انہیں ترسا ترسا کے روٹی کپڑا دیا تھا۔ ان کے منہ سے نوالہ چھین کے نواسی اور بیٹیوں کے منہ میں دیا تھا۔ اور نواسی کے ساتھ بھی کیا ہوا تھا۔ یونیورسٹی کے اوباش رئیس زادے کے ساتھ اس کی دوستی تھی، دوستی محبت میں تبدیل ہوئی اور وہ باقاعدہ پلاننگ کر کے اس کے ساتھ بھاگ گئی بڑے ماموں کے سر پر خاک ڈال کے۔ بعد میں عجیب و غریب خبریں سننے میں آئیں۔

لوگ کہتے تھے کہ وہ اسمگلر تھا۔ لڑکیاں عرب ممالک میں سپلائی کرتا تھا۔ وہ لڑکیاں نائٹ کلبز کی زینت اور شیخوں کی عیاشی کا سامان بنتی تھیں۔ اسی غم نے منجھلی پھوپھو کو پاگل اور دادی کو مفلوج کردیا تھا۔ پتا نہیں اسے آزمائش کہنا چاہیے یا مکافات عمل۔ یا پھر۔۔۔ خدا تعالیٰ کا کھلا انصاف۔



ناولٹ

رفاقت جاوید

میرے دل میرے مسافر



چوتھی اور آخری قسط



بچے اپنی دھن میں مگن اور شیریں اپنی سوچ میں محو زندگی کو نئی طرز اور طریقے سے آسودہ و مطمئن بنانے کے منصوبے بناتی ہوئی ایک طویل سفر کے اختتام کا انتظار کر رہی تھی۔ جہاز نے کینیڈا ایئرپورٹ پر لینڈ کیا تو بیٹے نے ماں سے سوال کرکے اسے چونکا دیا۔

"ماما۔ آپ نے پاپا کو آنے کی اطلاع تو دی ہوگی۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو بھیا؟ ماما کے پاس پاپا کا فون نمبر ہے نہ ہی ایڈریس۔ وہ کیسے انفارم کرتیں۔" بیٹی نے بڑی سمجھداری سے بھائی کو جواب دیا۔ "ہم خود ہی ڈھونڈ نکالیں گے پاپا کو۔"

"بہن ٹھیک کہہ رہی ہے۔ ہم تینوں پاپا کی تلاش میں ہی تو نکلے ہیں۔" شیریں نے دکھی لہجے میں کہا۔

"فی الحال ابھی تو کنول خالہ ہمیں ریسیو کریں گی۔ پھر ہم چند دن ان کے گھر میں رہیں گے۔ خوب انجوائے کریں گے۔ ان کے بھی دو بچے آپ دونوں کی عمر کے ہیں۔"

"خوب مزا رہے گا ماما۔ اب میری ماما کبھی نہیں روئیں گی۔" بیٹی نے خوشی میں ماں کو پیار کیا۔ تو شیریں کے آنسو چھلک پڑے۔ وہ منہ دوسری طرف پھیر کر آنسو پینے کی کوشش کرنے لگی۔

ایئرپورٹ پر کنول کا شوہر عثمان اسے ریسیو کرنے آیا تھا۔

کنول جاب کرتی تھی اس کی آفس ٹائمنگ عثمان کے ٹائم سے زیادہ تھی۔ وہ صبح جلدی جاتی اور رات دیر سے آتی۔ عثمان آفس سے جلدی آجاتا اور وہ وقت شیریں کے لیے بے حد تکلیف دہ ہوتا۔ وہ سارا وقت شیریں کو عجیب عجیب نظروں سے دیکھتا۔ وہ بہت خوفزدہ ہو چکی تھی اور جلد از جلد یہاں سے جانے کا سوچ رہی تھی اور آج کے واقعے نے اس کی سوچ کو عملی جامہ پہنا دیا۔

آج عثمان جلدی آگیا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں تھی کہ اس نے دستک دی اور کمرے میں چلا آیا۔

"ہیلو شیریں۔ کیسی ہو؟"

"جی۔ آپ.... آپ میرے کمرے میں۔؟" اس نے پریشانی سے کہا۔

"تم بے فکر رہو۔ کنول کو تمہارے اور میرے تعلقات کی کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔ تم ذرا ہمت پکڑو۔" اس نے اسے زبردستی اپنے قریب کیا۔ شیریں نے بھرپور چیخ ماری اور اس کے بازو میں اپنے دانت پیوست کردیے۔ وہ سرعت کے ساتھ پیچھے ہٹ گیا۔

"مجھے آپ سے ایسی امید ہرگز نہ تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ بھی ایک مجبور اور حاجت مند عورت کی کمزوری کا فائدہ اٹھائیں گے۔" وہ افسوسناک لہجے میں بولی۔

"کس قدر ناقابل اعتبار ہے یہ مرد کی ذات۔ میں ابھی اور اسی وقت یہ گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ کنول کو وجہ نہیں بتاؤں گی۔ کیونکہ وہ آپ پر اندھا اعتماد کرتی ہے۔ اور آپ پر مکمل بھروسہ کرتے ہوئے میرے سامنے آپ کے پیار اور توجہ کی مدح سرائی کرتے نہیں تھکتی۔" وہ تیزی سے باہر کی جانب بڑھ گئی۔ وہ دروازے میں کھڑا غیظ و غضب سے دیکھتا رہ گیا۔

چند منٹ میں ہی اس نے اپنے اٹیچی گھسیٹ کر باہر نکالے۔ اور اپنا سامان رکھنے لگی۔

"شیریں۔ ایک بات کان کھول کر سن لو۔ اگر اس راز کو اگلنے کی کوشش کی تو بہت نقصان اٹھاؤ گی۔" وہ

چیخنے لگا۔" اگر تم ایسی ہی پاکیزہ ہوتیں تو شوہر چھوڑ کر نہ چلا جاتا۔"

وہ اپنے سامان اور بچوں کے ساتھ سڑک پر نکل آئی۔ ٹیکسی منگوائی اور سیدھی ہوٹل کی جانب چل پڑی۔ کچھ کوشش کر کے اس نے ایک کمرے کا اپارٹمنٹ کرائے پر لے لیا۔ قسمت نے یاوری کی اور ساتھ ہی اسے اسپتال میں بہترین جاب مل گئی۔ اور زندگی اپنے تناسب سے رواں دواں چل پڑی۔ آخر انتھک کوشش کے بعد اس نے ہارون کو ڈھونڈ نکالا۔ وہ یہاں سے پانچ سو کلومیٹر دور ایک شہر میں اپنی ذاتی کمپنی کا مالک تھا۔ انٹرنیٹ نے تمام انفارمیشن اس کی نگاہوں کے سامنے کھول کر پیش کردی تھی۔

کنول کئی بار اسے لینے اس کے گھر آئی مگر اس نے مصروفیت کا بہانہ بنا کر ہر بار ٹال دیا۔ وہ کسی صورت عثمان کی شکل دیکھنے کی روادار نہ تھی۔ جس نے اس کی عزت و تکریم پر صرف ہاتھ ہی نہ ڈالا تھا۔ بلکہ اس سے الزام تراشی کا بدترین فعل بھی سرزد ہوا تھا۔ جو ناقابل فراموش اور اذیت ناک تھا۔



"خرم بیٹا۔ ماں کی جان۔ شیریں نے اپنی الگ تھلگ دنیا بسالی ہے۔ اب تم اپنے بارے میں بھی سوچ لو۔ حدیقہ کو ڈھونڈ لو۔" ماں جی نے خوشامدی لہجے میں کہا۔ "مجھے اپنا بستا گھر دکھا کر خوش کردو بیٹا۔ پھر میں آسانی سے موت کو گلے لگالوں گی۔"

"ماں جی حدیقہ خوش ہے اپنی زندگی میں۔" وہ تاسف بھرے لہجے میں بولا۔

"اگر میں تم سے کچھ کہوں تو مانو گے۔"

"جی بولیں۔"

"میں نے تمہارے لیے ایک لڑکی دیکھی ہے۔ لیلیٰ اپنے والدین کی اکیلی اور بے حد لاڈلی بیٹی ہے۔ ان کی فیکٹریاں ملیں بے حساب رزق سب کچھ لیلیٰ ہی کا ہے۔ انہیں تم جیسے شریف اور تعلیم یافتہ لڑکے کی تلاش ہے۔ اگر تم کہو تو بات کروں۔"

"پہلی شادی نے کون سی خوشی دی جو دوسری کروں؟"

"بیٹے میرا واسطہ دنیا کے بھانت بھانت کے لوگوں سے پڑتا رہا ہے۔ میں چہرہ مہرہ دیکھ کر انسان کی فطرت کو پہچاننے میں دیر نہیں لگاتی۔ حدیقہ کے بارے میں میری کوئی پیشن گوئی غلط ثابت نہیں ہوئی۔ اس بار بھی میں اول فول نہیں بک رہی۔ میرا دل بھلے کی گواہی دے رہا ہے۔"

"آپ نے جو بھی میرے لیے فیصلہ کیا ہے۔ اللہ کرے انجام بہتر ہی ہو۔"

"مجھے تم سے یہی توقع تھی۔" انہوں نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

"بس پھر دیر کسی بات کی۔ اگلے مہینے کا پہلا ہفتہ شادی کے لیے بہتر رہے گا۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔" وہ مسکرا رہا تھا۔ یکدم چونک کر گویا ہوا۔

"ماں جی حدیقہ سے اجازت نامے کے بغیر شادی کرنا تو قانوناً" جرم ہے۔ اس مسئلے کا کیا حل ہو؟ شرعی طور پر اسے انفارم کرنا ضروری ہے کیا؟"

"تم بدبخت کو طلاق روانہ کردو۔"

"طلاق تو نہیں دوں گا۔ اسے تاحیات تنہائی کی مار دوں گا۔ ہارون کو حاصل کرسکے گی نہ کسی اور کی ہوسکے گی۔"

"اس معاملے میں میرا بچہ اتنا دور اندیش ثابت ہوگا۔ مجھے یقین ہی نہیں آرہا۔" ماں خوشی سے نہال ہوتے ہوئے بولی۔

"ماں جی میں نے بھی زندگی کے تجربات و مشاہدات سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اور آپ کی بے لوث محبت مشعل بن کر میری زندگی کی راہوں میں کامیابی کے دیے روشن کررہی ہے۔ ماں جی! میں بہت خوش قسمت انسان ہوں۔ جسے آپ جیسی ماں نے جنم دے کر نہایت پیار سے پروان چڑھا کر ایک مکمل انسان

بنایا۔"

"جیتے رہو میرے بچے۔" ماں نے دل کھول کر دعائیں دیں۔

"مجھے شیریں کا دکھ کھائے جارہا ہے۔ کیسے ہنستے کھیلتے برباد ہو گئی۔ مجھ سے تو ایسی بدظن ہوئی ہے کہ کبھی مروتاً" بھی حال احوال پوچھنا گوارہ نہیں کرتی۔ بھلا آپ ہی بتائیں کہ میں کیونکر قصوروار ٹھہرایا جارہا ہوں۔" خرم نے افسردگی سے کہا۔

"بیٹا۔ کبھی بہن بھائی ایک دوسرے سے کنارہ کشی اختیار کرکے خوش و خرم رہتے ہیں؟ اسے وقتی غصہ ہے تم پر۔ بہت پیار کرنے والی بہن ہے تمہاری۔ تم بھی اپنا دل صاف رکھو۔ بدگمانی حرام ہے۔ کیونکہ فساد کی جڑ ہے یہ۔ اس جڑ کو تم دونوں اپنے وجود سے اکھاڑ پھینکو۔ ورنہ دوری اتنی طوالت پکڑ لے گی کہ خون میں سفیدی آجائے گی۔" ماں نے اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے بیٹے کو سمجھایا۔

"اس کے بغیر شادی کرنا بہت انوکھا اور عجیب لگ رہا ہے۔ ماں جی مجھے تو وہ آج بھی اسی طرح پیاری ہے۔ وہ ہی میری چاہتوں کو بھول گئی ہے۔" خرم نے پریشان لہجے میں کہا۔

"بیٹے وہ وہاں گئی ہے تو بہتر ہو جائے گی۔ اب مجبوری ہے۔ وہ ضد نہ کرتی تو کیا ہی اچھا ہوتا۔ مگر سنتی کب ہے کسی کی۔" ماں نے دکھی لہجے میں کہا۔ "میرے جسم کا حصہ ہے وہ۔ ہر وقت اس کی کمی محسوس کرتی ہوں۔ اس خراب صحت اور بڑھتی ہوئی عمر میں مجھے تو تم دونوں کے دکھ ہی لے ڈوبے۔ میرا یہ وقت تو تمام فرائض سے سبکدوش ہو کر آرام کرنے کا تھا۔" وہ سسکتے ہوئے بولیں۔ "تقدیر کا لکھا مٹ سکتا ہو تو والدین اپنے ہر بچے کا نصیب اپنے ہاتھوں سے لکھ لیں۔ ہم کاتب تقدیر کے سامنے بے بس مجبور اور لاچار جو ٹھہرے۔"

"ماں جی! آپ پریشان مت ہوں۔ میں شیریں کو یوں بے یارومددگار کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ اس کے بغیر میرا سچا ہمدرد کون ہے۔ اس کا غصہ ٹھنڈا ہونے کا انتظار کرتے ہیں۔ پھر مصلحت کی صورت نکلنے کے چانسز سامنے آئیں گے۔ بس آپ ریلیکس رہیں۔ وقت آنے پر سب کچھ درست ہو جائے گا۔" بیٹے نے ماں کو تسلی دی تو وہ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولیں۔" مجھے اللہ کی ذات پر یقین ہے۔ وہ ہماری مدد کرے گا۔"

"آپ کا مطمئن رہنا بہت ضروری ہے۔" اس نے ماں کو اپنے گلے سے لگالیا۔



"حدیقہ گھر سے فون آیا ہے۔ ایک بہت بری خبر ہے تمہارے لیے؟" اس نے اپنی کرسی اس کی طرف گھما کر آہستہ سے کہا۔ دونوں ایک ہی آفس میں اپنا اپنا کام کیا کرتے تھے حدیقہ ابھی تک انڈر ٹریننگ تھی۔ تمام اکاؤنٹس کا کام ہارون سے ہی سیکھ رہی تھی گوکہ اس کا پروفیشن مختلف تھا۔ مگر اسے اپنی کمپنی کے لیے یہ ذمہ داری اٹھانا قطعاً" مشکل نہیں لگ رہا تھا۔ وہ جذبہ شوق سے ہارون کے ساتھ دن رات محنت و مشقت کررہی تھی۔ حدیقہ نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "ہارون نے اسے خرم کی شادی کی خبر گوش گزار دی۔ وہ بے بسی سے اسے دیکھتے ہوئے میز پر سر رکھ کر رونے لگی۔

"تم اس سے طلاق کا مطالبہ کردو۔"

"نہیں ہارون۔ میں طلاق کا مطالبہ نہیں کروں گی۔ اگر اس نے خود مجھے اپنے نام سے آزاد کردیا۔ میں پھر بھی شادی کرکے اپنی ذات پر لگائی جانے والی جھوٹی تہمت کو تسلیم نہیں کروں گی۔" وہ ابھی بھی تاسف میں روئے جارہی تھی۔

"میرے ساتھ بھی وہ ہی ہوا جو میری ماما کے ساتھ ہوا۔"

"اگر تمہاری ماما کی زندگی کامیابیوں سے ہمکنار ہوتی تو کیا تمہارا نصیب ماں کے ساتھ منسلک ہوتا۔ ایسے ہرگز نہیں ہوتا۔ ہر بچہ اپنی قسمت لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اور اسی کے مطابق زندگی گزارتا ہے۔" وہ

نرمی سے سمجھانے لگا۔
بھول جاؤ اس خود غرض شخص کو اور نئے سرے سے زندگی شروع کرو۔" وہ اسے نرمی سے سمجھا رہا تھا مگر اس کی آنکھیں اشکبار تھیں۔



"خرم! تم جانتے ہو کہ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں۔ ان کی تمام جائیداد کی مالک۔" لیلیٰ نے فخر سے بھنویں چڑھا کر کہا۔
"جانتا ہوں۔" وہ معمولی سا مسکرا دیا۔ "مگر مجھے اس جائیداد سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ نہ ہی تمہارے ابا کے بینک بیلنس سے واسطہ ہے۔"
"اصولاً" ہمیں ابا جان کے گھر شفٹ ہو جانا چاہیے۔ رشتہ طے کرتے وقت میرے والدین نے آپ کو گھر داماد رکھنے کی خواہش کا اظہار ماں جی سے کر دیا تھا۔ انہوں نے آپ کو نہیں بتایا۔" وہ ڈائمنڈ کی چوڑیوں سے کھیلتے ہوئے بولی۔
"اچھا تو اب سمجھ آئی کہ ماں جی بستر سے اٹھ کیوں نہیں رہیں۔ انہوں نے سر کیوں باندھ رکھا ہے۔ کھانا کیوں نہیں کھا رہیں۔ مجھ سے نظریں چرا کر درد دل چھپا رہی ہیں۔ کیونکہ انہوں نے جو سوچا تھا تمام اس کے برعکس نکلا۔" وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا۔ حدیقہ کا حسن، معصومیت اور الفت بھری باتیں اس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔
"لگتا ہے پہلی بیوی یاد آ رہی ہے۔ آخر لو میرج تھی۔ بھلا کیسے بھلائی جا سکتی ہے؟" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔
"ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ سر جھٹک کر بولا۔
"اچھا تو بتاؤ کب تک شفٹ ہونے کا پروگرام ہے۔" وہ سختی سے بولی۔
"فی الحال ماں جی کی طبیعت ناساز ہے۔ اس وقت انہیں ہماری ضرورت ہے۔" وہ صوفے سے اٹھتے ہوئے بولا۔
"میری بات کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ خرم تم بچے نہیں ہو۔ جو اٹھتے بیٹھتے ماں کے درد میں ہلکان ہوتے رہتے ہو۔ میری شادی ناسمجھ دودھ پیتے بچے سے ہرگز نہیں ہوئی۔ ہماری ہر بات میں تمہاری ماں ٹپک آتی ہے۔ اصل بات کو چھوڑ کر تم کسی اور ہی ٹریک پر نکل جاتے ہو۔ مجھے ایسی فضولیات بالکل پسند نہیں۔ کیا ہنی مون منانے کے مقصد کو جانتے ہو؟ ایک دوسرے کو سمجھنے کا گولڈن چانس ہوتا ہے۔ اس وقت بھی ماں اور شیریں سر پر سوار رہیں۔ حدیقہ کے حسن کے قصیدے سن سن کر میرے کان ہی تو پک گئے ہیں۔ اتنی ہی دماغ پر چھائی ہوئی تھی تو مجھ سے شادی کیوں کی تھی۔"
"لیلیٰ تم میری شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش مت کرو۔" وہ تیز لہجے میں بولا۔
"میرے سامنے آج تک کسی نے آنکھ اٹھا کر بات نہیں کی۔ تم کس بل بوتے پر رعب جمانے لگے ہو۔ تمہاری بیوی ضرور ہوں۔ باندی نہیں ہوں کہ جب چاہو بے وجہ چڑھائی کرتے جاؤ۔ آئندہ منہ سنبھال کر بات کرنا۔" وہ چیخ اٹھی تھی۔ وہ کمرے سے باہر نکلنے لگا تو وہ سامنے آ کر بولی۔
"دفع ہو جاؤ اپنی ماں کے پاس۔ آئندہ اس کمرے کی جانب رخ کرنے کی جرات مت کرنا۔ ماں جی۔۔۔ ماں جی اک ڈراما بن گئی ہیں۔"
"بکواس بند کرو، ورنہ۔۔۔" وہ بھی چیخ اٹھا۔
"ورنہ کیا کرو گے۔ مجھے مارو گے۔ تمہارے ہاتھ نہ توڑ دوں۔" وہ قریب آ کر بولی۔
"تم بیوی ہو میری۔ اپنی حیثیت پہچانو اور حد میں رہو۔" وہ غصے میں کانپنے لگا۔
"نکل جاؤ یہاں سے۔ بڑے گھر کی بیٹی ہونے کے باوجود کس قدر حقیر اور گری ہوئی سوچ ہے۔ بڑا پن خصلتوں، کردار اور اخلاقیات سے شخصیت میں نمایاں ہوتا ہے۔ تم نے دین و ایمان صرف پیسے کو بنا رکھا ہے۔ میرے ساتھ یہ سب کچھ نہیں چلے گا، سوچ لو۔" وہ پاؤں پٹختا ہوا ماں کے کمرے کی طرف بڑھ گیا اور وہ ہکا بکا اسے جاتا ہوا دیکھتی رہ گئی۔ ایسا ردعمل تو

اس نے زندگی میں پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ وہ کس نفرت و حقارت سے اسے ٹھکرا کر چلا گیا تھا۔ وہ رات بھر انتظار کرتی رہی۔ مگر وہ واپس نہ آیا اور لیلیٰ اپنی اکڑ و غرور میں گرفتار اسے منانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

ماں حالات سے سمجھوتہ کر کے اپنے بیٹے کے گھر کو آباد رکھنا چاہتی تھی۔ مگر خرم کسی صورت ہتھیار ڈالنے کے لیے تیار نہ تھا۔ گھر میدان جنگ بن چکا تھا۔ لیلیٰ نے کئی بار خرم کو غصے و نفرت سے جھنجھوڑا۔ ماں جی کے خلاف کیا کچھ بکتی رہی۔ خرم نے اس کے والدین کو تمام حالات سے باخبر کیا تو انہوں نے اس مسئلے کا حل یہ نکالا کہ خرم اپنی ماں' اپنا گھر اور خاندان چھوڑ کر گھر داماد بن جائے۔ کھلے لفظوں میں ماں جی سے پہلے بھی کہا گیا تھا۔ جس کے بعد گھر میں ہر وقت کی چپقلش شروع ہو گئی تھی۔ خرم نے آج بھی انکار کر دیا تھا۔ ماں کی منت و سماجت کی پروا کیے بغیر وہ لیلیٰ کو اس کے میکے چھوڑ کر واپس آ گیا۔

چند دنوں بعد لیلیٰ کا فون آیا۔ ہر بار خرم نمبر دیکھ کر فون بند کر دیتا۔ آخر تنگ آ کر اس نے سرپھری بیوی کی کال اٹینڈ کر لی۔

"خرم میں تمہیں انفارم کرنا چاہتی ہوں کہ میں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہوں۔" لہجے میں اکڑ و تکبر بدستور قائم تھا۔

"مبارک ہو لیلیٰ۔۔۔ تم کیسی ہو؟ اپنا خیال رکھو۔" وہ بھرپور خوشی میں بولا۔ "میں ابھی آتا ہوں' اتنی بڑی خبر چھپائے بیٹھی ہو۔"

"آنے کی قطعاً" تکلیف نہ کرنا۔ کیونکہ میں تمہارے بچے کو جنم نہیں دینا چاہتی۔ بے چارا باپ کے بغیر پل کر نامکمل ہی رہے گا۔ اسے دنیا میں لانے کا کوئی حق نہیں پہنچتا مجھے۔" وہ لاپروائی سے بولی۔

"یہ کیسا مذاق ہے؟ تم تیار ہو جاؤ۔ میں تمہیں لینے آ رہا ہوں۔ تم میری آنکھوں کے سامنے ہو گی تو مجھے اور ماں جی کو تسلی اور بے فکری رہے گی۔" وہ اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

"اگر تمہیں بچے کی خواہش ہے تو اپنی کٹیا کو چھوڑ کر میرے محل میں آ جاؤ۔ میں اپنے والدین کو تنہا چھوڑ کر تمہارے ساتھ ایک دن بھی نہیں گزار سکتی۔" وہ بدتمیزی سے بولی۔

"یار اب تو جھگڑا لڑائی چھوڑو۔ ہم پر تو اللہ کے فضل و کرم کے دروازے کھل گئے ہیں شکرانہ ادا کرنے کا وقت ہے' نہ کہ دنگا فساد کرنے کا۔" وہ محبت سے سمجھانے لگا۔

"خرم۔۔۔ تم نے مجھے جس گھر سے توہین اور بے عزتی سے نکالتے ہوئے یہ بھی نہ سوچا کہ میں تمہاری بیوی ہوں۔ میرے تم پر ان گنت حقوق ہیں۔ اگر میں نے اپنے تنہا والدین کے ساتھ رہنے کا نیک ارادہ کر لیا ہے تو کوئی ظلم نہیں کیا۔ اب اس گھر میں واپس آنا میری خود داری اور انا کی توہین ہے۔ میرے گھر کے دروازے تمہارے لیے ہر وقت کھلے ہیں۔ جبکہ میں تمہارے گھر میں بے وقعت اور بے حیثیت ہوں۔ جسے دھتکارتے ہوئے یہ خیال بھی نہ آیا کہ میں کس باپ کی بیٹی ہوں۔" وہ افسردگی سے بولی۔

"چلو یار غصہ تھوک دو۔ ہماری زندگی کا نیا سفر اپنی تمام تر رعنائیوں اور شادابیوں کے ہمراہ شروع ہونا چاہیے۔ اگر تم والدین کے پاس خوش اور مطمئن ہو تو مجھے تمہارا وہاں رہنا منظور ہے۔ میں چکر لگاتا رہوں گا۔" وہ پیار بھرے لہجے میں بولا۔

"اس احسان کی ضرورت نہیں خرم۔ آپ اپنی ماں کی خدمت گزاری کریں۔ میری نگہداشت کرنے والوں کی اک فوج یہاں ہر وقت موجود ہوتی ہے۔" اس نے زہر آلود لہجے میں کہا اور فون بند ہو گیا۔

"عجیب عورت ہے۔ ماں جی نے کہاں پھنسا دیا ہے؟" وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کے کانوں میں حدیقہ کی فریادوں کی آواز گونجنے لگی۔

"خرم مجھے بچہ چاہیے۔ مجھے نامکمل اور بے کار عورت بن کر زندگی گزارنا پسند نہیں ہے۔ مجھے ماں بننے اور ماں کہلوانے کا شوق ہر وقت مضطرب رکھتا ہے۔"

"خرم بیٹا کیا پریشانی ہے؟" ماں نے کمرے میں

جھانک کر پوچھا۔

"خوش خبری ہے ماں جی۔" وہ بناوٹی مسکراہٹ سے بولا۔

"جلدی بتاؤ بیٹا۔ یہ کان اچھی خبر سننے کو ترس گئے ہیں۔" وہ بے چینی سے بولیں۔

"آپ دادی بننے والی ہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"ارے دادی بننے والی ہوں۔ بتانے میں دیر کیوں کردی؟ منہ میٹھا کراؤ۔ ایسے تو خلاصی نہیں ہوگی تمہاری۔" وہ مسرت آگیں لہجے میں بولیں۔

"مگر ماں جی ایک مسئلہ درپیش ہے۔" وہ دکھ بھرے لہجے میں بولا۔

"اگر میں وہاں شفٹ نہیں ہوں گا تو وہ باپ بننے کی خوشی سے محروم کردے گی۔"

"ایسے ہی تمہیں دھمکی دے رہی ہوگی۔ یہ فیصلہ عورت تو کیا کوئی ڈائن بھی نہیں کرسکتی۔" وہ تسلی دیتے ہوئے بولیں۔

"وہ عورت کے روپ میں ڈائن ہے' چڑیل ہے' ماں جی۔ یہ آپ کس کو بہو بنا کر لے آئیں۔" وہ تڑپ اٹھا۔

"تمہاری بہتری کے لیے ہی تو یہ قدم اٹھایا تھا۔ مجھے علم نہ تھا کہ وہ ہمیں اتنی چھوٹی نظر سے دیکھے گی۔ ہائے ہماری قسمت' چھوٹے گھر کی بیٹی کے لچھن بھی دیکھ لیے اور بڑی گھر کی بیٹی کے طور اطوار بھی پرکھ لیے۔" وہ ہاتھ ملنے لگیں۔

"ماں جی! کہیں اللہ تعالیٰ ہمیں سبق تو نہیں سکھا رہا۔ کیونکہ ہم نے حدیقہ کو جتنا حقیر اور ناتواں سمجھ کر ناروا سلوک کیا تھا۔ اس کی کبھی ایک نہ سنی۔ اپنے احکامات مسلط کرکے اپنی بڑائی اور توانائی کو منواتے رہے اور وہ سب کچھ سہتی رہی۔ مگر ہمیں کبھی احساس ہی نہ ہوا۔ کہیں ہماری پکڑ تو نہیں ہوگئی۔" اس کے لہجے میں تاسف تھا۔

"ایسی بھی بات نہیں بیٹا۔ اگر وہ بلند کردار ہوتی تو آج ان پریشانیوں کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ وہ تو ایسی منحوس نکلی کہ اس گھر کو تنکا تنکا کرگئی۔ میری بچی پرائے دیس میں بچوں کے ساتھ نجانے کس حال میں ہوگی۔ ہمارے ساتھ تو انہونی ہوئی ہے بیٹے۔ ہمارے گھر کی کہانیاں ہر فرد کی زبان پر ہیں۔ خاندان میں منہ دکھانے کے لائق چھوڑا' نہ ہی محلے میں عزت سلامت رہی۔ یہ سب اسی کا کیا دھرا ہے۔ اس لیے خود پر الزام تراشیاں لگاکر خود کو مزید پژمردہ مت کرو۔" ماں کڑواہٹ سے بھرپور لہجے میں بولیں۔

"آپ درست فرما رہی ہیں۔ مگر لیلیٰ کا کیا' کیا جائے۔ وہ تو کسی صورت کوئی بھی بات سننے کو تیار نہیں۔" وہ بے بسی سے بولا۔ "بہت بے لگام اور منہ پھٹ عورت ہے۔"

"مجھے چھوڑ جاؤ' اپنا گھر اور خوشیاں اپنانے کی کوشش کرو۔ میری خیر ہے۔ ملاقات تو ہوتی ہی رہے گی۔" وہ بمشکل بولیں۔

"آپ کو کس کے سہارے چھوڑ دوں ماں جی۔ بیویاں پل بھر میں سیکڑوں مل جاتی ہیں۔ ماں صرف ایک ہی ہوتی ہے۔ آپ پہ ایسی ہزاروں بیویاں وار دوں۔ آپ کیا بات کرتی ہیں۔" وہ عقیدت سے بولا۔

"اتنے فرماں بردار بیٹے کی تقدیر تو سنہرے حروف سے لکھی جانی چاہیے تھی۔ یہ بے انصافی کیونکر ہوگئی میرے لخت جگر۔" وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولیں۔

"آزمائشیں انسان کی اپنی نیت' ارادے اور اعمال سے رونما ہوتی ہیں۔ اس کے ذمہ دار ہم خود ہیں۔ خدا تعالیٰ کی طرف سے اچھائی ہے' برائی ہرگز نہیں۔" خرم سوچتے ہوئے بولا۔

"ہمیں اپنے اعمال کا موازنہ کرنا چاہیے۔ شاید اپنی غلطیوں اور گناہوں کی کھوج لگاسکیں۔ اعتراف کے بعد استغفار کی قبولیت کا وعدہ کیا ہے میرے رب نے۔"

وہ خاموشی سے بیٹے کے خیالات اور اس کی فکرمند نظروں کا جائزہ لینے لگیں۔

"بیٹے! اب نئے سرے سے زمانے کو خود پر ہنسانا عقل مندی نہیں ہے۔ ہمیں صبر و تحمل اور دور اندیشی

سے کام لے کر یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ یہ شادی اور آنے والا مہمان کس طریقے سے بچ سکتا ہے۔" ماں نے طویل توقف کے بعد کہا۔

"بیٹے تو میرے ہی ہو' جہاں بھی رہو' کینیڈا بھی تو مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ اب ایک ہی شہر میں بیوی کے میکے رہ کر اپنا گھر آباد کر سکتے ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ آتے جاتے اپنا چہرہ دکھاتے رہنا' بس تسلی رہے گی۔"

"ماں جی دو سال کا عرصہ میری غیر موجودگی میں حدیقہ نے آپ کے ساتھ گزارا تھا۔ مجھے ہر لحاظ سے بے فکری تھی۔ اب بھی لیلیٰ کا آپ کے ساتھ رہنا فرض بنتا ہے۔ نہ کہ میں آپ کو اس بڑھاپے اور بیماری میں تنہا چھوڑ کر سسرال کا فرد بن جاؤں۔ میرے بس کا روگ نہیں ہے یہ۔" وہ پریشانی سے بولا۔

"بیٹا' لیلیٰ کے گھر میں رہ کر اسے آزمانا تمہارے لیے بہت ضروری ہے۔ ورنہ پچھتاوے پیچھا نہیں چھوڑتے' کیا معلوم وہ والدین کے گھر میں رہ کر انسانیت اور شرافت کے جامے میں آجائے۔ تم میری فکر کیوں کرتے ہو؟ گھر میں پرانے ملازم ہیں وہ میرا خیال کریں گے۔ ہاں میرے دل کے دکھڑے سننے کبھی کبھار چکر لگا لیا کرنا۔" ماں کی آواز بھرا گئی۔

"ایسا کرنا ناممکن ہے ماں جی۔ میں خود کو تا زیست معاف نہیں کر سکتا اور گلٹ میں جینا بہت بڑی آزمائش ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"لڑکی بیاہ کر سسرال جاتی ہے' نہ کہ لڑکا اپنا گھر چھوڑ کر بیوی کا غلام بن جاتا ہے۔ ہمارا کلچر اس کی اجازت نہیں دیتا۔ سراسر بے غیرتی اور بے عزتی ہے اس میں۔"

"ہے تو سہی۔ مگر کیا کریں مجبوری بہت بڑی ہے۔ لیلیٰ کی کوکھ میں ہماری نسل پل رہی ہے۔ اس بچے کی خاطر ہم اس کی ہر شرط قبول کرنے میں عار نہیں سمجھیں گے۔ تم تیاری کرو۔ میری دعائیں تمہارے آگے پیچھے اور دائیں بائیں حصار میں رکھیں گی' تم فکر نہ کرو' یوں سمجھو کہ مہمان بن کر جا رہے ہو۔" ماں نے اسے بوسہ دیتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ کی اس میں خوشی ہے تو میں یہ بھی کر دیکھتا ہوں۔ صبح آپ کی دعا لے کر آفس جاؤں گا اور شام بھی دعاؤں کے سائے میں بسر ہوگی۔ آپ نے سچ کہا ہے کہ ہمیں بچے کی خاطر یہ قدم اٹھانا پڑے گا۔ لیکن کیا گارنٹی ہے کہ بچے کی پیدائش کے بعد وہ اس گھر میں آنا پسند کرے گی۔ اس کے والدین تو مجھے عمر بھر کے لیے گھر داماد بنانے کے خواہشمند ہیں۔" وہ تذبذب کے عالم میں بولا۔

"بعد میں دیکھا جائے گا۔ فی الحال عافیت تمہارے شفٹ ہونے میں نظر آرہی ہے۔" ماں نے کہا۔

"ماں جی آپ نے دل اتنا بڑا کیسے کر لیا؟ اپنے گھر کے چراغ سے دوسروں کے گھر کو منور کرنے کا فیصلہ قابل آفرین ہے۔" وہ حیرت و ستائش بھرے لہجے میں بولا۔

"بیٹے وہ ماں ہی نہیں جو اولاد کی مجبوریوں کے ساتھ ڈھل نہ سکے۔" وہ اپنی آہ کو اندر دبا کر بولیں۔

"بیٹے تو میرے ہی ہونا' دل چھوٹا کیا کرنا' اللہ تعالیٰ تمہاری عمر دراز کرے۔ تمہیں سات بیٹوں کا باپ بننا نصیب ہو۔ لیلیٰ میں بچپنا ہے۔ ماں بن کر شاید میچور ہو جائے۔"

"آج مجھے شیریں کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ ہم دونوں کے درمیان اتنی طویل گہری خلیج حائل ہو جائے گی' میں نے تو کبھی سوچا تک نہ تھا اور وہ بھی تو ایسی گئی کہ جیسے میری زندگی میں اس کا دخل تھا' نہ خونی رشتہ تھا۔" اس کا لہجہ افسردہ تھا۔

"یہ تو سب کیا دھرا حدیقہ کا ہے۔ اس کا بیڑا ہی غرق ہو' میرا تو رواں رواں اسے بددعائیں دیتا ہے۔" وہ نفرت بھرے لہجے میں بولیں۔

"ماں جی اسے بددعائیں دینے کا فائدہ۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ تمام بددعائیں واپس پلٹ کر میرے دامن میں چنگاریوں کی صورت میں بسیرا کر کے میری تقدیر کو راکھ بنا رہی ہیں۔ اس کے لیے دعا کیا کریں۔ بے شک اس نے میرے ساتھ دغابازی اور

شیریں کے ساتھ صریحا" دھوکہ بازی کا ڈراما کھیلا ہے۔ جو ناقابل معافی ہے۔" وہ اتنے کرب سے بولا کہ ماں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "میرے دل میں اتنی وسعت ہے' نہ ذہن میں جگہ ہے کہ اس کی غلطیوں اور کوتاہیوں کو فراموش کر کے اس کے لیے دعاگو رہوں۔ جس نے میرے جسم کے حصے کو تقویت دینے کے بجائے اذیت دی۔ اسے کیسے دعا دے سکتی ہوں۔" وہ خاموش رہا۔

"اس کم بخت کی نصیبوں جلی ماں کو تو دیکھو کہ اکڑ ایسی کہ کیا مجال کہ دوبارہ مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی ہو۔"

"ماں جی چھوڑیں ایسی باتیں۔ اب ہمیں اپنے مسائل حل کرنے کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ آئندہ حدیقہ کا ذکر ہماری گفتگو میں نہیں آنا چاہیے۔ میرا سر گھومنے لگتا ہے اور بے بسی کا احساس سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے۔" اس نے بے چارگی سے کہا تو ماں نے اسے اپنے سینے سے لگا کر اس کی آغوش دعاؤں سے لبریز کر دی۔



"ماما! اب میری برداشت اور صبر نے جواب دے دیا ہے۔ تنگ آ گئی ہوں روز' روز کی بک بک سے۔ دل چاہتا ہے خرم ایڈیٹ کو دھکے مار کر اپنے گھر سے باہر نکال دوں۔ دفع ہو جائے یہاں سے۔" لیلیٰ نے غصے میں لال ہوتے ہوئے کہا۔

"وجہ تو بتاؤ میری جان.... اس سے ایسی کون سی غلطی سرزد ہو گئی ہے کہ نوبت دھکوں پر آ گئی ہے۔" ماما نے حیرت سے کہا۔

"ماما وہ ہر بات میں کبھی اپنی ماں کبھی بہن کو گھسیٹ لاتا ہے۔ ہماری اپنی تو کسی قسم کی گفتگو ہی نہیں ہوتی۔" وہ سختی سے بولی۔

"بیٹا غصہ اس حالت میں بہت نقصان دہ ہوتا ہے اور پھر زبان کی تلخی اور سوچ کی کڑواہٹ کا بچے پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ خوش خوش رہو' تاکہ بچہ بھی شگفتہ مزاج اور صحت مند ہو۔ اللہ کے ناموں کا ورد کیا کرو۔ اولاد نیک اور صالح ہو گی۔" وہ پیار سے اسے تھپتھپاتے ہوئے بولیں۔

"آپ کو جو ابھی آیا نہیں اس کی پروا ہے۔ میری کسی کو کوئی پرواہی نہیں رہی۔" وہ زور سے بولی۔

"بیٹا! ناشکری نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے۔ تم پر اس کے بے شمار کرم ہیں۔ جاتے ہی ماں کا رتبہ حاصل کرنے کے لیے تیار کھڑی ہو اور کیا چاہیے تمہیں؟ خرم تمہاری خوشی کی خاطر ماں کو اکیلے چھوڑ کر تمہارے قدموں میں آ بیٹھا ہے۔ خدا کا جتنا شکر ادا کرو کم ہے۔" ماں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ہمارے معاشرے کا مرد ایسا کرنے کا تصور بھی گناہ سمجھتا ہے۔ اس لیے اسے برا بھلا مت کہنا۔ ورنہ وہ تمہیں ساتھ لے جانے پر بضد ہو سکتا ہے اور ہمیں مجبورا" اس کی ماننی پڑے گی۔"

"میں کوئی موم کی گڑیا نہیں ہوں کہ وہ جب چاہے۔ اپنے مطابق ڈھال لے۔ انسانوں کی کیٹیگری میں آتی ہوں۔" وہ تلخی سے بولی۔

"اسے اپنے گھر میں آزاد اور پرسکون رکھو گی تو تب کہیں وہ اس ماحول میں اپنی بیوی اور سسرال کے ساتھ خوش و خرم بھی رہے گا اور خود کو کمتر بھی نہیں سمجھے گا۔ ورنہ اپنی ماں کے پاس چلا جائے گا۔ جس نے اپنی نسل کی بہتری کی خاطر بہت بڑی قربانی دے ڈالی ہے۔ ہم اس کے قدر دان ہونا پسند تو نہیں کریں گے۔ کم از کم نامناسب باتیں اور گھریلو چپقلش سے تو پرہیز کر سکتے ہیں۔"

"ماما وہ مجھ پر رعب جماتا ہے اور ہر بار گفتگو میں نصیحتیں ڈھونڈ نکالتا ہے۔ مجھے یہ سب ہر گز پسند نہیں۔ میں اس کی محتاج ہوں' نہ حاجت مند' پھر کیونکر اس سے دب کر زندگی گزار دوں وہ خود کو کیا سمجھتا ہے؟ ماما آپ نے رشتے کے انتخاب میں بہت بڑی غلطی کی ہے۔ وہ شوہر کے روپ میں سراسر اذیت ہے۔"

"اسے اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتی ہو تو صبر سے کام لینا پڑے گا۔ آرام کرو' خوش رہو' کھاؤ پیو اور ایک

تندرست بچہ جنم دے کر اس پر حکمرانی کرو۔ خرم بہت نرم مزاج اور وسیع نظر شوہر ہے۔ خوامخواہ اس کی باتوں پر اپ سیٹ ہو کر ہم سب کا جینا حرام کر دیتی ہو۔ اپنے ابا کو دیکھو۔ آج تک مجھے اونچی آواز سے بات نہیں کرنے دی اور ان کی خصلتوں کے بارے میں تمہیں کیا بتاؤں۔ خرم کے یہاں شفٹ ہونے کے اثرات کافی حد تک خوش آئند ہونے کے امکانات ہیں۔ تم حوصلہ رکھو' دیکھنا ایک دن وہ تمہارا نام جپتا پھرے گا۔ مگر اس کے لیے تمہیں خاموش رہنا ہو گا۔"

"نجانے کس کس بات کی آپ نے مجھ سے دشمنی کی ہے۔" وہ جل کر بولی۔

"خدا کا خوف کرو لیلیٰ۔۔۔ تمہیں خرم سے بہتر شوہر نہیں مل سکتا تھا۔ خدا کرے اس سے نبھا کر سکو۔ جس کی مجھے رتی بھر امید نہیں۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی سرزد ہو گئی کہ خرم جیسے بچے کی زندگی تباہ کر دی۔ سوچا تھا اپنے سسرال چلی جاؤ گی تو تمہاری عادت میں تبدیلیاں رونما ہوں گی۔ شوہر کے ساتھ ساتھ مل کر اپنا گھر بساؤ گی۔ اپنی فیملی مکمل کرنے میں فخر محسوس کرو گی۔ لیکن بدقسمتی سے تم میں عورتوں والی کوئی خو موجود ہی نہیں۔ شادی میں کیڑے نکالنا تمہارا مشغلہ تو تھا ہی۔ مگر ماں بننے پر اعتراض کیوں ہے؟ مجھے سمجھ نہیں آتی تمہاری سائیکی۔" وہ تذبذب کے عالم میں تھیں۔

"مجھے بچے پسند نہیں ہیں ماما۔ تو پھر ماں بننے پر خوشی کیسی؟ زندگی سہل اور آرام دہ تھی۔ شادی نے اور اب اس پریگننسی نے ستیاناس کر کے رکھ دی ہے۔ آگے بچہ آنے پر نجانے کیسی آزمائش میں گرفتار ہونے والی ہوں۔" وہ زہر آلود لہجے میں بولی۔

"میں یہ بچہ پیدا کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ خرم تو سراسر پاگل ہے۔"

"خدا کے لیے کہیں غلط حرکت نہ کر بیٹھنا۔ اپنی بھی جان گنواؤ گی اور اس معصوم کی قاتل بن کر باری تعالیٰ کا سامنا کیسے کرو گی۔" وہ پریشان ہو گئیں۔

"آپ کے اس دقیانوسی پن کا میرے پاس کوئی علاج نہیں۔" لیلیٰ نے تلخی سے کہا اور پرس اٹھا کر باہر نکلتے ہوئے بولی۔

"میں اپنی دوست کے ہاں جا رہی ہوں۔ آج رات اسی کے ساتھ ہوں گی۔"

"بیٹا خرم سے پوچھ تو لو۔" ماں فکرمندی سے بولیں۔

"وہ آج اپنی ماں کے چرنوں میں رات گزارنے جا رہا ہے۔ اس لیے مجھے اسے بتانے یا اجازت نامے کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی اور نہ ہی اس سے چھپانا ضروری سمجھتی ہوں۔ اگر اس کا فون آگیا تو بتا بھی دوں گی۔" وہ غصے میں بولی اور باہر نکل گئی اور ماں سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔



"شیریں۔۔۔ میں یہ مسٹری آج تک معلوم نہیں کر سکی کہ تم "آنا" فانا" میرے گھر سے غائب کیوں ہو گئیں۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی انجانے میں سرزد ہو گئی ہے تو کیا مجھے معاف نہیں کرو گی۔" وہ آج اس کے اپارٹمنٹ میں آئی تھی۔

"کنول ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تمہارا احسان زندگی بھر نہ بھولوں گی۔ اس ملک میں تین افراد کو ایک ماہ تک اتنی خاطر و مدارات سے پاس رکھنا اور پھر میری جاب بچوں کے ایڈمیشن تک تمام ذمہ داری بخوشی قبول کرنا آسان کام نہیں۔ میں تمہاری مہمان نوازی کو سیلوٹ کرتی ہوں۔ بس بیٹھے بیٹھے ہی شفٹنگ کا فیصلہ کر لیا۔ دیکھو میرا یہ فیصلہ اچھا تھا۔ آج اپنی روٹین میں سیٹ ہو گئی ہوں۔ ہارون کا ایڈریس بھی معلوم کر چکی ہوں۔ میرے جانے کے بعد تو اس کی لاٹری ہی نکل آئی۔ جس کمپنی میں جاب ملی۔ آج اسی کا مالک ہے۔ حدیقہ کے ساتھ اس کا رابطہ یا تعلق ہے یہ مجھے نہیں پتا۔ غالباً" میری آمد کی خبر اس کے گھر والوں نے اسے خوب مرچ مسالے لگا کر پہنچا تو دی ہو گی۔ اس نے مجھے ڈھونڈنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ مجھ سے تو ناراض سہی۔ کیا بچے بھی اسے یاد نہیں

آئے۔" وہ دکھی ہوگئی۔

"ممکن ہے اس نے کوشش کی ہو یا اسے تمہارے آنے کی خبر ہی نہ ہو۔" وہ تسلی دیتے ہوئے بولی۔

"اللہ کرے میری تمام غلط فہمیوں کی کوئی حقیقت ہی نہ ہو۔" وہ سوچتے ہوئے بولی۔

"ان شاء اللہ سب کچھ تمہارے حق میں بہت بہترین ہوگا۔ ماں جی کیسی ہیں؟" وہ نہایت ملائمت سے بولی۔

"کل ماں جی کا فون آیا تھا۔ لہجے سے مطمئن اور خوش تو بالکل نہیں لگ رہی تھیں۔ نجانے کیوں؟ کچھ بتایا نہیں، میں نے بھی کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید اپنے گھر کے مسائل مجھ سے شیئر نہ کرنا چاہتی ہوں۔" وہ لاپروائی سے بولی۔

"ایسے کیسے سوچ لیا تم نے۔ ماں اور بیٹی کا رشتہ بے تکلفی اور چاہتوں سے بھرپور ہوتا ہے۔" کنول نے ہنستے ہوئے کہا۔

"دراصل ہارون کی بے وفائی نے تمہیں ایک درس دیا کہ سگی ماں پر بھی بھروسا نہ کرو۔ تمہارے گرد و پیش کے تمام رشتے بے ثبات اور بے معنی ہوسکتے ہیں۔ مگر ماں کا رشتہ تو چٹانوں جیسا حوصلہ بخشتا ہے۔ مقابلہ کرنے اور سر اونچا کرکے جینے کی ترغیب دیتا ہے۔ ان کے بارے میں ایسا سوچنا چھوڑ دو۔ تمہارے نوے فیصد مسائل تو یہاں ہی حل ہوجائیں گے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ مگر کنول میری ایک بات پر غور ضرور کرنا۔ شوہر کی دھتکاری ہوئی بیٹی ماں کے لیے ناقابل برداشت بوجھ اور عذاب بن جاتی ہے۔" اس نے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"اس کرب سے جلد از جلد نکلنے کی کوشش کرو شیریں۔ یہاں ڈیپریشن کی بیماری اتنی عام کیوں ہے؟ تم خود ڈاکٹر ہو، بخوبی جانتی ہو اور بھائی سے اپنے دل کی ہر بات شیئر کیا کرو۔ کیونکہ غیروں سے قریبی دوستوں سے نہ تو تم اتنا کھل سکتی ہو۔ نہ ہی ان سے ہمدردی وصول کرسکتی ہو۔ اگر تنہا گھٹی میں اپنا مسئلہ ڈس کس کر بھی لوگی تو خود کو اتنا ناتواں محسوس کرنے لگو گی کہ جس کا علاج ہی ناممکن ہے۔ میری عقل تو یہی کہتی ہے۔" وہ نہایت پیار سے بولی۔

"ٹھیک کہہ رہی ہو۔" وہ ذرا سا مسکرائی۔

"ان رشتوں کی بحالی صبر و تحمل کی مرہون منت ہے۔ درگزر کرنے، دوسروں کی غلطیوں سے چشم پوشی کرنے میں ہی سکون ہے۔ میرے چار بھائی اور بھابھیاں ہیں، دو بہنیں ہیں۔ سب کو میں نے اپنے ہاتھ میں کیا ہوا ہے۔ میرا سسرال، میرے گن گاتا ہے۔ کیونکہ میں نے اپنے منہ میں زبان کی جگہ مصری کی ڈلی فٹ کر رکھی ہے۔ دوسروں کی زیادتی پر نہ کبھی شکوہ کرتی ہوں، نہ ہی ان سے بے جا توقعات رکھتی ہوں۔ اس لیے سب میرے ہیں۔" وہ فخر سے کہہ رہی تھی۔
شیریں کو اپنا آپ بہت ادنیٰ اور حقیر لگا۔ جس میں ایسی کوئی خوبی نام کو بھی موجود نہ تھی۔

"تم نے برا تو نہیں منالیا۔" وہ چونک کر بولی۔

"ہرگز نہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔ "کاش تم میرے حالات سے پہلے باخبر ہوتیں تو آج میں اس حال میں نہ ہوتی۔"

"ماضی ہمارے ہاتھ سے نکل کر ہمیں بے بس کردیتا ہے۔ حال تو ہمارا ہے۔ اس کے ایک ایک لمحے پر ہم غالب ہیں۔ اسے اپنی رضا کے مطابق ڈھالنے کی کوشش تو کرکے دیکھو۔ یہ دنیا تمہارے قدموں کے نیچے ہوگی۔ سب سے پہلا قدم ماں سے معافی مانگنے کا ہے۔ انہیں آج ہی فون کرو۔" اس کی باتوں سے اس کے بلند ہوتے حوصلے مزید بڑھتے جارہے تھے۔ وہ واپس چلی گئی۔ لیکن اس کی شیرینی سے بھرپور باتوں کو مثبت طریقے سے سوچنے پر شیریں مجبور ہوگئی تھی۔ دن بھر کی تھکن کے باوجود نیند اس سے کوسوں دور تھی۔ بیتے ہوئے وقت کا ایک ایک پل فلم کی مانند ذہن کے پروجیکٹر پر چل رہا تھا۔ ہارون جس سے اس نے ٹوٹ کر پیار کیا تھا اور جواباً ہارون نے کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ فقط اس کی بے روزگاری اک بہت بڑا معمہ بن گئی تھی۔ وہ اس کی نظروں سے گرتا چلا گیا تھا۔ بھائی کا اس سے لگاؤ اور الفت کی مثال ملنی مشکل تھی۔

سسرال ہمیشہ سے اس کی زندگی سے بہت دور رہا اور وہ ماں کی آنکھ کا نور اور دل کا سرور تھی۔ رشتوں کو فار گرانٹڈ لینے والی اس کی اپنی ہستی تھی۔ وہ اس نتیجے پر پہنچ کر بے کل ہو گئی تھی۔ فوراً" اماں کو فون کیا۔ ماں اس کی آواز سن کر خوشی کے مارے رو پڑیں۔

"شیریں میری جان تم ابھی تک سوئی کیوں نہیں۔ سب خیریت تو ہے۔" اس نے آنسو پیتے ہوئے جواب دیا۔

"جی ماں جی خیریت تو ہے۔ بس مصروف تھی اس لیے نہیں سوئی۔"

"بچے کیسے ہیں؟ آج ماں کی یاد کیسے آ گئی بولو۔" لہجہ حیران کن تھا۔

"کل آپ کے لب و لہجے میں انتہا کی اداسی تھی۔ خرم تو ٹھیک ہے نا۔" وہ نہایت پیار سے بولی تو ماں کی سسکیاں بلند ہوتی گئیں اور اپنی تنہائی کی داستان گوش گزار دی۔ وہ ہمت کر کے بولی۔

"ماں جی آپ میرے پاس آ جائیں۔ مجھے اور بچوں کو آپ کی اشد ضرورت ہے۔ خرم کی خوشی ہمیں عزیز ہے۔ اگر وہ اپنی نئی بیوی کے ساتھ رہنے میں قباحت محسوس نہیں کر رہا تو بہت اچھی خبر ہے۔" وہ تحمل سے بولی۔

"اس کا گھر آباد ہو جائے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا خوشی ہو گی۔ بلکہ بہتر ہو تا کہ حدیقہ سے رابطہ کرتا۔ اسے واپس لے آتا۔"

"تمہارے پاس آنا تو بہت مشکل ہے۔ ایک تو سفر بہت طویل ہے۔ دوسرا وہ ملک جوانوں کے کام کا ہے۔ ہم جیسے بوڑھوں کے لیے بے کار اور تکلیف دہ ہے۔ تم اپنی سناؤ۔ آج تو تم نے مجھے نہال کر دیا ہے۔ اب میں تنہا نہیں ہوں۔" وہ موضوع بدلتے ہوئے بولیں۔

"میں اور بچے خیریت سے ہیں۔ بس جاب ایڈیشن اور گھر کی سیٹنگ میں اتنی مصروف رہی کہ آپ کو فون نہ کر سکی۔ معافی کی خواست گار ہوں۔" لہجہ اتنا نرم تھا کہ ماں چونک کر بولی۔

"بیٹا... تم ٹھیک تو ہو۔ مجھے یقین نہیں آ رہا کہ یہ تم بول رہی ہو۔"

"ماں جی یہ مسئلہ مجھے بھی درپیش ہے۔ میں بھی خود کو پہچاننے میں مشکل کا سامنا کر رہی ہوں۔ ہم دونوں ہی یقین کر لیتے ہیں کہ یہ میں شیریں ہی ہوں۔" وہ شگفتہ لہجے میں بولی۔

"جیتی رہو میری بچی۔ تمہاری واپسی ہماری زندگی میں خوشیاں بھر دے گی۔ تم خرم سے بھی بات کر لینا۔ وہ کافی مضطرب ہے۔ اس بار جو بیوی اسے ملی ہے۔ عذاب اور سزا کے سوا کچھ نہیں۔ نباہ تو ناممکن ہی لگ رہا ہے۔" وہ دکھی لہجے میں بولیں۔

"ایسے اخلاقیات سے گرے ہوئے لوگوں میں آپ کیسے پھنس گئی ہیں۔ ذرا نرمی سے ہی اس مسئلے کا تدارک کیجیے گا۔ جلد بازی اور بے صبری ایک مسئلے کو تو حل کر دیتی ہے مگر سیکڑوں مسائل کو جنم دے کر زندگی حرام کر دیتی ہے۔" وہ نہایت نرمی سے بولی۔

"میری بچی اتنی سمجھ دار ہو گئی ہے۔" ماں سچ مچ مسرت و انبساط سے جھوم اٹھیں۔

"اپنی زندگی جینے سے ہی دانشمندی اور دور اندیشی کا سبق ملتا ہے۔ اب میں مطمئن ہوں۔ بیتے ہوئے ماضی کو گرفت میں کر نہیں سکتی۔ جو ہوا اسے بھول کر حال کو سنوارنے کی تگ و دو میں ہوں۔ آپ میرے لیے بہت فکرمند رہتی ہیں۔ اب اطمینان کا سانس لیں اور مجھے ان گنت دعائیں دیں۔" وہ تسلی سے بولی۔

"ضد اکڑ اور غرور انسان کے مقدر کو جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔ کیونکہ "میں" تو اللہ تعالیٰ کو قطعاً" پسند نہیں۔ ماں جی میں نے اپنے وجود کی نس نس میں بسنے والی "میں" کا قتل کر دیا ہے۔"

"خوش رہو بیٹا۔" وہ مسکرا کے بولیں اور فون بند ہو گیا۔ اس نے مسکرا کر موبائل ایک طرف رکھ دیا۔ کس قدر سکون ملا تھا اسے اپنی ماں سے بات کر کے۔ وہ سوئے ہوئے بچوں کے درمیان لیٹ کر پھر سے ماضی کے ورق الٹنے لگی۔

آج انگلی اپنی طرف اٹھی ہوئی تھی، کیسے راز افشا ہو رہے تھے۔ وہ مارے ندامت کے کروٹیں بدل رہی

تھی۔ اس نے زندگی کے کتنے سال کس قدر لاحاصل اور بے مقصد گزار دیے۔ ہر ایک سے پیار اور اہمیت کی توقع رکھی۔ خود سے کسی کے لیے کچھ کرنے کی تکلیف ہی گوارا نہ کی۔ خود غرضی، خود پسندی، خود پذیرائی کی انتہا ہی تو تھی۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے بیٹھ گئی۔



"ہارون بھائی! اب کام میں دل نہیں لگتا۔ نماز خشوع و خضوع سے ادا کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ کھانے کا مزا بھی نہ جانے کہاں رخصت ہو گیا۔ نہ گھومنے پھرنے ـــــ میں دلچسپی رہی ہے۔ آج کس قدر خوش گوار موسم ہے۔ سب کہہ رہے ہیں، لیکن مجھے اداسی اور مایوسی کی بو آتی ہے فضا میں۔ میں ہمت اور حوصلے سے اپنے حالات سے مقابلہ کر رہی تھی۔ مگر خرم کی شادی کی خبر نے توڑ ڈالا ہے۔" اس کے لہجے میں بے پناہ افسردگی تھی۔

"تم ڈیپریشن کی جانب جا رہی ہو حدیقہ، خود کو سنبھالو۔ میری ماما نے بتایا ہے خرم باپ بننے والا ہے اور بیوی کے گھر شفٹ ہو گیا ہے۔" وہ نارمل لہجے میں بولا۔

"ماں جی نے اجازت کیسے دے دی۔ بیوی کے گھر شفٹ ہونے کی وہ تو خاصی پوزیسو عورت ہیں۔"

"بہت بڑے باپ کی بیٹی ہے وہ۔ ویسے خرم نے ہاتھ خوب مارا ہے۔ اب تو اس کے وارے نیارے ہی تو ہو جائیں گے۔ اس کے دیرینہ خواب پورے ہوتے نظر آرہے ہیں۔ تم خوامخواہ اس کے انتظار میں بیٹھی ہو، اپنی ماں کی طرح۔ بھولے بھٹکے مسافر کبھی واپس نہیں لوٹا کرتے۔ اسے بھول جاؤ۔" اس کے لہجے میں حسد کی جھلک تھی۔

"ہارون کیا یہ ممکن نہیں کہ میں کمپنی سے اپنا شیئر نکال کر پاکستان واپس چلی جاؤں۔ شاید ماں کو میری بے گناہی پر یقین آجائے اور دن بھر کڑھتے رہنے سے بھی نجات پا جاؤں۔"

"کیسی فضول اور ناقابل معافی سوچ ہے تمہاری۔ میں اکیلے یہ کمپنی کیسے چلا سکتا ہوں۔ نہ اتنا پیسہ ہے، نہ ہی ہمت۔" وہ ایک دم گھبرا گیا۔

"میں بے زار ہو گئی ہوں۔" وہ سخت لہجے میں بولی۔ اپنا بیگ اٹھایا اور آفس سے باہر نکل کر گاڑی میں جا بیٹھی اور اپنے الجھے ہوئے سانس کو درست کرتے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

اگلے دن حدیقہ آفس نہ جا سکی۔ دن بھر اپارٹمنٹ کی بالکنی میں بیٹھی سوچوں کی ادھیڑبن میں مگن رہی۔ خرم کا اس سے رویہ اور سلوک اور دوسری بیوی کے اشاروں پر ناچنے کی رپورٹ نے اسے بے کل ہی تو کر دیا تھا۔ خرم کے خیال اور یاد کو ذہن سے کھرچ کر نکالنے کی خواہش نے پہلی بار جنم لیا۔

اسی تذبذب کے عالم میں وہ بالکنی میں بیٹھی شام کے دھندلکوں نے احساس دلایا کہ دن اختتام پذیر ہے۔ یک دم ہارون کی آواز پر چونک کر ایسے اچھلی جیسے بچھو نے کاٹ لیا ہو۔

"خیریت تو ہے۔ آج تم آفس بھی نہیں آئیں۔ کم از کم بیس بار فون کر چکا ہوں۔ ہمیشہ کی طرح تمہارا موبائل کمرے میں تکیے کے نیچے آرام فرما رہا ہو گا۔ پڑھے لکھے جاہلوں کے ساتھ گزارا کرنا کس قدر مشکل ہے۔ وہ ناراضی سے بولا۔

"باہر ٹھنڈ ہو رہی ہے۔ اندر چلو، بیمار پڑ جاؤ گی۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر آگیا۔

"تم ٹی وی آن کرو۔ میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتا ہوں۔ کس پاگل سے پالا پڑ گیا ہے۔" وہ بڑبڑایا۔ جسے پروا ہے نہ کوئی فکر و غم۔ اس کے لیے مرنے کو ہر دم تیار اور چاق و چوبند۔"

"آپ تشریف رکھیں۔ میں چائے بناتی ہوں۔" کہہ کر وہ کچن کی طرف بڑھ گئی، وہ بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔

"لگتا ہے چولہے برسوں سے ٹھنڈے پڑے ہیں۔ آج تم نے کھانا نہیں کھایا۔ چائے کا بھی ہوش نہیں رہا ہو گا۔ جی بھر کر غصہ کھایا ہو گا۔ نفرت کے انگاروں سے اپنی خاطر تواضع کی ہو گی۔" وہ غصے سے بولا۔

"اب مجھے اپنے سائے سے بھی خوف آتا ہے ہارون بھائی۔" وہ روہانسی ہو گئی۔
"خوف اور خفگی کی دنیا سے باہر نکل کر دیکھو خوشیاں تمہاری منتظر ہیں۔" وہ ملائمت سے بولا۔
"اس وقت ڈنر کا ٹائم ہے۔ چائے وائے چھوڑو۔ چلو باہر چلتے ہیں' اچھا سا کھانا کھانے۔ آج تمام دن کڑھنے اور خود سے جنگ وجدل کرنے کا تمہیں کچھ تو صلہ ملنا چاہیے۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ' چلو شاباش جلدی۔" ذرا سا مسکرائی۔
"تھینکس بے بی۔" وہ خوش ہو گیا۔



"کنول۔۔۔ مجھے کرسمس کی چھٹیاں پاکستانی مسلم ہونے کی وجہ سے نہیں مل رہیں۔ ان چھٹیوں کا مجھے کب سے انتظار تھا۔ بچوں کی بھی باپ سے ملنے کی چاہ میں مسلسل اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ اب انہیں کیا جواب دوں گی؟ وہ تو پوری تیاری کیے بیٹھے ہیں۔ بتاؤ اب کیا' کیا جائے۔" شیریں نے کنول کو تمام صورت حال سے باخبر کیا۔
"میرے ساتھ تو ایسا ہرگز نہیں۔ اس میں پاکستانی مسلم ہونے کا کوئی دخل نہیں ہونا چاہیے۔" کنول نے حیرت سے کہا۔
"مجھے لگتا ہے' اس اسپتال کی جاب چھوڑنی پڑے گی۔ کیونکہ نئی ایڈمنسٹریشن کی پالیسی ناقابل قبول ہے۔ نجانے یہ سرپھرا ڈاکٹر اس اسپتال میں کہاں سے آگیا ہے۔ تھرتھلی مچا دی ہے اس نے۔" وہ سخت برہم ہو رہی تھی۔ "اتنا سخت مزاج انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ ایک منٹ بھی لیٹ پہنچو تو طلب کرلیا جاتا ہے۔"
"اس کا حدود اربع تو معلوم کرو۔ پھر جاب چھوڑنے کی سوچنا' تم جانتی ہو آج کل ہر تیسرا بندہ جاب لیس ہے۔" کنول نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔
"کسی کے بارے میں معلومات حاصل کرنا کون سا مشکل ہے۔ اتنا خفیہ انسان ہے کہ کیا بتاؤں؟ لوگوں کی قیاس آرائیاں نجانے کہاں تک درست ہیں۔ انڈیا سے بی لانگ کرتا ہے۔ زندگی کا زیادہ ٹائم سعودی عرب میں گزار کر اب ہماری زندگی حرام کرنے کو پہنچ گیا ہے۔ مسلم لڑکی کو ننگے سر دیکھ کر سیخ پا ہو جاتا ہے۔"
"ففٹی پرسنٹ اسکینڈلز تیس پرسنٹ من گھڑت کہانیاں اور بیس پرسنٹ اصل حقیقت ہوتی ہے۔" کنول نے ہنستے ہوئے کہا۔" انسان کی ریپوٹیشن پہلے ٹریول کرتی ہوئی لوگوں تک پہنچ جاتی ہے۔ انفارمیشن 90 فیصد درست ہی ہوا کرتی ہے۔"
"مجھے تو بہت سڑا ہوا انسان لگا ہے۔"
"اس مسئلے کا حل ڈھونڈنا ضروری ہے' کیا' کیا جائے۔" کنول نے سوچتے ہوئے کہا۔
"فی الحال مجھے ڈیوٹی پر جانا پڑے گا۔ جب مجھے چھٹی ملے گی۔ بچوں کے اسکول کھل چکے ہوں گے اور وہ دونوں میرا ناک میں دم کردیں گے۔" وہ بے قراری سے بولی۔
"تم ہارون سے رابطہ کرنے کی کوشش تو کرو۔ پھر بچوں کی بات کروا دینا۔ ہوسکتا ہے وہ خود ملنے پہنچ جائے۔" کنول نے سوچتے ہوئے کہا۔
"مجھے چھٹیاں نہیں مل رہیں۔"
"ایک بار اپنی مجبوری اپنے باس کے گوش گزار کر تو دیکھو۔ ہوسکتا ہے کسی اور کی ڈیوٹی لگا کر تمہیں چھٹی دے ڈالے۔" کنول نے مشورہ دیا۔
"اپنے ذاتی مسائل کے بل بوتے پر چھٹیاں لینا مجھے پسند نہیں۔ باس بھی سراسر عذاب الٰہی ہے۔ مجھے ڈر ہے۔ میری مجبوری اور کمزوری کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش ہی نہ کرنے لگے۔ آخر ہے تو وہ دیسی مرد۔ جب عورت پرائے مردوں سے ہمدردیاں وصول کرنے لگے تو جلد یا بدیر اپنی عزت کی ہولی کھیلنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اسے ٹریپ کرنے کے تمام گر کارگر ثابت ہوتے ہیں اپنائیت ولگاوٹ اور پیار و محبت پر بھروسا کرتے ہوئے اسے بے بس ولاچار بنا دیتے ہیں۔ میں اس قسم کے کسی عذاب میں پھنسنا نہیں چاہتی۔ پہلے ہی زندگی دکھوں اور محرومیوں میں گھر چکی

ہے۔ مزید اسے الجھانے کی ہمت نہیں۔ بس جو بھی کرنا چاہتی ہوں' ان بے گناہ معصوموں کے لیے کرنا چاہتی ہوں۔" وہ بہت دکھی لہجے میں بول رہی تھی۔

"میری بات مانو' اپنے باس سے ریکویسٹ تو کرو۔ ہو سکتا ہے تمہارا مسئلہ حل ہو جائے۔" کنول نے پھر سمجھانے کی کوشش کی۔

"اچھا کوشش کرتی ہوں۔"

"رات کو کھانے پر میری طرف آجانا۔ تمہاری ریلیکس سیشن کے لیے بہت ضروری ہے۔" کنول نے نہایت پیار سے کہا۔

"کنول میں نے تمہیں ہزار بار بولا ہے کہ مجھے تم دونوں کے درمیان ہڈی بننا بہت معیوب لگتا ہے۔ میں سنگل ہوں۔ میری زیادہ تر فرینڈز بھی سنگل ہی ہیں۔ ان کے ساتھ وقت اچھا گزر رہا ہے۔ تم اپنی فیملی کو انجوائے کرو' تھینک یو ویری مچ۔" وہ نہ جانے کا بہانہ بناتے ہوئے بولی۔ "ویسے بھی تم سے ملاقات تقریباً" روزانہ ہی ہو جاتی ہے۔ گھر جانا مجھے قطعاً" ضروری نہیں لگتا۔"

"اچھا جیسے تمہاری مرضی اور جیسے تم خوش۔" کنول نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تم بہت بہترین دوست ہو۔ دراصل تم فطرتاً" بہت خوب ہو۔ اللہ تعالیٰ تمہیں ہمیشہ آباد رکھے۔" شیریں کے لہجے میں بے پناہ پیار تھا۔

"بہت خامیاں ہیں مجھ میں۔ اللہ تعالیٰ میرے ہر عیب کی پردہ داری رکھ کر مجھے عزت جیسی دولت سے ہمکنار رکھے۔ بے مثال تو تم بھی حد درجہ کی ہو۔"

"میں چلتی ہوں' چھٹی کی کوشش کرتی ہوں۔ دیکھتی ہوں ڈاکٹر فری بھی ہے یا نہیں۔" وہ ہمت کر کے اندر چلی گئی۔ اس کا مسئلہ ایسا گمبھیر تو تھا نہیں کہ حل نہ ہوتا۔ باس کو فون کر کے اسی وقت چھٹی مل گئی۔ شیریں اسے شکریہ کہہ کر اپنے آفس پہنچی تو کنول ابھی تک انتظار کر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بکھرا ہوا اطمینان دیکھ کر وہ مسکرا اٹھی۔ دونوں کی نگاہیں ملیں اور مسکراتے ہوئے دونوں پارکنگ کی جانب چل پڑیں۔



"تم چھٹی لے کر جا سکتی ہو۔ تمہارے کام کو بہت سراہنے لگے ہیں۔ ایڈمنسٹریشن کو تم جیسے لوگوں کی بے حد ضرورت ہے۔ ماں تنہا اور بیمار ہے تو ساتھ لے آؤ۔ یہاں کے اولڈ پیپلز ہوم میں ان کا دل بھی بہل جائے گا۔ تم ان کی نگہداشت بھی احسن طریقے سے کر سکو گی۔" وہ اپنی پر خلوص رائے دینے لگی۔ جو اسے پسند تو آگئی کہ ڈے کیئر ہوم میں وہ محفوظ ہاتھوں میں ہوں گی۔

"سننے میں آیا ہے کہ بہت ان سخت انسان ہیں۔ اپنی بات پر اڑ جائیں تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اپنا فیصلہ بدل دیں۔" حدیقہ نے خوف زدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"اونیسٹ اور ہارڈ ورکنگ لوگوں کی سب سے بڑی خامی یہی تو ہوتی ہے۔ ایک ماہ میں چھ اسپتال بدل چکے ہیں۔ ری سینٹلی ایک مشہور اسپتال کو چھوڑ کر آئے ہیں۔ آخر کار اس اسپتال کے اونر نے تمام اختیارات ان کے ہاتھ میں دے کر انہیں ہمیشہ کے لیے حاصل کر لیا ہے۔ انہوں نے آتے ہی کتنے ہی ڈنڈی مار ڈاکٹرز کی چھٹی کر دی ہے اور ان گنت نرسوں کو گھر بھیج دیا۔ انہوں نے اپنی پسند کے مطابق کمیٹی خود تشکیل دی ہے۔" وہ نہایت عقیدت سے بول رہی تھی۔

"اس اسپتال میں تم واحد نرس ہو۔ جس کا کام پاکستانی ہونے کے ناتے بھی انہیں بے حد پسند ہے۔" وہ رازداری سے بولی۔

"کیوں ناپسند ہیں پاکستانی؟ اب تو ان سے ملنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔ دیکھوں تو سہی کون ہیں۔" وہ خفگی سے بولی اور کسی بھی فارغ وقت میں ان سے ملنے کا سوچ کے وہ ہاسٹل چلی گئی۔

دوسرے دن اس کی درخواست پر ڈاکٹر صاحب نے اسے آفس بلا لیا۔ وہ غور سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے بولے۔ "پلیز ریلیکس۔ آرام سے بیٹھیے اور میرے چند سوالوں کا جواب دیجیے۔ ہاں تو

سسٹر جاب چھوڑنے کی وجہ جاننا چاہوں گا۔" سر نے سختی سے کہا۔ "کنٹریکٹ کا پیریڈ مکمل کرنا پڑے گا۔ یہ ہماری پالیسی ہے۔" لہجے کی درشتی سے وہ قدرے خائف سی ہو گئی۔

"مجبوری ہے سر۔" اس نے ڈرتے سہمتے ہوئے کہا۔

"پاکستان میں میری ماں بالکل تنہا ہیں۔ بیمار بھی رہتی ہیں۔ سوچتی ہوں واپس چلی جاؤں یا انہیں اپنے ساتھ یہاں ہی لے آؤں' ہو سکتا ہے وہ ماحول کی تبدیلی میں تندرست ہو جائیں۔ میں بھی مطمئن ہو کر جاب کر سکوں گی۔ ہم دونوں ماں' بیٹی ایک دوسرے کے بغیر نامکمل ہیں۔"

"اگر تمہاری ماں یہاں آنے پر رضامند نہ ہوئی..... تو پھر..." وہ سوالیہ نشان بن گئے۔

"تو ود ان ویک آپ کو انفارم کر دوں گی۔ پھر میرا یہاں رہنا بہت مشکل ہے؟" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"مجھے تمہاری کسی بات کا بھروسا نہیں۔ تم چھٹی کی خاطر کوئی بھی کہانی گھڑ سکتی ہو۔" وہ بے لحاظی سے بولے۔

"میں آپ کے پاس محض جاب کرتی ہوں۔ میں نے آپ کو اپنی ذات پر کیچڑ اچھالنے کا حق نہیں سونپا۔ میں ابھی اور اسی وقت ریزائن دیتی ہوں۔ رزق دینے والا وہ ہے' آپ نہیں۔" وہ تلملا کر بولی۔

"تم مجھے کردار سے پاکستانی معلوم نہیں ہوتیں ایشین تو نوکری کی خاطر اپنی انا اور غیرت کو بالائے طاق رکھے ڈورمیٹ بن کر زندگی گزار دیتے ہیں۔ تم کس دنیا کی باسی ہو۔" وہ حیرت سے بولے۔

"میری مزید انسلٹ کرنے سے پہلے یہ ضرور سوچ لیجیے کہ آپ بھی ایک ایشین ہی ..... ہیں۔"

سسٹر حدیقہ' پاکستانی قوم گر رہے ہوئے اخلاقیات کا دوسرا نام ہے۔ میں نے ایم بی بی ایس کنگ ایڈورڈ سے کیا تھا۔ میرے لیے ہاسٹل میں رہنا محال تھا۔ آخر میں نے ایک چھوٹا سا گھر لے کر دو جگری دوستوں کے ساتھ وہاں رہ کر اپنی تعلیم مکمل کی۔ ان دوستوں کی موجودگی میں خود کو بہت محفوظ کرتا تھا۔ مگر انہوں نے بھی مجھے خوب لوٹا۔ میں استعمال کیا گیا ہر لمحے اور ہر قدم پر..... اس کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب میں اپنوں میں واپس گیا۔ پھر میں نے جانے کا نام نہ لیا' پھر زندگی میں نے اس اصول پر گزار دی کہ پاکستانی کے سائے سے بھی بچ کر رہوں۔ ورنہ وہ اپنی میٹھی چپڑی باتوں میں پھانس کر تمہیں ایسا بے وقوف بنائیں گے کہ تم اپنے ہاتھوں خود کے قاتل بن جاؤ گے۔ پھر تمہارا ساتھ کوئی نہیں دے گا' بلکہ تمسخر اڑایا جائے گا۔" لہجے میں بے پناہ افسوس اور دکھ تھا۔

حدیقہ نظریں جھکائے تمام باتیں سن رہی تھی۔ ٹیبل پر رکھی نیم پلیٹ پر نظر پڑی تو چونک اٹھی۔ "ڈاکٹر آصف زیدی۔"

وہ ٹیبل پر رکھے ہوئے ہاتھوں کا بغور جائزہ لینے لگی۔" ان ہاتھوں نے میری ماں کا ہاتھ پکڑ کر زندگی کا آغاز کیا تھا۔ جب یہ ہاتھ چھوٹا تو آج تک نہ ماں سنبھلی' نہ میں۔ گل و گلزار اور خاردار رستے کی پہچان کرنا اپنے بس کا روگ نہ رہا۔ ہر بار راہ کا چناؤ غیر موزوں اور ہر موڑ ناکامیوں و مایوسیوں کی طرف مڑتا رہا۔ تحت الشعور میں فقط قدم اٹھانے اور بڑھانے کا درس پنہاں تھا۔ جب ہی زندگی الجھنوں کا گھروندا بن گئی ہے۔

"آپ نے پاکستان کو اپنی تعلیم کے لیے اہم کیوں سمجھا؟"

"بس جوانی میں ایسے غیر مناسب فیصلے نہ کیے جائیں تو جوان کیسے کہلائیں۔ وہ نشہ و سرور تو سوچنے سمجھنے کی تمام قوتوں کو سلب کر لیتا ہے اور دل پر جو گرہ لگتی ہے اس کی خبر ہی نہیں ہو پاتی۔" انہوں نے جواب دیا اور حدیقہ کے غصے میں لال بھبھو کا چہرے کو دیکھنے لگے۔

"سر اگر آپ کے پاکستانی نیشن کے بارے میں ایسے خیالات ہیں تو آئی ایم سوری' میں آپ کے ساتھ کام نہیں کر سکتی۔"

"آپ برا مان گئیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولے۔

"جی۔۔۔ اس میں کیا شک ہے آپ کو؟" وہ تلخی سے بولی۔

"آئی ایم ایکسٹریملی سوری۔ مقصد آپ کو ہرٹ کرنا ہرگز نہیں تھا۔ اچھا اصل بات کی طرف آتے ہیں۔ کتنے ہفتے چاہئیں چھٹی کے لیے۔" لہجہ بہت نرم تھا۔

"مجھے چھٹی نہیں چاہیے سر۔۔۔ میں آپ جیسے انسان کے ساتھ کام کرنا تو درکنار ایک لمحے کے لیے بھی رکنا گناہ عظیم سمجھتی ہوں۔ آپ خود کس مٹی سے تشکیل دیے گئے ہیں۔ ذرا اپنے گریبان میں جھانک کر اپنا موازنہ کرنے کی کوشش کیجیے۔ آپ کے سینے میں دل ہے' نہ ہی اس میں کسی قسم کے جذبات ہیں۔ آپ کی اس خامی نے نجانے کتنے لوگوں کی زندگیوں کو اجیرن کیا ہوگا۔ ذرا سوچیے گا۔ کتنی معصوم اور پاکیزہ ہستیوں کو جہنم رسید کیا ہوگا۔ آج میری اس بات پر جمع و تفریق کرکے کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش ضرور کیجیے گا۔" وہ غصے میں بولی اور باہر نکل گئی۔ وہ تذبذب کے عالم میں اسے جاتا ہوا دیکھنے لگے۔

"یہ کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی۔" وہ بڑبڑائے۔

"جو بھی تھی' بے مثال تھی۔"



"نجانے حدیقہ کہاں غائب ہوگئی ہے۔ نہ فون اٹھاتی ہے' نہ میسج کا جواب دیتی ہے۔ لگتا ہے وہ شیریں اور بچوں کو دیکھ کر بہت بڑے شاک میں مبتلا ہوگئی ہے۔" ہارون سر پکڑ کر بیٹھا سوچے جارہا تھا۔

"غیرت مند عورت ہے۔ شیریں کا سامنا کیونکر کرے گی۔ خود پر لگی ہوئی تہمت کی تصدیق کیونکر کرے گی۔" اس نے ایک لمبی آہ بھری اور بے دلی سے آفس جانے کی تیاری کرنے لگا۔ شیریں اسے ڈھونڈتی ہوئی آگئی تھی۔ ہارون سے معافی مانگ لی تھی۔ وہاں ہی اسے اسپتال میں جاب بھی مل گئی۔ بچے اسکول میں سیٹل ہوگئے۔ ہارون اپنی کمپنی حدیقہ کی غیر موجودگی میں بھی خوب چلا رہا تھا۔ مگر حدیقہ کی فکر اپنی جگہ تھی۔ رات کا کھانا شیریں اپنے ہاتھ سے بناتی اور ہارون شام کو آکر بچوں کے ساتھ کھانا تناول کرتا۔ شیریں کو اپنے کھوئے ہوئے حقوق حاصل ہوگئے تھے۔ اب شیریں اور بچے بھی محفوظ تھے اور ہارون بھی مطمئن اور پرسکون ہوگیا تھا۔ بچوں کو پاکر اس کی دیرینہ خواہش اور شب و روز کی محنت بر آئی تھی۔ اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ بچے اس کی نظروں کے سامنے تھے۔ شیریں اس ٹوٹے ہوئے رشتے کو دوبارہ بحال کرنے کے تمام قانون جان چکی تھی۔ دونوں کی ندامت عروج پر تھی۔ دونوں نے اپنی بری عادتوں کو بدل دیا تھا۔



اس نے باپ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اس بات کا یقین کرلیا تھا کہ ماں اس کے بارے میں جو تفصیل بتایا کرتی تھی وہ بالکل ویسا ہی تھا۔ آج وہ خدا کا شکر ادا کررہی تھی کہ اس سے ماں کے کردار پر شک کرنے کا گناہ سرزد نہ ہوا تھا۔ ڈاکٹر آصف زیدی ایک جیتا جاگتا انسان تھا۔ ماں کے ذہن کی جھوٹی تخلیق تھی نہ ہی فریب تھا۔ اس کا دل چاہا وہ زمانے کو چیخ چیخ کر بتا دے۔

"اس وقت مجھ بدنصیب کے گھر کون آسکتا ہے۔" صدیقہ نے بمشکل گرم کمبل کو ایک طرف کرتے ہوئے سوچا۔ مدتیں گزر گئیں اس وقت اس گھر میں بیل کی آواز نہ گونجی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی گیٹ تک پہنچیں۔ باہر ٹیکسی کھڑی تھی۔ انہوں نے گیٹ کا تالا کھولا تو سامنے حدیقہ کو پاکر ششدر رہ گئیں۔

"تم کیا کرنے آئی ہو یہاں۔ میں حدیقہ کو کب کا دفن کرچکی ہوں۔"

"میں اسی روح کا سایہ ہوں ماما۔ روحیں مرتی ہیں' نہ ہی دفن ہوتی ہیں۔ وہ اپنے پیاروں کا پیچھا کرتی ہوئی وقتاً" فوقتاً" ملنے ضرور آتی ہیں۔ آج آپ کی بیٹی کی روح اپنی ماں سے ملنے آئی ہے۔ تھوڑی دیر میں واپس چلی جائے گی۔"

حدیقہ نے ماں کے تیور دیکھ کر نہایت ملائمت سے کہا۔ اسے اپنی ماں کی ضد کا بخوبی اندازا تھا۔ وہ کسی صورت ماں کو طیش نہیں دلانا چاہتی تھی۔ ورنہ یہ دروازہ اس پر بند کرنا ممتا کے لیے مشکل نہ رہتا۔

وہ بیگ کھینچتی ہوئی گیٹ سے اندر آگئی۔ ماں خاموشی سے پلٹی اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی گھر کے اندر داخل ہوگئی۔ وہ بھی سر جھکائے ساتھ چلتی ہوئی اندر چلی گئی۔

"یہاں رات گزار سکتی ہو۔ صبح ہوتے ہی یہاں سے نکل جانا۔ میں ایسی بیٹی کی ماں نہیں ہو سکتی۔ آج کے بعد اپنی شکل بھی نہ دکھانا مجھے۔"

انہوں نے زہریلے لہجے میں کہا اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ حدیقہ خاموش کمرے کی طرف ہولی۔ وہ ماں کے مزاج کو مد نظر رکھتے ہوئے خاموشی پر اکتفا کر گئی۔

کمرے میں اس کی بچپن کی ہر چیز موجود تھی۔ اسے یوں لگا جیسے اس کمرے میں ابھی تک اس کی خوشبو رچی بسی ہے۔ ڈریسنگ ٹیبل پر اس کا استعمال شدہ میک اپ کا سامان، ہیر برش، ہیر بینڈ، ہیر ڈرائر سب کچھ موجود تھا۔ الماری میں اس کے پرانے کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ شو ریک میں جوتے۔ باتھ روم میں اس کے استعمال شدہ تولیے۔ استعمال شدہ صابن، شیمپو، ٹوتھ پیسٹ اور برش موجود تھے۔

ممتا کا یہ روپ حدیقہ کے بے اولاد ہونے کے باوجود ماں کا پیار و محبت اور انتظار کی غمازی کر رہا تھا۔ اس نے وضو کیا اور نماز پڑھی۔

وہ مسلسل سجدے میں گری بڑبڑاتے ہوئے روئے جا رہی تھی۔ آج اسے یقین ہو چلا تھا کہ اس دنیا میں ماں کے علاوہ کوئی بھی ایسا رشتہ نہیں جو فراخدلی سے معاف کر دیتا ہو۔ اسی امید پر وہ ہمت کر کے سیدھی بیٹھ گئی۔ اس کے ذہن میں گزرے ہوئے وقت کا ایک ایک لمحہ گھوم گیا کہ اس کی ماں نے کن مشکلات میں اس کی پرورش کی تھی۔ اس نے دنیا کو پرکھ کر اسے سمجھایا تھا کہ اپنے جیسے لوگوں میں حدیقہ کا رشتہ طے کر کے عمر بھر کے لیے سرخروئی حاصل کر لے گی۔ مگر وہ ایک نہ مانی تھی۔ خرم کا اسٹیٹس اس کے دماغ پر ایسا سوار تھا کہ اترنے کا نام نہ لے رہا تھا۔ ماں کی کسی نصیحت کا اثر نہ ہوا اور آج وہ ایسی آگ کے شعلوں میں گھر گئی تھی کہ جس سے ماں کے علاوہ کوئی نجات نہیں دلا سکتا تھا۔

ماں نے ناراضی کے اظہار میں اسے اندر آنے سے روکا ہے، نہ ہی مار پھٹکار سے خوش آمدید کہا ہے۔ ماں ہے بھلا کب تک ناراض رہ سکتی ہے۔ اس نے خود کو تسلی دی اور اپنے پرانے بیڈ پر نیم دراز ہو کر سائیڈ ٹیبل کا دراز کھول کر اپنی پرانی چیزوں کو دیکھنے لگی۔ اس کے ہاتھ کی رکھی ہوئی تمام چیزیں موجود تھیں۔ ایک پرانی سی ڈائری ہاتھ لگ گئی۔ وہ اسے کھول کر پڑھنے لگی۔ یہ اس کی ماں کی ڈائری تھی جو اس نے آصف زیدی کی مدح سرائی میں لکھ ڈالی تھی۔ اسے حاصل کرنے کے بعد مسرتوں اور امنگوں کی چاشنی میں ڈوبے ہوئے الفاظ اور پھر اس کے اچانک چلے جانے کا دکھ اور آج تک کے انتظار کا ہر لمحہ اس میں مقید تھا۔ ماں کی سوچ کے مطابق حدیقہ آج جس اسٹیج پر تھی اسے موردِ الزام نہیں ٹھہرایا گیا تھا۔ بلکہ اس کے لیے رحم و ترس اور ہمدردی و لگاؤ کے چاروں طرف سے دروازے کھلے تھے۔ ہاں صدیقہ نے ہر پل خود کو مجرم تسلیم کیا تھا۔ کہیں سے بھی آصف زیدی پر الزام تراشی کا گمان نہ ہوا تھا۔ وہ والدین کی نافرمانی پر سزا ملنے پر پشیمان ہو کر ان کی بخشش اور اپنی معافی کی دعا مانگا کرتی تھیں۔ صبح تک اس نے ڈائری کا ہر لفظ پڑھ کر ماں کی وفا و چاہت کا بخوبی اندازا لگا لیا تھا۔ اس کی عظمت اور بڑائی کے روبرو اسے اپنی حیثیت تنکے سے بھی کمتر اور بے کار لگی۔ وہ اضطراری کیفیت میں ڈائری کو اپنے بیگ میں چھپا کر بستر پر لیٹ کر سوچتی رہی۔ تھکاوٹ کے باوجود نیند نے نہ آنے کی قسم ہی کھالی تھی۔ وہ کروٹیں بدلتی رہی۔ آنسو گرتے رہے۔

صبح صدیقہ نے گھر کا جائزہ لیا۔ اسے یوں لگا کہ جیسے اس گھر میں شگفتگی سے رعنائیوں نے بسیرا کر لیا ہے۔

دو بیڈ روم۔ ڈرائنگ روم اور ۔۔۔۔ ڈائننگ روم کا یہ گھر حدیقہ کی محنت سے کی ہوئی کمائی سے خرید اگیا تھا۔ حدیقہ نے اسے اپنا ذاتی گھر سمجھ کر خوب سجایا بھی تھا۔ آرام دہ بھی بنالیا تھا۔ مگر اب اس کی توجہ سے محروم تھا۔ لان میں خالی کیاریاں برآمدے میں جھلسے ہوئے پودے اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ اس گھر کے مکین موت کے انتظار میں ہیں۔ انہیں زندگی کی رونقوں اور لذتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔

صبح اٹھتے ہی حدیقہ نے اپنی ملازمہ کے ساتھ لگ کر گھر چمکا دیا۔ ساتھ والوں کے مالی سے لان کی گھاس کٹوائی اور کیاریوں میں موسمی پودوں کی پنیری لگوادی۔ گملے رنگوا کر برآمدے میں سیٹ کرالیے اور پھر ملازمہ کے ساتھ مل کر حدیقہ کی پسند کا کھانا پکانے لگیں۔ دل خوش تھا۔ مگر اظہار پر پابندی لگائے وہ کچن میں تیزی سے کام کر رہی تھیں۔ آج جسم میں انرجی سرائیت کرتی ہوئی ۔۔۔ بہت بھلی لگ رہی تھی۔



ڈاکٹر زیدی نے ٹیبل پر رکھی ہوئی میل کو دیکھنا شروع کیا۔ بھاری پیکٹ دیکھ کر انہوں نے تیزی سے لفافہ کھولا۔ پرانے دنوں اور بیتے ہوئے سالوں کی خستہ حال ڈائری جس پر حدیقہ آصف زیدی لکھا ہوا تھا' پڑھ کر وہ ٹھٹکے۔ یہ ڈائری عموماً" حدیقہ کے ہاتھ میں دیکھ کر آصف سوال کیا کرتے تھے۔ افسانہ لکھ رہی ہو کہ حقیقت۔ تو وہ مسکرا کر جواب دیا کرتی تھی۔ ڈائری میں حقیقت نامے لکھے جاتے ہیں زیدی صاحب' افسانے نہیں۔ اس کی کھنکتی شوخ آواز ان کے کانوں میں گونجنے لگی۔ انہوں نے سر جھٹک کر اپنی سوچ کے دھارے کو بدلنا چاہا۔ مگر تجسس و حیرت سر پر سوار تھی۔

"کون ہے یہ ڈائری مجھ تک پہنچانے والا ۔۔۔ اور حدیقہ کو میرے یہاں رہنے کی خبر کس نے کی ہے؟" وہ اسی عالم میں ڈائری لے کر آفس سے باہر چلے گئے۔

اور گاڑی کی جانب چل دیے۔ حدیقہ کا مجھ سے رشتہ پردہ داری میں استوار ہوا تھا ماسوائے چند لوگوں کے کسی کو اس کی خبر نہ تھی۔ مگر کس نے کھوج لگا کر مجھے اس رشتے کی یاددہانی کرانے کی کوشش کی ہے۔ وہ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے سوچے جارہے تھے۔

اپنے محل نما گھر کے سامنے لمحہ بھر کو رک کر بھاری قدموں سے چلتے ہوئے وسیع و عریض لان کو عبور کر کے مین ڈور کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ گھر میں خاموشی اور تنہائی کا جان لیوا احساس ہمیشہ کی طرح ان کے ساتھ تھا۔ وہ سیدھے اپنی لائبریری میں آگئے اور اپنی دنیا میں ایسا کھوئے کہ وقت کے گزر جانے کا احساس ہی نہ ہوا۔ شام کے سائے گہرے ہوتے گئے۔ لائبریری میں کھڑکیوں سے جھانکتی ہوئی روشنی سیاہی کا روپ دھارنے لگی تو وہ چونک اٹھے۔ حقیقت و سچائی پر مبنی اس کی وہ زندگی جسے وہ فراموش کر چکے ان کے سامنے اک کھلی کتاب کی طرح موجود تھی۔

حدیقہ نے گاؤں کا ذکر کیا نہ ہی اپنی دوسری شادی کے بارے میں کچھ لکھا ہے۔ اپنی جاب کا رونا۔ نہ جانے چاچا اور ماسی کون ہیں۔ حدیقہ ان کی بیٹی ہے۔ کچھ گڈمڈ ہے۔ الفاظ مٹے ہوئے ہیں۔ کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ انہوں نے پڑھنے کی کوشش کی۔ مگر آخری صفحے پھٹے ہوئے تھے۔ تحریر مٹی ہوئی تھی۔ ہر جگہ چاچا کی مہربانیوں اور ماسی کی خدمت کا تذکرہ تھا اور آصف کی ہر پل کی یاد اور انتظار تھا۔

آج انہیں احساس ہو رہا تھا کہ انہوں نے جو بے انصافی اور زیادتی حدیقہ پر کی تھی۔ اس گناہ کا کفارہ انہوں نے بھی ادا کیا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں اس دنیا میں ہی جزاو سزا کا سبق سکھانے کا تہیہ کرلیا تھا۔ وہ لرز اٹھے تھے۔ انہیں حدیقہ کے ساتھ بیتے ہوئے ماہ و سال کا پیار اور لگاؤ تڑپانے لگا۔ وہاں سے واپس آنا اور حدیقہ کا رونا اور بلکنا فلم کی مانند آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔

بے دردی اور سنگدلی سے اسے اک اجنبی شہر کے انجانے لوگوں میں خالی ہاتھ چھوڑ کر لندن آجانا اور پھر خبر تک نہ لینا ظلم ہی تو تھا۔ پھر طویل وقفے کے بعد ثمینہ سے رابطہ اور اس کی باتوں پر یقین کرلینا نادانی اور

احمقانہ پن ہی تو تھا۔



"ماما جانی! میری التجائیں اور منتیں آپ کے سامنے بالکل بے معنی ہو کر رہ گئی ہیں۔ میں آپ کو ساتھ لے جانا چاہتی ہوں۔ یہاں آپ اکیلی وہاں میں تنہا۔ ماں بیٹی مل کر رہیں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم پہلے رہتی تھیں۔" وہ ماں کے قدموں میں بیٹھ کر خوشامدی لہجے میں بولی۔

"مجھے تمہاری شکل دیکھ کر خود پر غصہ آجاتا ہے۔ میں نے تمہیں جنم دے کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ تمہارے سسرال میں ہر ایک کی زبان پر میرے لیے منوں گالی ہر وقت گردش میں رہتی ہے۔ ان کا قصور نہیں۔ تم نے لوگوں کی پیش گوئیوں کو سچ کر دکھایا ہے۔" وہ قہر آلود لہجے میں بولیں "میں نے تمہیں اس گھر میں پناہ صرف اس لیے دی ہے کہ ورنہ تم مزید بھیک کر دکھاؤ گی۔ جب تک تم واپس نہیں چلی جاتیں۔ مجھے چین و سکون ملنے والا نہیں۔"

"ماما" کاش آپ نے مجھ سے پوچھ ہی لیا ہوتا کہ مجھ پر آپ کے بغیر کیا گزری؟ ماما آپ کی بیٹی لاوارث ہونے کی سند ہاتھ میں لیے پھرتی رہی۔ خرم نے خود کو میرا وارث کہا نہ سسرال نے اور نہ ہی باپ اور ماں نے۔ اس کا انجام کیا ہوا؟ سننا چاہتی ہیں تو بتاؤں۔" وہ سر جھکائے رونے لگی۔ مگر ماں پتھر کا بت بنی بیٹھی رہی۔

"مجھ سے استوار تمام رشتوں کی بے مہری' بے رخی اور لاپروائی نے نہ میرے پاس عزت چھوڑی نہ پیسہ۔ میں کتنی دفعہ اجڑی ہوں؟ آپ کو کچھ علم ہے۔ آپ فقط مجھے گناہگار کہہ کر مجھ سے کنارہ کشی اختیار نہیں کر سکتیں۔ آج میں آپ کو اپنی آپ بیتی سنا کر دم لوں گی۔ اگر پھر بھی مجھے مجرم کا خطاب دیا تو زہر کھا کر مر جاؤں گی آپ کے سامنے۔ مجھے نہیں جینا ماما۔ میں بے قصور ہوتے ہوئے بھی قصور وار ہوں۔ ایک بار میری زبانی میری داستان سن کر جو فیصلہ کریں گی۔ مجھے منظور ہو گا۔ ماما میں عدالت کے کٹہرے میں کھڑی ہوں۔ اپنی صفائی میں دلائل دینا میرا حق بنتا ہے۔ اور سن کر سزا تجویز کرنا یا درگزر کرنا آپ کے اختیارات میں ہے۔"

"تم اتنی بزدل بھی ہو۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ جاؤ میری آنکھوں سے دور ہو جاؤ۔ مجھے زندہ درگور کرنا چاہتی ہو۔"

"میں چلی جاؤں گی۔ مگر پہلے آپ کو میرے ماضی کے ہر لمحے سے باخبر ہونا پڑے گا۔ قرآن مجید لے آیئے میں اس اللہ کی مقدس کتاب پر ہاتھ رکھ کر قسم اٹھاتی ہوں کہ اپنی صفائی میں دلائل دینا میرا حق بنتا ہے اور سن کر سزا تجویز کرنا یا درگزر کرنا آپ کے اختیارات میں ہے۔"

"خبردار جو قرآن مجید کو درمیان میں لائیں۔ تم کیا جانو کبھی اسے پڑھنے کی کوشش کی ہے تم نے۔ اگر اس کو پڑھ کر سمجھنے کی محنت کی ہوتی تو آج تمہارا یہ حال نہ ہوتا۔" وہ غصے میں چیخ کر بولیں۔

"ماما! اگر آپ کی تربیت میں کھوٹ ہوتا تو بالکل ایسا ہی ہوتا جیسا آپ فرما رہی ہے۔ اس کی رفاقت نے مجھے پہاڑ کی مانند مضبوط رکھا۔ آج میں جس حال میں ہوں۔ اپنے نصیب کی دھتکاری ہوئی ہوں۔ جو بیٹیاں پیچھے سے کمزور ہوں۔ ان کے ساتھ معاشرہ یہی سلوک روا رکھتا ہے۔ آپ کی اپنی مثال سامنے ہے۔ میں نے آپ کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔ ماما میں بختوں والی کیسے ہو سکتی تھی؟" وہ ماں کے گھٹنوں پر سر رکھ کر رونے لگی اور بیتی ہوئی زندگی میں ظلم و تشدد' ناانصافی اور زیادتی کی آمیزش کو ماں کے گوش گزار دیا۔ ماں تڑپ اٹھی۔

"مجھے معاف کر دو بیٹی۔ کاش میں نے تم پر بھروسہ کر کے تمہاری ازدواجی زندگی میں رونما ہونے والے تمام حادثات کے بارے میں جان لیا ہوتا۔ میں آج تک تمہارے باپ کو نہ بھلا پائی اور نہ ہی اس کی آمد کے انتظار میں گلہ شکوہ کیا ہے۔ مگر آج میرے جسم کا رواں رواں زبان بن کر اسے بد دعائیں دینے لگا ہے۔

جس کی غیر موجودگی ' بے وفائی اور غیر ذمہ داری نے مجھے تو ذلیل و رسوا کیا ہی تھا۔ تم بھی اس ذلالت کے سائے سے نہ بچ سکیں ______ مجھے معاف کر دو میری بچی۔" حدیقہ ہاتھ جوڑے بیٹی سے التجائیہ انداز میں بولیں۔

"میں کس قدر نادان اور احمق ہوں کہ سر کے بال سفید ہو گئے۔ چہرے پر زمانہ گزرنے کے آثار ہویدا ہو گئے۔ مگر اپنے شوہر کی واپسی کے انتظار میں آج بھی پر امید ہوں۔ کیا معلوم؟ وہ کسی حادثے کا شکار ہو گئے ہوں یا کسی بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو گئے ہوں۔ یہ تو میں آج تک مان نہ سکی کہ وہ مجھے دل سے دھوکے باز اور خود غرض تصور کرتے تھے۔ جذباتی انسان تھے۔ لیکن اب تو خون بھی سرد پڑ گیا ہو گا۔ اب تک تو آ ہی جاتے۔ میں نے والدین کو ان کی خاطر چھوڑا تھا۔ کیا ابھی تک سمجھ نہیں پائے۔ میرا دل کہتا ہے وہ زندہ نہیں ہیں۔ ہاں دونوں صورتوں میں یہاں رکنا بے سود ہے۔" وہ الجھے ہوئے دل سے سوچتے ہوئے بولیں۔

"میں نے ایسا کیوں کیا حدیقہ؟ خود پر ظلم کیا اور تمہارے لیے اک گڑھا کھود دیا۔ جس سے تمہارا نکلنا مشکل ہو گیا ہے۔"

"ماما آپ پھر فینٹسی کی دنیا میں پہنچ گئی ہیں۔ حقیقت کچھ اور بھی تو ہو سکتی ہے۔ خرم اک انسان تھا تو کیا ڈاکٹر آصف زیدی فرشتہ تھے۔ ہر گز نہیں ماما۔ انہیں اس ملک سے اور یہاں کے باشندوں سے نہ لگاؤ تھا نہ ہی انس تھا۔ وہ انڈین اور آپ پاکستانی۔ آپ کی یکجائی عارضی اور وقتی تو ہو سکتی تھی۔ لیکن ابدی اور ہمیشگی جدائی میں ہی پوشیدہ تھی۔ انہوں نے آپ سے ہی بے وفائی اور دغابازی نہیں کی۔ آپ کے پاکستانی ہونے کے ناتے آپ سے بے پناہ نفرت کی ہے جب کہ آپ کہا کرتی تھیں کہ انہیں پاکستان بہت پسند تھا۔ لیکن وہ سارا ڈراما تھا ان کا وہ جذبہ وقتی تھا۔ وہ لگاؤ سچا نہ تھا۔ ورنہ یوں نہ چھوڑ جاتے۔ ایک بار تو مڑ کر دیکھ لیتے کہ آپ کس حال میں ہیں۔" وہ سنجیدہ تھی۔

"تم ٹھیک ہی کہتی ہو......" وہ تذبذب سے بولیں۔

"شاید مجھے چھوڑنے کا بہانہ ہی تھا۔ پھر بھی دل نہیں مانتا۔ وہ تو مجھ پر مرتے تھے۔"

"تو پھر بقیہ زندگی بھی اسی خوشی میں گزار لیں۔" وہ چڑ سی گئی۔

"میں خوش فہمی کی دنیا سے باہر نکل آئی ہوں تمہاری زندگی کی ان گنت ناکامیوں اور محرومیوں کا سن کر۔ اس لیے تو سوچنے پر مجبور ہو گئی ہوں کہ شہر کی بے رحم و بے مروت زندگی سے دور بہت دور اپنے گاؤں چلی جاؤں۔ جہاں کی زندگی سادہ اور سہل ہے۔ بناوٹ ہے نہ مقابلہ بازی میں سبقت لے جانے کی امنگ میں دوسروں کی حق تلفی ہے۔ جہاں غلطیوں کو در گزر کر کے دل کو فراخ اور سوچ کو مثبت کر لیا جاتا ہے۔ جہاں گرے ہوئے کو سہارا دے کر کھڑا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور کھڑا کرنے کے بعد قدم اٹھانے پر مجبور ہو کر دیا جاتا ہے اور زندگی پھر سے چل نکلتی ہے۔ دل تو چاہ رہا ہے کہ اسی جنت کو اپنی پناہ گاہ بنا لیں۔" لہجے میں اک تسلی بخش رمق نمایاں تھی۔

"ماما! سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا اشد ضروری ہے۔ کہیں یہ کہاوت ہم پر صادر نہ آجائے کہ دور کے ڈھول سہانے۔ آپشن اوپن رکھنے میں کوئی قباحت نہیں۔ ہم وہاں جس کی تلاش میں جانا چاہ رہی ہیں۔ اگر لایعنی اور لا حاصل ہوا تو واپسی کے تمام رستے کھلے ہونے چاہئیں۔ یہاں ہم اپنی زندگی کی ذمہ دار خود ہیں۔ وہاں ہماری ہر سانس پر گاؤں کے ہر فرد کا اختیار ہو گا۔ ہمیں ان کے اشاروں اور فیصلوں پر سرنگوں ہونا پڑے گا۔" وہ ماں کے ساتھ نہایت مودبانہ انداز سے بات کر رہی تھی۔

"اب اپنی بقیہ زندگی کا فیصلہ ایک دوسرے کے مشورے اور سوچ بچار سے کریں گے تو یہ گھنے اور سیاہ بادل چھٹ جائیں گے۔" ماں کو پا کر اس کے حوصلے بلند ہو چکے تھے۔

"ان شاء اللہ۔" ماں نے خوشی سے مغلوب ہو کر بلند آواز میں کہا اور اسے گلے لگا لیا۔



"سر میں اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں قطعاً" نہیں جانتی۔ وہ حد درجہ کم گو لڑکی تھی۔ عموماً" اپنی ماں کا ذکر بڑی ہی عقیدت اور احترام سے کیا کرتی تھی۔ ماں کی بیماری اور تنہائی کی وجہ سے بہت پریشان رہتی تھی۔ اس لیے تو یہاں سے چلی گئی۔" حدیقہ کی کولیگ نے آصف زیدی کو سوال کا جواب دیا۔

"واپسی کے بارے میں کچھ بتا کر گئی ہے کہ نہیں؟" وہ تجسس سے بولے۔

"کہہ رہی تھی کہ اگر ماں یہاں آنے پر رضامند ہو گئیں تو اس صورت میں واپسی کے امکان ہیں۔ لیکن وہ جاب کسی اور اسپتال میں کرنے کی خواہشمند نظر آ رہی تھی۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"کبھی اس نے اپنی شادی اور بچوں وغیرہ کا ذکر کیا ہو۔" انہوں نے کریدا۔

"شادی شدہ تو تھی۔ میاں ڈاکٹر ہے۔ یہاں جاب کرتا تھا۔ مگر کسی مجبوری کے تحت واپس چلا گیا تھا۔ وہ یہاں ہی رہ گئی۔ کیوں رہ گئی؟ آئی ڈونٹ نو۔ نہ اس نے بتایا نہ ہی میں نے پوچھنا مناسب سمجھا۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتی۔ میں نے کئی بار اسے آنسو بہاتے دیکھا۔

نجانے کس غم کی شکار تھی کبھی کھل کر ہنسی نہ ہی گپ شپ کی شوقین تھی۔ صرف اپنے کام سے مطلب رکھا۔ نہ کسی کے اچھے میں نہ برے میں۔ سر آپ سے پوچھ سکتی ہوں کہ آپ اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں کیوں جاننا چاہتے ہیں؟" وہ حیرت و اشتیاق میں بولی۔

"دراصل مجھے کام سے انصاف کرنے والے لوگ بے حد پسند ہیں۔ اس کے چلے جانے کا دکھ ہوا ہے۔ خیر کئی لوگ جاب پر آئے اور چلے گئے۔ اس کے رخصت ہونے کو بھی اسی سوچ کے ساتھ ختم کرنا ہی بہتر ہے۔ لڑکی بہت کھری تھی۔ امپریس ہو گیا ہوں آپ جا سکتی ہیں۔ تھینک یو ویری مچ انفارمیشن دینے کا۔"

"ویلکم سر۔" وہ اتنا کہہ کر آفس سے باہر نکل گئی۔

"نجانے کون تھی؟ پاکستان سے بھیجی گئی یہ ڈائری وہ کیونکر مجھے بھیجے گی میرا وہم ہے سب۔" انہوں نے سوچ کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کی۔ مگر بے سود ڈائری کے صفحات کو بے مقصد ہی الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ جسے وہ ابھی بھی پڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ذہنی ردو کد میں معاملے کو سمجھ ہی نہ سکا تھا حدیقہ کے پیار و محبت اور اس کے انجام کی تفصیل کو بار بار پڑھا دل پر قیامت کے گزر جانے کی تحریر سے آگ کے شعلے بھڑکتے معلوم ہوتے تھے۔

مجھے حدیقہ کی زندگی کو جہنم رسید کرنے کا قطعاً" حق نہیں پہنچتا تھا حدیقہ کی ذمہ داری میرا فرض تھا۔ میں نے اپنی جوانی کے نشے میں اپنی سوچ پر گرہ لگا کر ایک زندگی کو تباہ کر دیا ہے۔ میں ظالم ہوں۔ اللہ تعالیٰ مجھے کیسے معاف کر سکتا ہے۔ میں بے انصاف تھا تو پیدا کرنے والے نے تو انصاف برتا۔ مجھ پر اپنی ہر نعمت و فضل و کرم اور رحمتوں کے دروازے بند کر دیے نہ بیوی اپنی نکلی۔ نہ بچے میرے بنے۔ اس سے بڑی سزا اور کون سی ہو سکتی تھی کہ میری نسل ہی بے دین نکلی۔"

وہ کمرے میں ٹہلتے رہے اور آنسو سیلاب کی مانند ان کے گریبان کو بھگوتے رہے۔ جب دل ذرا ہلکا ہوا تو ذہن نے کام کرنا شروع کیا۔ رات بھر کی سوچ ایک نقطے پر منجمد ہو گئی اور اس کے سامنے سر جھکالیا۔ ہو نہ ہو یہ سسٹر ہادی ہے۔ اس کا حدیقہ سے کیا رشتہ ہے؟ جس نے ڈائری مجھے بھیج کر ماضی کی یادوں کو تازہ کرنے کی کوشش کی ہے۔



"شیریں مجھے تمہارے پیار اور وفا پر یقین اور اعتماد تو ہمیشہ سے تھا۔ تمہاری پاکیزگی اور شرافت پر حد درجے کا مان تھا۔ تم بخوبی جانتی ہو کہ بچے مجھے کس قدر عزیز ہیں۔ ان کی خاطر میں کچھ بھی کرنے کو ہر وقت تیار رہتا تھا۔ وہ گھر جس کو تم نے اپنی کاوش سے آباد کیا تھا۔ میرے جاب لیس ہونے پر تم نے اس گھر کی خوشحالی

میں رتی بھر فرق نہ آنے دیا۔ میں تمہارا قدر دان رہا ہوں۔ کبھی احسان فراموشی نہیں کی۔ ہمیشہ تمہاری عزت و تکریم کا خیال رکھا۔"

وہ اس کے سامنے کھانے کی ٹیبل پر بیٹھا پُر ستائش لہجے میں بول رہا تھا۔ وہ بے حد سنجیدہ تھی۔

"پھر اچانک کیوں چلے گئے تھے۔"

"اس کی وجوہات بے شمار تھیں۔ ایک ہوتی تو نوبت یہاں تک کیوں پہنچتی۔ انسان دوسروں کی ــــــ غلطیوں کو نظر انداز بھی کر سکتا ہے اور در گزر کرنے میں زیادہ مشکل بھی نہیں لگتی۔ تم جانتی ہو ہمارے درمیان غلط فہمیوں کا سمندر تھا۔ اس کا حل سوچنے کے بجائے میں نے جلد بازی سے کام لے کر گھر ہی چھوڑ دیا تھا" لہجے میں پچھتاوا تھا۔ شیریں نظریں جھکائے سن رہی تھی۔

"تمہاری سوگوار شکل دیکھ کر میں بہت پشیمان ہو رہا ہوں۔ اٹھو اچھا سا تیار ہو جاؤ۔ بچوں کے ساتھ کھانے کے لیے باہر چلتے ہیں۔" وہ پیار بھرے لہجے میں بولا۔

"دل نہیں چاہ رہا" دو موٹے آنسو اس کی آنکھوں سے نکلے اور اس کے رخسار بھگو گئے۔

"اب تم ہمیشہ رانی بن کر میرے دل پر حکمرانی کرو گی۔ مگر ایک شرط ہے کہ تم اپنے رول کو نبھانے میں کوتاہی نہیں برتو گی۔ میں اپنا رول پہچاننے سے نہیں بھاگوں گا۔ اب تمہارا شوہر کماتا ہے۔ تمہیں گھر کی چار دیواری میں ہر شے فراہم کرنے کی ہمت رکھتا ہے۔ مسکرا دو جان۔" لہجے میں خوشی تھی۔

"اگر آپ اجازت دیں تو جاب کر لوں۔ ہفتے کے تین دن کے لیے۔ اپنے پروفیشن سے ان ٹچ رہنا بھی تو بے حد ضروری ہے نا۔ یہ ایسی فیلڈ ہے۔ جس کی تعلیم دن بہ دن مشروط ہوتی چلی جاتی ہے۔ کبھی مکمل نہیں ہوتی۔" وہ نرم لہجے میں بولی۔

"اگر اس میں تمہاری خوشی ہے تو مجھے اعتراض کیوں ہو گا؟ اب تمہاری جاب ہماری ازدواجی زندگی پر برے اثرات نہیں چھوڑے گی۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"بیوی کمائے میاں کھائے۔ اس رول میں وہی کچھ ہوتا ہے جو ہمارے ساتھ ہوا تھا۔ اب ایسا کوئی اندیشہ نہیں۔ میری طرف سے ہفتے کے پانچ دن کام کرو۔ اپنی ڈگری کا زیاں کہاں کی عقلمندی ہے۔" وہ تشکر آمیز نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"ہارون آپ کا جواب نہیں یو آر گریٹ۔ میں ہی نا سمجھ نکلی۔"

"ایسے مت سوچو میری جان۔" وہ یہ کہہ کر کہیں دور سوچوں کی وادیوں میں بھٹکنے لگا۔

"کیا سوچ رہے ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"میرا دھیان حدیقہ کی طرف چلا جاتا ہے۔ وہ معصوم اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا کیوں بھگت رہی ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ خرم اور حدیقہ کا پیچ اپ کرا دیں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"نیکی اور پوچھ پوچھ۔" وہ سوچتے ہوئے بولی۔

"لیکن مجھے ڈر ہے حدیقہ رضامند نہیں ہو گی۔ کیونکہ خرم شادی بھی کر چکا ہے۔ آج کل میں باپ بھی بننے والا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خرم ہی انکار کر دے۔ حدیقہ سے صلح جوئی میں خرم مشکلات میں گھر سکتا ہے۔ کیونکہ اس کی بیوی بہت عجیب عورت ہے۔ ماں جی بتا رہی تھیں مینٹلی نارمل نہیں وہ اور سسرال تو ــــــ دولت نے اس خاندان کے ہر فرد کا دماغ ہی خراب کر دیا ہے اور آپ تو جانتے ہیں کہ خرم کمزور کے لیے اژدھا اور طاقتور کے سامنے بل میں چھپ جانے والے چوہے کی مانند ہے اسے حالات سے نبٹنا آتا ہے نہ ہی مقابلے کی ہمت ہے اس میں۔ بنیادی طور پر بزدل مرد ہے۔ کسی بھی رشتے کے ساتھ انصاف نہیں کر سکا۔" وہ تلخی سے بولی۔

"میں جانتا ہوں۔ وہ بچپن سے ہی ایسا ہے۔ پھر بھی کوئی مصلحت کا رستہ نکالو۔ ہمیشہ کی طرح مجھے آج بھی حدیقہ پر بے پناہ ترس اور رحم آتا ہے۔ اس بے چاری کا کہیں بھی کوئی قصور نظر نہیں آتا ہے نہ ہی غلطی۔" دکھ اس کے لہجے میں تھا۔

"ہارون! الجھی گتھیاں سلجھاتے ہوئے کہیں ہماری ازدواجی زندگی میں پھر سے گرہیں نہ پڑ جائیں۔ میں

کسی کے معاملات میں دخل اندازی کرنا چاہتی ہوں نہ ہی کسی قسم کا تعلق اور واسطہ رکھنا چاہتی ہوں۔ میں نے اپنی حماقتوں اور دوسروں پر بے جا توقعات قائم کرنے کا سبق اپنی ذات کو بے نشاں و بے وقعت کر کے سیکھا ہے۔"

"اگر تم اجازت دو تو میں خرم سے بات کر لیتا ہوں۔ کیونکہ میں یہ سوچ کر خوف سے لرز جاتا ہوں کہ بے بنیاد شک پر اس کا اور تمہارا گھر جہنم کا ایندھن بن گیا تھا۔ تمہارے گھر کی واپسی اور سلامتی میں حدیقہ برابر کی شریک ہونی چاہیے۔ ورنہ اس کا صبر اور خاموشی ہمیں بھسم کر دے گی۔ شیریں آخر اوپر والا ہماری نیت اور ارادوں کو پرکھ تو رہا ہے۔ میں آج دولت کی ریل پیل میں حدیقہ کے احسانات کو فراموش کر کے گناہ عظیم کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا۔ میرا اسٹیٹس اس ملک میں میری کمپنی کی شہرت اور پھر میرے بچوں کا سیکیور فیوچر اسی کی وجہ سے وجود میں آیا ہے۔ کیا تم شک کی دنیا سے باہر نکل کر میرے ہر لفظ پر اعتبار کرتی ہو نا۔" وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"جی۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو پھر حدیقہ تمہارے لیے تھریٹ نہیں ہونی چاہیے۔ وہ بن باپ اور بن شوہر کے بہت تنہا ہے۔ بہت دکھیاری اور اس زمانے کی ستائی ہوئی مظلوم ہستی ہے۔ اپنا دل کشادہ اور اپنی سوچ فراخ کر کے اس کی بہتری کے بارے میں غور و خوض کرو۔ تم رستہ تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گی۔ کیونکہ وقت کے ہچکولوں نے تمہیں بہت دور اندیش اور دانش مند بنا دیا ہے۔"

"وہ کیسے؟" وہ حیرت سے بولی۔

"میں خوشامد نہیں کر رہا نہ ہی منافقت میرا شیوہ ہے۔ تمہاری جیسی کمپرومائزنگ عورتیں شاذو نادر ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔ ورنہ عورت مرتے مر جاتی ہے۔ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے ایک انچ بھی نہیں سرکتی۔ تمہارا اٹھایا ہوا قدم تمہاری دور اندیشی کی دلیل ہی تو ہے۔ اس لیے مجھے امید ہے کہ تم خرم اور حدیقہ کے لیے بھی اک مناسب اور موزوں زندگی کا انتخاب کر سکتی ہو۔ اس نے شادی کی ہے تو کیا ہوا؟ حدیقہ کو سمجھایا جا سکتا ہے۔ حدیقہ کو آخری چانس ملنا بے حد ضروری ہے۔" وہ اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔

"سوچتی ہوں۔" اس نے آہستہ سے کہا اور اپنی ہی سوچ میں گھر گئی۔ وہ کیسے بتاتی کہ تم سے دور رہ کر میں نے خرم اور ماں کا وہ روپ دیکھا ہے۔ جس میں خود غرضی' بدلحاظی اور روکھا پن حد سے تجاوز کر گیا تھا۔ بیٹاں اپنے سرتاج کے سائے میں ہی قابل احترام ہوتی ہیں۔ ان کی اپنی ذات کی شناخت شوہر سے وابستہ ہے۔ چاہے شوہر نام کا ہی کیوں نہ ہو؟

ہارون' حدیقہ کے بارے میں سوچنے لگا اسے حدیقہ کے بارے میں صرف اتنی ہی خبر تھی کہ وہ کسی اسپتال میں جاب کر کے گزر اوقات کر رہی ہے۔ کمپنی میں اس کا شیئر تو تھا ہی۔ وہ پرافٹ قانونی طور پر اس کے اکاؤنٹ میں جمع کروا دیتا تھا۔ مگر اس سے رابطہ کرنے یا سامنا کرنے کی اس میں ہمت ہی نہ تھی۔



"سر۔" ڈیلیوری کیس میں ماں کی جان بھی جا سکتی ہے۔ آپ کا ہمارے ساتھ ہونا بہت ضروری ہے۔ ڈاکٹر ماہم آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔" وہ تیزی سے آفس سے نکل کر آپریشن تھیٹر کی جانب چل پڑا۔ باہر لیلیٰ کے والدین اور اس کی ماں انتظار میں بے حد بے قرار اور فکر مند ملے۔

"فکر کی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ انہیں تسلی دیتے ہوئے آگے بڑھا ہی تھا کہ لیڈی ڈاکٹر گھبرائی ہوئی باہر نکلی۔

"ڈاکٹر خرم آئی ایم سوری۔ ہم لیلیٰ کو بچا نہ سکے۔ البتہ بچی کو معائینے کے لیے لے گئے ہیں۔ ماشاء اللہ صحت مند اور نہایت حسین بچی ہے۔" اس نے خرم سے آنکھیں چراتے ہوئے کہا اور دوسری جانب ہولی۔ خرم ہکا بکا کھڑا اسے جاتے ہوئے دیکھنے لگا۔

"لیلیٰ کیسی ہے خرم؟" اس کی ماں نے قرآن پڑھتے ہوئے پوچھا۔

"بیٹی کو پیدا کر کے اپنے حقیقی خالق کے پاس چلی گئی ہے۔" خرم نے آزردہ لہجے میں کہا تو لیلیٰ کی ماں وہیں غشی کی حالت میں صوفے پر گر گئی۔

ننھی منی سی پری بن ماں کے نانی کے ساتھ چلی گئی۔ خرم، لیلیٰ کے چالیسویں تک تو وہاں رہا۔ اس کے بعد اپنی ماں کے پاس آ گیا۔ لیلیٰ کے چلے جانے کا غم اپنی جگہ پر ہی تھا۔ لیکن بچی کے ماں کی ممتا اور محبت کی شناخت سے پہلے ہی محرومی کا دکھ خرم کو چین نہ لینے دیتا تھا۔ روزانہ بلا ناغہ وہ گھر جانے سے پہلے اپنی بیٹی زینب کو دیکھنے جایا کرتا تھا۔ وہ اسے اپنے گھر لا کر ماں کی بے لوث محبت اور باپ کی بے پناہ شفقت کا سایہ بن کر اسے پروان چڑھانا چاہتا تھا۔ مگر ماں کی طرف سے اجازت نہیں مل رہی تھی۔ کیونکہ وہ اپنی بیماری اور بڑھاپے کی کمزوری اور نقاہت میں اتنی گراں ذمہ داری اٹھانے کے قابل نہ تھیں نہ ہی وہ بیٹی کو سونپ کر چوبیس گھنٹے دیکھ بھال کر سکتی تھیں۔ اس لیے زینب کا نانی کے زیر سایہ پروان چڑھنا زیادہ تسلی بخش لگا تھا۔

جب ہارون نے اتنے عظیم سانحہ کی خبر سنی تو اس نے فوراً" خرم کے دکھ میں شرکت کے لیے فون کیا۔ شیریں بھی بہت اپ سیٹ ہو گئی تھی۔ بھائی کو تسلی دیتے ہوئے اس نے زینب کے لیے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ خرم کو پیش کش پسند تو آ گئی۔ مگر اس کا دل تسلی میں تھا نہ ہی روح کو قرار ملا تھا۔ آخر ہارون نے موقع غنیمت جانا اور ایک اور جوائس سامنے رکھ کر بولا

۔

"خرم یار حدیقہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ زینب کی ماں بننے کی سب سے پہلی حق دار وہ ہے۔"

"اس کا نام بھی نہ لو میرے سامنے۔" وہ تلخی سے بولا۔

"خرم ہم نے شک کی بنیاد پر اپنے ہنستے بستے گھروں کو کھنڈرات میں بدل دیا تھا۔ مجھے ہارون کے ہر لفظ پر بے تحاشا اعتماد ہے۔ تم آج پہلی اور آخری بار میری بات دھیان سے سن کر غور و فکر کرنا۔ شاید میری سچائی پر یقین آ جائے۔ جس دن وہ شادی ہو کر ہمارے گھر آئی تھی تب سے ہارون کا اس سے رشتہ ہمدردی رحم و ترس کی بنیاد پر قائم ہوا تھا۔ وہ بن باپ اور ایک مجبور و بے کس ماں کی بیٹی تھی۔ جسے ہمارے خاندان نے بھی بحالت مجبوری قبول کیا تھا۔ ہارون ان تمام حالات کے پیش نظر اس پر بے پناہ ترس کھانے لگا تھا۔ بلکہ وہ اسے بھائی کا درجہ دیتی تھی۔ اس کے علاوہ ان میں اور کوئی رشتہ استوار نہ تھا۔ اس لیے حدیقہ کو واپس لانے کے بارے میں سوچنا غلط ہرگز نہیں ہو گا۔ بلکہ ہمیں اس کی بہت خوشی ہو گی۔ کہ تمہارا گھر ایک ایسی عورت کی رفاقت میں آباد ہو جو باہمت اور پاکیزگی کا شاہکار ہے۔" شیریں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"تم دیکھو اتنے عرصے سے وہ یہاں اکیلی ہے مگر۔ اس کے کردار کی سب ہی گواہی دیتے ہیں۔ میں شرمندہ ہوں کہ میں نے شک کا بیج بویا۔"

"کیا حدیقہ مجھے معاف کر دے گی۔ میری زیادتیوں کو در گزر کر دے گی۔ مجھے لگتا ہے ہرگز معاف نہیں کرے گی۔"

"معافی کے سوا عورت کے پاس چارہ ہی کیا ہے اور پھر حدیقہ جیسی لڑکیاں تو چکی کے دو پاٹ میں پس کر بھی مکمل اور ثابت رہتی ہیں۔ اب تم خود ہی فیصلہ کرنے کے اختیارات کے مالک ہو۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

" مجھے مدد کی ضرورت ہے تم دونوں ہی اس کے پاس جا کر میری طرف سے معافی کی درخواست پیش کر دینا۔ میں اس کے بعد بات کروں گا۔ منانے کی کوشش کروں گا۔ مجھے اب احساس ہوا ہے کہ شاید ایک بے گناہ اور کمزور ہستی پر زیادتیوں کی وجہ سے ہم لمبے عرصے کے لیے بری طرح آزمائشوں میں گرفتار رہے۔ تمہارا اور میرا پیار اک مثال تھا خاندان کے لیے اور دوست و احباب کے لیے۔ اس پیار میں ہی وہ بات نہ رہی۔ بس ہمارا گھر نفرتوں اور جھگڑوں کا اکھاڑہ بن گیا تھا اور میرے امتحان بڑھتے ہی چلے گئے۔ لیلیٰ جیسا زندگی کا ساتھی سوائے درد کے کچھ نہ تھا۔ طرہ یہ کہ

میری بچی ماں کی گود کی خوشبو سے بھی نا آشنا رہ گئی۔ ذرا ماضی میں جھانک کر دیکھو کہ ہمارا گھرانہ کیسا تھا؟ خوشیوں اور کامرانیوں کا سرچشمہ۔ اب وہاں الو بولتے ہیں۔ یا خاموشی کا راج ہے۔" وہ پژمردگی سے بولے جا رہا تھا۔

"ہم مل جل کر اس مسئلے کو خوش اسلوبی سے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں حدیقہ کی طرف سے بے فکر ہوں وہ بہت عظیم عورت ہے خرم اب بھی سب ہماری خواہش کے مطابق ہی ہو گا۔ ہماری آرزو میں حدیقہ کی آمادگی بہت ضروری ہے۔ اب ہم اس کی مجبوریوں اور بے بسی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا خیال اپنے دل سے نکال دیں۔ اگر ہمیں اپنی سلامتی اور اطمینان چاہیے۔"

"ہم اسے سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنے کا وقت دیں گے اور اس کے جواب کا انتظار کریں گے۔"

"تم نے بالکل درست سوچا ہے۔ اب کی بار فیصلے کے اختیارات حدیقہ کے پاس ہوں گے۔" شیریں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

ہارون دونوں کی باتیں سنتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ باری تعالیٰ کی شان کہ وہ چاہے تو گداگر کو بادشاہ بنا دے۔ چاہے تو اک ناتواں سے کار عظیم لے لے۔

واہ میرے مولا تیرا بھی جواب نہیں۔ فخر و غرور کو مٹی میں ملانا چاہے تو پل نہ لگائے۔ انسانی دل و ذہن کا رخ پلک جھپکتے بدل ڈالے۔

"ہارون خرم بات کرنا چاہ رہا ہے۔" وہ موبائل اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔ تو اس نے اچنبھے سے اس کی طرف دیکھا۔

"جی فرمائیے۔"

"ہارون! اگر مجھے معاف کر سکتے ہو تو یہ احسان زندگی بھر نہ بھولوں گا۔" خرم کا انداز التجائیہ تھا۔

"کیسی باتیں کرتے ہو؟ ہر رشتے سے بڑھ کر تم میرے بچپن کے جگری یار بھی ہو۔ تم مجھے بھی معاف کر دینا۔ نجانے مجھ سے بھی انجانے اور بے وقوفی میں کتنی غلطیاں سرزد ہوئی ہوں گی۔" وہ ندامت بھرے لہجے میں بولا۔

"بعض اوقات نہ چاہتے ہوئے بھی نا سمجھی میں غلطی سرزد ہو جاتی ہے۔ حالانکہ نیت اور ارادہ تو غلطی کرنے کا ہرگز نہیں ہوتا۔ ایسی غلطیوں کو تو اللہ تعالیٰ بھی معاف فرما دیتے ہیں۔ سوچ سمجھ کر زیادتی کر گزرنے کی بہت پکڑ ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ پھر پچھتاوا کیسا؟ جب ایک دوسرے کو اذیت دینے کا منصوبہ ہی نہ تھا تو پھر غلطی کیسی اور معافی کیسی؟" خرم ہنستے ہوئے بولا "ماضی کی تلخیوں کو بھلا کر نئی زندگی کا آغاز کرتے ہیں۔ جس میں پرانی محبتوں کی چاشنی کی آمیزش ہو۔ ایک دوسرے کی قربت میں لطافت اور چاہت ہو۔" وہ اک لمبی آہ بھر کر بولا۔

"ٹھیک ہے جی ٹھیک ہے۔ ابھی بیگم آئی نہیں اور لیکچر سننے کو مل گیا۔" ہارون نے مذاقاً کہا تو دونوں نے قہقہہ لگایا۔

آج کی شب کتنی پرسکون تھی۔ کتنے عرصے بعد ٹوٹے ہوئے رشتے جڑے تھے۔

آج کی صبح کس قدر انوکھی اور نرالی تھی۔ صلح جوئی، اتفاق و اتحاد نے دلوں میں جینے کی نئی امنگ جگا کر چہروں پر شادمانی کی چھاپ لگا دی تھی۔ ہارون نے حدیقہ کے بارے میں ہاسپٹل سے دریافت کرنے اور بات کرنے کی بے انتہا کوشش کی۔ یہ خبر سن کر وہ شاکڈ رہ گیا کہ حدیقہ کو پاکستان گئے کئی مہینے ہو چکے ہیں۔ وہ واپس آنے کا وعدہ کر کے گئی تھی۔ مگر ابھی تک اس کی جانب سے کسی قسم کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ ہارون نے فوراً خرم سے رابطہ کر کے تمام انفارمیشن گوش گزار دی۔ خرم یہ سن کر خوشی سے اچھل پڑا کہ حدیقہ چند کلومیٹر دور اپنے شہر میں موجود ہے۔ لیکن وہ اس مختصر اور محدود رستے کو کیسے طے کر سکتا ہے۔ سوچ کر ہی ندامت سے اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے۔

"اگر اس نے مجھے معاف نہ کیا تو۔۔۔۔"

یہ سوال اسے بے کل کیے جا رہا تھا۔ اسی حالت

میں دل کے ہاتھوں مجبور وہ حدیقہ کے گھر کی طرف چل پڑا۔ رستے سے اس کی پسند کا چیز کیک اور ریڈ روزز خریدے شرمندگی اور خوشی کے ملے جلے جذبات کو دل کے نہاں خانوں میں چھپائے گھر کے باہر گاڑی روک کر بال درست کیے اور ٹائی ٹھیک کرتے ہوئے گیٹ تک پہنچا۔ ڈور بیل بج تو رہی تھی۔ مگر جواب ندارد۔ یکدم نظر گیٹ پر لگے ہوئے تالے پر پڑی۔ منہ چڑاتا ہوا تالا۔ جی چاہا اسے توڑ کر اندر چلا جائے۔

اس نے پڑوس کی بیل بجا کر ان سے پوچھا۔

"بیٹا! آج صبح کی فلائیٹ سے ماں بیٹی کینیڈا چلی گئی ہیں۔" وہ خاتون بولیں۔

"گھر کرائے پر چڑھا گئی ہیں۔ بہت ہی اچھا ہوا کہ بیٹی اپنی ماں کو ساتھ لے گئی ان دونوں کا ایک دوسرے کے بغیر بھلا تھا بھی کون؟"

"کوئی پتا دیا ہے۔"

"وہ کسی سے ملتی ہی کب تھی کہ اپنا ٹھکانہ بتا کر جاتی۔ اپنی جوانی نوکری کے بعد گھر میں قید ہو کر ایسے گزار دی کہ کسی کو تہمت بازی کا موقع ہی نہ دیا اور پھر بیٹی بھی نیک اور شریف جاتے ہوئے سب سے مل کر ایسے شکریہ ادا کر رہی تھیں۔ جیسے ہم نے ان کے قدموں میں قارون کا خزانہ ڈھیر کر دیا ہو۔ بیٹا یقین مانو ماں بیٹی نے کبھی بل تک جمع کروانے کا احسان بھی کسی سے نہ لیا تھا۔ کیا غیرت مند اور خود دار خون تھا۔ خاندانی اور زیرک عورت تھی۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنی بچی کی بے شمار خوشیاں دکھائے۔ آمین۔" وہ حدیقہ کے گن گاتی اسے وہیں اکیلا چھوڑ کر آگے بڑھ گئیں۔ شاید کوئی نئی پڑوسن تھیں جبھی خرم کو نہیں پہچانا تھا۔

وہ بھاری قدموں اور منوں بوجھ دل پر لیے گاڑی تک پہنچا اور زینب سے ملنے سسرال کی طرف مڑ گیا۔



"ماما میں آپ کو کینیڈا کا چپا چپا دکھاؤں گی، پہلے ٹورنٹو پھر ہم جائیں گے رچمنڈ ہل، جہاں ہم ماں بیٹی ایک ہفتے قیام کریں گی اور بہت گھومیں گے۔"

حدیقہ بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ بولے جا رہی تھی۔

"ماما مجھے کینیڈا کبھی بھی اتنا خوب صورت، شفاف اور دل پذیر نہیں لگا۔ جتنا آپ کی قربت میں لگنے لگا ہے۔"

"اب مکھن نہ لگاؤ۔" حدیقہ قہقہہ لگا کر چھیڑتے ہوئے بولیں۔

"مام سچ ہی تو کہہ رہی ہوں۔ خوب صورت جگہوں کی اہمیت چار گنا زیادہ بڑھ جاتی ہے جب دل کے ساتھی کا ساتھ ہو۔ کوئی روک ٹوک اور ڈانٹ ڈپٹ کرنے والا نہ ہو۔ مام! آئی لیوی۔ اب مجھے کینیڈا کی سرد یخ بستہ صبحیں بھی تمازت اور حدت سے بھرپور معلوم ہوتی ہیں۔" وہ ماں کے ہاتھوں کو چومتے ہوئے بولی۔

"ماما راتوں میں مجھے خوف آتا تھا۔ آنکھ کھل جاتی تھی تو پھر دوبارہ لگ نہ پاتی تھی۔ اب جو بستر پر کمر لگتی ہے تو خراٹے بھرنے لگتی ہوں۔ آپ کو علم ہے۔ ایسے کیوں ہے؟" وہ ماں کو شوخی سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"بیٹا جی دن بھر لور لور پھریں گے تو انجام یہی ہو گا۔" وہ بھی شوخی سے بولیں۔

"سمجھ گئی۔" وہ ہنسنے لگی۔

"ہاں تو اگلا پروگرام نہیں بتایا۔" حدیقہ نے اس کی شوخی کو انجوائے کرتے ہوئے پوچھا۔

"اگلا پروگرام ہے۔ مسی ساگا۔ وہاں تین دن کا قیام ہے۔ وہاں سے مارکھم کا رخ کریں گے۔ پھر اگلا پروگرام ہے۔ اپنی پیاری ممی کو نیاگرا فال دکھانے کا۔ وہاں سے واپس آنے کو دل نہیں چاہتا ماما۔ بس یوں سمجھیں کہ ..... اپنی زندگی ہلکے میٹھے اور سرور سے بھرپور ہچکولے کھاتی ہوئی بوٹ میں بتانے کو جی چاہنے لگتا ہے۔ کیا سینری ہے ماما؟ کیا دلکش اور دلربا نظارے ہیں۔ کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔" وہ مزے لے کر بول رہی تھی۔

"اچھا جی۔ مجھے مانٹریال دیکھنے کا بھی تو شوق ہے۔ وہاں کب جا رہے ہیں۔" حدیقہ نے بات کو بڑھانا چاہا

۔

"ضرور چلیں گے۔"

"میں نے C.N Tower کے بارے میں بہت کچھ پڑھا ہے۔ وہاں جانا تو اتنا ضروری ہے جیسے جینے کے لیے کھانا۔

تیرھواں عجوبہ ہے وہ۔ آپ دیکھ کر مبہوت رہ جائیں گی۔"

"کتنا وسیع و عریض ملک ہے۔ اس کی مینٹننس کا جواب نہیں۔ صفائی نے تو جیسے دل جیت لیا ہو۔ نہ دھول نہ دھواں۔ چارسو نکھری اجلی فضا۔ حد نظر ہریالی ہی ہریالی۔ ایسے گمان ہوتا ہے جیسے حد نگاہ ہری مخمل بچھی ہو۔ آبشاروں کی مدھر تان دل کو لبھا لبھا جاتی ہے۔ حدیقہ تم نے تو مجھے جنت کی ہلکی سی جھلک دکھا دی ہے۔ میری بچی میری دعا ہے۔ تمہیں دونوں جہانوں میں جنت الفردوس کے اعلا درجے نصیب ہوں۔" وہ اسے دعائیں دینے لگیں۔

"ماما میں نے کہا تھا نا کہ ہم مل کر اپنی زندگی کی راہوں کے تمام کانٹے اور نوکیلے پتھر چن کر وہاں پھولوں کی چادر بچھالیں گے۔ اگر ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ رہا۔" وہ سرشار ہو کر جھوم اٹھی۔ تو صدیقہ ہنسنے لگیں۔

"میں نے سوچا ہے کہ کمپنی سے اپنے شیئرز نکال کر اپنا بزنس کروں۔ بے شک ہارون بھائی ایک ایک پائی کا حساب کر کے مجھے ای میل کر دیتے ہیں۔ اور پرافٹ میرے اکاؤنٹ میں جمع ہو جاتا ہے اس لحاظ سے سب درست جا رہا ہے۔ لیکن میں اب ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی۔" وہ ماں کے کپڑے نکالتے سنجیدگی سے بولی۔

"ماما میں اس دنیا کے پھیلے، شوخ و شنگ اور گہرے رنگوں کی سچائی اور مزاج کو جتنا سمجھ گئی ہوں آپ اس عمر میں بھی اس کا اندازہ نہیں لگا سکتیں۔"

"میں شرمندہ ہوں بیٹا دوسروں کی باتوں پر یقین کرنے سے پہلے تم سے حقیقت معلوم تو کر لیتی۔ تمہاری بدنامی اور رسوائی کو اپنی ایگو تصور کر کے تمہیں زمانے کی تیز و تند ہواؤں میں تنکے کی مانند چھوڑ دیا اور کیا ہوا اس کا انجام۔" وہ روہانسی ہو گئیں۔

"ہم اب ماضی کو نہیں کریدیں گے۔" وہ نہایت پیار سے بولی۔ "میں آج آپ کو یہاں کے سب سے وسیع و عریض شاپنگ مال لے کر چلوں گی۔ مگر پہلے ناشتا۔۔۔"

اور وہ دونوں گردوپیش سے بے خبر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ناشتے کی طرف چل پڑیں۔



"مما میں ٹورنٹو میں اپنی کمپنی بنانا چاہتی ہوں۔ میڈیسن سے متعلق مثلاً" آپریشن تھیٹرز، لیبارٹری اور پیشنٹ کے استعمال آنے والی ہر قسم کی equipment جو ملک کے مختلف ہاسپٹلز میں ڈیلیور کی جائے۔ میں نے چائینز کے ساتھ ڈیل سائن کر لی ہے۔"

"اگر تم سمجھتی ہو کہ مونیٹریال ہمارے لیے بہتر ہے تو ویل اینڈ گڈ۔ مجھے کیوں اعتراض ہو گا۔" ماں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"بس دعا کریں کہ ہارون بھائی سے اپنا بزنس الگ کرنے میں مسائل نہ کھڑے ہو جائیں۔" وہ بہت سنجیدہ تھی۔ "انہیں دو مہینے پہلے وارن کرنا پڑے گا۔ میں آج ہی انہیں ای میل کر دیتی ہوں تاکہ وہ میرا شیئر آسانی سے الگ کر لیں۔"

"اگر وہ نہ مانا تو۔۔۔" ماں ایک دم پریشان ہو گئیں۔

"قانونی طور پر دو مہینے کے پیریڈ میں اگر وہ میرا شیئر خود خریدنا چاہتے ہیں تو فرسٹ چوائس ان کی ہو گی۔ ورنہ کسی اور کو شیئر دے سکتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ وہ کیا جواب دیتے ہیں۔" وہ پرسکون لہجے میں بولی۔

"پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ یہاں بزنس کے اصول اور قانون بہت فیئر ہیں۔ یہ پاکستان نہیں کہ جو جتنا جھوٹا، چور اچکا اور منافق ہو گا دوسرے کا شیئر کھانے میں اتنی ہی جلدی کامیاب ہو جائے گا۔ یہاں دیانتداری اور راست بازی پر سودے ہوتے ہیں۔" وہ

لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھ گئی۔

جونہی ہارون کو ای میل ملی۔ اس نے اسے فوراً" تسلی بخش جواب دیا۔ اس نے اس سے دو مہینے کے بجائے چار مہینے کی مدت کی درخواست کی تھی۔ کیونکہ شیئرز وہ خود خریدنا چاہ رہا تھا۔ وہ بھی شیریں کے نام۔ اس نے اسے تفصیلاً" تمام حالات لکھ کر خرم کے حالات سے بھی روشناس کیا تھا۔ لیکن اگلی بات نہ لکھ سکا کہ وہ حدیقہ کو ڈھونڈ رہا ہے اور اسے اپنے پاس واپس لے جانے کا خواہشمند ہے۔ وہ ای میل پڑھ کر ہلکی سی خوشی کی لہر اس کے پورے جسم میں دوڑ گئی کہ شیریں کا گھر آباد ہوا اور بچے ماں اور باپ کی شفقت میں پروان چڑھنے لگے۔ اس نے ماں کو بھی تفصیل بتائی اور دونوں دیر تک تبادلہ خیالات کرتی رہیں۔

حدیقہ نے اپنے باپ کے بارے میں ماں کو نہیں بتایا تھا کہ وہ ٹورنٹو کے سب سے بڑے اسپتال کے ہیڈ ہیں۔ اور وہ ان کے ساتھ کام بھی کر چکی ہے۔ وہ انہیں پہچان کر بھی انجان بنی رہی۔ کیونکہ اس کو ایسے بے حس باپ پر نہ فخر تھا نہ ہی دیکھ کر خوشی کی لہر وجود میں دوڑی تھی ماں کی لکھی ہوئی ڈائری وصول کرنے کے بعد ان کا کیا ری ایکشن تھا۔ یہ بے خبر تھی۔ اتنا بڑا راز اپنے اندر چھپانے کا اک مقصد تھا۔ وہ ماں کے زخموں کے کھرنڈ کھرچ کر اسے نئے سرے سے درد کی کیفیت میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ زندگی میں پہلی بار تو اس نے ماں کو اپنی قربت میں اتنا خوش اور پرسکون دیکھا تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں بے وفا شوہر سے ملنے کی چاہ میں ـــــ مضطرب ہی نہ ہو جائے اور حدیقہ ایسے بے درد اور بے قدرے انسان سے ملاقات کروانے کے حق میں ہی نہ تھی۔

دن گزرتے گئے۔ حدیقہ نے اپارٹمنٹ کرائے پر لے کر اسے ضروری سامان سے سجا کر ماں کی اجازت سے اسپتال میں پارٹ ٹائم نوکری کر لی۔ جاب کا مقصد تنخواہ کا حصول نہیں تھا۔ بلکہ دوسرے اسپتالوں سے ان ٹچ رہنا تھا۔

چار مہینے کا عرصہ گزر جانے کے بعد اسے دوسرے شہر ہارون اور وکیل کے سامنے تمام ڈاکومینٹس پر دستخط کر کے کمپنی کے شیئرز سے دستبردار ہونا تھا۔ ہارون نے بیسیوں بار اسے ہوٹل کے بجائے گھر پر رکنے کی دعوت دی۔ جسے اس نے شان بے نیازی سے مسترد کر دیا اور ماں کے ساتھ ہوٹل میں قیام کیا۔

"حدیقہ! کیسی ہو" ہارون نے سامنے خاموش بیٹھی حدیقہ سے سوال کیا۔

"اللہ کا شکر ہے۔" وہ قدرے تلخی سے بولی۔

"تم نے خرم کو معاف نہیں کیا۔" وہ پریشانی کے عالم میں بولا۔

"میں کیا معاف کروں گی۔ بہت حقیر اور ناچیز ہوں۔" وہ خفگی سے بولی۔

"میری مثال تمہارے سامنے موجود ہے۔ دل کو بڑا نہ کرتا تو سوچو خاندان میں کتنی بڑی تباہی آجاتی۔ تم بھی گھر آباد کرنے کا سوچو۔" وہ ملائمت سے سمجھاتے ہوئے بولا۔

"شاید وقت اور حالات مجھے معاف کرنے پر مجبور کر دیں۔" وہ سوچتے ہوئے بولی۔

"میرا دل کہتا ہے حدیقہ وہ وقت آئے گا۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"میں تمہارے احسان کا بدلہ ضرور اتاروں گا حدیقہ۔ میں نہ تو احسان فراموش ہوں نہ ہی مطلب پرست ہوں۔

میں تاحیات تمہیں یاد رکھوں گا۔ میں آج جس مقام پر کھڑا ہوں۔ تمہاری نوازشات اور عنایات کی وجہ سے ہوں۔ تم نے جس پیارے اور حسین رشتے میں مجھے دیکھا ہے۔ اگر اللہ نے چاہا تو وہ دکھاؤں گا۔ منہ بولے رشتے بھی اپنی پاکیزگی اور تقدس کے حامل ہوتے ہیں۔ میں تمہاری زبان کی لاج رکھوں گا حدیقہ میرا وعدہ ہے تم سے۔"

حدیقہ نے اس کی طرف ایک بھرپور نظر ڈالی۔ مزاج نرم تو تھی ہی۔ اس سے پہلے اس عکبے میں آجاتی

فوراً" کھڑی ہو گئی۔

"آپ کل تمام ڈاکومنٹس کے ساتھ پہنچ جائیں تاکہ لائیر کے سامنے تمام حساب کتاب کلیر ہو جائے۔" وہ اتنی سنجیدہ تھی اور اتنی مضبوط نظر آ رہی تھی کہ وہ ہکا بکا اسے دیکھنے لگا۔ کیونکہ وہ تو بہت کمزور نظر آیا کرتی تھی وہ سوچے جا رہا تھا اور وہ آفس سے جا چکی تھی۔



حدیقہ نے جونہی آفس کا دروازہ کھولا تو وہ چکرا سی گئی۔ اچھنبے سے ہارون کی طرف دیکھا اور چہرے پر ناگواری اور ٹینشن کی لکیریں ابھر آئی تھیں۔

"حدیقہ آؤ۔" ہارون نے اسے ریسیو کیا۔ وہ بوجھل قدموں سے ساتھ ہولی۔

"ڈاکٹر خرم سے ملو۔" ہارون نے مودبانہ انداز میں کہا۔

"ہیلو...." کہہ کر وہ خاموش ہو گئی اور لائیر کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ گفت و شنید کے بعد دونوں نے پیپرز پر سائن کیے۔ جبکہ خرم خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ کتنی بدل گئی تھی۔ جذباتی اور چھوٹی موٹی سی حدیقہ تو نجانے کہاں کھو گئی تھی۔ کیا وہ اسے تلاش کر کے حاصل کرنے کی سکت بھی رکھتا ہے یا نہیں۔ حدیقہ نے اسے ایک نظر دیکھ کر سوچا۔

"خرم کتنے بدل گئے ہیں۔ بالوں میں چاندی کے چمکتے ہوئے تار عمر کے ساتھ خود سے بے پروائی برتنے کی داستان پیش کر رہے تھے۔ پیشانی پر لائینوں کا بچھا ہوا جال بیتے ہوئے ماہ و سال کی پریشانیوں اور کلفتوں کی غمازی کر رہا تھا۔ چہرے پر بلا کی سنجیدگی اور خاموشی چونکا دینے کو کافی تھی۔

"تھینک یو ہارون۔ آپ نے غیر متوقع طور پر میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے۔ لین دین، حساب کتاب میں جو راست بازی دکھائی ہے۔ امپریس ہو گئی ہوں۔ ہر انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے برائیوں کے ساتھ بے پناہ خوبیوں کی بھی آمیزش ڈال رکھی ہے۔ اسی سے انسان مکمل ہوتا ہے۔" وہ خرم کو اگنور کرتے ہوئے بولی۔

"میں چلتی ہوں۔ ایک بار پھر شکریہ۔"

"خرم آپ سے اکیلے میں بات کرنا چاہتے ہیں۔" ہارون نے سوچ میں ڈوبے ہوئے خرم کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کیا ابھی کہنے کو کچھ باقی رہ گیا ہے۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ "چار سال کے عرصے میں مجھ تنہا عورت پر کیا کچھ نہیں گزر گیا طوفان، آندھیاں اور جھکڑ۔ اس کے گواہ آپ ہیں۔ تب یہ صاحب کہاں تھے؟ مجھے ان سے کوئی سروکار نہیں ہارون۔ آج میرا ربط و تعلق آپ سے بھی ٹوٹ گیا ہمیشہ کے لیے۔ میرے ساتھ ہمدردی کا رشتہ قائم کرنا اک جرم بن گیا تھا ہم دونوں کے لیے.... ہمارے آشیانوں نے آگ پکڑ لی۔ میں جل کر راکھ ہو کر فضاؤں میں تحلیل ہو گئی اور آپ سب نے خود کو بھسم ہونے سے محفوظ کر لیا۔ گھاٹے میں کون رہا۔ میں حدیقہ زیدی اپنے دوست کو سمجھا دیجیے کہ حدیقہ کو زمانے نے جو سبق سکھائے ہیں۔ اپنی تنہائی اور اکیلے پن میں میں جن تجربات سے گزری ہوں۔ ان کو مدنظر رکھتے ہوئے۔ انہیں مجھ سے بات کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔" وہ طیش میں آ کر بولی۔

"حدیقہ بعض اوقات زندگی میں ایسے واقعات رونما ہو جاتے ہیں۔ جن کے بارے میں نہ سوچا ہوتا ہے نہ ہی ان کے ہونے کا تصور کیا جاتا ہے۔ مگر ان کے ظہور پذیر ہونے پر انسان ہکا بکا رہ جاتا ہے بدگمانی اور بے صبرا پن اس کی جڑ ہے۔ خرم اپنی ہستی میں سے ایسے تمام بیج نکال کر تمہارے سامنے آیا ہے۔ کم از کم اس کی بات تو سن لو۔" ہارون نے التجائیہ انداز میں کہا۔

"جب میرے دل نے اعتماد اور بھروسے کے رشتے کو خیرباد ہی کہہ دیا ہے تو ایک نئی الف لیلیٰ کی داستان کا مجھ پر کیا اثر ہو گا۔ میں اپنی زندگی میں بہت مطمئن بھی ہوں اور بے پناہ خوش بھی ہوں۔ مجھ پر آپ کا احسان ہو گا کہ آپ آئندہ مجھے تنگ کرنے کی کوشش مت

کریں۔ میرے پاس ایسی باتیں سننے کے لیے وقت ہے نہ ہی مجھ میں ہمت ہے۔" اس نے بے اعتباری سے کہا اور بے حد روکھائی سے سامنے کھڑے خرم کو اس کا رستہ چھوڑنے کا اشارہ کیا۔ باڈی لینگو تج میں اس قدر بے نیازی تھی کہ وہ چونک اٹھا۔

"حدیقہ! پلیز۔" خرم نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

"میں اب آپ کی کسی بات میں آنے والی نہیں ہوں۔" اس نے تلخی سے کہا۔

"تھینک یو خرم! آپ کے سلوک نے مجھے پاؤں پر کھڑا ہونا اور چلنا سکھا دیا۔ آپ کیا چاہتے ہیں کہ میں پھر سے معذور ہو جاؤں۔ ایسے لوگوں کو جوتے ہی پڑتے ہیں۔ اگر میں کوڑے کے ڈھیر سے پھینکی ہوئی بیساکھیوں کو اٹھانا بھی چاہوں تو کوئی فائدہ نہیں ہو گا کیونکہ اتنے سالوں میں وہ بھی گل سڑ کر اسی کا حصہ بن چکی ہوں گی۔" دونوں مجرم بنے اسے جاتے ہوئے دیکھتے رہ گئے۔ نہ ایک بولا نہ دوسرے کی جرات ہوئی کہ اسے روک سکتا۔



"بیٹا! کیا بات ہے؟ تم رات بھر سوئی بھی نہیں نہ ہی ناشتا کرنا چاہ رہی ہو۔ مسئلہ کیا ہے؟"

ماں۔ حدیقہ کی سوچ میں ڈوبی ہوئی آنکھوں کو بغور جائزہ لیتے ہوئے بولی۔

"میں تمہاری ماں ہی نہیں دوست بھی ہوں۔ بتاؤ کیا بات ہے؟"

"کوئی خاص بات نہیں۔" وہ موضوع بدلتے ہوئے بولی۔

"مجھے بتاؤ کیا کہا ہارون نے کہیں تمہارا پیسہ ہی تو ہڑپ نہیں کر گیا۔ اگر ایسا ہے تو ہم اسے نہیں چھوڑیں گے۔ یہاں کا قانون ہمارا ساتھ دے گا۔" وہ ایک دم سے پریشان ہو گئی تھیں۔

"ماما! ایسی کوئی بات ہی نہیں۔ آپ خود پر قابو پائیں۔ وہ حساب کتاب میں بہت فیئر رہا ہے میرے ساتھ۔" حدیقہ نے اپنے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر تم رات سے مرجھا کیوں گئی ہو؟ تمہیں میری قسم اگر نہ بتاؤ تو۔۔۔" ماں دھمکی کے انداز میں بولیں۔

"ایسے مت بولیں ماما۔ بعض اوقات اولاد اپنے بہت پیارے رشتوں کو اپنے مسائل بتا کر انہیں دکھی نہیں کرنا چاہتی۔ بس یوں ہی سمجھیں۔ ہم یہاں سے جائیں گے تو مونٹریال میں اپنے کام میں مصروفیت کی وجہ سے کوئی پریشانی میرے قریب نہیں پھٹکے گی۔ ٹورنٹو میں میں نے بہت مشکل وقت کاٹا ہے نا "بس وہی وقت افسردہ سا کر گیا ہے۔" اس کے آنسو پیتے ہوئے ٹالنے کے انداز میں کہا۔

"بیٹے تم ماں کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکتیں۔" وہ اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولیں۔

"بات یہ ہے۔ جب میں ہارون سے ملنے اس کے آفس گئی تو خرم وہاں موجود تھا اپنے طور طریقے سے بہت صلح جو اور مہذب لگ رہا تھا۔ لیکن میں اس پر بھروسہ کرنے والی نہیں۔ خود کو کیا سمجھتا ہے؟ جب دل چاہا گلے لگا لیا۔ جب دل بھر گیا تو آسمان سے زمین پر لا پٹخا۔ اب میں ایسی بھی بچی اور جذباتی نہیں رہی کہ اس کی مسکین اور آزردہ شکل دیکھ کر موم کی مانند پگھل جاؤں گی۔ میں نے اسے ایک لفظ بھی ادا نہیں کرنے دیا۔ جب میں نے اس کے ساتھ نہ رہنے کا تہیہ کر ہی لیا ہے تو پھر اس کی بک بک کیونکر سنوں اور خوامخواہ قیل و قال میں پڑ کر خود کو پریشان کیوں کروں؟ کیوں ماما میں نے ٹھیک کیا ہے نا۔" وہ اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں ڈوبتی ابھرتی بولے جا رہی تھی۔

جب ماں کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو اس نے چونک کر ماں کی طرف دیکھا۔ ان کا بلڈ پریشر انتہائی ہائی ہو چکا تھا۔ پریشانیوں نے انہیں اعصابی طور پر اتنا کمزور اور لاغر کر دیا تھا کہ وہ کسی قسم کا شاک برداشت کرنے کی قوت ہی نہیں رکھتی تھیں۔ حدیقہ نے اپنے اعصاب پر قابو رکھ کر فوراً "ایمبولینس کال کی

تھی۔



آئی سی یو میں وہ ابھی تک شوگر لیول ڈاؤن ہو جانے کی وجہ سے بے ہوش تھیں۔

آصف زیدی کے سامنے جو مریضہ بے ہوش پڑی تھی اسے دیکھ کر وہ حیرت زدہ تھے۔ حدیقہ نے اب بھی انہیں کچھ نہیں بتایا تھا۔

وہ ان کی بے تابی اور فکر مندی سے محظوظ ہو رہی تھی۔ اسے آج ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ تمام ذمہ داریوں سے فارغ ہو گئی ہے۔ اب ماں کی کیئر اور نگہداشت کرنے والا اس کا شوہر اس کے سر پر دن رات کھڑا ہے۔ اب اس کی موجودگی کی ضرورت ہی نہ رہی تھی۔

رات کا وقت تھا۔ حدیقہ کو آصف زیدی نے ہوٹل آرام کرنے کے لیے زبردستی بھجوا دیا تھا۔ اور خود صدیقہ کے قریب کرسی ڈال کر بیٹھ گئے۔ سسٹر نے کئی بار انہیں واپس جانے کا کہا۔ مگر انہوں نے ایک نہ سنی۔

یہ مرد بھی کیسی عجیب ذات ہے کہ پیار پر آئے تو اپنے تخت و تاج کو تیاگ دے۔ اس کی نفرت ایسی بھیانک اور جان لیوا کہ عورت سوچتی ہی رہ جائے کہ وہ کہاں پر بے وفا تھی۔ کون سی غلطی سرزد ہو گئی تھی کہ تمام ناتے ہی توڑ ڈالے اور جب لاپروا بننے پر آئے تو ایسا لاابالی اور غیر ذمہ دار کہ پلٹ کر دیکھنا بھی گوارہ نہ کرے۔

حدیقہ نے اسی ہسپتال سے رابطہ کیا تھا۔ چند منٹوں میں ایمبولینس ہوٹل کے دروازے پر کھڑی تھی اور اس اطلاع پر آصف زیدی اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہو گیا۔

وہ ڈائری پڑھنے کے بعد صدیقہ کو پانے کی جستجو میں دیوانے اور جنونی ہو گئے تھے۔ کسی طرف سے انہیں کوئی مژدہ راحت نہیں مل رہا تھا۔ اب اچانک وہ سامنے آگئی تھی۔ آصف نے انہیں ایڈمٹ مسز ڈاکٹر آصف زیدی کے نام سے کرا دیا تھا۔ جسے حدیقہ ہر بار بڑھ کر اگنور کر دیتی۔ آصف پر اپنی فیلنگز کا اظہار کر کے اسے پاپا پکار کر گلے لگ جانا بالکل اک فلمی سین کی طرح لگ رہا تھا۔ اس لیے وہ اپنے جذبات پر پوری طرح قابو پا چکی تھی۔ بس باپ کی بے چینی اور تڑپ پر حیران و شاداں تھی۔

جب صدیقہ نے آہستہ آہستہ آنکھ کھولی اور بلب کی مدھم روشنی میں اپنے قریب ایک مردانہ سایہ محسوس کیا اور پھر اس کے ہاتھ کی انگلیاں اس کی نبض پر رک گئیں اور آصف کی بے چین نظریں صدیقہ کی بجھی ہوئی آنکھوں میں اس صدیقہ کو ڈھونڈنے لگیں جسے اس نے ٹوٹ کر پیار کیا تھا۔ یہ تو زمانے کی ستائی ہوئی نجانے کون عورت تھی۔ آنکھیں من کی زبان ہیں۔ جو پل بھر میں زندگی کی تمام تر داستانیں بیان کرنے میں بہت ماہرانہ طریقے سے کام کرتی ہیں۔ عقل و شعور رکھنے والے لوگ اس کی بولی کو سمجھنے میں تاخیر نہیں کرتے۔ وہ کھلی آنکھوں سے گرد و پیش کا جائزہ لے رہی تھیں کہ وہ ہیں کہاں؟ طویل توقف کے بعد انہوں نے محسوس کر لیا کہ وہ اسپتال میں آئی سی یو وارڈ میں ڈاکٹروں اور نرسوں کی نگہداشت میں ہیں۔ پھر اگلا خیال حدیقہ کا تھا۔ ان کے لبوں نے جنبش کی۔ تو آصف زیدی کا چہرہ ان کے چہرے کے اتنا قریب آگیا کہ صدیقہ اس کی سانسوں کی حدت اور مخصوص خوشبو کے جھونکے سے چونک اٹھیں۔ ماضی میں ابھرنے والی محبت سے لبریز سانسوں کے ساتھ پرفیوم کا دلفریب جھونکا بیتے ہوئے دنوں کی یاد دلا گیا۔ انہوں نے ملگجی سی روشنی میں اسے پہچاننے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بیٹھنے کی کوشش کی۔ مگر سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ وہ پھر سر تکیے پر رکھ کر بے بسی و لاچارگی سے اس ہیولے کو دیکھتے ہوئے لرزش زدہ آواز میں بولیں۔

"آپ کون؟ اور میری حدیقہ کہاں ہے۔"

"آپ آرام فرمائیں۔" انہوں نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"ڈاکٹر' ڈاکٹر آصف زیدی ـــــ" مانوس آواز اور پسندیدہ مانوسیت سے بھرپور خوشبو پر چونک کر بولیں۔
"آصف زیدی۔" انہوں نے ٹوٹے پھوٹے لفظوں سے نام مکمل کیا۔
"ہاں حدیقہ! تمہارا مجرم' تمہارا گناہ گار تمہارے سامنے کھڑا ہے۔ اس کے لیے جو سزا تجویز کرو گی اسے قبول ہے۔" وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر ندامت سے بولے۔
"آصف! آپ' آپ کہیں خواب تو نہیں۔" وہ پھر تذبذب کے عالم میں اٹھنے کی کوشش کرنے لگیں۔ مگر اٹھ نہ سکیں۔
آصف نے ـــ پیار بھرے لہجے میں لیٹے رہنے کی تلقین کی۔
"آئی کانٹ بی لیواٹ۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔" وہ اپنے سینے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے انہیں دیکھتے ہوئے بولیں۔
"مجھے بچالیں۔ میں جینا چاہتی ہوں۔ کہاں ہے ہماری بچی۔" وہ نڈھال سی ہو کر ان کے چہرے کی طرف دیکھنے لگیں۔
"کچھ نہیں ہونے والا۔ خود کو سنبھالو۔" وہ جلدی سے ان کا بلڈ پریشر چیک کرنے لگے۔ جو اتنا گر چکا تھا کہ ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔
"حدیقہ ـ مجھے معاف کر دو۔ میری غلطیوں کو فراموش کر کے مجھے صدق دل سے معاف کر دو۔ جوانی کے نشے' دولت کی حرص اور والدین کی عزت و لحاظ اور اسٹیٹس کے جنون میں' میں نے تمہیں جن خطابات سے نوازا تھا۔ سب غلط تھے۔ پھر بھی تم نے میرا انتظار کیا۔ ہر پل اور ہر ساعت مجھے معاف کر دو۔ مجھے معاف کر دو حدیقہ۔" وہ تڑپ اٹھے تھے۔

حدیقہ کی زندگی لاتعداد مسرتوں اور پچھتاووں کی آماجگاہ تھی۔ کم سنی میں والدین سے زیادتی کرنے پر وہ اپنی نظروں سے اس حد تک گر چکی تھیں کہ انہوں نے دنیا کو تیاگ دیا تھا۔ شوہر کی جدائی کے کرب اور انتظار پیہم کے جان لیوا لمحوں میں وہ گھنٹوں اپنے ماں باپ سے مخاطب ہو کر اپنے گناہ کبیرہ کی معافی تلافی کرنے کی کوشش کیا کرتی تھیں۔ آج ان کی خواہش رنگ لے آئی۔ انہوں نے آصف زیدی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ان کی سانسوں اور ان کے جسم کی مخصوص خوشبو کو محسوس کیا تھا۔ انہی لمحوں کا انتظار تھا۔ اپنے من کی تمام حسرتیں اور پچھتاوے شوہر کے دامن میں ڈال کر وہ پل بھر میں شانت ہو گئیں۔
صدیقہ ان سے یوں ملی تھیں جیسے کبھی ناراض ہی نہ تھیں مگر حدیقہ کو آصف زیدی سے بے پناہ شکایتیں تھیں اور آصف ان شکایتوں کو دور کرنے اس وقت اس کے پاس موجود تھے۔ نرس کو صدیقہ کا خیال رکھنے کا کہہ کر ادھر آگئے تھے۔
باپ بیٹی کے پاس گھر پہنچا تو حدیقہ لاؤنج میں ہی مل گئی۔ آصف اس کے قریب ہی کارپٹ پر سر نیچے کیے بیٹھے رہے۔
"بیٹا ناراض ہونے کا حق تمہیں ہے۔ کیا مجھے معاف نہیں کرو گی۔"
حدیقہ نے ماما کے پرس سے نکاح نامہ نکالا اور آصف کو دکھاتے ہوئے بولی۔
"میری ماں زندگی بھر یہ نکاح نامہ دنیا کو دکھا کر مجھے جائز اولاد ہونے کا ثبوت دیتی رہی۔ اسی خوف میں' آج بھی ان کے پرس میں محفوظ ہے۔ کس گناہ کی پاداش میں انہیں یہ سزا سنائی تھی آپ نے؟" یہ سن کر وہ بری طرح تڑپ اٹھے۔ مگر کسی بات کا جواب نہ تھا۔ ملزم کی طرح ندامت اور خوف سے سر جھکا ہوا تھا۔ انہوں نے حدیقہ کو دیکھا۔ وہ ماں کی طرح کتنی خوب صورت تھی۔ اس نے اپنا بچپن جن محرومیوں اور خواہشوں کی توڑ پھوڑ میں گزارہ تھا وہ کیفیت اس کے چہرے پر ثبت تھی۔ جوانی میں وہ کس دھوکے اور فریب کا شکار ہوئی تھی۔ باپ کو اس کی قطعاً" خبر نہ تھی۔
"حدیقہ! بیٹا مجھے معاف کر دو۔" وہ ملامت سے

بولے۔

"آپ میری ماں کی خوشیوں کے قاتل ہیں ڈاکٹر آصف زیدی صاحب۔" وہ تلخی اور درشتی سے بولی۔

"تم جو بھی کہو سننے کو تیار ہوں۔ کچھ کہو لعن طعن کرو۔ گالی گلوچ سے مجھے بے عزت کرو۔ میرے بچے مجھے سب منظور ہے۔ کیونکہ میں صدیقہ کا اور تمہارا مجرم ہوں۔ مجھے ایسی سزا دو کہ دنیا میرے عبرت ناک انجام کی۔ مثالیں دے ممکن ہے کہ اس طریقے سے کتنی ہی معصوم لڑکیوں کی زندگی عذاب بننے سے بچ جائے۔" وہ تڑپ اٹھے وہ اور کیا کہتی انہیں کون سی سزا سناتی۔ جبکہ وہ خود عدالت میں اقبال جرم کے ساتھ اپیل کر چکے تھے۔ اور یہ عدالت تو بیٹی کی تھی۔ باپ کو خاموشی سے دیکھتی رہی۔

"میں معافی کی عرض داشت لے کر کبھی بھی تمہارے پاس نہیں آؤں گا۔ مجھے سزا سنا دو۔" وہ پھر گویا ہوئے۔

"اگر میری ماں نے آپ کو معاف کر دیا ہے تو میں کون ہوتی ہوں سزا سنانے والی۔ ماں کے لبوں کی مسکان اور چہرے کی طمانیت اور سکون سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ انہوں نے آپ کو معاف کر دیا ہے۔"

"اگر تم میری زندگی کی حماقتوں کو سن کر مجھے باپ کے روپ میں قبول کرنا چاہتی ہو تو بیٹا میں تمہیں اک پرانی داستان جس کا انجام نہایت عبرت ناک اور روح فرسا ہے۔ سنائے دیتا ہوں۔ تمہیں میری کہانی سن کر میری سچائی پر رتی بھر شک و شبہ نہ ہو گا۔ کیونکہ من گھڑت اور جھوٹی کہانیوں میں اتنی پائیداری اور طاقت نہیں ہوتی کہ گرفت میں رہ سکیں۔ ڈھیلی پڑ کر جھوٹ کو نمایاں کر دیتی ہیں۔"

"جی۔" اس نے اثبات میں سرہلایا۔

"بیٹا ہماری شادی کے چھ مہینے ایسے بیت گئے۔ جیسے آنکھ کا جھپکنا۔ ہر دن ہنی مون کا گمان ہوتا تھا۔ میرے والدین کو اس شادی کی خبر تھی نہ ہی کسی طرف سے انہیں اطلاع ملی تھی۔ وہ اسی میں خوش تھے کہ بیٹا اک کامیاب ڈاکٹر بن کر واپس آئے گا تو وہاں دھوم دھام سے کسی ہندوستانی لڑکی سے شادی کر دی جائے گی۔" وہ تفصیل بتاتے ہوئے مسلسل آنسو صاف کر رہے تھے۔ حدیقہ انہماک سے سن رہی تھی۔ آصف جسے مجبوری کا نام دے رہے تھے۔ اس میں خود غرضی کی جھلک نمایاں تھی۔ قیل و قال کے بغیر ہی وہ اس گفتگو کے تمام پہلوؤں کے بارے میں سوچنے لگی۔ باپ نے اسے اپنی مجبوری کہا تھا۔ مگر کیا کوئی مرد اتنا بے بس بھی ہو سکتا ہے۔ کاش مائیں اپنی طاقت کا غیر مناسب استعمال نہ کریں تو اس دنیا کے بے شمار مسائل خود بخود ہی حل ہو جائیں۔ وہ متذبذب سی ہو کر سوچ رہی تھی۔ آصف بھی اٹھ کر اس کے پاس آکر بیٹھ گئے۔

"اب تو آپ مجھے پاپا کہنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کریں گی۔"

"آپ کی ایک غلطی نے آپ سے وابستہ ہر رشتے کو تہ و تیغ کر دیا۔ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ اگر غلطی سرزد ہو ہی گئی تھی۔ تو پھر اپنے فیصلے پر ثابت قدم رہتے۔ اللہ تعالیٰ نے مرد ذات کو مجبور اور بے بس پیدا نہیں کیا۔ آپ کیسے مجبور ہو گئے؟" وہ پژمردگی و آہستگی سے بول رہی تھی۔

"بیٹے میں تمہاری باتوں سے متفق ہوں۔ میری ایک بات غور سے سننا۔ بڑے بڑے سورما ماں کے سامنے کمزور اور مجبور پڑ جاتے ہیں۔ میں تو اک ناچیز اور حقیر سی ہستی ہوں۔ ماں کو کورٹ میرج کا بتا کر دکھی کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔"

"تو پھر آپ ماں کی آمادگی حاصل کر کے ماما سے شادی کرنے کا فیصلہ کرتے۔" وہ دکھ سے بولی۔

"وہ پاکستان کے خلاف تھیں۔ میں اپنی خواہش کا اظہار کر کے انہیں دکھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ انہیں ان سیکورٹی تھی بے پناہ محبت تھی مجھ سے اور مجھے صدیقہ سے بے پناہ محبت تھی اور اسے تو مجھ سے عشق تھا۔ ہم ایک دوسرے کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے

تھے۔ اس لیے تو کورٹ میرج کرلی۔ جب تمہاری نانی اسی دکھ میں چلی گئیں تو اپنی ماں کے تصور میں میرے ذہن نے ایسا پلٹا کھایا کہ میں اندھا اور بہرہ ہو گیا۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں نے اس کے بغیر پر مسرت زندگی گزاری ہے۔ گلٹی فیلنگز کا درد ایسا عجیب ہے کہ جیتے جی دل و دماغ کو مردہ کر دیتا ہے۔ انسان اک چلتی پھرتی لاش بن کر رہ جاتا ہے۔ میں نے موت اور زندگی کی یکجائی اپنی ذات میں محسوس کی ہے۔"

باپ کا شرمندگی میں جھکا ہوا سر اور آنکھوں میں جل تھل حدیقہ کو مزید آزردہ کر گیا۔ آخر وہ اسی کا خون تھی۔ خون حدت میں جوش کیسے نہ مارتا۔ مگر وہ کچھ بھی کہے بغیر کمرے سے نکل گئی۔



اپارٹمنٹ کی بیل پر حدیقہ چونک گئی۔ وہ لیپ ٹاپ پر اپنی اور ماں کی تصویریں دیکھنے میں اتنی محو تھی کہ بیل کی آواز پر وہ تقریباً" اچھل پڑی تھی۔ سوچنے لگی کہ کون ہو سکتا ہے۔ ساتھ ہی اس نے دروازہ کھولا اور ٹھٹک گئی۔

ڈاکٹر آصف زیدی ________ اس کے سامنے کھڑے تھے۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اور جسم کا ہر عضو دل کی دھڑکن بن کر بول اٹھا تھا۔

"اندر آنے کو نہیں کہو گی۔" وہ افسردگی سے بولے۔ تو اس نے باپ کو گہری نظروں سے دیکھا۔ وہ کس قدر کمزور اور لاغر لگ رہے تھے اور کتنے ہی بے ضرر۔

"کیوں نہیں کہوں گی؟" وہ سنجیدہ تھی۔ "گھر آئے مہمان کے لیے دروازہ نہیں کھولوں گی تو گھر کی تمام برکتیں مجھ سے روٹھ جائیں گی۔ آپ اندر تشریف لائیں۔"

وہ صوفے پر بیٹھ گئے۔ حدیقہ کچن میں چائے بنانے چلی گئی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا۔ جن رستوں سے باپ ہوتا ہوا آیا تھا۔ وہاں پھولوں کی چادر بچھادے اور اس پر پھول نچھاور کردے۔ جس رشتے کی تڑپ اور کسک نے اسے چڑچڑا پن بخشا تھا۔ آج وہ اس کے گھر میں اپنے قدموں سے چل کر آیا ہے۔ وہ چائے اور ساتھ بلیک فارسٹ کیک سامنے رکھ کر خاموشی سے بیٹھ گئی۔

"اپنے بیٹے سے ایک بار پھر التجا کرنے آیا ہوں۔ مجھے معاف کرکے سکون دے دو۔ صدیقہ تب ہی مجھے درگزر کرے گی۔" وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"پاپا مجھے گناہ گار مت کیجیے۔ ورنہ میری ماں جو آپ کی پرستار ہے۔ مجھ سے خفا ہو جائے گی۔ مجھے معاف نہیں کرے گی۔ میں آپ دونوں کے پاس رہنا چاہتی ہوں۔"

"اس مقدس ہستی اور بے لوث محبت کرنے والی ماتا کے صدقے مجھے معاف کر دو۔ اور ہمیں اکیلا مت چھوڑو۔ تم صدیقہ کی بیٹی ہو، جو بے حس اور خود غرض نہیں ہو سکتی۔ میں مانتا ہوں کہ میں نے تمہارا بچپن محرومی کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل دیا لڑکپن حسرت و یاس کی آگ میں جھونک کر تمہاری جوانی کا تماشا بنا دیا ہے تو ناقابل معافی جرم۔ پھر بھی میری عرض پر غور کرو اپنے ساتھ زندگی گزارنے کا شرف بخش دو۔ تم میری زندگی کی آخری تمنا پوری کر سکتی ہو کیونکہ تمام اختیارات کی تم مالک ہو۔ میرے بچے میں نے زندگی میں جو بھی پایا گنوانے کے لیے حاصل کیا تھا اب میں اپنی تقدیر میں لکھی ہوئی اس ٹریجڈی کو بدل دینا چاہتا ہوں۔ تمہیں پا کر کھونا نہیں چاہتا۔" وہ اس کے سامنے گڑگڑا رہے تھے۔

حدیقہ نے باپ کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"اللہ نہ کرے۔ ایسے مت کہیں۔" آصف نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگالیا اور حدیقہ باپ کی بے پناہ شفقت میں ڈوبی ہوئی خوشبو میں سرشار ہو اٹھی۔ تحفظ اور مضبوطی کے احساس کا مزا ہی کچھ اور تھا۔ اسے یوں لگا جیسے اب وہ دونوں ماں بیٹی اک ایسے سائبان کے نیچے آکر رک گئی ہیں۔ جہاں گرم اور یخ بستہ ہواؤں کا گزر تک نہیں۔



ٹورنٹو میں اپنی کمپنی اسٹارٹ کرنے سے پہلے وہاں کے تمام ہاسپٹلز کا وزٹ کر کے اس نے فیزی بیلٹی رپورٹ تیار کر لی۔ آصف زیدی نے اسے فون پر اس خبر کی اطلاع دی۔ کہ ریموٹ ایریا میں حال ہی میں ایک چیری ٹی اسپتال تعمیر ہوا ہے۔ وہاں کے بارے میں بھی غور و فکر کرے۔ ایک نیک کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں اس کی توجہ اور محنت کا ہاتھ ضرور ہونا چاہیے۔ یہ کنٹریکٹ ملتے ہی اس نے اپنے مقصد اور ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کی تمام تر محنت کو تیز کر دیا۔ اب وہ ماں کی طرف سے بے فکر تھی وہ اور بابا ایک دوسرے کی سنگت میں خوش تھے اس کے آئے دن چائنا کے ٹرپ لگنے لگے اور اس کی کمپنی روز بروز ترقی کرنے لگی۔

یہ خبر حدیقہ تک پہنچ گئی کہ خرم نے یہاں کسی اسپتال میں جاب کر لی ہے اور اپنے لیے الگ اپارٹمنٹ لے کر بسر اوقات کر رہا ہے۔ پیسے کی طمع اور اسٹیٹس کا لالچ تو اس کی گھٹی میں تھا ہی۔ وہ اپنی جلد بازی کی وجہ سے زندگی میں بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ ہارون بھی اپنی مستقل مزاجی کی وجہ سے دن بہ دن ترقی کی راہوں پر گامزن تھا۔ شیریں بھی اپنی جاب سے مطمئن اور خوش تھی۔ بلکہ ان کی ازدواجی زندگی میں اک ٹھہراؤ اور اطمینان آگیا تھا۔



خرم اسپتال سے اپنے اپارٹمنٹ پہنچا تو اپنی جائے قیام کا جائزہ لینے لگا۔ اجڑے پن کے ساتھ ہر طرف منتشر استعمال شدہ چیزیں اس کا منہ چڑا رہی تھیں۔ لونگ روم میں حسب ضرورت نہایت ہلکی کوالٹی کا سامان اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔ حدیقہ کی ترقی نے پہلے ہی اسے مضطرب اور ہراساں کر دیا تھا۔ اب اپنی حیثیت کا احساس کم مائیگی میں ابھر کر اسے سکون دل سے محروم کر رہا تھا۔ اس نے بیگ کندھے سے اتارا۔ بے دلی سے صوفے پر پھینکا۔ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کی اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ڈنر کیے بغیر ہی وہ بے سدھ اور بے ترتیب ہو کر بیڈ پر لیٹ گیا۔ اس کی حالت اس کے وجود کی توڑ پھوڑ کو نمایاں کر رہی تھی۔ کروٹیں بدل کر کبھی گھبرا کر کھڑکی میں کھڑے ہو کر باہر کی اسٹریٹ لائیٹس اور پارک شدہ گاڑیوں کو بے مقصد گھورنا اور منٹوں فریج کھول کر ایسے جھانکنا جیسے اس عمل سے فریج اسے من و سلویٰ فراہم کر دے گا۔ بھوک نے اسے بے حال کر دیا سیدھا اسٹیک ہاؤس چلا گیا۔ وہ گہری سوچ میں غرق تھا کہ وہ نہیں کھائے گا تو کوئی اصرار کر کے کھلانے پر رضامند نہیں کرے گا۔ کپڑے جیسے مرضی زیب تن کر لوں۔ کون ہے جو اپنی پسند کے کپڑے تیار کر کے میری دس خوشامدیں کر کے مجھے پہنانے کی کوشش کرے گا۔ دن بھر کی تھکن ہے کوئی ساتھی جو اپنے اندر سمو کر مجھے میٹھی اور پر سکون نیند سلائے گا۔ اس کا سر نفی کے انداز میں ہلا اور ویٹر کی آواز پر چونکا۔ کھانا آرڈر کر کے اس کی نگاہیں سامنے کھلنے والے مین ڈور پر جم گئیں۔ حدیقہ ریڈ اینڈ بلیک لانگ اسکرٹ اور بلاؤز میں ملبوس نہایت خوب صورتی سے بنا ہوا ہیئر اسٹائل اور تین انچ کی ہیل میں قد اور دراز لگ رہا تھا۔ ایسے لگا جیسے کوئی ماڈل گرل نپے تلے قدم اٹھاتی سب کو اپنے حسن و نزاکت سے امپریس کرتی شان بے نیازی سے چلتی ہوئی اس کے ساتھ والے ٹیبل پر بیٹھ گئی۔ وہ ایک دم سے یہ دیکھ کر چونک اٹھا۔ ایک ادھیڑ عمر کھچڑی نما بالوں والا پتلا دبلا مرد اس کے سامنے مسکراتا ہوا بیٹھ گیا۔ اسے وہ شکل شباہت اور رنگ سے ایشین ہی لگ رہا تھا۔ مگر اس کی حرکات و سکنات اور انداز گفتگو کے طور طریقے اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ وہ پیدائشی طور پر یہاں سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ مسلسل حدیقہ کو پیار بھری نظروں سے دیکھ کر مسکرائے جا رہا تھا۔

وہ غیر ارادی طور پر حدیقہ کی طرف چل پڑا۔ ذہن میں سوچوں کے مدوجزر برپا تھے۔ اب وہ ان کے قریب پہنچ چکا تھا۔ دونوں کی نظریں یکجا ہوئیں۔ حیرت کی پرچھائیوں کے ساتھ ان گنت شکوے اور شکایتیں ابھریں اور حدیقہ نے منہ دوسری طرف پھیر کر اس

سے گفتگو نہ کرنے کا سگنل دے ڈالا۔ مگر وہ نہایت نرم آواز میں بولا۔
"ہیلو حادی۔ ہاؤ آر یو۔" اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھادیا۔
"آئی ایم ڈاکٹر خرم فرام پاکستان۔" کیونکہ یہ نام انہوں نے حدیقہ سے سن لیا تھا مگر آصف زیدی ایک دم چوکنا ہو گئے۔ حدیقہ کے چہرے پر بے زاری تھی وہ چند ثانیے خاموش رہے پھر ہمت کر کے بولے۔
"آئی ایم ڈاکٹر آصف زیدی۔ ہر فادر۔" انہوں نے حدیقہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
حدیقہ کے پاپا کہاں سے آ ٹپکے۔ وہ شاک کی کیفیت میں گھر گیا۔ خرم مسلسل اسے دیکھے جا رہا تھا۔
"آیئے تشریف رکھیے۔ جاب کس ہاسپٹل میں ہے۔ پاکستان سے کب آئے۔ یہاں کون سے ایریے میں رہائش پذیر ہو۔" پانچ منٹ میں سوالات کی بھرمار پر حدیقہ متذبذب سی ہو کر دونوں کو دیکھنے لگی۔ وہ نہایت مہذب طریقے سے سوچ سمجھ کر جواب دے رہا تھا۔ کھانا ٹیبل پر پہنچ چکا تھا۔ خرم نے ایکسیوز کیا اور اپنی ٹیبل کی طرف بڑھ گیا۔ حدیقہ نے اسے رحم بھری نظر سے دیکھ کر خود کو لعنت ملامت کی اور کھانے میں بظاہر مصروف تو ہو گئی۔ لیکن دل میں ہلچل مچ گئی تھی۔ خرم نے حدیقہ کو ہنستے ہوئے دیکھا تو تلملا کر رہ گیا۔
"اب مجھے کیا کرنا ہے۔ کس سے مشورہ لوں۔ سب اپنے پرائے جو بن گئے ہیں۔ ہمدردیاں جتانے والے خود غرضی کا لبادہ اوڑھ کر غائب ہو گئے ہیں۔ کسی کو کیا پڑی ہے کہ میری زندگی کی غلطیوں کوتاہیوں اور جذباتی فیصلوں کی دکھ بھری داستان سن کر مجھے تسلی و تشفی دینے کی ضرورت محسوس کرے۔" اس نے سوچتے ہوئے بے دلی سے پیٹ کی آگ بجھائی اور ان کے جانے کا انتظار کرنے لگا۔ کیونکہ وہ ان کا پیچھا کر کے حدیقہ سے ملنے کے تمام بند رستے کھولنا چاہتا تھا۔ آج کے اس گولڈن چانس کو وہ مس کیوں کر کرتا۔ اس نے حدیقہ کو حاصل کرنے کا اٹل فیصلہ کر لیا تھا۔ دل مطمئن بھی تھا اور مضطرب بھی کہ وہ کس منہ سے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اپنے گناہوں کو تسلیم کر کے اپنی تمام تر کوتاہیوں کی معافی مانگے گا۔ وہ سوچے جا رہا تھا اور نظریں حدیقہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔



آج کی سرد رات میں حدیقہ عادتاً" کمبل لپیٹے مطالعہ کر رہی تھی۔ ورنہ جنت کے اس حصے میں سردی اور گرمی کا کبھی احساس ہی نہ ہوتا تھا۔ یہ تو انسانوں کی محنت سے تشکیل کی ہوئی بہشت تھی اللہ کی جنت کی تو شان و شوکت ہی کیا ہو گی۔ وہ ناول کا صفحہ پلٹ کر حیران رہ گئی کہ اس نے نجانے کیا پڑھا تھا۔ دل و دماغ میں تو خرم بسا تھا۔ محبت اور نفرت کے امتزاج میں ملوث اس کا شوہر۔ اس نے ناول کو سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور ذہن کو ہر طرح کی سوچوں اور خیالات سے عاری کرنے کی ناکام کوشش کی۔ تنگ آ کر اسے ٹیبل لیمپ آف کیا اور کمبل میں ایسے دبک کر آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔ جیسے نیند اسے حسین سبزہ زاروں میں لے جائے گی۔ مگر ایسا تو نہ ہوا۔ نیند تو کوسوں دور تھی۔ بھلا کیسے آتی؟ چند گھنٹے پیشتر اس نے اس خرم کو دیکھا تھا۔ جس کو اس نے ٹوٹ کر پیار کیا تھا۔ اس کی زیادتیوں پر بھی وہ اس کی ایک مسکراہٹ پر شیر و شکر ہو جایا کرتی تھی لیکن من کی تشنگی برقرار ہی رہی اس کی قربت میں۔
اس نے ان مشکل سوچوں سے نکلنے کی کوشش کی۔ مگر کامیابی نہ ہونے کی صورت میں وہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔ فرسٹ ایڈ کیبنٹ کھول کر اس نے ٹرنکولائیزر نکال کر کھائی اور دبے پاؤں اپنے کمرے میں آ گئی۔ مگر نیند پھر بھی کوسوں دور رہی تھی۔
"اف یہ شادی یعنی کسی مخالف جنس سے بندھ جانے کا نام ہے۔ بس صرف قید بامشقت کے سوا اور کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔" وہ بڑبڑائی تھی۔ نکاح کے چند بول عورت کو سرتاپا بدل کر ہر طرح کی قربانی کے لیے تیار کر لیتے ہیں۔ نہ نیند کی پروا نہ کھانے پینے کی

خواہش۔ اس کی قربت میں دن اور رات کا حساب ہی گڑبڑ ہو جاتا ہے۔ نہ دن گزرنے کا احساس نہ رات بیتنے کی خبر۔ وہ بھی کیا سہانے دن تھے۔ پلک جھپکتے گزر گئے۔ اس نے کروٹ بدل کر سوچا۔ مگر توہین آمیز لمحے کیسے جان لیوا تھے۔ کہ طویل ہی ہوتے چلے جاتے تھے اور ــــــ اب اللہ کے فضل و کرم سے دنیا کی کون سی نعمت میرے پاس موجود نہیں۔ ان تمام نعمتوں میں تیری شمولیت کے بغیر خلا محسوس کرتی ہوں کہ اس سہانے موسم میں ہم دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے دنیا کی نظروں سے او جھل ہو جائیں۔ وہ ایک دم اپنی اس سوچ پر چونک اٹھی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟ زندگی کس قدر حسین ہے۔ اس کو انجوائے کرو۔ بھول جاؤ خرم کو جس نے تمہیں سوائے بے وفائی کے اور کچھ نہیں دیا۔ اگر آج اس کی بیوی زندہ ہوتی تو یہ سنگدل انسان مجھے مڑ کر دیکھنا بھی گوارہ نہ کرتا۔ آج اپنی مسکینیت اور مظلومیت کو چہرے پر چسپاں کیے مجھے دھوکہ نہیں دے سکتا۔ گو تو ہیل۔" اس نے قدرے اونچی آواز میں کہا اور کمبل کھینچ کر سر تک لیا اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔



"حادی بیٹا! ڈاکٹر خرم میرے پاس بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگر اجازت دو تو ڈنر پر گھر لا سکتا ہوں۔" آصف نے نہایت پیار سے فون پر کہا تو وہ اچنبھے سے بولی۔

"پاپا! اسے بھگانے کی کوشش کریں گھر کا رستہ دیکھ لیا تو چوکھٹ اکھاڑ دے گا۔ مگر آنا بند نہ کرے گا۔"

"وہ تم سے ملنا چاہتا ہے۔" وہ آہستگی سے بولے۔

"مجھ سے کیوں پاپا؟" وہ بے اختیار ــ بولی۔

"میاں بیوی کا رشتہ ریشم کے دھاگے کی مانند نازک لیکن آئرن کی مانند اٹوٹ اور مضبوط ہوتا ہے۔ حادی بچے! اسے معاف کر دو۔ خرم برا انسان ہرگز نہیں۔ پچھلے تین مہینے سے میرے ساتھ کام کر رہا ہے۔ ہی از ایکسٹریملی گڈ ہیومن بی انگ؟"

"تین مہینے سے۔" حیرت سے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں "تو آپ کو اس نے مظلوم بن کر اپنی جھوٹی کہانی سنا دی ہے اور آپ نے بھی ون سائیڈڈ اسٹوری پر یقین کر لیا۔"

"ایسی بات نہیں ڈنر کے دوسرے دن ہی میں نے اسے اپنے پاس بلا کر اپنے شک کو یقین میں بدل کر اسے اسی اسپتال میں جاب دے دی تھی۔ مقصد اسے پرکھنا ہی تھا۔ میں نے اس کی روداد سنی ہے۔ باقی باتیں باپ بیٹی بعد میں کریں گے۔ فی الحال ابھی تمہاری طرف سے اجازت کی ضرورت ہے۔" آصف نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

"پاپا! یہ مجھ پر زیادتی ہے۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"وہ آپ کو استعمال کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ میں نے اسے منہ نہ لگانے کا تہیہ کر لیا ہے۔ وہ بخوبی جانتا ہے۔"

"بچے از راہ مجبوری اپنے تعلقات کو بحال کرنے سے زندگی مسرتوں کی آماجگاہ نہیں بنتی۔ بلکہ آزمائشوں کا کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل نکلتا ہے تمہیں صرف ایک چانس دینے کی التجا کر رہے ہیں۔ آمنے سامنے بیٹھ کر بات کرنے سے ان گنت مسائل حل ہو جائیں گے بیٹا۔ اتنی ہمت تو میرا بہادر بیٹا کر ہی سکتا ہے نا۔" وہ ملائمت سے بولے۔

"پلیز پاپا۔ آج انہیں ٹال دیجیے۔ پہلے ہم تینوں ماں باپ بیٹی بیٹھ کر آپس میں ڈس کس کریں گے۔ پھر ملاقات کے بارے میں سوچیں گے پھر یہ رشتہ نئے سرے سے قبول کرنے کا مجھے وقت چاہیے ہو گا۔" وہ بھی ملائمت سے بولی۔

"پاپا یہ دل ہی تو ہے۔ اس کو منانا کون سا آسان کام ہے۔"

"او کے ــــ او کے اس ویک اینڈ پر بلا لیتے ہیں۔ بار بی کیو کا خواب مزا رہے گا۔" وہ ہنس رہے تھے "دیکھتے ہیں۔ ابھی کچھ نہیں کہیے گا۔" وہ آہستگی سے بولی "مجھے سوچنے تو دیں۔"

"او کے" آصف نے پیار سے کہا۔

"بیٹا بات یہ ہے۔ میں حدیقہ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ اس کا ماضی کیسے گزرا تم بخوبی جانتے ہو۔ اسے میں نے ایک دو بار ـــــ کہا ہے۔ مگر اس کی طرف سے خاطر خواہ ری ایکشن نہیں تھا۔ تم ذرا صبرو تحمل سے کام لو۔ تمہاری امانت بہت ہی محفوظ اور پائیدار ہاتھوں میں ہے۔ جہاں اس کے بغیر اتنا عرصہ گزار لیا وہاں تھوڑا اور سہی۔ اب حدیقہ ہی یہ فیصلہ کرے گی کہ آیا وہ تمہیں معاف کرنے کی ہمت رکھتی بھی ہے یا نہیں۔ اس نے خود کو شب و روز اپنے کام میں اتنا بزی کر لیا ہے کہ مجھ سے بھی بات بمشکل ہو پاتی ہے۔ میں خود اس سے بہت نادم رہتا ہوں اور پچھتاوے کی ایک سلگتی آگ میں ہر طرح جلتا رہتا ہوں۔ کیونکہ میں نے واپس آنے میں بہت دیر کر دی۔ تم نے تو جلد ہی واپسی کا رستہ پکڑ کر بہت بڑی عقلمندی کی ہے۔" آصف حد درجہ سنجیدگی سے بول رہے تھے۔

"آپ نے درست فرمایا ہے۔ مگر رستہ بہت خاردار ہے۔ انکل میرے جسم کا پور پور زخمی ہو گیا ہے۔ ان کے درد کی شدت نے بے حوصلہ کر دیا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ حدیقہ کے پاس کس حق کے بل بوتے پر جاؤں ۔ کن عہد و پیمان کا واسطہ لے کر اسے مناؤں اور نئے وعدوں کی سچائی کا کیسے یقین دلاؤں۔ وہ پچھلے وعدے وعید کا حساب لینے بیٹھ جائے گی۔ تو پھر ان سوالات کا کیا جواب دوں گا۔ میرا ذہن اسی کشش و پنج میں جکڑا ہوا ہے۔ آپ ہی مجھے بتائیں کہ کیا کروں؟ ہاری ہوئی بازی کو کیسے جیت لوں؟ اب تو وہ مجھ پر اعتماد کر کے ایک بار پھر کیونکر رسک لے گی۔" وہ بہت دکھی لگ رہا تھا۔

"بیٹے یہ مرد ذات بڑی عجیب ذات ہے۔ عورت کے چہرے کا تل پسند آگیا تو اس کی تمام شخصیت کو اگنور کر کے ایک تل کے پیچھے چل پڑتا ہے۔ جب اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ تو وہی تل دور کہیں دور پس پردہ ـــ جا چھپتا ہے اور پھر اس کی پرسنالٹی کی ایک ایک خامی اور خوبی ابھرنے لگتی ہے۔ جنہیں وہ کسی صورت قبول نہیں کر پاتا اور اسے گھر کے غلیظ کونے کا حصہ بنا دیا جاتا ہے۔ جیسے گھر کا استعمال شدہ ناکارہ اور ناپسندیدہ فرنیچر کبھی یہاں تو کبھی وہاں۔ ضرورت اور استعمال کے مطابق اس کی جگہ تو بدل جاتی ہے مگر اس کی اہمیت میں قطعاً" فرق نہیں آتا۔ وہی بے مول پڑا رہتا۔ جس کی انسانی فطرت کے پیش نظر کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ یہ تمام باتیں جو میں کر رہا ہوں مجھ پر بھی لاگو آتی ہیں۔ کیونکہ میں نے بھی تو یہی کچھ کیا تھا صدیقہ کے ساتھ بلکہ میں نے تو اسے بالکل بے کار سمجھ کر ایسا ٹھکرایا کہ اس کی ضرورت کا احساس تک نہ ہوا۔

ہم دونوں کی مثال سے بڑی اور کونسی مثال ہو سکتی ہے۔" ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ انگلیوں کے پوروں سے تیزی سے آنکھیں پونچھ کر خرم کو دیکھنے لگے۔ وہ سر جھکائے اک ہارے ہوئے انسان کی طرح بیٹھا ان کی گفتگو سن رہا تھا۔

دونوں سوچ میں محو تھے۔ کمرے میں خاموشی طاری تھی۔

"تو پھر خرم بولو۔ اس ناقابل تلافی غلطی کو کیسے سدھارو گے؟" ڈاکٹر آصف نے خاموشی کو توڑتے ہوئے نہایت ملائمت سے کہا۔

"پیاسا کنویں کے پاس جانے کے لیے تیار ہے۔ آپ ہی کنویں تک جانے کا بند رستہ کھول سکتے ہیں۔ اس سے بہتر طریقہ میرے ذہن میں نہیں آرہا۔" خرم نے بے تابی سے کہا۔

"تم نے مجھے کافی مشکل کام دے ڈالا ہے۔ سوچتا ہوں کہ کیا اور کیسے اور کب یہ دھماکہ کیا جائے کہ وہ پریشان بھی نہ ہو اور مان بھی جائے۔"

"انکل آپ اس سے پوچھیے کہ کیا سچ مچ وہ مجھ سے نفرت کرنے لگی ہے۔ میری کج اداؤں دغابازی اور بدسلوکی کو فراموش کر کے مجھے اپنی زندگی میں شامل کرنے کی جتنی شرائط ہیں۔ مجھے قبول ہوں گی۔ انکل میں اسے پانا چاہتا ہوں صدق دل سے۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔

"اچھا میں کچھ سوچتا ہوں۔" انہوں نے کہا۔

لیچ کرتے ہوئے صدیقہ نے حدیقہ کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"بیٹا خرم تم سے ملنا چاہتا ہے۔" وہ تیزی سے کہہ کر ایسے ریلیکس ہو کر بیٹھ گئیں جیسے سر سے منوں بوجھ اتار پھینکا ہو۔

"وہ کس لیے۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"آئی ڈونٹ نو۔" وہ بظاہر لاپرواہی سے بولیں۔

"میں جانتی ہوں۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"تو پھر اسے کب کی ڈیٹ دوں۔" وہ بھی سنجیدگی سے بولیں۔

"میری زندگی کا ایک لمحہ بھی اس پر صرف کرنا سراسر زیاں ہے۔" وہ تلخی مگر آہستگی سے بولی۔

"بیٹا! تم عقل و شعور رکھتی ہو نشیب و فراز میں گزرا ہوا تمہارا ماضی اک بہت بڑے تجربے کا حامل ہے۔ پھر بھی تمہیں ریکوسٹ کرتا ہوں کہ اسے ایک بار چانس دے دو۔" اس بار پاپا نرمی سے بولے۔

"چانس...... اور وہ بھی خرم جیسے بے دید' بے لحاظ اور بے فیض انسان کو...... نہیں پاپا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔" وہ دکھ بھرے لہجے میں بولی۔

"اگر میں نے صدیقہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی تو کیا اس نے مجھے دھتکار دیا۔" وہ ملائمت سے بولے۔

"ہر گز نہیں پاپا۔ کیونکہ انہیں آپ کا ہر پل انتظار رہتا تھا۔ نجانے کیوں؟ جبکہ آپ نے آنے کا نشان چھوڑا تھا۔ نہ ہی وعدہ کیا تھا لوٹ آنے کا۔ لیکن پھر بھی منتظر رہتی تھیں۔ اس کی وجہ ہے۔" وہ کھانا کھاتے ہوئے بولی۔

"وجہ......؟" وہ سوالیہ انداز میں بولے۔

"آپ نے ان کی تذلیل نہیں کی تھی۔ ان پر ہاتھ اٹھا کر ان کی خودداری اور نسوانیت کو زخمی نہیں کیا تھا۔ چند دنوں میں ہی فیصلہ کیا اور چھوڑ کر آ گئے۔ جبکہ خرم نے ولیمے کے فوراً بعد ظلم و ستم ڈھانے شروع کر دیے تھے۔ پاپا وہ بزدل اور ڈرپوک شوہر فیصلہ ہی نہ کر پایا کہ مجھے چھوڑ دے۔ اب میرے پاس واپس کیونکر آئے گا۔ میں اس کی الزام تراشیوں کو فراموش نہیں کر سکتی۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"تمہیں پریشان کرنا ہمارا مقصد ہر گز نہیں۔ اس کی خواہش تم تک پہنچانا ہمارا فرض بنتا ہے بیٹا۔" حدیقہ سنجیدگی سے بول کر خاموش ہو گئیں۔

"آپ کا دل کیا کہتا ہے۔" وہ سوچتے ہوئے بولی۔

"جسٹ ون چانس۔" وہ آہستہ سے بولے۔

"آپ نے ایسا کیسے سوچ لیا۔" وہ حیرت سے بولی۔

"میں نے خود کو اس کے سانچے میں ڈھال کر بہت گہرائی سے سوچا ہے۔ عورت گھر آباد کرتی ہے۔ اس میں مسرتوں کے شوخ و شنگ رنگ وہ بھرتی ہے۔ مرد کیا جانے یہ آرٹ۔"

وہ لمبی آہ بھر کر بولے۔

"تمہاری ماں ایسی عورت تھی کہ وہ میرا گھر تو کیا خاندان سنوار دیتی۔ بہت زیرک اور سمجھ دار خاتون تھی۔ مجھ سے پیار ہی اس کا گناہ بن گیا۔ اسی جرم میں بے چاری بری طرح قید و بند کی صعوبتوں کے شکنجے میں جکڑ گئی۔ میں نہیں چاہتا کہ تم بھی ایک تنہا اور بے مقصد و بے معنی زندگی گزارو۔ تمہارا باپ ہوں تمہاری بہتری ہی چاہوں گا۔ اگر تمہیں مجھ پر بھروسہ ہے تو۔" وہ ان کا ہاتھ پکڑ کر سر جھکا کر رو دی۔

"اگر آپ کی یہ خواہش ہے تو میں خرم سے مل لیتی ہوں۔ مجھے پہلی ملاقات میں ہی اندازہ ہو جائے گا کہ وہ کیا چاہتا ہے؟" وہ یہ فیصلہ سنا کر چپ ہو گئی اور آصف اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر تسلی دیتے رہے۔

☆ ☆ ☆

"آج وہ آفس سے جلدی گھر آ گئی تھی۔ تیار ہو کر اس نے آئینے میں اپنا سراپا دیکھا۔ دکھوں اور کرب ناک مسافت طے کرنے کے باوجود وہ بہت فریش لگ رہی تھی۔ من کی معصومیت اور شرافت تھی جو

چہرے سے عیاں ہو رہی تھی۔ اس نے کالے رنگ کی کامدانی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ گوری اور پنک گردن پر ڈائمنڈ کا چھوٹا سا لاکٹ اور کانوں میں ڈائمنڈ کے ٹاپس میں وہ بہت گریس فل لگ رہی تھی۔ میک اپ چھوڑے ایک زمانہ بیت گیا تھا۔ آج اس نے اپنے گلابی بھرے ہوئے خوب صورت ہونٹوں پر ریڈ لپ اسٹک لگائی۔ خمار آلود ــــ آنکھوں میں کاجل کی ہلکی سی لائن لگا کر اسے عجیب لگ رہا تھا۔ کچھ سبکی سی بھی ہو رہی تھی۔

ماما پاپا سے نظریں چرائے وہ باہر نکل گئی۔ اسے جاتا ہوا دیکھ کر وہ دونوں دل ہی دل میں مسکرا دیے۔ اس پر بے تحاشا پیار آنے لگا۔

"بالکل ماں کی طرح معصوم اور پاکیزہ ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میرا دل رکھ لیا۔ میری زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کو اہمیت دے ڈالی۔"

"آخر بیٹی کس کی ہے۔" وہ صدیقہ کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہے تھے۔ انہیں بیتے ہوئے لمحے یاد آنے لگے۔ چہرے پر مسکراہٹ اور طمانیت تھی۔ شام گہری ہو رہی تھی۔ آسمان پر کہیں کہیں بادل کے ٹکڑے سرگرداں تھے۔ چاند ان سے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے شریر لگ رہا تھا۔ وہ دیکھتے ہوئے مسکرا اٹھے۔ آصف کو وہ رات یاد آگئی جب آسمان پر ایسا ہی کھیل جاری و ساری تھا۔ اور انہوں نے صدیقہ کو بانہوں میں بھر لیا تھا۔ گردوپیش کی خبر تھی نہ ہی چاند تاروں سے پردہ تھا۔ وہ میٹرس پر ایک دوسرے کے دلوں کی آواز سنتے ہوئے سحر میں گم ہوتے چلے گئے۔ کیا یہ محبت تھی عشق تھا' دیوانگی اور جنون تھا یا دو جسموں کی ضرورت تھی۔ وہ خود سے سوال کیے جا رہے تھے۔ اور اندر سے جواب آیا تھا کہ یہ محبت تھی۔

☆ ☆ ☆

یہ سوچ کر اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی کہ وہ خرم کا سامنا کیسے کرے گی۔ کیا وہ اسے سختی سے انکار کر سکتی

ہے۔

"میں یہ تسلیم کرتی ہوں کہ میں تمہاری قربت کے بغیر بھی تمہارے نام کو جیتے زندگی بتا سکتی ہوں۔ کیونکہ مجھے گزرے ہوئے کل میں بھی تم سے بے تحاشا پیار تھا اور تم آج بھی میرے دل کے نہاں خانوں میں چار سال کی دوری اور جدائی کے باوجود آباد ہو۔ تمہاری دغا بازی اور بے وفائی کے باوجود میں تمہیں بھول نہیں سکی۔ مجھ سے تحفظ اور سائبان چھین کر تم نے پلٹ کے نہ دیکھا کہ دیار غیر میں میں کس حال میں ہوں۔ بیچ منجدھار میں چھوڑ کر لاتعلق ہو گئے یہ دکھ معمولی نہ تھا۔ اس درد کی شدت سے نکلنے کے لیے میں نے کتنی محنت کی ہے۔ یہ میں ہی جانتی ہوں اس محنت نے میری روح تک کو تھکا دیا ہے۔

میری شخصیت میں آج بھی ادھورا پن موجود ہے۔ کیونکہ میرا بچپن جو باپ کی محرومی کے احساس میں نامکمل اور ادھورے پن کا شکار رہا۔ جوانی تلخیوں اور کڑواہٹ کے ساتھ گزری۔ تو تم میں خود کو مکمل ہوتے دیکھا۔ مگر تم... کیا کیا تم نے میرے ساتھ؟ اک عمر گزارنے کے بعد اب تم مجھے وفا کی پتلی اور ایثار و پیار کی دیوی کا نام دینے لگے ہو۔ اپنے تھکے ہوئے وجود کے ساتھ میں اپنا تار تار گھونسلا کس بل بوتے پر دوبارہ تعمیر کر سکتی ہوں۔ وفا' ایثار' محبت و لگاوٹ کے تنکوں کو کہاں تلاش کروں؟ اف یہ تو اپنے وجود میں گردش کرنے والے خون میں ہی سرائیت کرتے رہتے ہیں جنہیں میں نے خون سے نکال کر جلا دیا۔ اب اس کی راکھ سے گھونسلا کیسے بن سکتا ہے گھونسلے کا ہر تنکا ایثار و وفا سے مضبوط اور اٹوٹ بنتا ہے اور انہی کی مضبوطی سے ایک محل تعمیر کیا جاتا ہے۔ جس پر کوئی اندھی اور تیز و تند طوفان اثر انداز نہیں ہوتے۔ دھوکے اور جھوٹ کی بنیاد پر ہمارا گھونسلا ہلکی سی جنبش سے ملیا میٹ ہو جائے گا۔" وہ سوچ کر کانپنے لگی

"جب اللہ تعالیٰ مجھے گولڈن چانس دے رہا ہے تو فائدہ اٹھانا میرا حق بنتا ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے بنے نہ ہوتے تو آج قسمت ہم پر تمام راہیں یوں نہ کھول دیتی۔ آج کی شناخت کرو کل سے بے فکر ہو جاؤ۔"

وہ اپنے ذہن میں ابھرنے والی تمام مثبت و منفی سوچوں کو کھرچ کر گاڑی ڈرائیو کرنے لگی۔



"حدیقہ اتنی دیر کر دی۔ میں کب سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ تم نے دو بجے آنے کا وعدہ کیا تھا نا۔"

"دیر سے ہی سہی آ تو گئی۔ حالانکہ مجھے آنا نہیں تھا

"کیا تم مجھ سے اب تک ناراض ہو۔" خرم نے شکوہ کیا "بات ناراضی کی نہیں۔"

"تو کیا بات ہے۔" خرم نے اس کی بات کاٹی۔

"بات یہ ہے میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔" حدیقہ نے اٹکتے جھجکتے اپنا جملہ مکمل کیا۔

"تم اپنا یہ فیصلہ میری آنکھوں میں دیکھ کر سنا دو۔ میں تمہاری بات مان جاؤں گا۔" خرم نے نرمی سے کہا۔

"یہ میرے لیے ممکن نہیں۔ میں نہیں کر سکتی یہ۔" حدیقہ نے سختی سے کہا۔

"اسی لیے نا کہ تمہارے دل میں اب بھی میری محبت ہے۔ مگر تم اس بات کو قبول نہیں کر رہیں اور ضد میں آکر خود سے بھی انتقام لے رہی ہو اور مجھ سے بھی۔" حدیقہ کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں مری ہوئی آواز میں بولی۔

"خرم آپ نے بہت دیر کر دی۔ میں آپ کے قابل نہ تو پہلے تھی نہ ہی اب ہوں۔ جس حدیقہ کو آپ اپنانا چاہتے ہیں وہ تو اس دن قتل کر دی گئی تھی۔ جس دن آپ نے دوسری شادی کر لی تھی۔ اب حدیقہ ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گی۔ وہ چار سال کی دوری

اور جدائی کی مسافت طے کرتے کرتے راہوں کی دھول بن کر فضاؤں میں تحلیل ہو چکی ہے۔ وہ پہلے بے حیثیت نہیں تھی۔ آج بے وقعت ہوگئی ہے۔ آپ کی جدائی کرب تنہائی اور آپ کی طرف سے بے اعتنائی نے میری روح کو بھی تھکا دیا۔"

"حادی تم جس ماں کی بیٹی ہو۔ اسے ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں۔۔۔۔" وہ حیرت سے بولا۔

"میری ماں بہت عظیم عورت ہے۔ وفا و ایثار اس کا ایمان اور محبت و چاہت اس کا مذہب ہے کوہ ہمالیہ کی مانند مضبوط اور بلند ہے۔ وہ ایک ایسا نگینہ ہے جس میں فقط وفا کا رنگ منور ہے۔ کاش میں ان جیسی ہوتی۔" وہ حسرت و یاس سے بولی۔

"حادی! تم۔۔۔ اپنا مقام معلوم کرنا چاہتی ہو تو میرے دل میں جھانک کر دیکھو۔ تمہارا درجہ بہت اعلا ہے۔ گوہر وفا ہو تم، محبتوں اور لگاوٹوں کا سرچشمہ ہو تم ۔ مجھے فیضیاب ہونے کا موقع دو فقط ایک بار میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔" وہ التجائیہ لہجے میں بولا۔

"میرے ساتھ ایک ننھی سی گڑیا بھی تمہارے سینے سے لگنے کو باہیں پھیلائے منتظر ہے۔ اس کا مان رکھ لو۔"

"یہ فیصلہ میں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔"

"گڑیا کے لیے میں ایک بہترین مثال نہیں ہوں خرم ۔ مجھے اتنا اعلا مقام سونپ کر شرمندہ مت کریں۔ میں بہت تھک گئی ہوں خرم اب مجھ میں بے وفائی، بے زاری سہنے کی ہمت نہیں۔ میں نئے سرے سے زندگی نہیں گزار سکتی۔ مجھ سے کوئی سوال مت کیجیے گا۔" وہ سختی سے بولی۔

"میں تمہارا مجرم ہوں سزا کا حق دار ہوں تم جو چاہے سزا دو میں اف نہیں کروں گا مگر خود کو مجھ سے الگ نہیں کرو تم جو بھی ہو۔ جیسی بھی ہو۔ میری حدیقہ ہو۔ میری زندگی کا ساتھی اور رازداں۔ میرے دل کا سکون اور روح کی ٹھنڈک ہو۔ میری نئی نسل کا نام اور پہچان تم سے ہی چلے گا۔ حادی آئی لو یو۔" وہ جذباتی سا ہو گیا۔

"خرم مجھے معاف کر دیجیے۔ اس پیار، وفا اور چاہ کے صدقے میں۔ جو ہر حال میں زندہ جاوید رہی۔ خرم عورت مرد کی کھیتی ہے۔ اگر آپ نے اپنی کھیتی میں پیار و محبت کے بیج بوئے ہوتے تو آج محبتوں کے تناور درختوں کے سائے میں ہم ستا رہے ہوتے مگر آپ کی جلد بازی اور غصے کی وجہ سے ہم دونوں ہی کھلے آسمان کے تلے ننگے سر اور برہنہ پا چلتے ہوئے حیات کے آخری سرے تک پہنچ گئے ہیں اب نئے امتحان دینے کی مجھ میں ہمت ہے نہ سکت۔" وہ زارو قطار رو رہی تھی۔ اس پر رحمتوں کا دروازہ کھل گیا تھا۔ مگر اندر جانے کی ہمت نہ تھی۔

"حادی محبت کی کبھی انتہا نہیں ہوتی۔ کبھی موت لاحق نہیں ہوتی۔ جسم مرجاتے ہیں۔ روح ازل سے ابد تک زندہ رہتی ہے۔ تمام خدشات سے باہر نکل آؤ پلیز۔ میں اپنی ہر غلطی مانتا ہوں۔" وہ پیار بھرے لہجے میں بولا۔

"ذرا اپنے دل سے پوچھو کہ میں وہاں موجود ہوں کہ نہیں۔"

"آپ سے دور ہو کر بھی میں نے خود میں آپ کو موجود پایا ہے۔ آپ میرے پاس ہی تھے ہمیشہ۔" حدیقہ نے مستحکم لہجے میں کہا۔

"تو پھر اس دوری کو ختم کردو اور میرے پاس چلی آؤ پلیز۔۔۔ تمہیں اس محبت کا واسطہ جو تمہیں مجھ سے ہے۔ تم نے کبھی میرا کہا نہیں ٹالا تو یہ آخری بات بھی ضرور مانو گی،" حدیقہ نے ہار مانتے ہوئے کہا۔

"ہاں آپ کے بغیر میں نہیں جی سکتی آپ کے بغیر میری زندگی نامکمل ہے۔"

"آئی لو یو حدیقہ۔" اس نے میز پر رکھے حدیقہ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ چہرے پر سکون تھا۔ طمانیت تھی اور اب پرسکون زندگی ان کی منتظر تھی۔



صبا جاوید



سورج دن بھر چمکنے کے بعد مغرب کے کناروں پر ڈوبتا نظر آرہا تھا اور شفق کی نارنجی سرخی آسمان کے کناروں پر پھیل چکی تھی۔ ہر شے پرسکون ہوتی جارہی تھی۔ درختوں کی ٹہنیاں جو دن بھر جھومتی رہی تھیں' اب تھک کر سر جھکا رہی تھیں۔ فضاؤں سے ٹھنڈک اتر رہی تھی اور ماحول میں خنکی بڑھتی جارہی تھی۔ سورج کی کرنوں کی تمازت ختم ہوچکی تھی اور دھیرے دھیرے شام کا ساکت وجامد منظر بھی اندھیرے کی سیاہ چادر میں چھپتا جارہا تھا۔ تاریکی ویسی ہی تھی ہولناک اور پرسوز' کوئی درد کا راگ الاپتی' بظاہر خاموشی میں سوگ ماتم بچھائے کبھی جان لیوا اور اداس تو کبھی جامد وچپ چاپ اور بے بسی کی المناک تصویر۔

مشعال رویم ٹیرس پر کھڑی ان تمام کیفیات کو اپنے اندر اترتا محسوس کررہی تھی۔ شام اور شب کے وصل میں اندھیرے کا تال میل اور مغموم سی اداسی اسے خوب بھلی محسوس ہورہی تھی۔ نہ جانے کتنی دیر سے وہ اس تاریکی سے محو گفتگو تھی۔

''مما۔۔۔ مما کہاں ہیں آپ؟'' رباب رویم اس کی اٹھارہ سالہ بیٹی کی زندگی سے بھرپور شوخ اور کھنک دار آواز نے اسے ماضی کے گرداب سے حال کے دامن میں لا پٹخا۔ اس نے ایک ٹھنڈی آہ سینے سے خارج کی اور مسکراتے ہوئے رباب کی طرف پلٹی۔ جو اسے ڈھونڈتے ہوئے ٹیرس پر ہی آچکی تھی۔

''کیا بات ہے رباب؟''

''مما۔۔۔ یونو میں آپ کو کب سے ڈھونڈ رہی ہوں' مجھے آپ سے بہت ضروری کام ہے۔'' وہ مشعال رویم کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے آئی' جو اس کا اور مشعال کا مشترکہ کمرہ تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کے ساتھ بیڈ پر ٹک گئی۔ ''مما آپ یہاں بیٹھیں' میں ابھی آتی ہوں۔'' اسے بٹھا کر وہ خود اسٹڈی روم میں گھس گئی۔ چند لمحوں بعد وہ ہاتھ میں رزلٹ کارڈ لیے برآمد ہوئی۔

''سی مما۔۔۔ میرا مڈٹرم رزلٹ آگیا۔'' وہ خوشی سے چہک رہی تھی۔ مشعال نے محبت سے اس کے خوشی سے لبریز دمکتے چہرے کو دیکھا اور رزلٹ کارڈ تھام لیا۔

نتیجہ حسب توقع تھا۔ اس نے ہر سبجیکٹ میں اسی فیصد سے زائد نمبر حاصل کیے تھے۔ مشعال کے روم روم میں ٹھنڈک اتر گئی۔

''میں جانتی تھی میری بیٹی شاندار کامیابی حاصل کرے گی' کیونکہ وہ ہے ہی اتنی انٹیلی جنٹ۔'' مشعال نے محبت سے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور اسے خود میں سمیٹ لیا۔

''مجھے امید ہے آپ فائنل میں بھی ایسی ہی پرفارمنس دو گی۔''

''آف کورس مما۔۔۔'' اس نے وثوق سے کہا۔

''مما آپ خوش تو ہیں نا۔'' اس نے کسی خدشے کے پیش نظر استفسار کیا۔

''کیوں نہیں مما کی جان۔۔۔ مما بہت خوش ہیں' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بہت خوب صورت اور ذہین رباب سے نوازا ہے۔'' مشعال نے نرمی سے اس کے رخساروں کو چھوا۔

''مما۔۔۔ آج رات کے لیے ڈنر میں تیار کروں گی اور برتن بھی صاف کردوں گی' آپ ریسٹ کریں۔''

"کیا... آپ اور وہ بھی برتن..." مشعال اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کی گھر کے کاموں سے جان جاتی ہے۔ لہٰذا حیران ہونا ایک فطری سا عمل تھا۔

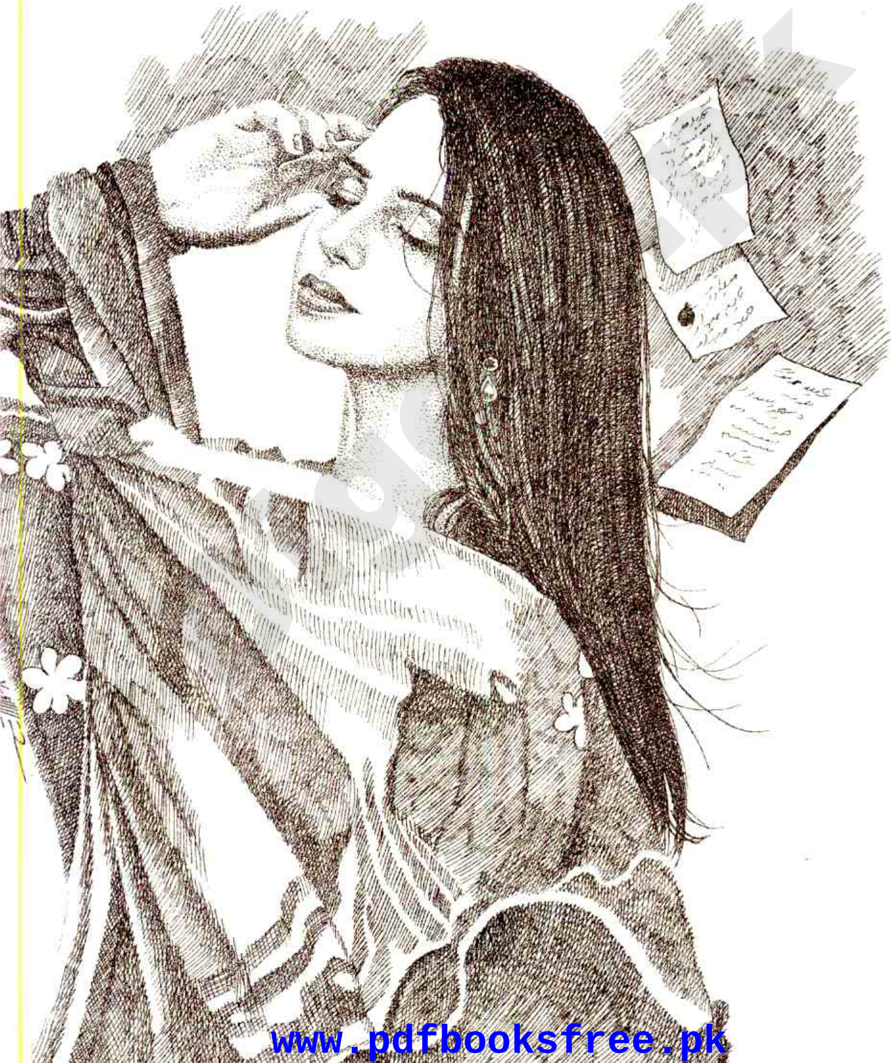
"آپ کے کپڑے بھی پریس کردوں گی، صبح ناشتے کے لیے آٹا بھی گوندھ کر رکھ دوں گی۔" اس نے مزید گوہر افشانی کی۔ مشعال ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں سمجھ گئی کہ اسے کسی چیز کی ضرورت ہے۔ جسے پانے کے لیے وہ معصوم سی رشوت سے مشعال کو بھانے کی کوشش کررہی تھی۔

"رباب کیا چاہیے آپ کو؟"

"مما آپ کو کیسے پتا چل جاتا ہے کہ مجھے کس وقت کیا کہنا ہوتا ہے۔" ماں کے درست اندازپر وہ جی بھر کر حیران ہوئی۔

"وہ دراصل میں آپ کی ماں ہوں نا اس لیے۔" مشعال نے شرارت سے کہا۔

"وہ... ایکچوئیلی ہمارا ٹرپ جارہا ہے ناردرن



ایریان۔۔۔ مما۔۔۔ مجھے بھی جانا ہے۔" اس نے لاڈ سے مشعال کے گلے میں بانہیں ڈال کر فرمائش کی۔

"سوری۔۔۔ رباب آپ نہیں جاسکتیں۔" اس نے نگاہیں جھکائے جھکائے نفی میں سر ہلایا۔ بیٹی کے چہرے پر چمکتے ستاروں کو نوچنا اس کے لیے آسان نہ تھا۔ اس کی معصوم نگاہوں میں شفاف موتیوں سے قطرے اسے تکلیف میں مبتلا کر دیتے تھے۔ وہ تو خود حالات کے دھارے میں وقت کی بساط پر بہہ رہی تھی۔ اس کا وجود وقت اور حالات کے مابین تلوار کی طرح لٹک رہا تھا۔ وقت کا یہی تقاضا تھا کہ رباب اس کے سائے سے بھی دور نہ ہو۔ اس نے دل پر پتھر رکھتے ہوئے درشتی سے انکار کر دیا۔

"لیکن مما میری ساری فرینڈز جارہی ہیں۔ ان کے پیرنٹس نے تو انہیں نہیں روکا۔" اس نے معصوم سی دلیل پیش کی۔

"کیونکہ ان کے پیرنٹس ہیں رباب اور تمہاری صرف ماں ہے۔" وہ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہ پائی اور محض سوچ کر رہ گئی۔

"انہیں جانے دو مگر تم نہیں جاؤ گی۔" مشعال نے تردید کی اور اٹھ کر بے وجہ دبیز پردے درست کرنے لگی۔

"مما کیا وجہ ہے آخر۔ آپ ہر وقت مجھے اپنے پلو سے باندھ کر کیوں رکھنا چاہتی ہیں؟ کیا آپ کو پیسوں کی پرابلم ہے؟" وہ بے بسی سے بولی۔ اس کی بے بسی اب ہٹ دھرمی اور ضدی پن اختیار کر چکی تھی۔ مشعال جسے ابھی تک بچی سمجھ رہی تھی وہ اب بچی نہیں رہی تھی، وہ اپنی ماں سے بازپرس کرنے لگی تھی۔ مشعال کو بے پناہ حیرت نے آن گھیرا۔

"رباب۔۔۔" وہ محض اتنا ہی کہہ پائی۔

"سوری مما۔" شاید اسے بھی اپنے الفاظ کی سنگینی اور غیر موزونیت کا احساس ہو چکا تھا۔ فوراً" ندامت سے سر جھکا گئی۔

"رباب۔۔۔ کیا کبھی آپ کی خواہشات کو میں نے پیسے کے نام پر دبایا۔ آپ ابھی چھوٹی ہو اکیلے کیسے بھیج دوں۔ وہاں آپ کا خیال کون رکھے گا۔"

رباب کی آنکھوں کے گوشوں سے ابھرتی نمی کو دیکھ کر وہ کچھ نرم پڑ گئی۔

"میں اکیلی کہاں جارہی ہوں مما۔۔۔ اتنی ساری لڑکیاں جائیں گی۔ ہمارا کالج اسٹاف بھی ہوگا۔ آپ کیسی ٹپیکل ماؤں والی باتیں کر رہی ہیں۔"

اس نے جھنجلا کر توجیہہ پیش کی۔ مشعال نے ایک تفصیلی نگاہ رباب کے سراپے پر ڈالی۔ دراز قد، شہابی رنگت، سیاہ چمک دار آنکھیں، خمیدہ لب، شیشے کی طرح شفاف اور سانچے میں ڈھلا وجود، چہرے سے چھلکتی معصومیت اور بانکپن، وہ خوب صورتی و معصومیت کا حسین امتزاج لگ رہی تھی۔ مشعال رویم نے بے ساختہ اس کے ملکوتی حسن سے نگاہیں چرائیں۔ اس نوخیز حسن و رعنائی کے ہمراہ وہ کیسے اسے اپنی چھتر سایہ سے دور بھیج دیتی۔ اگر کوئی مضبوط سہارا ہوتا تو یقیناً" اس کا فیصلہ آج مختلف ہوتا۔ وہ تنہا ناتواں وجود یہاں تو اسے کچھ حد تک تحفظ فراہم کر سکتا تھا مگر وہاں نہیں۔ کالج انتظامیہ نے تحفظ کا بھرپور یقین دلایا تھا۔ مگر اس کا دل سینے میں خوف سے پھڑپھڑا کر رہ جاتا۔ اکیلی عورت جنگل میں بھیڑیوں کے لیے آسان شکار ہوتی ہے۔ یہ دنیا ایک جنگل ہی تو ہے۔ جس میں انسانوں کے خول میں بھیڑیے چھپے ہیں اور اپنی اصلیت کی پردہ پوشی کر رہے ہیں جہاں کہیں موقع میسر آئے تو یہ بھیس اتار پھینکتے ہیں۔ مگر وہ یہ بات اس لاابالی اور خواہشوں کے بھنور میں ڈوبتی سنبھلتی لڑکی کو نہیں سمجھا سکتی تھی۔ جس کا ذہن ابھی ان باتوں کو سوچنے اور پرکھنے کے لیے بہت چھوٹا تھا۔

"رباب کیا تم اتنی بڑی ہوگئی ہو کہ اپنی ماں کے فیصلے سے اختلاف کرو اور اس سے بازپرس کرو۔" اپنی عمیق سوچوں کو خیرباد کہتے ہوئے وہ فی الوقت اصل مدعا کی طرف آئی۔ مشعال نے ایک تیکھی نگاہ اس کے شدت گریہ سے سرخ پڑتے چہرے پر ڈالی۔

"مما پلیز۔۔۔" اس نے گویا التجائی آنسوؤں کو پینے کی کوشش میں الفاظ منہ میں ہی ٹوٹ کر بکھر گئے اور

آواز اندر ہی دم توڑ گئی۔

"رباب میں نے کہا نا تم ابھی چھوٹی ہو تمہارا وہاں خیال کون رکھے گا؟"

"مما میں کوئی بچی نہیں ہوں جو اپنا خیال خود نہیں رکھ سکتی۔ جسے ہر آن کسی کے سہارے کی ضرورت ہو' میں جانتی ہوں آپ کو تنہائی سے خوف آتا ہے۔ تو یہ تنہائی اور بے سرو سامانی بھی تو خود آپ نے اپنی تقدیر میں رقم کی ہے۔ آپ کے ایک فیصلے کی وجہ سے میں بھی تنہائی کا عذاب جھیل رہی ہوں۔ زندگی کا ہر قدم ہزاروں واہمے اور خدشات من میں سمیٹے اٹھاتی ہوں۔ مجھے اپنی ذات کا اعتماد حاصل نہیں ہر لحظہ ایک نئے خوف سے نبرد آزما ہوتی ہوں۔ آپ کو وفا نہیں ملی تو اس میں میرا کیا دوش؟ کیا ہر بار آپ کا خوف' تنہائی اور بے بسی میری خوشیوں کے آڑے آئے گی۔ کاش میرے بھی پاپا ہوتے تو اس قدر تلخ اور کٹھنائیوں بھرے راستے عبور ہی نہ کرنے پڑتے۔"

اس نے تڑخ کر کہا۔ مشعال اس کے لب و لہجے اور الفاظ پر ششدر تھی۔ وہی خود سری' وہی ضد' وہی ہٹ دھرمی۔ وہ تو اس کا پرتو تھی۔ خدوخال وہ مشعال رویم کے چرا لائی تھی۔ مگر مزاج کی قطعیت اور طبیعت میں طنطنہ تو اسی شخص کے تھے۔ جس سے وہ اٹھارہ برس سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے لگا وہ اٹھارہ برس بعد بھی اس شخص کی عدالت میں مجرم بنی کھڑی ہے۔ وہ چند لمحوں میں نہ جانے کون کون سے گناہ اس کے دامن میں ڈال گئی۔

"میں بھی خوشیاں کشید کرنا چاہتی ہوں' اس خلا کو پر کر دینا چاہتی ہوں' محبت محسوس کرنا چاہتی ہوں۔ مضبوط سائبان تلے پروان چڑھنا....."

"تڑاخ...." مشعال کے زناٹے دار تھپڑ نے اس کی چلتی زبان کو یکدم بریک لگا دیا۔ اس کے دل و دماغ کی کھڑکیاں بڑی تیزی سے کھلی تھیں۔ اس کی شہد آگیں آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھر گئیں۔ دائیں ہاتھ سے رخسار کو چھو کر اس نے گویا خود کو یقین دلایا۔ لب ہولے ہولے لرز رہے تھے۔ وہ حق دق ماں کی شکل دیکھ رہی تھی۔ جہاں اک شکست خوردہ سا احساس عجیب سی توڑ پھوڑ مچا رہا تھا۔ موتی ٹوٹ ٹوٹ کر دامن میں بکھر رہے تھے اور ایک لفظ بھی ادا کیے بغیر مشعال کمرے کی حد عبور کر گئی۔ اس کے نکلتے ہی رباب جیسے ہوش میں آئی۔ ایک لمحے میں اسے اپنے الفاظ کی غیر موزونیت کا احساس ہوا۔

"مما.... مما پلیز.... پلیز مجھے معاف کر دیں۔"

وہ جو پتھر کی مورت بنی ساکت کھڑی تھی چلاتی ہوئی مشعال کے پیچھے لپکی۔ جس طرح کمان سے نکلا ہوا تیر واپس نہیں آتا' اسی طرح زبان سے ادا ہوئے لفظ بھی نہیں لوٹتے' شاید بہت دیر ہو چکی تھی۔



ساری رات عجیب بے کلی اور بے چینی طاری رہی۔ اس کی بیٹی جو متاع حیات تھی اس کے فیصلے کے خلاف تھی۔ اس کے منہ سے ایسے الفاظ اور بدگمانی کے بادلوں میں ہچکولے لیتی خود ساختہ باتیں اسے دکھ و یاسیت کی ہولناک کھائی میں منہ کے بل دھکیل گئیں۔ دل کو کسی طور قرار نہیں تھا۔

خواہشات تو اسپرنگ کی مانند ہوتی ہیں۔ انہیں جتنا دبایا جائے یہ اتنی ہی شدت سے ابھرتی ہیں۔ رباب ایک نوجوان لڑکی تھی۔ امنگوں سے بھرپور آرزوؤں کے ستارے آنچل میں ٹانکے۔ وہ اس طرح روک ٹوک' سختی یا نرمی سے اس کے معصوم اور شوریدہ سری کے بھنور میں ڈوبتے ابھرتے جذبات پر بند نہیں باندھ سکتی تھی۔ ہر دور کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں اور وہ عمر کے اس دور میں تھی جب سب کچھ پالینے کی چاہ میں کچھ کھونے کا ڈر نہیں رہتا۔ یہ بے فکری' آرزوئیں' بے کل کرتے جذبات' جوانی کی دہلیز کو چھونے کا بانکپن' خواب اور ان کی تعبیر پانے کو مچلتی آنکھیں اس کی نوعمری کا تقاضا تھیں' جنہیں وہ اپنے گریز کے بھینٹ نہیں چڑھا سکتی تھی۔ اسے ایک انقلاب برپا کرنے کی خواہش رکھنے والی عورت نہیں فی الوقت خود کو ایک ماں کے عہدے' مرتبے اور حیثیت پر رکھ کر سوچنا تھا۔

اور اب وہ اپنے غم کو مامتا کے پُر خلوص خول میں چھپا کر یہی فریضہ انجام دے رہی تھی۔ وقت کی گرد اور سرکشی سے اپنی بیٹی کو بچانا تھا' نہ کہ اپنے خوف اور وسوسے اس کی ابھرتی شخصیت میں منتقل کر کے چاند کو نکلنے سے پہلے گرہن کا شکار کرنا تھا۔ یقیناً" زیست کے سفر میں جہاں کانٹوں کی چبھن سے پاؤں زخمی تھے وہاں خوشیوں کے پھول اور سکھ کی مہک اپنے اندر اتارنا اس کا حق تھا۔ اس مختصر سے تنہائی کے دورانیے نے اس کے لیے فیصلہ کرنا آسان کر دیا تھا۔ آنسوؤں سے تربتر آنکھوں کو ہتھیلی کی پشت سے رگڑتے ہوئے وہ اسٹڈی روم سے باہر آئی۔ جہاں رباب آڑی ترچھی دراز تھی۔ اس کے گلابی رخساروں پر خشک آنسوؤں کی بڑی معنی خیز سی تحریر رقم تھی۔ وہ یقیناً" روتے روتے وہیں کارپٹ پر سو گئی تھی۔ مشعال نے شفقت سے اس کے بال سنوارے اور کمبل اوڑھانے لگی۔

"آئی ایم ساری بیٹا۔" مشعال نے جھک کر محبت سے لبریز بوسہ اس کی پیشانی پر ثبت کیا۔ ماماتا کے لمس کی تمازت محسوس کر کے اس نے **کسمسا** کر نگاہیں وا کیں۔

"مما...." اس کے لب بے ساختہ کھلے۔ وہ جلدی سے آنکھیں رگڑتی اٹھ بیٹھی۔

"مما... مجھے معاف کر دیں۔" گلوگیر لہجے میں کہتے ہوئے وہ شدت سے رو پڑی۔

"رباب بیٹا... آپ اپنا سامان پیک کر لو۔ میں آج آپ کے ڈیوز کلیئر کر دوں گی اور شام کو ہم شاپنگ کے لیے چلیں گے۔" اس کے عارضوں کو بھگوتے سفید نمکین قطروں کو چنتے ہوئے وہ محبت سے بولی۔

"مما... مجھے کہیں نہیں جانا... میں نے آپ کو ہرٹ کیا ہے۔" وہ گھٹنوں میں منہ چھپا کر سسک اٹھی۔

"رباب... میں نے تمہیں اجازت تمہاری تلخ کلامی کے سبب نہیں دی۔ مجھے اپنی بیٹی پر کامل اعتماد اور بھروسا ہے۔ اس لیے میں نے خود کو اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور پایا۔ ماں ہوں' اس لیے جلد ہی واہمات اور خدشات دامن میں نمو پانے لگتے ہیں۔" رسانیت سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"مما آپ مجھ سے ناراض تو نہیں؟" اس کی استفہامیہ نگاہیں مشعال کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔

"رباب جو ہوا اسے بھول جاؤ میری جان' میں تم سے بالکل ناراض نہیں ہوں' جب چھوٹے غلطی کرتے ہیں اور نادم ہو کر سوری بھی بولتے ہیں تو بڑوں کا فرض بنتا ہے کہ وہ انہیں معاف کر دیں۔"

اس کے لہجے میں محبت اور شفقت کی آمیزش تھی۔

"اور مما یو آر سو سویٹ' آئی لو یو' میں ابھی اپنی فرینڈز کو انفارم کر دیتی ہوں کہ میں بھی ان کے ساتھ آ رہی ہوں۔" وہ خوشی سے چہک اٹھی اور اظہار کے طور پر مشعال سے لپٹ گئی۔ اس کے رخسار پر پیار کرتے ہوئے وہ داخلی دروازہ عبور کر گئی۔ مشعال کی نرم اور مسکراتی نگاہوں نے رباب کا تعاقب کیا۔ سورج کی چاروں اور سویرے کا پیغام پھیلاتی کرنیں چھن چھن گلاس ونڈو سے اندر آ رہی تھیں۔



"ارے کہاں جا رہی ہو؟ ابھی تو میں نے تمہیں جی بھر کر دیکھا بھی نہیں۔" مقیت زماں نے مشعال کا ہاتھ پکڑ کر حیرت سے کہا' جو اس کے رد عمل پر پہلے ہی بوکھلا گئی۔

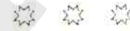
"باہر جا رہی ہوں' کچن میں سب کام ویسے ہی پڑا ہے۔ ابھی مجھے رات کے کھانے کی تیاری بھی کرنی ہے۔" مشعال نے گھبرا کر وضاحت پیش کی۔

"مجھ سے بھی زیادہ ضروری ہیں یہ تمہارے گھریلو کام؟ جو بھی کام کاج ہوں وہ میرے آنے سے پہلے کر لیا کرو۔ جب میں آجایا کروں تو کمرے سے باہر مت جایا کرو۔" اس نے گویا حکم دیا۔

"اچھا بابا... آئندہ احتیاط کروں گی' اب تو جانے دیں آنٹی میرا انتظار کر رہی ہیں۔" اس نے جان

چھڑوانا چاہی۔
"تم ایک بات بتاؤ' تمہاری شادی مجھ سے ہوئی ہے یا اس گھر سے۔" اس نے جل کر کہا تو مشعال بے ساختہ مسکائی۔ روٹھا روٹھا سا پیا بڑا پیارا الگ رہا تھا۔
"شادی تو آپ سے ہوئی ہے مگر مجھ سے جڑے رشتوں کے لیے کچھ فرائض بھی تو منسوب ہیں جنہیں پورا کرنا میرا فرض ہے۔" اس کے بالوں کو بگاڑتے ہوئے وہ شوخی سے گویا ہوئی۔
"تمہارا سب سے مقدم اور اولین فریضہ مقیت حیدر ہے۔ پہلے اسے ٹائم دو کیونکہ تم اس سے منسوب ہو تو ہی ہر رشتے تم سے۔"
ایک جھٹکے سے اسے خود سے قریب کرتے ہوئے وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔ مشعال اس اچانک افتاد کے لیے تیار نہ تھی۔ لہٰذا ایک ہی رو میں اس کے حصار میں قید ہو گئی۔ بلا کی قربت تھی اس کے تو حواس ہی جھنجھنا اٹھے اور دل سینے میں ہی مچل کر رہ گیا۔
"کہا تھا نا آرام سے مان جاؤ ورنہ تمہیں قابو کرنا مجھے بہت اچھی طرح آتا ہے۔"
بازوؤں کے گھیرے کو مزید تنگ کرتے ہوئے وہ مزے سے بولا۔ مقیت حیدر اس کی بے بسی سے حظ اٹھا رہا تھا۔ اس کا انداز والہانہ تھا۔ چاہتوں اور شدتوں سے لبریز۔ وہ ہر بار اس کی دیوانگی سے یوں ہی ہار جایا کرتی تھی۔ وہ لاکھ مزاحمت کرتی' دامن بچاتی' مگر اس کی بے لوث چاہت اسے شکست دے ہی جاتی اور یہ شکست اسے سرتاپا سرشاری اور طمانیت کے احساس میں جکڑ جاتی۔ مقیت حیدر منہ اندھیرے ہی گاؤں روانہ ہو گیا تھا اور اب تقریباً سات بج رہے تھے۔ اس کی بے تابیاں عروج پر تھیں۔ مشعال کے ڈھیروں کام منتظر پڑے تھے جنہیں اسے پایہ تکمیل پہنچانا تھا مگر مقیت حیدر کی موجودگی میں یہ سب ممکن دکھائی نہ دیتا تھا۔ وہ کنی کترانا چاہتی تھی مگر مقابل زور آور تھا' اس کی ایک نہ چلی۔
حیدر زمان کی دیہی علاقے میں قدرے طویل رقبے پر پھیلی قطعہ اراضی تھی۔ جس میں بڑا حصہ باغات پر مشتمل تھا۔ مقیت حیدر' حیدر زمان کی اکلوتی اولاد تھا مقیت حیدر خوبرو اور جاذب نوجوان تھا گھر میں پیسے کی ریل پیل تھی مقیت حیدر کو تعلیم سے کچھ خاص دلچسپی نہ تھی لہٰذا وہ میٹرک سے آگے تعلیم حاصل نہ کر سکا اور یہ واجبی سی تعلیم زمینوں کے حساب کتاب کے لیے کافی تھی۔ مگر اس کی پرکشش شخصیت اور رکھ رکھاؤ کے سامنے یہ کمی ہیچ نظر آتی۔ لہٰذا رفعت بیگم نے ہتھیلی پر سرسوں جمائی چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کر کے وہ بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہو بیٹھیں۔ عارفہ بیگم (مقیت حیدر کی والدہ) کے قریبی رشتہ داروں کے توسط سے یہ رشتہ طے ہوا اور عارفہ بیگم کو مشعال پہلی ہی نظر میں ایسی بھائی کہ انہوں نے مزید انتظار مناسب نہ سمجھا۔
مشعال کو بابل کے آنگن سے وداع ہوئے چند ماہ بیتے تھے مقیت حیدر کے سنگ مشعال کی زندگی پھولوں کا حسین گلدستہ تھی جس میں خوشیوں کے رنگ' چاہتوں کی مہک اور وفا کی خوبصورتی تھی۔ مقیت حیدر تو حجلۂ عروسی میں اس کا گھونٹ الٹتے ہی اس حسن کی دیوی کا گرویدہ ہو گیا۔ مقیت حیدر نے اسے کسی خوبصورت اور نازک مجسمے کی طرح سنبھال کر رکھا تھا۔ اس کی والہانہ چاہتیں ہر گزرتے لمحے شدت اختیار کرتی جا رہی تھیں۔ مقیت حیدر' عارفہ بیگم اور حیدر زمان کی اکلوتی اولاد تھا لہٰذا شادی کے چوتھے روز ہی مشعال نے نئے نویلے دلہناپے کو خیرباد کہا اور بیشتر ذمہ داریاں اپنے نازک کندھوں پر اٹھا کر عارفہ بیگم کو بری الذمہ کر دیا۔ مگر مقیت حیدر کو تو ہر لحہ' ہر پل مشعال اپنی نگاہوں کے سامنے چاہیے ہوتی۔ کام کے سلسلے میں بھی گاؤں جاتا تو اندھیرا ہونے سے قبل ہی لوٹ آتا۔
"ٹھیک طرح زمینوں کا حساب کتاب اور دیکھ بھال کیا کریں ادھر سے آجاتے ادھر سے آ بھی جاتے ہیں" وہ جان بوجھ کر اسے چڑاتی۔
"اچھا جی۔ اب میں کئی کئی دن تمہیں اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا پھر مت دہائیاں دیتی رہنا۔" وہ اسے

مصنوعی خفگی سے گھورتا۔
"ایسا کبھی ہو ہی نہیں سکتا۔" وہ محبت کی سرشاری کو وجود میں سموئے اطمینان سے کہتی تو مقیت حیدر کی نگاہیں بے لگام ہونے کو مچل اٹھتیں۔
"تمہاری زلفیں، تمہارا چہرہ، تمہاری خوشبو، تمہاری باتیں مجھے جلد آنے کا سندیس دیتی ہیں۔ تمہیں پتا ہے کتنی مشکل سے جان چھڑا کر بھاگتا ہوں۔ ورنہ مسائل تو ایسے توجہ طلب ہیں کہ ہفتوں نہ سلجھیں۔"
اس کے بالوں کی چوٹی کے بل کھولتے ہوئے وہ مخمور لہجے میں کہتا وہ چند لمحے اس کو وارفتگی سے بھرپور نگاہوں سے دیکھتی اور پھر گھبرا کر اس کے چوڑے سینے میں منہ چھپالیتی۔ اس کی اس معصوم سی ادا پر مقیت حیدر کا قہقہہ بے ساختہ ہوتا۔ مشعال رویم اپنی قسمت سے مطمئن تھی وہ خوش تھی بہت خوش۔



مشعال نے ایک پریشان نگاہ دیوار گیر گھڑی پر دوڑائی جو ایک کے ہندسے کو چھو رہی تھی۔ اس نے بے بسی سے کھڑکی سے جھانکتے گہرے اور تاریک سائے دیکھے۔ خوف و ہراس کی ایک شدید لہر اس کے بدن میں پھریری سی دوڑا گئی۔ اتنی رات بیت گئی اور مقیت حیدر کا کچھ اتا پتا نہ تھا۔ وہ کئی بار سیل نمبر ٹرائی کرچکی تھی مگر مسلسل آف جارہا تھا۔ ان چند ماہ کی رفاقت میں یہ پہلی شب تھی جب مشعال کے ساتھ وہ نہیں بلکہ اس کا انتظار تھا۔ وہ تو سرشام ہی لوٹ آتا تھا چاہے کتنے ہی کام ادھورے پڑے ہوں تو پھر آج ایسا کیا ہوگیا جو وہ ابھی تک نہیں لوٹا۔
نجانے کیوں اس کی سوچیں منفی رو میں بہنے لگیں۔ انجانے وسوسے اور خدشات اسے دہلائے جارہے تھے۔
"نہیں..... نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ خدانہ کرے انہیں کچھ ہو۔" اپنے خیال کی اس نے پرزور تردید کی۔
"مجھے شاید ان کے بغیر رات دیر تک جاگنے کی عادت نہیں ہے اس لیے گھبراہٹ ہورہی ہے۔"
اس نے خود کو تسلی دینا چاہی۔ مگر دل تھا کہ کوئی بھی تاویل ماننے کو تیار نہ تھا۔ وہ جلے پیر کی بلی کی طرح متواتر دائیں بائیں چکر کاٹ رہی تھی اور ساتھ ساتھ اس کی سلامتی کی دعائیں بھی مانگ رہی تھی یہاں تک کہ بے بسی سے اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ روتے روتے نجانے کب نیند کی وادی میں اتر گئی اسے خبر ہی نہ ہوئی۔
صبح پانچ بجے الارم کی آواز سے اس کی نیم خوابیدہ حسیات بڑی آہستگی سے بے دار ہوئیں۔ اس نے جلدی سے الارم بند کیا اور نا سمجھ آنے والے انداز میں خالی خالی نگاہوں سے غیر مرئی نقطے کو تکنے لگی۔ بیڈ پر دراز مقیت حیدر کو دیکھ کر گزشتہ شب پوری جزئیات سمیت اس کے ذہن میں آگئی۔ وہ اس کا انتظار کرتے کرتے صوفہ کم بیڈ پر ہی سوگئی تھی۔
"یہ کب آئے؟" اس نے خود کلامی کی۔ اضمحلال کے بادل چھٹ گئے۔ یکدم ہی وہ خود کو بہت ہلکا اور پرسکون محسوس کرنے لگی تھی۔ سیاہ بال، فراخ پیشانی پر بکھرے تھے۔ کٹاؤ دار عنابی لب ایک دوسرے میں پیوست تھے۔ اس نے کمبل گردن تک تان رکھا تھا۔ مشعال نے ایک تفصیلی نگاہ مقیت حیدر پر ڈالی اس کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ بکھر گئی۔
"صبح بے دار تو ہوں آپ۔ جناب خوب خبر لوں گی آپ کی، کس قدر پریشان کیا ہے مجھے۔ جانتے ہیں گزشتہ شب میرے اعصاب پر کس قدر بھاری گزری ہے۔" وہ سوچتے ہوئے ارادہ باندھنے لگی۔ پھر اس نے وضو کیا اور خدا کے حضور سربہ سجود ہوگئی اور معمول کے کام سرانجام دینے لگی۔
"مشعال۔ مشعال کہاں ہو تم؟" اس کی بے زار سی آواز مشعال کے کانوں میں اتری تو وہ چولہے کی آنچ دھیمی کرتی ہوئی کچن سے باہر نکل آئی۔ وہ نہایت عجلت میں دور ہی سے چلا آرہا تھا۔
"کیا ہوا؟" وہ لاؤنج میں ہی اسے مل گیا۔

"کیا یار! میرا کوئی بھی ڈریس ریڈی نہیں۔ مجھے ابھی گاؤں کے لیے روانہ ہونا ہے۔" اس نے برہمی سے استفسار کیا۔

"ابھی؟ اتنا لیٹ تو آئے تھے اب پھر کہاں جا رہے ہیں؟" اس کا دل بجھ سا گیا۔

"تو نہ جاؤں... وہاں کے معاملات کیا تم سنبھالو گی؟" مقیت حیدر کو اس کی بات خاصی گراں گزری تھی۔

"اچھا میں ابھی کردیتی ہوں۔" اس کی پیشانی پر تنے شکنوں کے جال کو دیکھتے ہوئے وہ جلدی سے بولی۔

"سارا دن تم گھر میں کیا کرتی ہو۔ میرے کام بھی ڈھنگ سے نہیں کرسکتیں۔"

"آ... آپ۔" وہ بے ربط سی بولی۔ مقیت حیدر نے ہمیشہ اسے مہربان نگاہوں سے دیکھا تھا۔ یہ اکھڑا سا انداز اسے بوکھلائے دے رہا تھا۔ وہ حیرت کی عملی تفسیر بنی کھڑی تھی۔

"اب بت بن کر کیوں کھڑی ہو جاؤ کپڑے پریس کرو۔"

اسے بت بنا کھڑا دیکھ کر وہ بھنایا۔ اس کی بلند آواز پر وہ دو قدم پیچھے ہوئی اور جلدی سے مقیت حیدر کی تقلید میں چل پڑی جس کا رخ کمرے کی طرف تھا۔

"آپ رات کو کب آئے۔ پتا ہے رات دیر تک میں آپ کا انتظار کرتی رہی۔" کپڑے اسے تھماتے ہوئے ناچاہتے ہوئے بھی شکوہ زبان سے پھسل گیا۔ کوئی بھی جواب دیے بغیر وہ باعجلت کپڑے پکڑتا واش روم میں گھس گیا۔ جبکہ مشعال ہونق پن سے اپنے محبوب کے بدلے بدلے اطوار ملاحظہ کررہی تھی۔ اس قدر بے وقعتی پر اس کی کان کی لویں تک جل اٹھی تھیں اپنا وجود دھواں بنتا اور ہوا میں تحلیل ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ اہانت کے احساس سے بلا اجازت نکل آنے والے سفید پانی کے قطروں کو اس نے بے دردی سے رگڑا۔

"انہوں نے میری طرف دیکھا بھی نہیں۔ مجھے خدا حافظ بھی نہیں کہا۔ میری بات کا جواب دینے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ ایک بار بھی مجھ سے نہیں پوچھا کہ ساری رات میں کس قدر بے چین رہی۔ تسلی کے دو بول' نہ لگاوٹ' نہ محبت کا لمس کچھ بھی تو نہیں تھا۔"

وہ حیرت سے خود سے سوال کررہی تھی۔ پھر صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور وہ اس بے اعتنائی پر سسک اٹھی۔



یہ معاملہ صرف ایک دن پر محیط نہیں تھا۔ اب تو اکثر ایسا ہونے لگا تھا۔ وہ رات کے نجانے کس پہر قدم رکھتا اور وہ انتظار کی ڈور سے بندھی نیند کی وادیوں میں اتر جاتی۔ اگلی صبح اسے بازپرس کا موقع دیے بغیر نکل جاتا۔

"نجانے مجھ سے ایسا کیا گناہ سرزد ہوا ہے۔ جو مقیت مجھ سے ایسا سلوک روا رکھے ہیں اور وہ مجھ سے بات کرنا بھی گوارا نہیں سمجھتے۔"

کبھی کبھار وہ خود سے سوال کرتی۔ جواب میں ایک جامد خاموشی اور سکوت کے علاوہ کچھ اس کے ہاتھ نہ آتا۔ اس نے گیارہ ماہ کی رفاقت کا ایک ایک لمحہ ٹٹول لیا لیکن اسے کوئی ایسی ٹھوس اور سنجیدہ دلیل نہیں ملی جس کی سزا اتنی شدید ہو۔ مشعال پہلے پہل مصروفیت کا بہلاوا دے کر خود کو تسلی دے لیتی اب تو اس کا دل بھی مضطرب ہونے لگا تھا۔ وہ خالی خالی آنکھیں دہلیز پر جمائے اس کی راہ تکتی رہتی۔ تمام دن بے سروپا باتیں ذہن کی آماجگاہ بنی رہتیں۔

"مجھے اپنی چاہتوں کا عادی بنا کر اب منہ کیوں موڑ رہے ہو مقیت حیدر۔ اتنی محبتوں کے بعد بے رخی کا یہ پہلو میں برداشت نہیں کرپاؤں گی۔"

کبھی مشعال رو دیتی اور اداسی و معصومیت کے لبادے میں لپٹی تفسیر انتظار بنی نظر آتی۔ دل و دماغ میں بے نام سی ہلچل برپا تھی مگر کوئی سرا ہاتھ نہیں آرہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اب وہ دیر سے آئے گا مگر نجانے کیوں وہ اس کا انتظار کرتی رہتی یہاں تک کہ تاریکی کے گہرے ہوتے سائے اسے بے بس کردیتے۔ پہلے

پہل وہ محض دیر سے لوٹتا تھا مگر آتا ضرور تھا مگر اب تو تین دن ہونے کو آئے تھے لیکن مقیت حیدر کی کچھ خبر نہ تھی۔ سیل ٹرائی کر کر کے وہ ہار گئی۔ وجود پر عجیب سی بے کلی اور بوجھل پن طاری تھا نہ موسم اچھے لگتے تھے نہ بہار 'بہار لگتی تھی۔

عارفہ بیگم اس کے متعلق دریافت کرتیں تو وہ نگاہ چرا جاتی اسے تو خود معلوم نہ تھا ان کی تسلی کیونکر کروائی۔

"دنیا کا ہر آدمی گھر کے سکون اور آسائشات کے لیے کام کرتا ہے۔ سو تمہارا بیٹا بھی کر رہا ہے پہلے جب کام نہیں کرتا تھا تب تمہیں اعتراض تھا اب جب ساری ذمہ داری اس نے اپنے کندھوں پر اٹھالی ہے تو تم خوش نہیں۔ کام کے معاملات میں دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔"

اس کی جگہ حیدر زماں' عارفہ بیگم کو جواب دے کر اس کا دفاع کرتے۔

"ارے ایسا بھی کیا کام کہ بچی بے چاری کو بھی وقت نہ دے۔ دیکھو ذرا' اداسی سے صورت کیسے کملا گئی ہے۔ اس کی موجودگی میں تو کنول کی طرح کھلتی ہے۔"

وہ اپنی تکرار میں اسے گھسیٹتے تو وہ گھبرا کر ان کے درمیان سے اٹھ آتی۔ اس کے اندر ہچکولے لیتا درد کا طوفان بڑی شدت اختیار کر گیا۔ صحن میں بنی سیڑھیوں پر بیٹھی وہ کھوئی کھوئی سی ہتھیلی کی لکیروں میں نجانے کیا تلاش کر رہی تھی۔ سورج کی سنہری کرنیں الوداع کہتی محسوس ہو رہی تھیں آنکھوں میں اترتی دھند کو رگڑتی وہ عارفہ بیگم کی آواز پر اندر کی طرف بڑھنے لگی مگر مقیت حیدر کی آواز نے مشعال کے قدموں میں گویا زنجیر ڈال دی۔ اک پل میں کوئی ان چھوا انوکھا سا احساس اس کے وجود میں چٹکیاں لینے لگا۔ دل سینے کی دیواریں توڑ کر باہر آنے کو بے تاب تھا۔ اس نے برق رفتاری سے مڑ کر آواز کی سمت میں نگاہیں دوڑا دیں۔ سفید کلف شدہ شلوار سوٹ زیب تن کیے' چوڑی پیشانی' مسکراتے لب' کشادہ سینہ' دراز قد' شادابی رنگت بلاشبہ وہ نکھرا نکھرا سا مقیت حیدر ہی تھا۔ اسے تو یہ فریب نگاہ ہی لگا تھا۔ وہ ٹکر ٹکر تو وارد کی شکل تک رہی تھی یقین اور بے یقینی کے مابین ڈول رہی تھی۔

"یار مان لیا کہ بہت خوبصورت لگ رہا ہوں لیکن اب گھورنا تو بند کرو۔ اگر بابا آگئے تو اس بے باکی پر میری پٹائی تو پکی۔" وہی فریش آواز اس کے کانوں کے پردوں سے سرسراتی تخیل تک رسائی حاصل کر گئی۔ وہ آنکھ دبا کر شرارت سے بولا۔ وہ جیسے خواب سے چونک پڑی۔ ہڑبڑا کر نگاہیں جھکائیں۔ مقیت حیدر کی پرشوق نگاہیں اسے اپنے حصار میں لیے تھیں۔ ایک پرشکوہ نگاہ مقیت حیدر پر ڈال کر وہ اندر بڑھ گئی۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ آگیا میرا خیال۔

اتنے دنوں سے وہ اسے تڑپا رہا تھا اب اک پل میں کیسے بھول جاتی اتنے دنوں کی ناراضی کا اظہار بھی تو مقصود تھا۔

"مشعال پلیز چائے بنا کر کمرے میں لے آؤ۔ تب تک میں اماں اور بابا سے مل لوں۔"

کچن میں کھڑی مشعال کو آرڈر دے کر وہ پھر غائب ہو گیا جس سے فرار پانے کی خاطر اس نے کچن میں پناہ لی تھی۔

وہ چائے بنانے میں جان بوجھ کر دیر لگا رہی تھی نجانے کیوں دل میں موہوم سی امید تھی کہ وہ اسے دیر لگانے پر ڈانٹے گا' اسے خود لینے آئے گا اس سے باز پرس کرے گا کہ اتنے دنوں کے بعد وہ گھر لوٹا ہے اور وہ اسے بے رخی دکھا رہی ہے۔ اس سے گزشتہ رویے پر ندامت کا اظہار کرے گا۔ مگر امید۔ امید ہی رہی اس نے حقیقت کا روپ نہیں دھارا۔ اس کی آنکھیں بے اختیار بھیگ گئیں۔ اس کی بے بسی غصے میں ڈھلنے لگی تھی چائے کی ٹرے اٹھا کر وہ پیر پٹختی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی مگر اسے خواب خرگوش کے مزے لوٹتے دیکھ کر اس کا پارہ مزید ہائی ہو گیا۔ وہ الٹے قدموں واپس لوٹ آئی۔



وقت اپنی مخصوص رفتار سے محو سفر تھا۔ شب و روز

ڈھلتے چڑھتے ماضی اور حال کی داستان کے تال میل میں مگن تھے اور مقیت حیدر کے رویے میں پنپتے جارحانہ تیور تند ہی اختیار کرتے جارہے تھے۔ ان ہی دنوں مشعال کو امید سے ہونے کی خبر ملی تو وہ جیسے سب کچھ فراموش کر گئی۔ مقیت حیدر کی بے رخی، کج ادائی، بے زاری کچھ بھی یاد نہ رہا۔ اس کے اندر خوشی کی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ ننھے منے ہاتھوں کی دستک کا احساس ہر دکھ اور ہر سکھ پر حاوی تھا۔

"مقیت مجھے امی کی طرف جانا ہے۔" نک سک سے تیار وہ اس کی نگاہ خاص کی منتظر تھی۔ "ہاں ٹھیک ہے تم چلی جاؤ۔" سرسری سے انداز میں جواب دے کر وہ والٹ دراز سے نکالنے لگا۔

"مجھے اکیلے نہیں جانا۔ امی، بابا اکثر آپ کا پوچھتے ہیں۔ میں آپ کی مصروفیت کا بہانہ گھڑ گھڑ کر تھک گئی ہوں۔ اتنا بھی کیا کام کہ آپ کے پاس اپنی بیوی کے لیے بھی وقت نہیں۔ وہ بھی ان دنوں میں جب اسے سب سے زیادہ آپ کی ضرورت ہے۔"

وہ روہانسی ہو کر قدرے بے بسی سے بولی۔ اس کی بازپرس نے مقیت حیدر کے تن بدن میں آگ لگادی۔ شعلے لپکاتی نگاہیں اس کے سراپے پر گاڑتے ہوئے وہ جیسے اسے جلا کر خاکستر کر دینا چاہتا تھا۔ وہ جارحانہ انداز میں اس کی سمت مڑا اور بازو سے دبوچ کر ایک جھٹکے سے اپنے قریب کیا۔

"جب تمہیں بیاہ کر لایا تھا تو یہ عہد نہیں باندھا تھا کہ تمہارے پلو سے بندھا رہوں گا اور "مصروفیت کے بہانے" سے تمہاری کیا مراد ہے۔ کیا میں بہانے بناتا ہوں، میں گھر بیٹھ جاتا ہوں تم کاروبار سنبھال لو۔ یہ جو اتنی عیش و عشرت کی زندگی گزار رہی ہو تو یہ سب اسی محنت کی مرہون منت ہے۔ ناشکری عورت۔ رہی بات ماں بننے کی تو ہر عورت اس عمل سے گزرتی ہے تم نے کون سا انوکھا کام کرلیا ہے آئندہ مجھ سے اونچی آواز میں بات مت کرنا۔ بے ادب اور بدزبان عورتیں مجھے بالکل پسند نہیں اپنی اوقات میں رہو اس سے باہر نکلنے کی کوشش کی تو لمحوں میں اس گھر سے چلتا کردوں گا۔ تم میری کمزوری نہیں ہو مشعال بی بی۔"

اس کے بازو میں اپنے پنجے گاڑھ کر وہ حلق کے بل دھاڑا اور درد کی شدت سے مشعال کی رنگت زرد پڑنے لگی تھی۔ اس کی آنکھیں خوفزدہ ہرنی کی طرح پھیلی تھیں۔ وہ حق دق اس کا بے تاثر چہرہ تک رہی تھی۔

"دفع ہو جاؤ اب۔ سارا موڈ خراب کردیا منحوس عورت۔"

بے زاری اور تنفر سے سر جھٹکتا وہ شعلے اگل رہا تھا۔ اسے بیڈ پر لڑھکا کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا داخلی دروازہ عبور کر گیا اور مشعال درد کے احساس سے دوہری ہوگئی۔ اس بے وقعتی اور کم مائیگی پر اس کا وجود دھواں بن کر ہوا میں تحلیل ہونے لگا تھا۔ درد کا جان لیوا احساس اس کے وجود میں کہرام مچانے لگا تھا۔ اس کی دلخراش چیخوں نے پورا زماں ہاؤس دہلا ڈالا۔



جب کچھ ہوش آیا تو مشعال نے اپنے پہلو میں کومل سے وجود کی موجودگی کو محسوس کیا۔ ننھے ننھے وجود کا گداز لمس اسے ایسی سرشاری سے نواز رہا تھا کہ گزشتہ شب و روز میں مقیت حیدر کی ہر تلخی کو فی الوقت بھول گئی۔

ممتا کا احساس ایک عجیب، نامعلوم سی ہلچل سے روشناس کروا رہا تھا۔ موسم بہار میں کھلتے پھولوں کی بھینی بھینی مہک کی طرح، زرخیز مٹی میں پھوٹتی کونپل جیسی نوخیز، ہواؤں کے دوش پر اڑتے بادلوں جیسا مدہوش، انوکھا اور دلفریب۔

اسپتال سے ڈسچارج ہوئے اسے ایک ہفتہ گزر چکا تھا مگر رباب کا باپ اس کی شکل دیکھنے بھی نہیں آیا تھا۔ معصوم سی رباب کو گود میں لیے وہ نڈھال سی بیٹھی تھی وہ ہر ایک سے نظر چراتی پھر رہی تھی۔ لوگوں کے سوال و جواب اسے پریشان کر رہے تھے۔ مقیت حیدر کی غیر موجودگی خود اس کے لیے سوالیہ نشان بن کر رہ گئی تھی۔

رباب کا بھوک سے برا حال تھا اور اظہار کے طور پر اس نے اپنا لاؤڈ اسپیکر آن کر لیا تھا۔ اسے دادی کے سپرد کر کے وہ جلدی جلدی فیڈر بنانے لگی تب ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ نووارد مقیت حیدر تھا۔ مگر یہ کیا اس کے ساتھ بے حد الٹرا ماڈرن جدید تراش خراش کا لباس زیب تن کیے دوپٹے کے تکلف سے آزاد لڑکی کھڑی تھی۔

رباب کو بھول کر وہ مقیت حیدر کے پہلو میں کھڑی لڑکی کا جائزہ لینے لگی۔

"میری بیٹی کہاں ہے؟ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔" اس کی حیرت میں ڈوبی شکل کو نظرانداز کرتا وہ بے تابی سے بولا اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر عارفہ بیگم کے کمرے کی طرف بڑھ گیا کہ رونے کی آواز وہیں سے برآمد ہو رہی تھی۔

"یہ لڑکی کون ہے مقیت؟"

اسے وہیں لاؤنج میں چھوڑ کر اخلاقیات کا کوئی بھی فریضہ انجام دیے بغیر وہ اس کے پیچھے لپکی۔ اس کی چھٹی حس کچھ غلط ہونے کا الارم بجا رہی تھی۔

"آرام سے یار۔ ابھی آیا ہوں نہ سلام نہ دعا۔ الٹا سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔ مجھے اپنی بیٹی تو دیکھنے دو۔"

رباب کو بڑے پیار سے گود میں اٹھا کر وہ لاپروائی سے بولا۔

"ماشاء اللہ' اللہ نظر بد سے بچائے۔" اس نے فوراً" جیب سے ہرے ہرے نوٹ نکال کر سارے رباب پر سے وار دیئے۔

"یہ لیں امی صدقہ کر دیں۔" انداز بتا رہے تھے کہ وہ بے حد خوش ہے۔

"اب بتائیں وہ لڑکی کون ہے؟"

اس سے مزید صبر نہ ہوا تو بڑی بے قراری سے پوچھا۔

"اتنی ہڑبونگ مت مچایا کرو مشعال۔ اتنا لمبا سفر کر کے آیا ہوں کچھ تھکاوٹ تو اترنے دو۔ بجائے مہمان نوازی کے تم یہاں جاہل عورتوں کی طرح تفتیش میں مگن ہو۔ جاؤ گیسٹ روم صاف کرو اور ہاں روی کو وہیں پہنچادو۔ خیال رہے کسی چیز کی کمی نہ ہو۔" وہ چڑ کر بولا تو مشعال کے کہنے کو کچھ باقی نہ رہا۔ وہ جلتی کڑھتی اس کے حکم بجا لانے لگی کہ جاہل عورت کا لیبل جو اس کے ساتھ لگ گیا تھا۔

کھانا خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔ مقیت حیدر سے حیدر زماں نے دبے دبے الفاظ میں اس لڑکی کے متعلق استفسار کیا مگر وہ صاف ٹال گیا۔ پھر سب ہی خاموش ہو گئے۔ البتہ مشعال کے دل میں احساس زیاں نجانے کیوں قوی ہوتا جا رہا تھا۔ بار بار آنکھیں چھلک رہی تھیں۔ وہ تنہا ہر مرحلہ طے کر آئی تھی اس کو ساتھ دیکھنے کی خواہش کو دل میں دبائے وہ ہر راہ سے گزر آئی تھی۔ دل میں کہیں کوئی اضطراب خلا بنا گیا تھا۔ تنہائی کا جان لیوا احساس آس پاس منڈلاتا دکھائی دے رہا تھا۔ کوئی مٹھی میں اس کے دل کو بھینچے شدت درد سے روشناس کروا رہا تھا مگر وہ بھیگی پلکوں سے روز کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ برتن سمیٹ کر کچن صاف کرنے کے بعد اس نے رباب کو سلایا اور کاٹ میں لٹا کر مقیت حیدر کی طرف بڑھی جو اس کے انتظار میں جاگ رہا تھا۔

"کیسی ہو مشعال؟" اسے دیکھتے ہی وہ خوش دلی سے مسکرایا جواباً" وہ بس اس شخص کو دیکھ کر رہ گئی جو مطمئن تھا۔

"ادھر آؤ" اسے وہیں ساکت دیکھ کر وہ بولا اور پہلو میں جگہ بنائی۔ مشعال ٹرانس کی سی کیفیت میں اس کے پہلو میں ٹک گئی۔ اس نے بازو اس کی کمر کے گرد حائل کر کے اسے اپنے مزید قریب کر لیا تو پر حدت سا احساس مشعال کے وجود میں منتقل ہو گیا اس کے اندر زندگی کا احساس دوڑ گیا۔

"مقیت" وہ بے اختیار ہی اس سے لپٹ گئی اور معصوم بچوں کی طرح رونے لگی۔ ساری تکلیفیں جیسے اس کے قرب میں بہہ گئیں وہ سب شکوے بھول گئی۔

"آپ کہاں تھے مقیت۔ ہمارے پیار کی نشانی اس دنیا میں آگئی آپ بابا بن گئے مگر آپ میرے پاس نہیں تھے۔"

اس نے آنسوؤں سے آنکھیں بھر کر شکوہ کیا۔

"بس یار بہت اہم مسئلے میں پھنس گیا تھا۔"

اس کا سر سہلاتے ہوئے وہ گمبھیر تا سے بولا۔

"ایسا بھی کیا ضروری کام جس نے آپ کو مجھ تک آنے سے روک دیا کیا مجھ سے بھی اہم ہے کچھ آپ کی زندگی میں" وہ پھر شکوہ کناں ہوئی۔

"بتادوں گا بس کچھ دن صبر کرو۔" اس نے پھر ٹالا۔

"ایک بات پوچھوں؟" اس نے سر اٹھا کر استفہامیہ انداز میں پوچھا۔

"ہاں بولو۔" وہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

"آپ کسے اپنے ساتھ لائے ہیں۔"

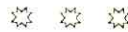
"وہ اس گھر کا حصہ ہے مشعال وہ اب یہیں رہے گی۔"

"کیوں مقیت یہاں کیوں؟"

وہ ناسمجھی کے عالم میں بولی۔ اس کے دل نے بے ساختہ ایک بیٹ مس کی۔

"جواب دیں۔۔۔ کس حیثیت سے؟" اس نے دہل کر پوچھا۔

"زیادہ سوال جواب کر کے مجھے پریشان مت کرو۔ مشعال لائٹ آف کرو اور سونے دو۔" وہ کروٹ لے کر اس سے دور ہو گیا اور مشعال کو لگا جیسے وہ صحرائے زیست میں تنہا اور لاچار کھڑی ہے۔



اگلا دن اپنی تمام تر حشر سامانیوں سمیت برپا تھا۔ پولیس ان کے گھر آچکی تھی اور مقیت حیدر پر ایک لڑکی کو اغوا کرنے کا مقدمہ بن چکا تھا۔

"یہ دعوا ہر صورت جھوٹا ہے۔ یہ دیکھیں نکاح نامہ قانونی اور شرعی طور پر رومیلہ میری بیوی ہے اور یہ سب کچھ ہم دونوں کی باہمی رضا مندی سے ہوا ہے چاہیں تو آپ رومیلہ کا بیان لے سکتے ہیں۔" پولیس انسپکٹر کے سوال کے جواب میں مقیت حیدر نے اسے نکاح نامہ دکھایا اور ساتھ ہی بڑے رعب سے جواب دیا۔

"بی بی بتائیں کہ کیا اس شادی میں آپ کی رضا مندی شامل ہے اگر کوئی زور زبردستی کی گئی ہے تو آپ بتا سکتی ہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔" انسپکٹر نے پیشہ وارانہ انداز میں کارروائی کا آغاز کیا۔

"میں نے اپنی مرضی اور ہوش و حواس میں ان سے شادی کی ہے انہوں نے مجھ سے کوئی زور زبردستی نہیں کی۔"

اس نے دھیرے سے اقرار کیا تو مقیت حیدر کی تمکنت میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ پولیس انسپکٹر نے رومیلہ سے چند ایک مزید سوالات کیے کارروائی مکمل کی اور جانے کی اجازت طلب کی۔

"بے وقت تکلیف کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ مگر قوم کی خدمت ہمارا اولین فریضہ ہے۔" پولیس انسپکٹر نے شائستگی سے کہا اور زمان ہاؤس سے رخصت ہو گیا۔

مقیت حیدر ایک بازاری عورت سے شادی کر چکا تھا گزشتہ گیارہ ماہ یہی اس کی مصروفیت کا محور تھا رومیلہ کی ماں اور نانی نے مقیت حیدر کے خلاف اغوا کا مقدمہ دائر کیا' مگر نکاح نامے اور لڑکی کے بیان جیسے ثبوت کی روشنی میں مقدمہ چل نہ سکا۔ یوں انہیں واضح شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر وہ دونوں ہر صورت میں رومیلہ کا حصول چاہتی تھیں کہ اس کی غیر موجودگی کی صورت میں ان کا کاروبار ٹھپ ہو چکا تھا۔

اس تمام صورت حال نے مشعال پر ہر حقیقت منکشف کر دی تھی غم و غصے کی زیادتی سے اس کا وجود لرز رہا تھا۔ پے در پے سوالوں کی بوچھاڑ اس کے من میں ہو رہی تھی جس میں اس کا شعور بھیگتا جا رہا تھا۔

"کیوں۔۔۔ مقیت۔۔۔ ایسا کیوں۔۔۔ مجھ سے اس قدر بے وفائی کیوں؟ میری وفا میں کوئی کمی رہ گئی تھی کیا۔"

گلوگیر آواز کے ساتھ اس نے گویا محبوب کی بے وفائی کا ماتم کیا۔

"یہ حقیقت ہے مشعال۔۔۔ جتنی جلدی ہو سکے اسے قبول کر لو اور خواہ مخواہ عورتوں کی طرح واویلا مچا کر معاملے کو طول مت دینا میں کسی بحث کے موڈ میں

نہیں ہوں۔" وہ بے زاری سے بولا۔
"میرے سینے میں خنجر گھونپ کر کہتے ہیں درد سے چلاؤں بھی نا۔ کیوں ایک وحشیہ کو میرے برابر لا کر بٹھا دیا آپ نے؟" وہ حلق کے بل دھاڑی۔ سارا درد جیسے اس کی آواز میں سمٹ گیا تھا۔
"مشعال۔۔" مقیت حیدر اس سے بھی زیادہ بلند آواز میں چنگھاڑا۔ ساتھ ہی مشعال کے بالوں پر اس کی گرفت مضبوط ہوئی تھی۔
"تم جاؤ یہاں سے رومیلہ۔" اس نے اس خاموش تماشائی کو رخصت کیا۔
"ہاں یہی سچ ہے مقیت۔ آپ کی بلند آواز اس ـــــ کی حیثیت کو چھپا نہیں سکتی۔" اپنے بال اس کی گرفت سے چھڑوانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے وہ شیرنی کی طرح غرائی۔
"یہ فیصلہ میرے ہاتھ میں ہے مشعال بی بی اور میں اپنے کسی عمل کے لیے تمہارے سامنے جوابدہ نہیں ہوں' اپنی آواز دھیمی رکھو۔" ایک جھٹکے سے اس نے مشعال کو پرے دھکیلا جواباً" وہ صوفہ پر لڑھک گئی۔
"کیوں رکھوں دھیمی آواز۔ تاکہ آپ کے گھٹیا فعل پر پردہ پڑا رہے۔ گھن آتی ہے مجھے آپ سے۔ میرے گھر کی پاک دہلیز کو ایک بازاری عورت کے قدموں سے ناپاک کیا ہے آپ نے۔"
مقیت حیدر کا صبر جواب دے گیا تھا۔ اس نے بازو سے دبوچ کر مشعال کو اپنے سامنے کیا اور پے در پے اپنے فولادی ہاتھوں سے اس کے چہرے کی نرمی کو نوچ ڈالا۔
"بکواس بند کرو۔ اب میں رومیلہ کے خلاف ایک لفظ نہیں سنوں گا۔ اپنی پارسائی کا زیادہ ڈھونگ رچانے کی ضرورت نہیں' میرے لیے یہ سب بے معنی ہے۔ تمہیں اس لیے برداشت کر رہا ہوں کہ میری بیٹی کی ماں ہو۔ یہ گھر میرا ہے مشعال بی بی۔ اس کا ایک ایک فیصلہ میرے حکم کا مرہون منت ہے جب تک میں چاہوں گا تب تک تم یہاں ہو اس کے بعد۔۔۔۔"
اس کے الفاظ اور ہاتھوں کی مار نے مشعال کو بے مایہ کر دیا تھا اس کی ذات کا غرور ریزہ ریزہ ہو گیا۔ سینے میں ایک تلاطم برپا تھا جس کے بہنے کا راستہ محض آنکھیں تھیں۔ اس کا محبوب اس کے ہاتھوں سے ریت کی طرح پھسل گیا اور وہ تہی داماں رہ گئی۔ درد کی لکیریں اس کے وجود کو چیر رہی تھیں۔ یہ اس کا گھر تھا وہ تو ابھی تک اسی زعم میں لڑ رہی تھی' مگر نہیں یہ گھر تو صرف مقیت حیدر کا تھا تب ہی تو وہ اسے دھتکار چکا تھا۔ وہ ٹکر ٹکر اس کی شکل تک رہی تھی۔ ہر احتجاج اندر ہی دم توڑ گیا۔ وہ اس سنگ دلی پر یقین نہیں کرنا چاہتی تھی مگر مقیت حیدر کے چہرے کی درشتی اور سپاٹ تاثرات اس کے حقیقت ہونے پر مہر ثبت کر رہے تھے۔ اس نے بے دردی سے آنسو رگڑے مزید کوئی بحث کیے بغیر چادر اوڑھی اور رباب کو اٹھا کر باہر نکل آئی۔
"جس کی خاطر آپ مجھے برداشت کرنے پر مجبور ہیں۔ میں اسے ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ لے کر جا رہی ہوں۔ جب رشتے مجبوری بن جائیں تو ان کی بقا ممکن نہیں ہوتی۔"
نظریں جھکائے جیسے وہ سب کچھ یہاں ہار کر جا رہی تھی۔
"کہاں جا رہی ہو مشعال۔۔۔ یہ کیا پاگل پن ہے۔" عارفہ بیگم اس کے درد کو سمجھتی تھیں مگر مقیت حیدر کی جارحانہ طبیعت سے بھی واقف تھیں۔
"جب دلوں میں ایک دوسرے کے لیے گنجائش ختم ہو جائے تو ایک چھت کے نیچے رہنے کی خواہش کرنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔"
اپنے چور چور وجود کو سمیٹتی جیسے وہ مزید ڈھلتی جا رہی تھی۔
"جانے دیں اسے۔ چند دنوں میں خود ہی واپس آجائے گی۔ تب میں اس کی شکل دیکھنا بھی پسند نہیں کروں گا۔ جو عورت ایک بار گھر سے باہر قدم نکالنا سیکھ لے وہ اعتماد کے قابل نہیں رہتی۔ اس بدزبان' جاہل اور شوہر کی نافرمان عورت کو میں کسی صورت برداشت نہیں کروں گا۔ دوسروں پر انگلی اٹھانے چلی ہے بازاری

عورت کی خصلتیں خود اس میں پائی جاتی ہیں۔" اس نے تنفر سے سر جھٹکا۔

"میں خود ایسے مرد کی شکل دیکھنا پسند نہیں کروں گی جسے اپنی بیوی کی پارسائی کا یقین نہ ہو۔" وہ زخمی ناگن کی طرح پھنکاری کہ بہر حال اپنی انا اور عزت ہر عورت کو اپنی جان سے بھی بڑھ کر عزیز ہوتی ہے۔

"اونہہ۔۔۔ بیوی۔" وہ استہزائیہ مسکرایا۔

عارفہ بیگم کی پکار کو ان سنی کرتی وہ زمان ہاؤس کو الوداع کہہ گئی۔



"یہ کیا، کیا تم نے مشعال؟ اپنا گھر چھوڑ آئیں خود اپنے ہاتھوں سے اپنی حکومت کسی اور کے سپرد کردی۔" رفعت بیگم نے سنتے ہی سر پیٹ لیا۔

"کیسی حکومت امی۔۔۔ اس شخص نے مجھے بازاری عورت تک کہہ دیا۔ میری پارسائی پر انگلی اٹھائی مجھے دھتکار دیا پھر بھی میں اس کے ساتھ رہنے کو ترجیح دیتی تف ہے مجھ پر۔" وہ بے بس سی رو دی۔

"مگر اس طرح اپنا گھر چھوڑ کر بیٹھ جانا۔ یہ بھی تو مسئلے کا حل نہیں۔" رفعت بیگم نے رسانیت سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"تو کیا اس کی درندہ صفت جارحیت برداشت کرتی رہوں محض اس لیے کہ وہ مرد ہے۔ عورت کمزور نہیں ہے، میں ثابت کردوں گی۔ مرد اپنی مرضی کرے اور پھر عورت کے سر پر تھوپ کر بری الذمہ ہو جائے اب ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ میں سمجھوتہ نہیں کروں گی اپنی بیٹی کو ایسی عورت کے زیر سایہ ایک لمحہ بھی برداشت نہیں کرسکتی۔ گھر، بچے، شوہر ہمیشہ عورت کے پاؤں کی زنجیر کیوں بنتے ہیں۔ گھر کو آباد رکھنے کے لیے اپنی انا اور نسوانیت کو ہمیشہ عورت ہی کیوں داؤ پر لگائے۔ آخر قربانی کا یہ مہرہ مرد کیوں نہیں بنتا۔ اس معاشرے میں مردوں کو بڑھاوا دینے والی عورتیں ہی ہیں جو انہیں ان کے غیر اخلاقی اور غلط افعال کا احساس نہیں دلاتیں۔ بلکہ اولاد اور گھر کے نام پر ان کے گھٹیا افعال کو برداشت کرتی ہیں، میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ گھر اجڑنے کا، پاکباز عورت کے ساتھ کی برکتوں کا احساس اسے بھی ہونا چاہیے۔ میں کسی طور اس شخص سے سمجھوتہ نہیں کروں گی۔"

وہ تمام فیصلے کرکے آئی تھی اور اپنے فیصلے سے ایک انچ بھی ہٹنے کو تیار نہ تھی۔ ایک آدھ بار عارفہ بیگم اسے منانے آئیں مگر وہ جانتی تھی یہ ان کی خود ساختہ کوشش ہے اس میں مقیت حیدر کی مرضی کا کوئی عمل دخل نہیں لہٰذا ایسا نہ ہوئی۔ مناسب وقت دیکھ کر رفعت بیگم نے اسے سمجھانے کی ناکام کوشش کی۔ اس کے مسلسل انکار کا نتیجہ مقیت حیدر کے طلاق نامے کی صورت میں نکلا۔ عورت کی ضد کے سامنے سرنگوں ہونا مرد کی فطرت نہیں اور مشعال کو خود اپنی تمام غلطیوں کا اعتراف کرکے واپس اس گھر میں لانا مقیت حیدر کی مردانہ انا پر کاری ضرب تھا لہٰذا اس نے اپنی مردانگی پر مشعال کو وار دیا۔

ایک آخری امید کا ٹمٹماتا دیا بھی حالات کی بے سرو سامانی سے گل ہوگیا۔ ایک بھرم جسے عرف عام میں محبت کہتے ہیں ٹوٹ کر چور چور ہوگیا۔ مقیت حیدر نے اپنے نام کا حق بھی مشعال سے چھین لیا تھا۔ وہ جو خود کو بہت مضبوط سمجھتی تھی اس بے رحمی پر بلبلا اٹھی۔ تو طے ہوا کہ مقیت نے اسے زمانے کے سرد گرم سے نبرد آزما ہونے کے لیے تنہائی کے سپرد کردیا۔

اس شخص سے دل کا رشتہ ٹوٹنے پر جو ایک کاغذ کے ذریعے قائم تھا۔ وہ نوحہ کناں تھی۔ مگر اپنے فیصلے پر پچھتاوا اسے نہیں تھا کیونکہ اس کے جینے کی وجہ اس کی بیٹی رباب تھی۔ جسے اسے بہترین پرورش دینا تھی۔ معاشرے کا باوقار شہری بنانا تھا جب تک والدین زندہ رہے جیسے تیسے بھائی بھاوج، مشعال کو اس کی اولاد سمیت برداشت کرتے رہے مگر ان کے رخصت ہوتے ہی اس گھر کی چھت مشعال پر تنگ پڑگئی۔

اس نے چند ماہ کی تگ و دو سے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب حاصل کرلی اور اس کی درخواست پر اسے ایک فلیٹ بھی دے دیا گیا۔ لہٰذا اپنے معاملات میں خود

کفیل ہوتے ہوئے اس نے اپنے والدین کے آبائی گھر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا اور پھر اسے احساس ہوا کہ اکیلی عورت کا معاشرہ میں رہنا محض عزت کا سودا ہے۔ اس نے کوئی رات چین سے نہیں گزاری۔ ہر لمحہ اپنی آنکھیں کھلی رکھیں۔ اس پر اپنی عزت کے ساتھ ساتھ اس کی جوان بیٹی کی عزت کی ذمہ داری بھی عائد تھی جو وہ پوری جانفشانی سے 'اپنا آپ بھلائے نبھا رہی تھی۔



رباب کو لانگ ٹرپ پر ناردرن ایریا ز گئے ہوئے آٹھ دن بیت چکے تھے خالی گھر مشعال کو کاٹنے کو دوڑ رہا تھا۔ وہ مغموم و اداس سی در و دیوار میں اترتی وحشتوں کے سناٹے اپنے اندر اترتے محسوس کر رہی تھی۔ دو دن میں رباب واپس آنے والی تھی طرح طرح کے اندیشے اور وسوسے مشعال کے شعور سے دامن گیر ہو رہے تھے۔ دل پر عجیب سا اضمحلال بوجھ ڈالے تھا وہ نڈھال سی اس کے آنے کی گھڑیاں گن رہی تھی۔

''آپ نے خوامخواہ زحمت کی 'میں خود رباب کو پک کرنے آجاتی۔''

رباب کی صورت دیکھ کر اس کی وحشتوں کو جیسے قرار ملا۔ وہ دس دن بعد اپنی بیٹی کی شکل دیکھ رہی تھی اس کی شاداب رنگت مزید نکھر گئی تھی۔ اس کے خدوخال خوب بھرے بھرے اور اناری محسوس ہو رہے تھے۔ نجانے حقیقتاً'' رباب میں اس قدر تبدیلیاں آئی تھی یا صرف مشعال کو ہی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ دیوانہ وار اس سے لپٹ گئی۔ اس میل ملاپ سے فارغ ہوئی تو اسے مشعال کے پیچھے کھڑی ایک باوقار شخصیت کا خیال آیا۔ وہ یہی سمجھی تھی کہ کالج انتظامیہ سے کوئی رباب کو چھوڑنے آیا ہے۔

''مما یہ ہمارے کالج میں پڑھاتے ہیں۔'' کچھ جھجکتے ہوئے رباب نے تعارف کیا تو مشعال نے ٹھٹک کر اس کے لب و لہجے پر غور کیا۔

''اوہ... آئیے سر کھڑے کیوں ہیں۔ تشریف رکھیں۔'' حیرت پر قابو پاتے ہوئے مشعال نے اصول مہمان نوازی نبھایا۔

''رباب بیٹا آپ سامان اپنے کمرے میں رکھو۔ میں آپ کے سر کے لیے کچھ کھانے کا انتظام کرتی ہوں۔'' مشعال نے تیزی سے ہدایت جاری کی۔

''مما میرے پاس کوئی سامان نہیں۔'' رباب نے سر جھکائے ناقابل یقین جملہ کہا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب میں ٹرپ پر گئی ہی نہیں مما۔'' اس نے نگاہیں جھکائے مشعال کے وجود کو متزلزل کر ڈالا۔

''رباب... ٹرپ پر نہیں تھی... تو پھر... کہاں تھیں؟'' کسی انہونی کے احساس نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ وہ بے ربط سی بولی۔

''مما میں نے ابتاج سر سے شادی کرلی ہے۔''

الفاظ تھے یا منوں وزنی بھالا جو مشعال کے سر پر ضرب لگا تا اسے لہولہان کر گیا۔ مشعال نے پہلی بار اس چھتیس پینتیس کے لگ بھگ مرد کو غور سے دیکھا جس کی عمر رباب سے دگنی تھی۔

مشعال نے بے ساختہ اپنا دایاں ہاتھ رباب کے چہرے پر ثبت کر دیا۔ اسے لگا تھا وہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی ہے۔ جس میں اس کی عمر بھر کی کمائی لٹ گئی۔ وہ شخص خاموش تماشائی بنا کھڑا تھا جیسے متوقع صورت حال سے آگاہ ہو۔

''کیوں... رباب... ایسا کیوں؟'' مشعال کو لگا اٹھارہ سال قبل بیتے لمحے پھر ان کے بیچ آکھڑے ہوئے ہوں۔ اٹھارہ سال قبل وہ اس کے باپ سے سوال کر رہی تھی اور اٹھارہ برس بعد اس کی بیٹی سے۔

''اس قدر بے وفائی' اس قدر بے اعتمادی اپنی ماں پر۔ میری پرورش کو گالی بنا دیا تم نے رباب۔ میری اٹھارہ سال کی محنت کو لمحوں میں داغ دار بنا دیا' کیوں تم نے اخلاقیات سے بے بہرہ یہ فعل سرانجام دیا۔''

اس کے وجود میں غم و غصے کا طوفان برپا تھا۔

''میں نے کچھ غلط نہیں کیا مما... اپنے لیے آزادی کی راہ ہی تو چنی ہے۔ آپ کے فیصلے نے مجھے کیا دیا'

آپ کو کیا دیا؟ بے اطمینان زندگی، نا آسودگی، فکریں، بے سکونی اور غیر محفوظ رکھا مجھے۔ میں مزید بے سرو سامان اور بے سائبان زیست کا سفر طے نہیں کر سکتی۔ سر نے میرے لیے اپنی فیملی کو چھوڑا ہے۔ وہ مجھے سہارا دے رہے ہیں مما۔ ان دس دنوں میں جتنی بھرپور زندگی میں نے گزاری ہے وہ پچھلے اٹھارہ سالوں میں میں نہیں گزار سکی۔ اگر آپ سے اپنی خواہش کا اظہار کرتی تو آپ کبھی مجھے فیور نہیں کرتیں۔ لہٰذا مجھے یہ راہ اختیار کرنی پڑی۔ مجھے مزید آپ کے فیصلے کی بھینٹ نہیں چڑھنا تھا، میں آپ کے چنے ہوئے جیون ساتھی پر قطعاً" اعتماد نہیں کر سکتی تھی۔ دنیا کی ہر عورت اپنی اولاد اور گھر کی خاطر ظلم و ستم برداشت کرتی ہے مرد کے قدموں میں رہنے کو بھی تیار ہوتی ہے، مگر آپ کو تو اپنا آرام مطلوب تھا مما۔ تب ہی تو سمجھوتہ کر نہ سکیں آپ۔ آپ پاپا سے سمجھوتہ کر لیتیں تو آپ کو یہ دن دیکھنا نہیں پڑتا، مگر آپ کو اپنی بیٹی سے زیادہ اپنی انا اور ضد عزیز تھی آپ نے مجھے بے آسرا کیا۔"

مشعال حق دق اس کی باتیں سن رہی تھی۔ اٹھارہ سال کا بھرم دھیرے دھیرے ٹوٹ رہا تھا۔ اس کی بیٹی اسے موردِ الزام ٹھہرا رہی تھی جس کی بہترین پرورش کے لیے اس نے خود پر خوشیاں حرام کر لیں۔ وہ اس پر انگلی اٹھا رہی تھی۔ وہ اسے بے جرم خطاوار بنا رہی تھی۔ اسے سمجھوتے کا پاٹ پڑھا رہی تھی جس کی وجہ سے اطمینان اس کی زندگی سے رخصت رہا وہ اسے قصوروار ٹھہرا رہی تھی۔ اسے اپنے عمل پر کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ عورت کے حقوق اور بقا کی جنگ لڑتی برسوں سے نشوونما پاتی 'انقلاب برپا کرنے کی خواہش رکھنے والی' اپنے آپ کو عملاً" برباد کر دینے والی عورت مشعال کے اندر بے موت ماری گئی۔

ایک عورت ہی عورت کو برباد کرنے کا سبب بنتی ہے۔ اسے برباد کرنے والی عورت رومیلہ تھی اور ایک مزید گھر کو تباہی کے دہانے پر لانے والی خود اس کی بیٹی تھی۔ اس کا صبر، قربانی سب رائیگاں گئی، عورت کی تاریخ اب بھی وہی تھی بے بسی، سمجھوتہ، حق پر ہوتے ہوئے بھی مرد کی محتاج۔

عورت ہی عورت کا آئینہ ہے۔

مشعال کی اندھیری ہوتی سوچ میں اک نقطہ ابھرا اور وہ وہیں بیٹھتی چلی گئی۔



نبیلہ نازش راؤ



جونہی میں نے فرانس کی سرزمین پر قدم رکھا' ایک بھولی بسری مگر جانی پہچانی درد کی سرد لہر میری روح تک کو ہلا گئی تو میری چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میں نے بمشکل دانتوں کو ایک دوسرے میں بھینچے رکھا۔ آخر عزت بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے نا۔

سفری ایجنٹ نے مختلف علاقوں کی طویل فہرست کو نہایت خوب صورت انداز میں ترتیب دے کر اس کی ایک کاپی باری باری تمام گروپ کے حوالے کی۔ میں نے سرسری سی طویل فہرست پر نظر دوڑائی اور پھر سے خود کو اردگرد کے حسین مناظر میں گم کرلیا۔

ان دنوں موسم چونکہ نہایت خوشگوار تھا اس لیے بارونق شہر پیرس سے پرے سنسان مگر سرسبز علاقوں میں "کمپنگ سائٹس" بکھری پڑی تھیں۔ ظاہر ہے' ہم جیسے باذوق بندے اس دنیا میں اور بھی بہت سارے ہیں مگر پھر بھی ان میں اور ہم میں ایک خاصا فرق تھا کہ ہمارے وزٹ کے شوق کی تکمیل میں ہمارے فرائض کی شمولیت بھی تھی جبکہ وہ سب آزاد پنچھی تھے یا "آپ حال مست حال مست" کہہ لیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ہم سب نسبتاً "اونچے ٹیلے پر اپنے سفری بیگ بے پروائی سے ڈھیر کیے اور پوری وزیٹرز ٹیم (سفر کرنے والے) ممبر تھکاوٹ کی وجہ سے خود بھی ڈھے سے گئے۔

ملازموں نے نہایت پھرتی سے کمپنگ کی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے خالی جگہ سات صاف ستھرے اور ہوادار کمروں پر مشتمل ایک کوارٹر میں تبدیل ہوگئی جس میں اینٹوں اور سیمنٹ کی چنوائی نہیں ہوئی تھی بلکہ اس جگہ موٹی ترپال کو کام میں لایا گیا تھا۔ ٹونی (**ہمسفر**) نے نہایت مہارت سے پلاسٹک کے Pillow میں ہوا بھری اور میرا بیڈ تیار تھا۔

"بیڈ تیار ہے میڈم!" اس نے حسب عادت فرشی سلام جھاڑا تو میں بے اختیار مسکرا دی۔

شکریہ! اب تم بھی آرام کرو۔ میں نے نرم تکیے پر سر جماتے ہوئے کہا اور آنکھیں موند لیں گویا اسے سگنل دیا ہو کہ اب بھاگو یہاں سے' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

میں اس کی عادت سے واقف تھی کہ وہ ڈھیروں گپیں لڑانا چاہتا تھا مگر میں اپنے اس نادان دل کا کیا کرتی جس کا پرندہ ماضی کی طرف پھڑپھڑانے کو تڑپ رہا تھا اور پھر اس کمزور لمحے کی گرفت میں آگئی۔

شوق ہر تمنا کے ٹھکانے گزرے
رات پھر ذہن سے کچھ خواب پرانے گزرے
چاند جب جھیل میں اترا تو منظر کی طرح
مجھ کو چھو کر ترے بازو ترے شانے گزرے
جانے کس شخص کے بارے میں پریشان ہو تم
اب ہمیں خود کو بھولے بھی زمانے گزرے
بجھنے لگتا ہے کسی شام کی مانند وجود
جب تری یاد ہواؤں کے بہانے گزرے

میرا تعلق ایک نہایت ہائی کلاس سے تھا۔ ماما بچپن میں ہی وفات پاگئیں لہٰذا میری پرورش میری دوسری ماما

کے بجائے کلثوم بی بی جو ہماری خاندانی آیا تھیں' انہوں نے کی۔ پاپا کی چونکہ میں اکلوتی اولاد تھی' اس لیے وہ مجھے جی جان سے چاہتے تھے۔ ان کی لکڑی کی فیکٹریاں ملک بھر میں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ مارچ کے مہینے کے اوائل کی صبح تھی۔ پاپا میری برتھ ڈے کو دھوم دھام سے منانے کے جوش میں دیوانے ہوئے جا رہے تھے۔

"امام دین بنگلے میں ہر طرف اتنے چراغ جلا دو کہ ہر طرف جگنو ہی جگنو چمکنے لگیں۔" یہ کہتے ہوئے پاپا کی اپنی آنکھیں جگنو کی طرح چمکنے لگی تھیں۔

میں نہایت خوبصورت لباس پہنے تتلی کی طرح اپنی فرینڈز میں پھدکتی پھر رہی تھی۔ اماں کلثوم بی بی میری طرف دیکھ کر ماشاءاللہ کا ورد کر رہی تھیں اور میں اتنی ساری محبتیں پا کر نہال سی ہوئی جا رہی تھی اور پھر اچانک پاپا کی ایک ارجنٹ کال آئی جسے سن کر پاپا ہلدی کی طرح پیلے پڑ گئے' میرا دل سہم سا گیا۔

"پاپا اینی پرابلم؟" میں نے سہارا دے کر انہیں بیڈ پر لٹایا۔

"شیبا بیٹے تم جلد از جلد کلثوم بی بی کے ہمراہ پیرس روانہ ہو جاؤ۔" ان کی آواز ڈوب رہی تھی۔



"پاپا یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" میری آواز میں حیرت اور تشویش تھی۔

"اوہ ڈیئر! ایسا ہے کہ تمہیں پیرس دیکھنے کا شوق بھی ہے اور اکثر تم مجھ سے زمان انکل کے پاس جانے کی فرمائش بھی کرتی ہو اور آج کل تم پیپرز سے فارغ بھی ہو تو وہ لوگ تمہیں خاص کمپنی دیں گے۔" پاپا تھکی تھکی آواز میں بول رہے تھے۔

"مگر پاپا ابھی یوں اچانک ہم...." کتنے سوال میرے ہونٹوں تک آتے آتے رہ گئے۔ میں پاپا کی اٹل اور ضدی طبیعت سے واقف تھی اگرچہ وہ مجھ پر جان چھڑکتے تھے اس لیے میں خاموشی سے سفری بیگ میں کپڑے ٹھونسنے لگی اور پھر کلثوم اماں کے ساتھ گاڑی میں بیٹھے ہوئے میں نے مڑ کر بنگلے کے ان جگنوؤں کی طرف دیکھا جو ابھی تک ٹمٹما رہے تھے۔ پاپا گلے ملتے ہوئے سسک اٹھے۔

"مجھے معاف کر دینا بیٹا!" انہوں نے ایک سرگوشی سی کی۔

میں حیرت سے منہ کھولے انہیں دیکھ رہی تھی یہ سب کیا ہے، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ میں اپنے سائیں سائیں کرتے دماغ کے ساتھ جہاز کی سیٹ پر ڈھے سی گئی اور پھر میرا یہ عقیدہ مزید جڑ پکڑ گیا کہ جب بھی مجھے کوئی خوشی ملتی ہے "فوراً" اس سے دو گنا غم آن ٹپکتا ہے اور خوشی کافور ہو کر رہ جاتی ہے۔

زمان انکل چونکہ خاندانی پٹھان تھے اس لیے پیرس جیسے شہر میں رہتے ہوئے بھی ان کی بیوی آنٹی سارا ایک فرانسیسی خاتون تھیں مگر شادی کے بعد دائرہ اسلام میں داخل ہو گئی تھیں۔ زمان انکل نے جانے دنیا کے کس کس حصے سے قیمتی پتھر اکھٹے کر کے دس کمروں پر مشتمل وہ کوٹھی تعمیر کی ہوئی تھی۔ وہ پیرس کے شور شرابے سے دور ایک پرفضا مقام پر تھی جس کے ایک طرف خاکستری پہاڑوں کی ایک لمبی اور نہ ختم ہونے والی قطار تھی اور دوسری طرف جھر جھر۔ بہتی ٹھنڈے پانی کی میٹھی جھیل اور لان قسم قسم کے پھولوں سے اٹا پڑا تھا کوریڈور کی دائیں سائیڈ پر لکڑی کے بڑے سے چوپائے پر چار گاگریں یا شاید گھڑے دھرے تھے جن پر زمان انکل کی اکلوتی اور پیاری بیٹی ریما روز گلاب پرو کر ڈالتی تھی ہر کمرے میں — آتشدان بنے ہوئے تھے غرضیکہ ایسے لگتا تھا کہ میں پاکستان کے کسی پٹھانی گھرانے کی حویلی میں کھڑی ہوں۔

آنٹی سارا کی ایک بھانجی **سنیلا** جس کے والدین اس کے بچپن میں ہی کار حادثے کا شکار ہو گئے تھے وہ ان کے ساتھ رہائش پذیر تھی۔ وہ بے انتہا حسین اور معصوم تھی۔ جب میں نے پہلی بار اسے دیکھا تو اس کا معصوم حسن ایک لمحے کو مجھے مبہوت کر گیا مگر وہ تو مجھ سے بہت امپریس لگ رہی تھی۔ اماں کلثوم بی بی تو سارا دن عبادت میں گزار دیتیں، مجھے بابا کی فکر کھائے جاتی۔ جانے ایسی کیا ایمرجنسی تھی جو انہوں نے ہمیں یہاں بھیج دیا۔

انکل زمان سے بارہا پوچھا مگر وہ برابر ٹال مٹول کر جاتے اور میرا دل بہلانے کے لیے گھماتے پھراتے رہتے۔ زمان انکل، ریما، **سنیلا** اور میں ہم سب گاڑی میں خوب گھومتے اور ہر روز زمان انکل یہ کہہ کر میرے تجسس کو ابھار دیتے کہ شباز شاہ آئے گا تو تم اس سے بھی زیادہ انجوائے کرو گی۔ میں چونکہ ان قدرتی مناظر کی دیوانی تھی۔ اس لیے روز شباز شاہ کے آنے کی دعائیں مانگتی۔ اصل میں شباز شاہ انکل زمان کا بڑا بیٹا تھا جو انگلینڈ میں زیر تعلیم تھا۔ اب اسے دو ماہ کی چھٹی پر آنا تھا۔ گھر میں اس کے آنے کے خاص الخاص انتظامات جاری تھے اور پھر وہ آ گیا۔ میں ایک لمحے کو اسے دیکھ کر ساکت سی ہو گئی۔ یا خدا! میں نے اسے پہلے کہاں دیکھا ہے؟ یا پھر.... یا پھر اسی کے انتظار میں میں نے زندگی میں آنے والے ہزاروں مردوں کو اگنور کیا؟

"ماما آپ کے لیے یہ خالص پاکستان کا امپورٹڈ شیشوں کے کام والا گاگرا۔" اس نے آنٹی کی آنکھوں کے آگے نہایت جھلمل کرتا ڈریس لہرایا تو آنٹی نہایت خوش ہوئیں، وہ مجھ سے اور اماں کلثوم بی بی سے قطعاً بے نیازی دکھا رہا تھا۔ اماں کلثوم تو خود اس سے بے نیاز

اپنی تسبیح میں گم تھیں مگر مجھے اس کی اگنورنس بہت کھل رہی تھی۔ آخر میں اتنے بڑے بزنس مین کی اکلوتی اولاد جس سے لوگ بات کرنے کو ترستے تھے۔

"اور مانو تمہارے لیے یہ شال اور ساڑی۔" اس نے ریما کی گود میں دو پیکٹ پھینکے۔ "اور ہاں' سنبلاجی آپ کے لیے یہ بلیک موتیوں کی مالا۔" اس نے نہایت خوبصورت مالا خود اس کے گلے میں پہنائی تو ایک شرمیلی مسکراہٹ سنبلا کے چہرے پر آکر معدوم ہوگئی۔ یہ دیکھ کر میرے تازہ اور خودرو جذبات ایک لمحے کو سن سے ہوگئے جانے ایسا کیوں ہوا؟

"شباز شاہ بیٹے اب شیبا کو گھمانے پھرانے اور کمپنی دینے کی ذمہ داری تم پر ہے کیونکہ مجھے بزنس کے سلسلے میں جرمنی جانا ہے۔" زمان انکل قہوے کا آخری گھونٹ حلق میں انڈیلتے ہوئے بولے تو اس نے پہلی بار ایک اچٹتی سی نگاہ مجھ پر ڈالی اور پھر جیکٹ کندھے پر ڈال کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"اوکے ڈیڈ! لیکن ابھی میں آرام کروں گا۔" اور وہ باہر نکل گیا۔ اس دن پیرس کے شہر میں موسم بے حد خوشگوار تھا۔ ریما' سنبلا میں شباز شاہ ہم سب پیرس کے دائیں کنارے پر واقع قہوہ خانے میں مخصوص قہوے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ ایک جدید طرز کا قہوہ خانہ تھا۔ ایک ٹھنگنا سا فرانسیسی نہایت پرسوز دھن چھیڑے ہوئے تھا۔

ریما قہوہ پیتے ہوئے سائڈ پر پڑی شیشے کی الماری میں رنگین مچھلیوں کو دلچسپی سے گھور رہی تھی اور سنبلا جوش و خروش سے میرے ساتھ کسی بحث میں الجھی ہوئی تھی۔ میں بظاہر تو اس سے گپ شپ لڑا رہی تھی مگر میرا سو میں بچانوے پرسنٹ دھیان شباز شاہ کی طرف تھا جو قہوہ پیتے ہوئے گہری نظروں سے سنبلا کو تک رہا تھا۔ میں کن انکھیوں سے یہ سب نوٹ کر رہی تھی مگر سنبلا ان پڑھ ہونے کے باوجود بلا کی ذہین تھی' وہ ایک دم شباز شاہ کی جانب پلٹی۔

"شباز جی؟" اس کے لہجے میں بلا کی معصومیت تھی۔

"آں۔ ہاں" وہ خیالوں کی دنیا سے حقیقت میں آیا تھا۔

"شباز جی! تم جانتے ہو شیبا بھی تمہاری طرح بڑے کالج سے پڑھی ہوئی ہے؟" وہ یونیورسٹی کو بڑا کالج کہہ رہی تھی "اور پھر اتنی خوبصورت ہے دیکھو تو۔" اس نے اپنی مرمریں انگلیوں سے میرا چہرہ پکڑ کر شباز کی طرف کیا۔

"یا خدا' یہ اسے ایک دم کیا ہوگیا ہے تو گویا شباز شاہ کے لیے میری دیوانگی اتنی عیاں ہے کہ سنبلا جیسی بے پروا لڑکی بھی نوٹ کیے بنا نہ رہ سکی۔" میں اندر ہی اندر پزل سی ہوگئی۔ میں سارا آنٹی کی بدولت جان چکی تھی کہ سنبلا بچپن سے ہی شباز شاہ سے منسوب ہے اور شباز شاہ اسے دیوانوں کی طرح چاہتا ہے جبکہ سنبلا کی دیوانگی بھی اس سے کم نہ تھی مگر بظاہر وہ اتنی گرم جوشی کا مظاہرہ نہ کرتی تھی جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ اس سے شکوہ کناں رہتا۔

"ہاں ہے تو خوب صورت پھر میں کیا کروں؟" وہ میز پر کہنیاں ٹکا کر سنبلا کی طرف مزید جھک کر شوخ نظروں سے بولا۔

"شہباز جی تو پھر تم اس سے شادی کیوں نہیں کرلیتے؟" اس نے نہایت سادگی سے کہا۔

"واٹ؟ کیا بکواس کر رہی ہو؟" شباز شاہ ایک دم چیخ اٹھا۔

میں اس کی غیر متوقع بات پر نروس ہو کر ایک دم کھڑی ہوگئی۔

"سنبلا تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میری شادی ہوگی تو صرف تم سے' سمجھیں۔" اس نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے اس کے کمزور کاندھوں پر دباؤ ڈالا اور سخت لہجے میں بولا۔ "مجھے شیبا یا دوسری عام لڑکیوں سے کوئی غرض نہیں۔"

میں اپنی اس توہین پر بلبلا اٹھی۔ میں اب اپنی نظروں میں خود کو نہایت حقیر محسوس کرنے لگی تھی۔

"شباز شاہ' نہ کرو تم مجھ سے شادی مگر خدارا مجھے اپنی نظروں میں اتنا معتبر تو جانو کہ میں سر اٹھا کر جی

سکوں۔" میں نے کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں اور آنکھوں کی نمی کو اندر ہی اندر اتارنے لگی۔

پھر میں نے محسوس کیا کہ شباز شاہ مجھ سے کترانے لگا تھا۔ جتنا میں اس کی طرف بڑھتی، وہ اتنا پیچھے ہٹتا اگر کبھی وہ کام کے سلسلے میں باہر جاتا تو میری نگاہیں بے چینی سے گیٹ کا طواف کرتیں۔ بہت اس دل کو سمجھایا مگر پھر دل و ذہن کی جنگ میں فتح دل کو ہوئی لہٰذا اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ میری شوخ و چنچل طبیعت چند دنوں میں مرجھا گئی۔ اب میں کافی حد تک سیریس ہو گئی تھی۔ بے وجہ شباز شاہ سے بات کرنے کی بالکل کوشش نہ کرتی کیونکہ مجھے بار بار اپنی توہین گوارا نہ تھی مگر اتنا تو جانتی تھی کہ شباز شاہ کی چاہت کا نشہ میری رگ رگ میں اتر چکا ہے اور اب اس نشے کے زیر اثر میری باقی ماندہ زندگی بیتے گی۔ اس دن وہ صبح کا گیا ہوا شام کو لوٹا تو ساتھ میں اس کے تین، چار فرینڈز بھی تھے۔

انہیں مہمان خانے میں بٹھا کر وہ مجھے اگنور کرتا ہوا مختلف کمروں میں جھانک رہا تھا، میں بھی بظاہر بے نیازی سے لان میں جھکی سبز ڈال پر بکھرے گلاب کے پھول چنتے ہوئے ہولے ہولے گنگنا رہی تھی۔ میں جانتی تھی آخر کار میرے پاس آئے گا۔

"سنو۔" ایک دم مجھے پیچھے سے دھاڑ سنائی دی۔

میں ایک دم سہم گئی آہ۔۔۔ ایک کانٹا میری انگلی کی پور میں پیوست ہو چکا تھا میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں، تکلیف جو بہت ہو رہی تھی۔

"اوہ۔۔۔ سوری لاؤ میں نکال دوں۔" وہ شرمندہ شرمندہ سا میری جانب بڑھا۔

"نن۔۔۔ نہیں۔" میں گھبرا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ میں نے بڑے ضبط سے لمبا کانٹا کھینچا اور پھر خون کی ایک دھار پھوٹ گئی۔ میں نے دوپٹے کے پلو میں انگلی لپیٹی اور دوسرے ہاتھ کی پشت سے گالوں پر لڑھکتے آنسو پونچھے۔

"جی فرمایئے۔" میں اس کی جانب متوجہ ہوئی تو ایک دم بزدل ہو گئی۔ وہ نہایت گہری اور عجیب نظروں سے مجھے گھور رہا تھا، ایک دم چونک گیا۔

"وہ میں یہ پوچھنے آیا تھا کہ سب کہاں ہیں؟"

"آنٹی اور ریما بازار گئی ہیں اور سنیلا صبح سے سر درد ہونے کے باعث لحاف میں لیٹی ہوئی ہے۔" میں بات مکمل کر کے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ کافی مشکل میں لگ رہا تھا۔ میں سمجھ گئی۔

"اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں چائے بنا دوں آپ کے دوستوں کے لیے۔"

"ارے واہ، آپ نے تو میرے دل کی بات سن لی۔" وہ ایک دم کھل کر مسکرایا، مگر میں بدستور سیریس رہی تو وہ میرا ری ایکشن دیکھ کر شرمندہ سا ہو کر مہمان خانے کی جانب مڑ گیا۔

"شباز شاہ اگر تمہاری یہ مسکراہٹ بغیر کسی چاپلوسی اور ملاوٹ کے صرف میری ذات کے لیے ہوتی تو خدا کی قسم میں اپنی تمام عمر اس ایک مسکراہٹ کے سہارے بتا دیتی۔ بغیر تم سے شکوہ کیے۔" میں نے سر کچن کی دیوار سے ٹکا دیا۔

"اماں بی بی، بابا کا نہ کوئی فون اور نہ ہی ای میل آیا۔ میں جب زمان انکل سے پوچھتی ہوں تو وہ ہوں ہاں کر کے ٹال دیتے ہیں۔" میں اماں بی بی کی گود میں سر رکھ کر مچل اٹھی۔ اماں بی بی کی تسبیح کے دانے ایک دم رک گئے۔ "شیبا بیٹا، تم فکر نہ کرو، اللہ بہتر کرے گا۔" ان کی نرم نرم انگلیاں میرے بالوں میں رینگ رہی تھیں، مگر آنکھیں کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔



بھیگی رتوں میں اکثر
پلکوں پر اشک کے چراغ سجا کر
آج بھی نجانے کیوں
تجھے آنکھیں تلاش کرتی ہیں
بس!
تیری یادیں اداس کرتی ہیں

آج پیرس کی بوندا باندی میں مجھے پاپا بہت یاد آ رہے تھے۔ ان کا وہ آخری بار دیکھا ہوا اداس چہرہ اور ان کے وہ الفاظ "بیٹے مجھے معاف کر دینا۔" میں الجھ کر رہ گئی' آخر مفہوم سمجھ میں نہ آسکا۔ پھر کالج فرینڈز بہت یاد آ رہی تھیں۔ یہاں سے دل بہت اچاٹ ہو گیا تھا۔ اچانک کسی نے بٹن آف کیا تو میں نے چونک کر دیکھا وہ شباز شاہ تھا۔ اس نے میری جانب جھک کر دو ٹکٹیں میرے چہرے کے آگے لہرائیں۔

"آپ کا بلاوا آیا ہے۔" وہ گنگنایا تو بے اختیار میری آنکھیں چھلک پڑیں۔ پتا نہیں پاپا سے ملنے کی خوشی میں یا شباز شاہ سے دوری کے رنج میں۔ شباز شاہ کے پیچھے ہی ریما اور سنیلا چلی آئیں۔ ان کے منہ اترے ہوئے تھے۔

"سچی شیبا' ہم نے تو ابھی دل بھر کر باتیں بھی نہیں کیں۔" وہ دونوں میرے دائیں بائیں لپٹ گئیں۔

"بھئی شیبا' پاکستان جا رہی ہے اس لیے آج آخری بار میری طرف سے ڈنر ہو جائے۔" شباز شاہ نے خوش دلی سے دعوت دی جسے نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے قبول کرنا پڑا اور پھر ہم سب شام کو پیرس قہوہ خانے کے باہر لان میں بچھی کرسیوں پر بیٹھے مشہور فرانسیسی کھانے کا آرڈر دے رہے تھے۔ ریما بے حد چہک رہی تھی یا شاید پوز کر رہی تھی مجھے خوش کرنے کو۔ سب بہت بول رہے تھے کہ کسی طرح میرے نالے بھی ٹوٹیں' آج تو شباز شاہ بھی بہت توجہ دے رہا تھا۔

"کیا بات ہے سوپ پینے میں پرابلم ہو رہی ہے؟" شباز شاہ میری طرف جھک کر مسکرایا۔ مجھے واقعی سوپ پینے میں پرابلم ہو رہی تھی۔

"بہت کڑوا ہے' بالکل میرے ذہن و سوچ اور زبان کی طرح۔" میں منہ میں ہی بڑبڑائی غیر ارادی طور پر' چانک جسے صرف شباز شاہ سن چکا تھا۔

"کوشش کرو یہ سب سوچیں کڑوی ختم ہو جائیں گی۔" اس کے انداز میں نصیحت تھی۔

میں چڑ گئی۔ "نہیں انہیں یونہی رہنے دو کوشش کرنے سے ـــــ کڑواہٹ مزید بڑھ جائے گی اور مشورے کا شکریہ۔" میرا انداز نہ چاہتے ہوئے بھی جارحانہ ہو گیا اور میں ایک دم چیئر چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس رات چاند کی پندرہ تاریخ تھی ہم سب یعنی ریما' سنیلا' میں لان میں بیٹھے تینوں اپنی اپنی سوچوں میں گم تھے۔

"شیبا' کچھ بات کرو۔" سنیلا نے میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر دبایا۔ وہ لڑکی تو میری رگ رگ سے واقف ہو گئی تھی۔ اتنے قلیل عرصے میں میری دل کی گہرائیوں میں جھانک چکی تھی جہاں میں شاید خود بھی جھانکنے سے گریز کر رہی تھی۔ میں نے دھندلی آنکھوں سے سنیلا کی طرف دیکھا اور بمشکل آنسوؤں کا گولہ جو میرے حلق میں اٹکا ہوا تھا اسے نگل کر بولی۔

"سنیلا پلیز' وہ فرانسیسی لوک گیت سنا دو جو تم اکثر گنگنایا کرتی ہو۔"

میں نے عاجزی سے درخواست کی تو سنیلا دھیرے سے مسکرا دی اور پھر نہایت سریلی آواز میں گیت گنگنانے لگی۔

اور جب وہ لوک گیت ختم ہوا تو میرے رخسار آنسوؤں سے تر ہو چکے تھے۔ میں نے کرسی کی پشت سے سر ٹکائے ہوئے اپنی موندی آنکھیں کھولیں تو سامنے شباز شاہ سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا ہوا عجیب اور اداس نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا اور سنیلا اور ریما غائب تھیں۔ میں نے نظریں چرالیں' وہ آہستہ آہستہ میری چیئر کی طرف بڑھا اور میرے بہت قریب جھک کر پوروں سے میرے گالوں پر لڑھکتے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔

"پاگل لڑکی! جو چیز تمہاری رسائی سے بہت دور ہے اس کے پیچھے کیوں بھاگتی ہو' خود بھی پریشان ہوتی ہو اور دوسروں کو بھی پریشان کرتی ہے۔"

میرا دل چاہا' پوچھوں شباز شاہ ان دوسروں میں تمہاری ذات بھی شامل ہے یا نہیں' مگر میں وہاں سے ایک دم بھاگ آئی کیونکہ اس کی یادوں کی کتاب

میرے دل میں مکمل ہو چکی تھی۔ اس میں مزید کسی نئی یاد کے باب کا اضافہ کرنے کی گنجائش نہ تھی۔ میرے لیے اب یہی کتاب سرمایہ حیات تھی۔

صبح ایرپورٹ جانے سے پہلے اچانک پاپا کی ڈیتھ کی اطلاع ملی۔ زمان انکل نے بتایا کہ پاپا اپنا لکڑی کا بزنس اسٹارٹ کرنے سے پہلے بے روزگاری سے تنگ آکر اسمگلنگ کے ایک گروہ سے وابستہ ہو گئے تھے، مگر بعد میں انہوں نے ان سے علیحدگی اختیار کر کے اپنا لکڑی کا بزنس اسٹارٹ کر لیا تھا، اس وقت سے وہ پورا گروہ پاپا کا دشمن بن چکا تھا اور پھر ان دنوں جب ان کا پورا گینگ پکڑا گیا تو انہوں نے لسٹ میں پاپا کا نام بھی لکھوا دیا۔ پاپا نے مجھے اس صدمے سے دور رکھنے کے لیے یہاں بھیج دیا اور پھر خود جیل میں ہی دل کا دورہ پڑنے سے۔۔۔ میں تڑپ تڑپ کر رو دی۔ ”پاپا آپ اتنی مشکلات کیسے اپنی جان پر سہتے رہے، آپ نے مجھے اس قابل نہ سمجھا کہ میں آپ کی پریشانیوں میں شیئر کر سکتی۔“

مجھ پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ پیرس میں چھ دن اسپتال میں رہنے کے بعد جب طبیعت ذرا سنبھلی تو میں نے پاکستان جانے کی رٹ لگا دی۔ سب نے بہت سمجھایا، مگر میں اماں کلثوم بی بی کے ساتھ واپس آ گئی۔ جب پاپا کے بزنس پارٹنر سے حساب مانگا تو اس نے پچھلے حساب نکال کر رکھ دیے کہ بزنس میں بہت نقصان رہا۔ لہذا کوئی امید نہ رکھی جائے۔ پاپا کے کچھ شیئرز پڑے تھے جنہیں بیچ کر میں نے رقم فلاحی ادارے کو دے دی۔ کلثوم اماں کے لیے ایک جوان سی ملازمہ رکھ دی۔ اب مجھے حالات سے سمجھوتا کرنا آ گیا تھا۔ وقت بھی گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہے۔ کبھی دکھ، کبھی سکھ زندگی کس کس طرح اپنا خراج وصول کرتی ہے، کسی کی جھولی خوشیوں سے بھر کر اور کسی کو غموں کے ڈھیر میں پیوست کر کے۔ میں چونکہ فارغ بیٹھ کر اکتا گئی تھی۔ اس لیے ایک نیا انسٹی ٹیوٹ جوائن کر لیا ہمارے ادارے کی کل پچیس شاخیں کھلی تھیں جو نگری نگری گھوم کر حسین مناظر کی کھوج لگاتیں پوسٹ مارٹم کر کے اسے کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کرتی چلی جاتیں۔ مجھے شروع سے ہی نیچرل بیوٹی کا بہت کریز تھا۔ چھ سال میں، میں نے تقریباً ”پوری دنیا کھنگال ڈالی آج پیرس کو کھوجنے آئی تھی، مگر یہاں آکر میں پیرس کو کھوجنے کے بجائے اپنے آپ کو، اپنی ذات کو کھوجنے بیٹھنے گئی تھی۔ میرے خیالات کا تسلسل ٹونی کی پرسوز وائلن کی آواز نے توڑا۔

ٹونی ہمارے ممبرز میں سے سب سے جونیئر ممبر تھا۔ تیکھی مونچھوں والا یہ اسمارٹ سا لڑکا مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ ابھی عمر بائیس برس تھی، مگر عشق کا روگ پال بیٹھا تھا۔ جب شروع شروع میں مجھے ٹھنڈی آہیں بھر بھر کر اپنے کالج کے ناکام عشق کا قصہ سناتا تو ہنستے ہنستے میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتیں تو وہ اپنا قصہ بھول کر حیرت سے منہ کھولے مجھے تکے جاتا۔

”میڈم، آپ رو رہی ہیں یا ہنس رہی ہیں؟“ وہ ہمیشہ مجھ سے سوال کرتا تو میں واقعی یہ خود نہ جان سکتی کہ میں رو رہی ہوں یا ہنس رہی ہوں۔

اگلی صبح بے حد خوشگوار تھی۔

”آج کہاں مارچ کرنا ہے جہانگیر خاں؟“ میں نے اپنے گھنے بالوں کو ربڑ بینڈ میں کستے ہوئے اپنے سفری ایجنٹ سے دریافت کیا۔

”میڈم آج ہمارا ارادہ پیرس کی ایک جھیل دیکھنے کا ہے۔ جس کے دائیں طرف پہاڑوں کی لمبی قطار ہے اور ہاں ایک پتھروں کا خوب صورت پیلس مجھے بہت اٹریکٹیو لگا۔ میں نے کل شام ایک طائرانہ نظر دوڑائی ہے وہاں۔“

میں تو یہ جان کر سن سی ہو گئی، آج میرے اس یقین کو شہ ملی تھی کہ دنیا واقعی گول ہے

ہماری ٹیم گھنی پگڈنڈیوں سے گزر رہی تھی۔ میرا دامن کانٹوں میں الجھا، میں کانٹوں سے نجات حاصل کرنے میں لگی تھی۔ جب ارد گرد نگاہ دوڑائی تو تمام ممبر آنکھوں سے اوجھل تھے۔ دائیں طرف پتھروں کا

محل کھڑا تھا۔ مجھے وہ محل جادو کا محسوس ہوا اور میں اپنے آپ کو اس شہزادی کی مانند سمجھنے لگی جو اچانک جادو کے اثر سے پتھر کی ہو جاتی ہے' پھر ایک غیر مرئی طاقت مجھے ادھر ادھر دھکیلتی چلی گئی۔ ریما پہلے تو مجھے اجنبی نگاہوں سے گھورتی رہی پھر مجھے زور سے بھینچ کر ہنستی چلی گئی اور اچانک رک کر چیخ چیخ کر رونے لگی۔

ریما سے علم ہوا کہ آنٹی اور انکل حج کی سعادت حاصل کرنے گئے ہیں اور باقی سب؟ میں نے اردگرد نگاہ دوڑائی تو وہ نگاہیں چرا گئی۔ میرے اصرار پر بتایا کہ میرے جانے کے چار سال بعد سنیلا کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو کر اگلی دنیا سدھار گئی اور شباز شاہ دن رات اس کی قبر پر ساکت بیٹھا رہتا ہے۔ میں ریما کو دیوانوں کی طرح گھسیٹتی وہاں لے گئی۔ یہ شباز شاہ وہ تو نہ تھا جسے میں چھوڑ کر گئی تھی وہ پتھریلی نگاہوں سے مجھے گھورتا رہا پھر میں اس کے بازو پر سر ٹکا کر بے تحاشا روئی۔

وہ دونوں مجھے سہارا دے کر گھر لائے' زبردستی تین چار لقمے کھانا کھلایا۔

"اب میں چلوں؟" میں اپنا شولڈر بیگ اور کیمرہ سنبھال کر کھڑی ہو گئی۔

"سنیلا آخری سمے کہہ رہی تھی کہ شیبا سے کہنا' مجھے معاف کر دے۔" ریما نے ہولے سے سرگوشی کی تو میں پھر سے چیئر پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"شیبا؟" میں نے سر اٹھا کر دیکھا' وہ شباز شاہ تھا۔

"تم ہمیں چھوڑ کر جانے کے لیے آئی ہو؟" اس کی آنکھوں میں' لہجے میں حسرت تھی۔ ناکامی' دکھ حزن و ملال جانے کیا کیا تھا کہ میری آنکھیں جھکتی چلی گئیں۔

"مگر شباز شاہ' میں سنیلا تو نہیں ہو سکتی نا؟" میرے لہجے میں حسرت تھی۔

"مگر شیبا' انسان زندگی میں ایک ذات سے ہی تو محبت نہیں کرتا نا اس کا دل تو بہت وسیع ہوتا ہے۔ آسمان کی وسعتوں سے بھی زیادہ۔ ہر ذات کے لیے مخصوص محبت ہوتی ہے' تم اپنا حصہ وصول نہیں کرو گی اور پھر جاتے سمے سنیلا کی بھی یہی خواہش تھی۔"

آہ۔۔۔ آج گیارہ سال بیت چکے ہیں۔ ہم دونوں ہر ماہ سنیلا کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جاتے ہیں اور ہر ماہ وہاں سے واپسی پر شباز شاہ کی آنکھوں میں ایک نامعلوم سی خلش دکھائی دیتی ہے تو میرا دل کٹ کر رہ جاتا ہے' مگر گھر کی چوکھٹ پر قدم رکھتے ہی وہ خلش غائب ہو جاتی ہے اور وہ میرے استفسار پر کہتا ہے کہ 'شبی' سنیلا تمہاری جگہ نہیں لے سکتی اور تم سنیلا کی جگہ نہیں لے سکتیں۔ میں تو خوش قسمت ہوں جسے اپنی مختصر سی زندگی میں دو پرخلوص ہستیاں نصیب ہوئیں' اور جب میں شباز شاہ کی آنکھوں میں اپنا عکس سنیلا کی طرح جگمگاتا دیکھتی ہوں تو اپنی نظروں میں مزید معتبر ہو جاتی ہوں۔



فرح طاہر



"کہو آصف میاں! باپ بننے کی خبر سن کر کیسا محسوس کر رہے ہو؟" صادق صاحب نے اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر دراز کیا۔ آصف نے ان کی بات سنی تو مسکراتے ہوئے سر جھکا دیا۔ اس کی اس ادا پر وہاں بیٹھی اس کی ماں اور بیوی بھی مسکرا دی تھیں، جبکہ صادق صاحب نے پیار بھری چپت اس کی ۔ پشت پر رسید کرتے ہوئے کہا۔

"حالت دیکھو اس کی، کس طرح لڑکیوں کی طرح شرما رہا ہے۔"

"آپ بھی ناخواہ مخواہ بچے کو تنگ کر رہے ہیں۔ پہلی بار ایسی خبر سنی ہے۔ اسی طرح شرماتا تو اس کا حق بنتا ہے۔" بانو بیگم فوراً" بیٹے کی حمایت کو آگے آئی تھیں، پھر مزید بولیں۔ "ہمارے آصف کی خوشی تو اس کے چہرے سے جھلک رہی ہے، مگر رضوانہ تم بھی تو کچھ کہو۔" اب ان کی باتوں کا رخ خاموش بیٹھی بہو کی جانب ہوا تھا۔

"میں... میں کیا بتاؤں امی..." وہ ایک دم بوکھلا سی گئی۔

"ہاں تم... آخر تم بھی تو ماں کے عہدے پر فائز ہونے جا رہی ہو، اب سے تم ایک نئی زندگی میں قدم رکھنے والی ہو جہاں بہت کچھ تمہارے لیے بالکل نیا اور انوکھا ہو گا۔ اس لیے بتاؤ اپنے بچے کے لیے تم نے کیا کچھ سوچا ہے۔" یکے بعد دیگرے انہوں نے سوالوں کی بوچھاڑ کی تھی۔

"امی پلیز..." وہ خود میں سمٹی وہاں سے جانے کو اٹھی تھی۔ جب صادق صاحب کی آواز نے اس کے بڑھتے قدموں کو روک دیا تھا۔

"تم دونوں کچھ نہ کہو۔ مگر ہم دونوں دادا، دادی بننے کی خبر پا کر بہت خوش ہیں۔ اتنے خوش کہ اپنی خوشی کا ڈھنگ سے اظہار بھی نہیں کر پا رہے ہیں۔ حالانکہ ابھی ہمیں بہت لمبا عرصہ انتظار کی سولی پر لٹکنا پڑے گا، مگر اس انتظار کا بھی اپنا ہی ایک الگ مزا محسوس ہو رہا ہے۔" اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے وہ ذرا دیر کو چپ ہوئے، پھر ذرا دیر کے توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوئے۔

"مگر اس وقت میں ایک بات بتا دینا چاہتا ہوں۔ یہ ریت ہمارے پرکھوں سے چلی آ رہی ہے۔ ہمارے ہاں بچوں میں زیادہ تر بیٹے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ خاص کر پہلا بچہ بیٹا ہی پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے تم سے بھی ہم یہی چاہیں گے کہ تمہارے ہاں بھی پہلا بچہ بیٹا پیدا ہو۔" رضوانہ جو شرمائی، لجائی سی وہاں سے چلی جانا چاہتی تھی۔ ان کی بات پر ایک دم گھبرا کر ان کی طرف پلٹی تھی۔

"یہ کیسی شرط ہے ابو... لڑکا ہو یا لڑکی یہ تو خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ وہ جسے جو چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ ہمارے لیے بھی جو وہ چاہے گا ہمیں وہی عطا کرے گا۔ پھر آپ بیٹے کی شرط کیوں رکھ رہے ہیں؟"

آج سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ رضوانہ نے کبھی ان کی کسی بھی بات سے اختلاف کیا ہو۔ وہ ایسی ہستی کی مالک تھی، جس پر اللہ میاں کی گائے ہونے کی مثل صدق آتی تھی۔ مگر جانور سے بھی ایک حد سے

زیادہ چھیڑ خانی کی جائے تو وہ پلٹ کر ردِ عمل ضرور ظاہر کرتا ہے۔ اس کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔ بیٹے کی شرط سن کر وہ تڑپ اٹھی تھی۔ ابھی تو وہ ان لمحات کو پوری طرح محسوس بھی نہیں کر سکی تھی۔ اس کے سامنے شرط رکھ دی گئی۔ اس کی آنکھوں کی سطح پر آنسوؤں کی واضح چمک ابھر آئی تھی۔

"ہاں تو خدا سے جو مانگو گی وہی ملے گا۔ تم اس سے بیٹا طلب کرو، تاکہ ہماری روایت سلامت رہے۔" ان کا انداز قدرے رعونت لیے ہوئے تھا۔

ان کے انداز پر رضوانہ نے خاموش بیٹھے اپنے شوہر کی جانب دیکھا کہ شاید اس موقع پر وہ اس کی حمایت میں کچھ بولے۔ مگر آج ایک بار پھر آصف نے اپنے والدین کے سامنے اس کو اکیلا چھوڑ دیا تھا۔ افسوس کی شدید کیفیت میں لب بھینچے چند پل اسے دیکھتے رہنے کے بعد اس نے صادق صاحب سے کچھ کہنا چاہا تھا۔ مگر بانو نے اسے ٹوک دیا۔

"تم بحث کیوں کر رہی ہو؟ ایسے موقع پر ایسی بد شگونی مت کرو۔ لگتا ہے تم بیٹی کی خواہش مند ہو؟



حالانکہ اب تک سب اچھی طرح جان چکی ہو اس کے باوجود بھی..." انہوں نے دبے لفظوں نجانے کس بات کی طرف اشارہ کیا تھا۔ وہ کچھ نہ بول سکی۔ بانو مزید کہہ رہی تھیں۔

"تمہیں بیٹی کی خواہش ہے تو وہ پھر کبھی سہی... مگر پہلا بچہ تو بیٹا ہی ہونا چاہیے۔ جیسے میری اولادوں میں بھی پہلا بچہ بیٹا پیدا ہوا اور تمہاری نندوں تک کے ہاں بیٹوں نے ہی جنم لیا۔ ایسے میں اگر ہم نے تم سے بیٹے کی فرمائش کی ہے تو کوئی بہت بڑی فرمائش نہیں کر دی ہے جو تم اس طرح ری ایکٹ کر رہی ہو۔ جس حالت میں تم ہو اس حالت میں خدا سے جو مانگا جائے وہ مل جاتا ہے۔ تم بھی بیٹے کے لیے دعا کرو۔" ہاتھ اٹھا کر قدرے تیز لہجے میں بولتے ہوئے انہوں نے جیسے بات ہی ختم کر دی۔

وہ ان بے حس لوگوں کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی۔ مگر لاکھ ضبط کے باوجود بھی اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ ان کی اس عدالت میں وہ ایسی مظلوم تھی جو اپنے حق میں ایک لفظ بھی ادا نہیں کر سکتی تھی۔ کیونکہ کچھ بھی کہنے کے جرم میں اسے بانو اور صادق صاحب کی ناراضگی تو سہنا ہی پڑتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ آصف بھی اس سے شدید خفا ہو جایا کرتا تھا۔ اس نے ایک نظر بانو کی طرف دیکھا اور سوچنے لگی۔ "ایک عورت ہونے کے باوجود ان کے انداز میں کس قدر رعونت بھری تھی۔ وہ بھی صرف اس لیے کیونکہ انہوں نے پہلا بچہ بیٹا پیدا کیا ہے۔ ایسا کر کے وہ ہر لحاظ سے بڑی ہو گئی ہیں۔ اس لیے وہ عورت کے جذبات تک کو سمجھنے سے محروم ہو گئی تھیں۔ ان کی باتوں نے اسے پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ انتہائی پریشانی کی حالت میں اس نے بے ساختہ دعا کی تھی۔ "یا اللہ میرے بچے کی حفاظت فرمانا۔"

صادق صاحب کی تین اولادیں تھیں۔ سب سے بڑا بیٹا آصف' پھر انعم اور حنا... دو سال قبل صادق نے آصف اور اپنی دونوں بیٹیوں کی شادی کر دی تھی' جن میں سے انعم اور حنا کے ہاں پچھلے برس بیٹوں نے جنم لیا تھا۔ جن کے پیدا ہونے کی خوشی سال بھر منائی جاتی رہی تھی۔ چونکہ انعم اور حنا کی شادیاں ان ہی کی پھوپھو کے گھر ہوئی تھیں۔ وہ لوگ بھی صادق صاحب اور بانو ہی کی طرح کی سوچ کے مالک تھے۔ اسی وجہ سے بیٹوں کی خوشی اس قدر منائی گئی کہ لوگوں نے مہینوں اسے یاد رکھا تھا۔ صادق اور بانو دونوں ہی آصف کے بچے کے منتظر تھے۔ اب جب شادی کے دو سال بعد خدا نے ان کی خواہش کو پورا کرتے ہوئے ان کے انتظار کو ختم کر دیا تھا تو وہ بے انتہا خوش تھے۔ مگر اب وہ پوتے ہی کے خواہش مند تھے اور یہ خواہش اس قدر زور آور تھی کہ انہوں نے رضوانہ سے صرف بیٹا پیدا کرنے کی شرط رکھ دی تھی۔



وہ اپنے کمرے میں سر پکڑے بیٹھی تھی۔ جب مغرب کی نماز کے بعد آصف کمرے میں داخل ہوا اسے آتا دیکھ کر وہ سیدھی ہو بیٹھی۔ آصف چلتا ہوا بیڈ پر اس کے برابر آن بیٹھا۔ رضوانہ نے شاکی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس پل ہزاروں شکوے تھے۔ جو اس کی نگاہوں سے عیاں ہو رہے تھے جن سے نظر چراتے ہوئے آصف نے کہا۔

"تم ابھی سے اتنا پریشان کیوں ہو رہی ہو؟"

"اب کیا میں پریشان بھی نہ ہوں آصف؟ وہ ہمارا بچہ ہو گا' جب ہمیں کوئی اعتراض نہیں کہ ہمارے ہاں بیٹا پیدا ہو یا بیٹی... تو پھر کوئی دوسرا اعتراض کرنے والا کون ہوتا ہے؟" اس کے انداز میں تیزی تھی۔

"وہ کوئی دوسرے نہیں' میرے ماں' باپ ہیں۔" اس نے گھورتی نظروں سے اسے ٹوکا تھا' جس پر رضوانہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔

"جانتی ہوں' وہ آپ کے ماں' باپ ہیں۔ اسی لیے تو آج تک سب برداشت کرتی رہی ہوں' کبھی زبان نہیں کھولی۔ مگر اب کیا کروں؟ اب مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا۔ آج ہی تو ہمیں اپنی زندگی کی اتنی خوب صورت خوشی ملی ہے۔ جسے ہم ڈھنگ سے محسوس بھی نہیں

کر سکے۔ ابھی ہم خوش بھی نہ ہو سکے تھے کہ ہمیں بیٹے کی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ کیا کیا کچھ نہ سوچا تھا ہم نے' ہمارا بچہ ہو گا' ہم ایسے کریں گے' ویسے کریں گے۔ میں اس تمام عرصے کے ایک ایک پل کو محسوس کرنا چاہتی تھی۔ مگر اب تو جیسے ابھی سے دم گھٹتا محسوس ہو رہا ہے۔ نجانے آگے کیا ہو گا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ آصف کو احساس تو تھا۔ مگر اس کے لیے اس کے پاس تسلی کے دو لفظ بھی نہ تھے۔

"آپ نے بھی تو کچھ نہیں کہا ابو سے۔" نا چاہتے ہوئے بھی شکوہ اس کے لبوں سے پھسل گیا تھا۔

"تم اچھی طرح جانتی ہو' میں ان کے سامنے بولنے کی جرات نہیں کر سکتا۔" وہ ایک دم سے بے بس دکھائی دینے لگا تھا۔

"ہاں جانتی ہوں۔ شادی شدہ ہونے کے باوجود بھی آپ ان کے محتاج ہیں۔ آج تک خرچے کے نام پر آپ کو جیب خرچ ملا کرتا ہے۔ آپ اس قابل ہی نہیں کہ اپنے زور بازو پر کما کر مجھے اور خود کو کھلا سکیں۔ ایسی حالت میں بھلا کیسے آپ ان کے سامنے بولنے کی جرات کر سکتے ہیں۔" رضوانہ نے تلخی سے کہتے ہوئے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

آصف نے لب بھینچ کر روتی بلکتی رضوانہ کو دیکھا تھا۔ لوگ تو ایسی خوش خبری ملنے پر خوشیاں مناتے ہیں' یہاں سوگ منایا جا رہا تھا۔

"اچھا۔۔۔ تم ایسے پریشان مت ہو' رونا بند کرو' لازمی تو نہیں ہے بیٹی ہی ہو۔ بیٹا بھی تو ہو سکتا ہے؟ تم بس اچھا اچھا سوچو۔۔۔ ابھی سے اس طرح خوف زدہ مت ہو۔ اللہ سے اچھے کی امید رکھو۔" آصف نے اسے تسلی دینا چاہی تھی۔ جسے سن کر اس نے کہا۔

"اپنے اللہ سے تو اچھی ہی امید ہے مجھے' ہونے کو تو بیٹا بھی ہو سکتا ہے' مگر بات پھر وہی ہے جو اگر بیٹی ہو گئی تو۔۔۔؟"

بیٹی کے نام پر ایک بہت بڑا سوالیہ نشان اسے خوف و ہراس میں مبتلا کرنے کو کافی تھا۔ آصف کے پاس اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا اور جواب تو خود اس کے پاس بھی نہیں تھا۔ جب ہی اپنی خود ساختہ سوچوں کے درمیان پھنس کر رہ گئی تھی۔

"جو اگر بیٹی پیدا ہو گئی تو۔۔۔ ابو نے ہمیں گھر سے بے گھر کر دیا تو۔۔۔ پھر ہم کہاں جائیں گے۔ اگر ایسے ہو گیا۔۔۔ ویسے ہو گیا تو۔۔۔ اس ایسے ویسے کی اذیت بھری سوچوں کے درمیان وہ بری طرح پھنسی تھی۔



آج صادق صاحب کی دونوں صاحب زادیاں ماں کے گھر آئی ہوئی تھیں۔ ان کے گھر میں عموماً" خاموشی کا راج ہوا کرتا تھا۔ مگر آج صبح سے ہی گھر میں رونق تھی۔ یہی وجہ تھی گھر کی ۔ دیواریں تک چمکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ ان دونوں نے آتے ہی اپنے پسند کے کھانوں کی فرمائش کر دی تھی۔ جس کو پورا کرنے کی ذمہ داری رضوانہ کی تھی۔ جو ان کے آنے کے بعد سے کچن میں کھڑی ان کی فرمائشیں پورا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ حالانکہ آج صبح سے سستی نے اسے اپنے لپیٹے میں لے رکھا تھا۔ بس دل چاہ رہا تھا کہ سب کام چھوڑ کر بستر میں جا گھسے۔ مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔ خود وہ سب بھی اس کی حالت سے باخبر تھے۔ اس کے باوجود بھی انہیں اس کی ذرا پروانہ تھی وہ دکھی دل کے ساتھ تنہا جتی کھڑی تھی۔ بریانی کو دم لگانے کے بعد وہ ذرا دیر کو ستانے کی نیت سے ڈرائنگ روم میں ان سب کے درمیان آبیٹھی۔۔۔ اپنی باتوں میں مصروف سب ہی نے ایک نظر اسے دیکھا تھا۔ اس ایک نظر نے ان کے دل میں یہ احساس پیدا کیا تھا کہ وہ ٹھیک نہیں ہے۔ وہ واقعی ٹھیک نہیں تھی۔ اسی لیے تھکے وجود کے ساتھ صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے لمبے لمبے سانس بھر رہی تھی۔ انعم اٹھ کر اس کے پاس آ گئی۔

"بھابھی آپ ٹھیک تو ہیں۔" اس کے سوال پر اس نے زخمی نظروں سے اسے ایسے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔

"تم خود بھی تو ایسی حالت سے گزر چکی ہو۔ تمہیں تو اندازہ ہونا چاہیے کہ میں ٹھیک ہوں یا نہیں۔" انعم

اس کی نظروں کے مفہوم کو شاید سمجھ گئی تھی۔ اس لیے اس کے پاس سے اٹھ کر ماں کے قریب آتی بولی۔

"امی۔۔۔ آپ بھابھی سے زیادہ کام مت لیا کریں۔"

"میں کون سے کام لیتی ہوں اس سے؟ ویسے بھی تین بندوں کے کام ہوتے ہی کتنے ہیں؟ روز آرام ہی تو کرتی ہے یہ۔۔۔ آج تم ہی لوگوں نے آکر فرمائشیں کی ہیں، جب ہی کام بڑھ گیا ہے۔ اب تم کیا چاہتی ہو۔ اس عمر میں، میں تم دونوں کی فرمائشیں پوری کرنے کچن میں جا کھڑی ہوں؟" بانو کو شاید اس کی بات پسند نہیں آئی تھی۔ اسی لیے ناک چڑھا کر اسے جھاڑ دیا تھا۔ وہ چپ کر گئی۔۔۔ پھر کچھ توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوئی۔

"امی، بھابھی کا الٹرا ساؤنڈ کروالینا تھا، بچے کا پتا لگ جاتا۔"

"کیوں الٹرا ساؤنڈ کی کیا ضرورت ہے، جب ہمیں پتا ہے بیٹا ہی پیدا ہوتا ہے۔ کیا تم بھول رہی ہو ہمارے ہاں پہلا بچہ بیٹا ہی ہوتا ہے؟" اس قدر یقین بھرا تھا ان کے انداز میں وہ سب چند پل کے لیے چپ رہ گئے۔ پھر حنا نے اس خاموشی کو توڑتے ہوئے اس سے سوال کیا تھا۔

"بچے کے لیے کیا نام سوچا ہے بھابھی؟"

"ہاں۔۔۔ ہم نے نام سوچ لیا ہے۔ ہم بچے کا نام انس رکھیں گے۔" جواب بانو کی طرف آیا تھا۔ ان کا جواب سن کر رضوانہ ایک دم سیدھی ہوئی تھی۔

"انس۔۔۔" وہ زیر لب بڑبڑائی تھی۔ بچے کا نام سوچ لیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے پاس اپنے بچے کا نام تک رکھنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ سب حق اس سے چھین لیے گئے تھے۔

"امی بلاول نام بھی اچھا ہے۔" حنا نے مفت کا مشورہ دیا تھا۔

رضوانہ کا دل خون خون ہو کر رہ گیا۔ اس کا دل بری طرح دہائی دے رہا تھا۔ "ارے کوئی مجھ سے بھی پوچھ کر دیکھ لے آخر وہ بچہ میرا بھی کچھ لگتا ہوگا۔" شدید دکھ کی ایک ساتھ کئی لہروں نے اس کی اذیت میں کئی گنا اضافہ کیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اس احساس کو کھو رہی تھی کہ ہونے والے بچے سے اس کا کوئی رشتہ ہوگا یا نہیں۔ بڑی تلخ سی مسکراہٹ اس کی ذہنی سوچ کی غمازی کر رہی تھی۔ اس نقار خانے میں اسے سننے کا وقت کسی کے پاس نہیں تھا۔ اس لیے کچھ بھی بولے بنا ان کو سننے لگی، حنا کہہ رہی تھی۔

"جب میرا حماد پیدا ہوا تھا تو خوشی میں اس کے باپ نے سب کے درمیان مجھے یہ شرف بخشا تھا کہ میں اپنے بیٹے کا نام خود رکھوں۔" وہ بیٹے کی ماں تھی۔ جس کا فخر اس کے لفظ لفظ سے عیاں ہو رہا تھا۔

"میرے منان کا نام تو اس کے دادا نے رکھا تھا۔" انعم نے بھی باتوں میں حصہ لیا۔ مسکراہٹ لبوں پہ سجائے وہ ایک دوسرے کو سن رہے تھے۔ رضوانہ ایک ایک کے چہرے پر بجی ان کی خوشیوں میں اپنی خوشی تلاشنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب حنا اور انعم کے ساتھ آیا ان کی جٹھانی کا بیٹا گھبرایا ہوا سا اندر داخل ہوا۔

"چچی کیا حماد آپ کے پاس ہے؟"

"کیا مطلب؟ وہ تو تمہارے ساتھ تھا نا۔" اس نے الٹا اسی سے سوال کر دیا۔

"جی وہ میرے ساتھ تھا، بلکہ منان اور حماد دونوں ہی میرے ساتھ تھے ہم باہر کھیل رہے تھے۔ پھر پتا نہیں حماد ایک دم کہاں چلا گیا۔" اس کی بات نے تو حنا کے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔ وہ ایک دم گھبرا کر تیزی سے اٹھی تھی۔

"تم نے کہاں گم کر دیا میرے بچے کو؟"

"مجھے نہیں پتا چچی وہ کہاں گیا۔" وہ بچہ خود بھی کافی گھبرایا ہوا لگ رہا تھا، اب حنا کا رد عمل دیکھ کر مزید گھبرا گیا، جبکہ حنا خوف زدہ سی کلیجے پہ ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔

"کہاں چلا گیا میرا حماد وہ تو اتنا چھوٹا ہے اسے کسی راستے کا بھی نہیں پتا۔" ایک کے بعد ایک سوال اس کی پٹاری سے باہر آرہے تھے۔ جس کے جواب فی

الحال کسی کے پاس نہیں تھے۔ وہ سب بھی پریشان مگر چپ کھڑے تھے۔ اسی وقت اچانک ہی صادق صاحب گھر میں داخل ہوئے تھے۔ وہ چیل کی طرح ان کی طرف لپکی تھی۔

"ابو حماد کہیں کھو گیا ہے۔ اب ذرا پتا کریں' باہر کسی کے پاس نہ ہو۔"

"کھو گیا ہے مطلب..." صادق صاحب نے بھنویں سیکڑ کر اس کی طرف دیکھا تو اس نے تفصیل سے ساری بات ان کے گوش گزار کی جسے سن کر وہ ایک دم غصہ ہوتے بولے۔

"ایک ذرا سا بچہ نہیں سنبھلتا تم سے۔ کیا ضرورت تھی اسے باہر بھیجنے کی۔" بجائے اسے تسلی دینے کے انہوں نے اسے ڈانٹ پلا دی۔ وہ چپ کر کے آنسو بہانے لگی۔ تب وہ جھنجلاتے ہوئے بولے۔

"میں مسجد میں اعلان کراتا ہوں۔ اگر کسی کے پاس ہوا تو وہ ہمیں دے جائے گا۔" وہ جانے کو مڑے جب وہ تیزی سے ان کے سامنے آتی بولی۔

"یہ غضب مت کیجیے گا ابو... مسجد میں اعلان سے تو یہ خبر میرے سسرال والوں تک جا پہنچے گی۔ پھر کوئی تو بعد میں کچھ کہے گا' پہلے حیدر ہی میری جان نکال دیں گے۔" وہ ایک دم خوف زدہ دکھائی دینے لگی تھی۔

"ہاں ابو یہ ٹھیک کہہ رہی ہے آپ مسجد میں اعلان مت کرائیں۔" انعم نے بھی انہیں ایسا کرنے سے باز رکھنا چاہا تھا۔ حنا روئے جا رہی تھی۔ جب بانو نے کہا۔

"اب اس طرح رو کر خود کو ہلکان مت کرو۔ حماد کہیں نہیں گیا۔ ابھی مل جائے گا۔"

"اللہ کرے وہ مل جائے امی۔ ورنہ حیدر مجھے جان سے مار ڈالے گا۔" اپنے بچے کے کھونے سے زیادہ خوف اسے حماد کے باپ کا تھا۔ وہ سب پریشان تھے۔ رضوانہ بھی پریشان سی اس کے قریب کھڑی تھی۔ صادق صاحب باہر جانے کو مڑے' جب گھر کے باہر ہلکا سا شور سن کر وہ سب تیزی سے دروازے کی طرف مڑے۔ دروازہ صادق صاحب نے کھولا۔ تو ان کے سامنے ان کے محلے کی ایک خاتون سوئے ہوئے حماد کو گود میں لیے کھڑی تھی۔ حنا نے آگے کو جھپٹ کر اس کی گود سے حماد کو لیا اور بے تابی سے اس کی پیشانی پر بوسہ دینے لگی۔ صادق صاحب نے شکریہ ادا کیا تو وہ خاتون مسکرا کر واپس پلٹ گئی۔ حنا اپنے بچے کو خود میں سموئے سکون سے بیٹھ چکی تھی۔ ان کے چہروں پر ایک بار پھر رونق لوٹ آئی تھی۔ مگر رضوانہ ابھی تک حیرت سے بت بنی انہیں دیکھے جا رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے والی حنا کی کیفیت نے اس کے دل و دماغ کو بری طرح اپنے لپیٹے میں لے لیا تھا۔ ایک سوچ تھی جو اس کے دل و دماغ پر حاوی تھی کہ...

"ایک ماں کے لیے اس کی خوشی اور سلامتی کی ضمانت صرف اس کا بیٹا ہوتا ہے۔" پیٹ پر دونوں ہاتھ رکھے اس نے کھڑکی سے نظر آتے نیلے آسمان کو دیکھتے ہوئے بہت تھک کر دعا کی تھی۔

"اے خدا مجھے بھی پہلی اولاد میں بیٹے کی نعمت سے نواز دے۔"

☼ ☼ ☼

وقت گزر گیا۔ آس و نراس میں ڈوبے خوف سے بھرے ان دنوں نے بالآخر جنت کو اس کے قدموں تلے لا دھرا تھا۔ ہوش کی دنیا میں قدم رکھتے ہی اس نے آنکھیں کھول کر بے تابی سے اپنی چاروں اور دیکھا تھا جہاں فی الحال ڈاکٹر کے علاوہ کوئی دوسرا فرد اسے دکھائی نہیں دیا تھا۔ اس نے اپنی برابر کی خالی جگہ کو ایک نظر دیکھ کر مصروف دکھائی دیتی ڈاکٹر کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا تھا۔ وہ جو اس کے ہوش میں آنے پر مسکرا کر اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ اس نے فوراً نقاہت بھری آواز میں اس سے سوال کیا۔

"ڈاکٹر میرا بچہ..."

"گھبرائیں مت آپ کا بچہ بالکل خیریت سے ہے۔ سسٹر ابھی لے کر آتی ہی ہوگی۔" اس کے لفظوں میں جو سوال چھپا تھا ڈاکٹر نے اسے بالکل نہیں سمجھا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ پھر سے کوئی دوسرا سوال کرتی سسٹر اس کا بچہ لیے اندر آتی دکھائی دی تھی۔ وہ لیٹے سے

فوراً" اٹھ بیٹھی تھی۔ سسٹر نے اس کے قریب آکر بچہ اس کی گود میں ڈال دیا۔ اس نے شوق سے ایک نظر اپنی گود میں پڑے بچے کی طرف دیکھا۔ پنک کمبل میں لپٹے وجود نے اس کے دل کی دھڑکن کو ایک پل کے لیے بند کرکے رکھ دیا تھا۔ اس کی گود میں اس کی بیٹی تھی۔

"بیٹی۔۔۔" اس نے گھبرا کر سامنے نظر کی تھی جہاں اب بانو اور صادق صاحب کے ساتھ خود آصف بھی کھڑا اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"کیا اللہ نے اس کی تمام دعاؤں کو رد کردیا تھا۔"

وہ کچھ بھی بول نہیں پا رہی تھی۔۔۔ جبکہ سامنے کھڑے سب ہی افراد اس کے بولنے کے منتظر تھے۔ ان کے کچھ کہنے اور سننے سے قبل ہی وہی سسٹر دوبارہ اندر داخل ہوئی۔ اس بار بھی اس کی گود میں بچہ موجود تھا۔ جسے آگے بڑھ کر اس نے اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔ جس پر اس نے ناسمجھی کے تاثرات کے ساتھ اس کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"اتنی حیران کیوں ہو رہی ہیں۔ یہ بھی آپ ہی کا بچہ ہے۔ آپ کے ٹوئنز بے بیز ہوئے ہیں۔ ایک بیٹی دوسرا بیٹا۔"

"بیٹا۔۔۔" کس قدر چاشنی محسوس ہو رہی تھی۔ اس ایک لفظ میں۔ اسے یقین ہونے لگا تھا کہ معجزے اب بھی اسی دنیا میں رونما ہوتے ہیں اور یہ کہ خدا دل سے مانگی گئی دعاؤں کو کبھی رد نہیں کرتا ہے۔ اس کی دعاؤں کو بھی قبولیت کی سند بخش دی گئی تھی۔ وہ بھی اس طرح کہ جس کا اس نے تصور تک نہیں کیا تھا۔ بے تحاشا خوشی کے عالم میں اس نے ان سب کی طرف دیکھا، جن کے چہروں پر وارث کو پالینے کی فاتحانہ مسکراہٹ بڑی نمایاں تھی۔

"اب تو تم خوش ہو رضوانہ؟ اللہ نے ہم دونوں ہی کی مرادوں کو پورا کردیا ہے۔ تمہیں تمہاری بیٹی مل گئی، ہمیں ہمارا بیٹا۔" بانو نے آگے بڑھ کر سسٹر کے ہاتھ سے اس کے بیٹے کو اپنی گود میں لیا اور بچے کی پیشانی چوم کر اسے صادق صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ وہ سب ہی خوش تھے۔ خوشی کے اس سمے میں اس کے جذبات میں خوشی سے بڑھ کر جو کچھ تھا وہ اس کے بیان سے بالاتر تھا۔ وہ بس اتنا جانتی تھی کہ اس سمے اس کی جسم و روح دونوں خدا کے حضور سربسجود تھے۔ جس نے اس کی لاج رکھ کر اسے سرخروئی عطا فرمائی تھی۔ اب ہر طرح کا ڈر خوف ختم ہو چکا تھا۔ یہی وجہ تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں طمانیت در آئی تھی۔ وہ مسکرا کر کہہ رہی تھی۔

"جی میں بہت خوش ہوں۔" ان کو جواب دیتی ممتا بھرے جذبات کے ساتھ اس نے گود میں لیٹی اپنی بیٹی کی طرف نگاہ کی۔۔۔ جو چپ چاپ آنکھیں بند کیے، اپنی معصوم نیند کے مزے لے رہی تھی۔ اس کے دل میں ایک دم محبت کے سوتے پھوٹے تو اس نے جھک کر دھیرے سے بچی کی پیشانی کو چوم لیا۔ صادق صاحب نے بچے کو پیار کرکے آصف کے بازوؤں میں دیا اور خود بانو کے ہمراہ کمرے سے باہر چلے گئے۔ اب کمرے میں صرف وہ دونوں موجود تھے۔ آصف بچے کو لیے رضوانہ کی طرف آیا اور قریب پہنچ کر بیڈ پر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ "شکریہ۔۔۔" آصف نے اس کی طرف دیکھ کر دھیمے سے انداز میں لفظ شکریہ ادا کیا تھا۔ جس پر اس نے ذرا سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"میرا نہیں اللہ تعالیٰ کا شکریہ ادا کریں۔ جس نے ہماری دعاؤں کی لاج رکھ لی ہے۔ ورنہ آج یہ نہ ہوا ہوتا تو نجانے اب کیا ہو رہا ہوتا۔" اس کے لفظوں میں گزرے وقت کی ہلکی سی اذیت ابھری تھی۔

"اللہ کا تو جتنا شکریہ ادا کروں کم ہوگا بیگم۔۔۔ مگر اب شکریہ ادا تو آپ کا بھی بنتا ہے۔ کیونکہ آپ ہی کی بدولت آج ہمیں یہ خوشی دیکھنا نصیب ہوئی ہے۔" اس نے میٹھی نظروں سے اس کی سمت دیکھا تو وہ اسی موڈ کے ساتھ سر جھکا گئی، جس پر اس نے کہا۔

"گزرے وقت کو بھول جانے کی کوشش کرو۔ ورنہ ہمیشہ دکھی رہو گی، کیونکہ گزرے وقت کی بری یادوں کو یاد کرنے سے سوائے اذیت کے اور کچھ نہیں

ملا کرتا۔"

آج جو خوشی تم نے مجھے دی ہے۔ اس کا شکریہ میں ادا نہیں کر سکتا۔ ہاں اب میں اپنی پوری کوشش کروں گا کہ پھر کبھی تمہیں مجھ سے وہ شکایت نہ ہو۔ جو ہمیشہ سے تمہیں مجھ سے رہی ہے۔ اس کا اشارہ جس طرف تھا۔ رضوانہ نے اسے سمجھا تو فوراً "یقین چاہتی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"میرا یقین کرو۔" اس نے یقین دلاتے ہوئے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تو وہ مطمئن ہوتی ہلکا سا مسکرا کر بولی۔

"ہماری بیٹی کتنی پیاری ہے۔"

" بیٹی ہی نہیں ہمارا بیٹا بھی بہت پیارا ہے۔ جسے تم نے ابھی تک دیکھا نہیں ہے۔ اس لیے اب میری بیٹی مجھے دو اور اپنا بیٹا تم لو۔ اس نے ذرا شوخی سے کہتے ہوئے اس کی گود سے اپنی بیٹی کو اٹھایا تو رضوانہ نے ذرا سا آگے ہو کر اپنا بیٹا اس کی گود سے اٹھا کر اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔

"ماشاء اللہ..." بیٹے کو دیکھ کر وہ بڑا بے ساختہ بولی تھی۔ ان کے دونوں ہی بچے بہت پیارے تھے۔ شام تک اسے گھر جانے کی اجازت ملی تو وہ سب بچوں کے ہمراہ خوشی خوشی گھر چلے آئے جہاں ایک نئی زندگی ان کی منتظر تھی۔



زندگی بڑے ہی خوب صورت موڑ پر آن رکی تھی۔ پندرہ دن گزر جانے کے باوجود بھی مبارک سلامت کا سلسلہ زور و شور سے جاری تھی۔ دونوں بچوں کے نام رکھ دیے گئے تھے۔ اپنے پوتے کا نام صادق صاحب نے بنا کسی کے صلح و مشورے کے خود ہی "انس" رکھ دیا تھا۔ جس پر کسی نے اعتراض نہیں کیا تھا۔ البتہ بیٹی کے نام کی باری پر رضوانہ نے آصف سے مشورے کے بعد اس کا نام "مناہل" رکھ دیا تھا۔ زندگی کو مقصد ملا تو دنوں کے گزرنے میں روانی سی در آئی تھی۔ سب ہی کچھ ٹھیک ہی چل رہا تھا اور ٹھیک ہی چلتا رہتا جو اگر اس دن وہ سب نہ ہوا ہوتا۔

بچوں کی پیدائش کو دو مہینے ہونے کو آئے تھے۔ رضوانہ کا ابھی تک اپنی ماں کے گھر جانا نہیں ہوا تھا۔ اسی لیے اس دن اس کا پروگرام اپنی ماں کے گھر جانے کا بن گیا۔ ساس، سسر سمیت آصف نے بھی اسے جانے کی اجازت دے دی۔ یہی وجہ تھی اس نے بڑی خوشی خوشی اپنی ساری تیاری مکمل کی اور پھر جاتے سمے جب وہ انس کو لینے بانو کے کمرے میں آئی جہاں وہ انس کو گود میں لیے بیٹھی تھیں۔ اس کو اپنے جانے کا بتا کر جوں ہی انس کو اٹھانے کی نیت سے اس نے ہاتھ آگے بڑھائے بانو نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"اسے کیوں اٹھا رہی ہو؟"

"اپنے ساتھ لے جانے کے لیے امی۔" وہ ان کے سوال کو سمجھی نہیں تھی۔ اسی لیے ان کے سے انداز میں جواب دیا تھا۔

"مگر تمہیں کس نے کہا، تم انس کو ساتھ لے جا رہی ہو؟" ایک بار پھر سوال ہوا تھا۔ جسے وہ اب بھی نہیں سمجھی تھی۔ وہ ان کے سوالوں کو سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی۔ وہ اس کا بچہ تھا جسے اپنی ماں کی ضرورت تھی۔ ایسے میں اگر وہ کچھ دن کے لیے اپنی ماں کے گھر رہنے جا رہی تھی تو اسے اس کے ساتھ ہی جانا تھا۔ بات بڑی سیدھی سی تھی۔ مگر نجانے بانو کیوں اس طرح کے سوال کر کے اسے الجھن میں ڈال رہی تھیں۔

"نہیں... تم اسے ہمارے پاس ہی رہنے دو۔" بڑی آسانی سے کہہ کر انہوں نے اسے ورطہ حیرت میں ڈال دیا تھا۔

"کیا مطلب امی..." اس وقت جو وہ سمجھ رہی تھی۔ اسے سمجھنا نہیں چاہ رہی تھی۔ بانو نے اس کے تاثرات دیکھے تو اس بار ذرا الفظوں کو سنبھالتے ہوئے اسے سمجھانے کو بولیں۔

"دو چھوٹے بچوں کو تم ایک ساتھ کیسے سنبھالو گی؟ یہاں تو انس کو ہم سنبھال لیتے ہیں۔ اس لیے تم کو مسئلہ نہیں ہوتا۔ مگر وہاں تمہیں پریشانی کا سامنا نہ کرنا

پڑے۔ اس لیے تم اسے ہمارے پاس رہنے دو۔ میں اسے سنبھال لوں گی۔" اس بار انہوں نے بڑے صاف لفظوں میں اپنی بات اسے سمجھائی تھی۔ جسے سن کروہ بری طرح چونکی تھی۔

"مگر امی..... یہ ابھی فیڈ کرتا ہے۔"

"ہاں تو فیڈ کے وقت تمہارے پاس بھیج دیں گے۔ بالکل اس طرح جس طرح یہاں تمہارے پاس لے آتے ہیں۔" اس بار وہ مزید بری طرح چونکی تھی۔

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ بچوں کی پیدائش کے بعد سے اب تک بانو ہی انس کو سنبھال رہی تھیں۔ انس سارا وقت ان کے پاس ہوتا تھا۔ بس جب اسے بھوک ستاتی تو بانو اسے اس کے پاس لے آتی تھیں اور جب وہ فیڈ کر چکا ہوتا وہ اسے دوبارہ لے جاتی تھیں۔ آج سے پہلے اس کی توجہ کبھی اس بات کی طرف نہیں گئی تھی۔ کیونکہ انس کی اپنے دادا' دادی کے پاس موجودگی سے خود اسے واقعی سہولت ہو جاتی تھی۔ اس لیے اس کی سوچ کی پرواز کسی دوسری طرف گئی ہی نہیں۔ بلکہ وہ تو ان کی احسان مند ہوتی رہی۔ مگر آج اسے احساس ہوا یہ سب وہ اس کی سہولت کی خاطر نہیں بلکہ پوتے سے اپنی محبت کی خاطر کرتے تھے۔ ایک دم ہی اس کی سماعتوں کے پردے پر ان کی کہی ایک پرانی بات نے دستک دی تھی۔

"ہمارا بیٹا' تمہاری بیٹی۔" اس ہمارا' تمہارا کا فرق آج اس پر واضح ہوا تھا۔ انہیں بس انس سے لگاؤ تھا۔ وہ ان کا وارث تھا۔ مناہل کی تو جیسے انہیں ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس خیال کے آتے ہی وہ لب بھینچ گئی۔ بات اب ساری اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ ان سے بحث کرنا نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ ان سے بحث کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ جو انہوں نے کہنا تھا وہ کہہ چکی تھیں۔

اس لیے اس نے انتہائی خراب موڈ میں اپنے جانے کا ارادہ ملتوی کیا اور مناہل کو لیے واپس اپنے کمرے میں چلی آئی۔ جہاں آکر وہ مسلسل کڑھتی تھی۔ بہت یاد کرنے پر بھی اسے ایسا کوئی لمحہ یاد نہیں آیا تھا جس میں انہوں نے مناہل سے کبھی لگاؤ ظاہر کیا ہو۔ انہوں نے ٹھیک کہا تھا۔

"انس ان کا بیٹا تھا۔ مناہل صرف اس کی بیٹی تھی۔"

یہ بات تو وہ اچھی طرح جان چکی تھی کہ یہ لوگ بیٹی کے وجود کو بوجھ سمجھ کر اسے ناپسند کرتے ہیں۔ مگر اس قدر ناپسندیدگی کا ٹھیک طرح احساس اسے آج ہوا تو اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔ اس کے بعد تو جیسے ہر غلط بات کا احساس خود بخود ہی اسے ہوتا چلا گیا۔ بانو اور صادق کی ساری محبت اور توجہ کا حق دار صرف اور صرف انس تھا۔ چونکہ خود اس کا زیادہ وقت گزرتا بھی ان ہی کے ساتھ تھا۔ اسی لیے خود انس ان کے پاس رہ کر خوشی محسوس کرتا تھا۔ اس کے پاس تو اسے اس کی ضرورت ہی کھینچ لاتی تھی۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا۔ بچے بڑے ہو رہے تھے۔ جس بات پر اس نے صبر کر کے سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہی بات خود مناہل بھی محسوس کرنے لگی تھی۔ ایسے میں وہ اپنے سوال لیے اس کے سامنے آجاتی۔

"ممی..... دادا' دادی انس کی طرح مجھ سے پیار کیوں نہیں کرتے؟"

اس کو جواب دے کر کسی طرح مطمئن کرتی تو پھر وہ نئے سوال کے ساتھ اس کے سامنے آجاتی۔

"دادا جی میری بات تو سنتے ہیں' مگر ان کی توجہ ہمیشہ انس کی طرف کیوں ہوتی ہے؟"

"دادا جی کو بس انس سے پیار ہے۔" ان دونوں کے درمیان جو فرق رکھا جا رہا تھا۔ وہ اسے بہت زیادہ محسوس کرنے لگی تھی۔ شاید اسی لیے وہ جب بھی کسی نئے سوال کے ساتھ اس کے سامنے آتی تو اس کا منہ پھولا ہی ہوتا۔ حالانکہ اپنی طرف سے وہ پوری کوشش کرتی تھی کہ مناہل کو اس بات کا احساس نہ ہونے دے۔ اسی لیے وہ اس کی توجہ دوسری کسی بھی طرف مبذول کرنے کی سعی کرتی رہتی۔ مگر مناہل تھی کہ ہر بار گھوم پھر کر اسی جگہ آن کھڑی ہوتی جہاں سے وہ اسے ہٹانے کے جتن کر رہی ہوتی تھی۔

آگہی عذاب ہوا کرتی ہے۔ اسی لیے وہ نہیں چاہتی

تھی۔ شعور کی پہلی منزل پر قدم رکھنے والی مناہل کو پہلے ہی قدم پر کسی کی ناپسندیدگی اور بوجھ ہونے کی اذیت کا سامنا کرنا پڑے۔۔۔ مگر یہ انسان کی بری خصلت ہے کہ جو چیز اسے مشکل دکھائی دے رہی ہوتی ہے وہ اسی کی جستجو کرنے لگتا ہے۔ رضوانہ اس کے ان نت نئے سوالوں سے زچ ہونے لگی تو اسے ڈانٹنے لگی۔ جس کا فائدہ یہ ہوا کہ اب اس نے اس سے سوال کرنا بند کردیے اور خود دادا' دادی کے ان رویوں کی کھوج لگانے ان کی طرف بڑھنے لگی۔

مناہل ایک اچھی بچی تھی۔ جتنی وہ بڑی ہو رہی تھی اتنی ہی اس کی سمجھ بھی بڑھ رہی تھی۔ جبکہ اس کے ساتھ پیدا ہونے والا انس حد درجہ تک چڑھا ثابت ہوا تھا۔ بات بات پر ہتھے سے اکھڑ جانا معمولی سی بات پر طوفان اٹھا دینے والا۔ ضدی اور خود سر بچہ۔۔۔ وہ جیسا بھی تھا شاید اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا بلکہ صادق اور بانو کے بے جا لاڈ پیار نے اس کی شخصیت کو بالکل بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ صادق صاحب اب بوڑھے ہو رہے تھے یہ ان کی عمر کا تقاضا تھا کہ وہ اب زیادہ وقت گھر پر گزارنے لگے تھے۔ ایسے میں کاروبار کی ساری ذمہ داری آصف پر آن پڑی تھی۔ اس لیے وہ ــــ کاروبار کو سنبھالنے اور اس کو بڑھانے میں جتا رہتا تھا۔ خود رضوانہ بھی اسے گھر کی ان سب باتوں سے دور رکھتی تھی' تاکہ وہ مکمل یکسوئی کے ساتھ اپنے کاروبار کو سیٹ کر سکے۔

زندگی جس بھی رخ پر بہہ رہی تھی اس نے اسی رخ پر بہنے کو چھوڑ دیا تھا۔ اس امید پر کہ وقت خود ہی اس کی سمت کو درست کردے گا۔ بچے اب بڑے ہو گئے تھے۔ ان کی کالج لائف شروع ہو چکی تھی۔ انس پہلے سے کہیں زیادہ لاپروا ہو گیا تھا۔ وقت نے شاید مناہل کے ہر سوال کا جواب بڑی تفصیل کے ساتھ اسے سمجھا دیا تھا۔ اسی لیے وہ پہلے سے کہیں زیادہ سنجیدہ رہنے لگی تھی۔ مگر اس کی سنجیدگی میں بھی توجہ اور پروا کے تمام رنگ محسوس کیے جا سکتے تھے۔ بنی ماں' باپ کا خیال تو وہ رکھتی ہی تھی۔ مگر دادا' دادی کی ناپسندیدگی کے باوجود وہ ان کا بھی حد سے زیادہ خیال رکھتی تھی۔ شاید اس امید پر کہ ان کا دل اس کے لیے موم ہو جائے یا شاید وہ ایسی ہی فطرت کی مالک تھی' ہر ایک کا خیال رکھنے والی۔ سب سے محبت کرنے والی۔۔۔ اسے انس سے بھی محبت تھی۔ اس کی خود سری پر وہ اکثر اسے سمجھایا کرتی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ ہمیشہ ہی اس کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیا کرتا تھا۔ آج بھی ایسا ہی ایک دن تھا۔

انس نے دادا جی سے ناراض ہو کر ہمیشہ کی طرح بھوک ہڑتال کا اعلان کرتے ہوئے خود کو کمرے میں بند کر لیا تھا۔ گھر کے ہر فرد نے اس کو منانے کی اپنی سی کوشش کر دیکھی تھی' مگر انہیں اس کے کمرے کے بند دروازے سے ناکام لوٹنا پڑا تھا۔ رضوانہ مناہل کے ہمراہ کھانے کی ٹرے لیے ایک بار پھر اس کے کمرے کے باہر کھڑی اسے پکار رہی تھی۔

"انس دروازہ کھولو بیٹا۔" رضوانہ نے بڑی نرمی سے دروازہ کھولنے کی درخواست کی تھی۔ مگر اس نے تیز لہجے میں بول کر اس کی درخواست کو رد کر دیا۔

"مجھے بار بار دروازہ کھولنے کا مت کہیں ممی۔ آپ اچھی طرح جانتی ہیں' میں اس وقت تک دروازہ نہیں کھولوں گا جب تک مجھے ٹرپ پر جانے کی اجازت نہیں دے دی جائے گی۔" اس کی ضد ابھی تک برقرار تھی۔

رضوانہ نے بڑی بے بسی سے مناہل کی طرف دیکھا تھا۔ مناہل کو ایک دم ہی ڈھیروں غصے نے آن گھیرا تھا۔ انس کی اس حرکت کی وجہ سے وہ سب سخت پریشان ہو کر رہ گئے تھے۔

"انس! کبھی تو بات مان لیا کرو۔ ممی کہہ رہی ہیں تو کھول دو دروازہ۔" اپنی بات کہنے کے بعد اس نے ذرا دیر رک کر اس کے جواب کا انتظار کیا تھا۔ مگر دوسری طرف سے خاموشی پا کر اس نے اس بار قدرے آرام سے کہا۔

"تم باہر آؤ آرام سے بات کرتے ہیں۔ شاید تمہاری بات کا کوئی دوسرا حل نکل آئے۔"

"مناہل محترمہ تم سے مشورہ نہیں مانگا ہے میں نے۔ میں جو کررہا ہوں ٹھیک کررہا ہوں۔ جب تک میری بات مانی نہیں جائے گی' میں باہر نہیں آؤں گا۔ پھر چاہے مجھے اندر ہی بھوکا پیاسا کیوں نہ مرجانا پڑے۔" اس کے عزائم بڑے خطرناک تھے۔ وہ دونوں دہل کررہ گئیں۔ کچھ دیر مزید وہاں کھڑا رہنے کے بعد وہ ناکام ہی واپس پلٹ آئیں۔ کوریڈور کے آخری سرے پر بانو سے ان کا ٹاکرا ہوا تو انہوں نے استفہامیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"انس نے اپنی ضد چھوڑی یا نہیں؟" رضوانہ کے ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے جوں کی توں دیکھ لینے کے باوجود بھی انہوں نے ایسا سوال کیا تھا۔ جس پر رضوانہ نے جواب دیا۔

"امی۔۔۔ اپنی بات منوائے بنا اس نے کبھی اپنی ضد چھوڑی ہے بھلا۔ اب بھی یہ تیسری بار کھانا لے کر گئی تھی۔ مگر ہر بار کی طرح اس بار بھی اس نے کھانے سے انکار کرتے ہوئے کہہ دیا ہے کہ جب تک اس کی بات نہیں مانی جائے گی تب تک وہ باہر نہیں آئے گا اور نہ ہی کچھ کھائے گا۔ پھر چاہے اسے یوں ہی بھوکا پیاسا ہی کیوں نہ مرجانا پڑے۔" اس کی دھمکی کو لفظ بہ لفظ اس تک پہنچایا تو انہوں نے بے ساختہ دل پر ہاتھ دھرا اور تیزی سے واپس پلٹ گئیں۔ رضوانہ جانتی تھی اب وہ صادق صاحب سے انس کو ٹرپ پر جانے کی اجازت دلوا کر ہی پلٹیں گی۔ اس لیے سکھ کا سانس لیتے ہوئے وہ کھانا پھر سے گرم کرنے کی نیت سے دوبارہ کچن میں چلی آئی۔ پھر وہی ہوا جیسا اس نے سوچا تھا۔ ذرا دیر بعد انس دادی کو بازوؤں میں لیے ان سے لاڈ کرتا ہوا ناشتا کرنے کے لیے کچن میں چلا آرہا تھا۔

اس کے کالج کا ٹرپ پورے ایک ہفتے کے لیے شمالی علاقہ جات کی سیر کے لیے جارہا تھا۔ جس میں وہ شرکت کا اس لیے خواہش مند تھا' کیونکہ اس کے تمام فرینڈز اس ٹرپ پر جارہے تھے۔ وہ کالج سے ہی جانے کا پلان کرکے گھر آیا تھا ایسے میں دادا' دادی کے انکار نے اسے مایوس کیا۔ جس کے نتیجے میں اس نے اپنا ہمیشہ والا حربہ اپنا کر انہیں اپنی بات ماننے پر مجبور کردیا اور رزلٹ کے طور پر وہ آج اپنے سازوسامان کے ہمراہ ان کے سامنے کھڑا جانے کی اجازت طلب کررہا تھا۔

"اچھا دادا جی اب میں نکلتا ہوں۔" صادق صاحب نے نظر اٹھا کر شکایتی نظروں سے اس کی سمت دیکھ کر کہا۔

"کتنا منع کیا تمہیں جانے سے۔۔۔ مگر تمہیں تو اپنی ضد کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ بیمار بوڑھے دادا سے زیادہ تمہیں اپنا ٹرپ عزیز ہے۔" انہوں نے ہلکی سی ناراضی کا اظہار کیا تھا۔ جس پر وہ ہنستا ہوا ان کے قریب آکر ان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔

"کون کہتا ہے میرے دادا جی بوڑھے ہیں؟ میرے دادا تو ابھی بھی جوان ہیں ایک دم جوانوں کی طرح چاق وچوبند اور رہا میرے جانے کا تو بس ایک ہفتے کی تو بات ہے۔ ایسے چٹکیوں میں ہفتہ گزر جائے گا۔ اور میں پھر سے آپ کے سامنے ہوں گا۔" وہ اپنی بات منوانے کے ہر فن سے واقف تھا اس وقت بھی انہیں باتوں میں لگا کر بات کو گھما گیا۔ اس سے پہلے صادق صاحب مزید کچھ کہتے۔ وہ ان کے پاس سے اٹھتا سیدھا ہوتا ہوا اپنا سامان اٹھا کر بولا۔

"اچھا دادا جی۔ ٹائم بالکل کم رہ گیا ہے اب میں چلتا ہوں سب میرا انتظار کررہے ہوں گے۔" ان کو خدا حافظ کہتا وہ تیزی سے وہاں سے نکلا۔۔۔ باہر آکر ماں بہن اور دادی سے ملتا ہوا اپنے ٹرپ پر روانہ ہوگیا۔



انس کو گئے ہوئے آج تیسرا دن تھا۔ گھر میں ہر طرف سناٹا طاری تھا ایسا لگتا انس گھر کی ساری رونق اپنے ساتھ لے گیا ہو۔ مناہل کالج بھی چلی جاتی۔ رضوانہ گھر کے کام میں مصروف رہتی جبکہ بانو اور صادق زیادہ وقت اپنے کمرے میں گزارتے۔ بہت ہوتا تو صادق صاحب نماز یا کسی سے ملاقات کی خاطر ذرا دیر کو گھر سے جاتے اور تھوڑی دیر تک واپس آجاتے پھر ان کا سارا وقت اپنے کمرے میں گزرتا۔۔۔ مگر اب وہ

دن سے ان کی طبیعت کچھ زیادہ ہی خراب تھی۔ شاید وہ انس کی کمی کو کچھ زیادہ ہی محسوس کر رہے تھے۔ ان کی ایسی حالت دیکھ کر بانو انہیں چھیڑتی تھی کہ اتنی محبت تو انہوں نے اپنے بیٹے سے نہیں کی جتنی پوتے سے کرتے تھے۔ جس پر صادق صاحب ہمیشہ مسکرا کر انہیں جواب دیتے تھے بڑوں نے بالکل ٹھیک کہا ہے رقم سے زیادہ سود پیارا ہوا کرتا ہے انہیں آصف سے بھی محبت تھی مگر انس سے محبت کچھ زیادہ تھی جب سے وہ گیا تھا دن میں نجانے کتنی بار اسے کال کرتے تھے اور انس تھا کہ اپنے ٹرپ میں اس قدر بزی تھا کہ شاذ و نادر ہی ان کی کال پک کرپاتا تھا۔ اب اس سے بالکل بات نہیں ہوپارہی تھی شاید اسی لیے صادق صاحب کچھ زیادہ اداس ہوگئے تھے۔

موسم نے بھی کروٹ بدل لی تھی جس کی لپیٹ میں صادق صاحب بھی آگئے تھے۔ ڈاکٹر ان کے چیک اپ کے لیے آیا تو میڈیسن کے ساتھ ساتھ ان کا خاص خیال رکھنے کی خصوصی تاکید کرتا گیا۔ آصف نے بھی آج اپنا آدھا دن ان کے پاس گزارا تھا مگر جب امپورٹنٹ کال آئی تو اسے مجبوراً ان کے پاس سے اٹھ کر جانا پڑا۔ بانو مسلسل صادق صاحب کے پاس تھیں مگر جب وہ نماز کے لیے اٹھیں تو مناہل دادا کے لیے سوپ لیے ان کے کمرے میں داخل ہوئی۔ صادق صاحب آنکھیں بند کیے لیٹے تھے۔ کھٹکے کی آواز پر انہوں نے آنکھ کھول کر دیکھا تو مناہل سوپ کا پیالہ ہاتھ میں لیے ان کے سامنے کھڑی تھی۔ ایک نظر دیکھ کر وہ دوبارہ آنکھیں موند گئے مناہل آگے بڑھ کر بیڈ پر ان سے ذرا فاصلے پر بیٹھ گئی۔

"دادا جی۔ سوپ پی لیں۔" اس نے بڑے پیار سے انہیں پکارا تھا۔

"رکھ دو میں پی لوں گا۔" آنکھیں ہنوز بند تھیں

"پھر تو ٹھنڈا ہو جائے گا۔ دادا جی! سوپ تو گرم ہی پینے میں مزا آتا ہے۔" وہ پلانے پر بضد تھی۔

اس کے انداز پر صادق صاحب کو ایک دم انس کا گمان ہوا تو انہوں نے آنکھیں کھول کر اس کی سمت دیکھا۔ وہ مناہل تھی۔ اس کی ہم شکل اس کی بہن۔ وہ غور سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جو ان کو اس طرح اپنی طرف دیکھتا پا کر مسکرا کر کہہ رہی تھی۔

"اب اٹھ بھی جائیں دادا جی' سوپ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

اس کے انداز میں ان کے لیے پیار ہی پیار تھا۔ وہ نظر انداز نہ کرسکے اور بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگاتے ہوئے نیم دراز ہوگئے۔ تو مناہل نے اپنے ہاتھ سے ان کو سوپ پلانا شروع کردیا۔ انہوں نے بنا کوئی مزاحمت کیے چپ چاپ اس کے ہاتھ سے سوپ پی لیا۔ بانو نماز پڑھ کر ان دونوں کے پاس بیٹھی تھیں۔ جب وہ سوپ پی چکے تو مناہل اٹھتے ہوئے بولی۔

"اب آپ لیٹ جائیں دادا جی۔" وہ کہہ کر جانے کو پلٹی۔ پھر چند قدم چل کر دوبارہ مڑتی ہوئی بولی۔

"دادا جی۔۔۔ آج میں اپنے پڑھنے کے لیے لائبریری سے ایک کتاب لے کر آئی ہوں۔ اگر آپ کہیں تو میں آپ کو بھی وہ کتاب پڑھ کر سناؤں؟" وہ اجازت طلب نگاہوں سے ان کی سمت دیکھ رہی تھی' جو آج بہت زیادہ چپ محسوس ہو رہے تھے۔ اس نے سوال کیا تھا اور وہ نظریں اٹھائے اس کی سمت دیکھ رہے تھے۔ اسے اپنا منتظر پایا تو ایک بار پھر اقرار میں سر ہلا دیا۔ اقرار میں ہلتا ان کا سر دیکھ کر مناہل جہاں حد درجہ حیران ہو رہی تھی وہیں بہت زیادہ خوشی بھی محسوس کر رہی تھی۔ خوشی کے عالم میں وہ کتاب لینے جاچکی تھی۔ کمرے میں ایک دم سکوت طاری ہوگیا تھا۔ جسے بانو کی آواز نے توڑا تھا۔

"آج آپ اتنے چپ کیوں ہیں؟"

"مناہل اچھی بچی ہے۔" ان کے سوال کا یہ جواب نہیں تھا۔ مگر انہیں ایسا ہی جواب ملا تھا۔ جس نے انہیں شدید حیرت میں مبتلا کیا تھا۔ صادق صاحب نے تو کبھی اپنی سگی بیٹیوں کے لیے ایسے لفظ ادا نہیں کیے تھے۔ جیسے وہ مناہل کے لیے ادا کرگئے تھے۔ وہ حیرت سے سنبھلتی' پھر سے سوال کے لیے لفظوں کو جمع کر رہی تھیں۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ بولتیں مناہل

کتاب ہاتھ میں لیے اندر داخل ہوئی اور آگے بڑھ کر کچھ دیر پہلے اپنی چھوڑی جگہ پر بیٹھ گئی۔ وہ دونوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"یہ بہت اچھی کتاب ہے دادا جی۔ آپ سنیں گے تو خوش ہو جائیں گے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کتاب کو کھولا اور آہستہ آہستہ پڑھنا شروع کر دیا۔ صادق صاحب نے ذرا دیر کو اس کے ہلتے لبوں کو سنا' پھر اچانک ہی اس سے سوال کر دیا۔

"تمہارے کالج کا ٹرپ بھی تو گیا ہو گا مناہل؟"

مناہل نے ان کے سوال پر ذرا دیر کو ان کی طرف سے دیکھا' پھر نظروں کو دوبارہ کتاب پر جمائے ہوئے مناہل نے اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"جی دادا جی.... اس سے پہلے ہمارے کالج کا ٹرپ گیا تھا۔ مگر وہ چند گھنٹوں کا ٹرپ تھا۔" وہ جواب دے کر دوبارہ سے کتاب پڑھنا چاہتی تھی۔ مگر صادق صاحب کی طرف سے ایک بار پھر سوال ہو گیا تھا۔

"تم کیوں نہیں گئیں؟" اپنے اس سوال کے جواب سے وہ بخوبی واقف تھے' مگر پھر بھی جواب کے لیے اس کے منتظر تھے۔

"میرا دل ہی نہیں تھا جانے کو اس لیے نہیں گئی۔" اس کے لفظوں نے ایک دم ہی انہیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر وہ جانا بھی چاہتی تب بھی جا نہیں سکتی تھی' کیونکہ انہوں نے اسے کسی صورت جانے کی اجازت نہیں دینی تھی۔ انس کو ہر صورت ٹرپ پر جانا تھا۔ اس لیے وہ اجازت نہ ملنے کے باوجود زبردستی اجازت لے کر چلا گیا تھا۔ کیونکہ وہ ایک لڑکا تھا اور لڑکا ہر طرح کی آزادی کا حق دار ہوا کرتا ہے اور وہ ایک لڑکی تھی' اسے اجازت نہیں ملنی تھی' کیونکہ لڑکیاں کسی بھی طرح کی آزادی کی حق دار نہیں ہوا کرتیں۔

لڑکیاں تو بس بوجھ ہوتی ہیں' جنہیں ان کی شادی سے پہلے اور بعد تک ہر صورت برداشت کرنا ہوتا ہے۔

ان کی سوچ ہمیشہ سے ایسی ہی تھی' مگر آج نجانے کیا ہوا تھا۔ مناہل نے ان کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ ان کے دل کی آنکھوں کو بھی کھول کر رکھ دیا تھا یا شاید آج خدا نے ان کے دل کی دنیا بدلنے کا دن مقرر کر دیا تھا۔ یہی وجہ تھی انہیں اپنی تمام غلطیاں تمام کوتاہیاں بڑی شدت سے محسوس ہو رہی تھیں۔ انہوں نے ہمیشہ اپنی بیٹیوں کو نظرانداز کیا۔ بیٹیوں پر ہمیشہ بیٹے کو ترجیح دی اور اب مناہل کو نظرانداز کیے انس کو اپنی تمام محبتوں سے نواز رہے تھے۔ مناہل کو تو آج تک انہوں نے ڈھنگ سے دیکھا تک نہیں تھا۔ اس کے باوجود بھی مناہل ہمیشہ ان کی فکر کرتی' ان کے گرد گھومتی دکھائی دیتی تھی۔ آج بھی جب وہ انس کے لیے اداس ہو رہے تھے تو وہ ان کا دھیان بٹانے کے جتن کر رہی تھی' تاکہ ان کی اداسی دور ہو جائے۔ انہیں ایک دم اس پر بہت زیادہ پیار آنے لگا تھا۔ اس وقت بہت سارے احساسات کے ساتھ یہ احساس سب سے زیادہ حاوی ہو رہا تھا کہ "بیٹیاں بوجھ نہیں ہوتیں" بیٹیاں تو نرمی' پیار اور توجہ کی اصل حق دار ہوا کرتی ہیں۔

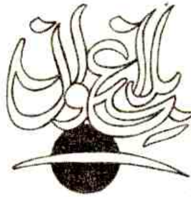
ان کی سوچ کیا بدلی' ان کے دل میں مناہل کے لیے ڈھیروں ڈھیر جگہ بنتی چلی گئی۔ پوتی کے لیے دل کی دنیا بدلی تو محبت نے بھی سر اٹھا دیا۔ تو وہ نرمی سے مسکراتے ہوئے بے ساختہ سیدھے ہوئے اور ہاتھ بڑھا کر قریب بیٹھی مناہل کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ کیونکہ بیٹیاں حقیقتاً" اسی جگہ کی مستحق ہوا کرتی ہیں۔



سرورق کی شخصیت

ماڈل ــــــــــ دیا شاہ
میک اپ ــــــــــ روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافر ــــــــــ موسیٰ رضا

خدیجہ مغل





جب آنکھیں ان چاہے منظر سے کترائیں اور دل کسی قسم کے رد عمل کو قبول نہ کرے تو مان لینا چاہیے کہ محبت ہمارے اندر پر پھیلا چکی ہے اور پر تو اس نے میرے اندر بھی پھیلا لیے تھے مگر مجھے پتا ذرا دیر سے لگا ہے۔

کاش کہ انسان کو اپنے اندر پنپنے والی محبت کا ادراک اس وقت ہو جایا کرے جب وہ اپنا پہلا وار کرتی ہے تو شاید وہ کچھ کر سکے۔ اپنے لیے، محبت کے لیے، مگر انسان کی حرماں نصیبی کہ جب وہ مقتل میں پہنچ چکتا ہے اور رسی اس کی گردن میں ہوتی ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ وہ تو محبت کے جہاں میں پہنچ چکا ہے جہاں کا دستور ہی نرالا ہے، ہر قانون انوکھا ہے اور اگلے ہی لمحے محب کو پچھتاووں کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ جہاں بے بسی کے معبد میں قید وہ صرف آہیں بھرنے تک زندہ رہ جاتا ہے۔

اے کاش! آدمی کو اپنے جذبات پر کچھ اختیار دیا گیا

ہوتا تو شاید آج میں یوں اداس کھڑا رات کی سیاہیوں میں اپنا آپ تلاشنے کی کوشش نہ کر رہا ہوتا۔

"زیاد! ہم قسمت کا ہاتھ صرف ایک مرتبہ جھٹکتے ہیں اور وہ قدم قدم پر ہمیں جھکاتی چلی جاتی ہے اس لیے ہمیشہ اس کے ساتھ دوست بن کر چلنا چاہیے تاکہ ایک کامیاب زندگی گزاری جاسکے۔"

سڑک پر رواں گاڑیوں کو بے دھیانی سے دیکھتے ہوئے مجھے اپنے قریب کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے چونک کر دائیں بائیں دیکھا۔ کوئی بھی نہیں تھا میرے پاس مگر کوئی احساس تھا جیسے ٹھٹھرا دینے والی ٹھنڈ، جیسے میں دسمبر کے مہینے میں بنا سویٹر کے کھڑا ہوں۔ مجھے جولائی کے مہینے میں بھی جھرجھری سی آگئی۔

"ہاں نیہال شیرازی! دوستی تو کرلی ہے میں نے تقدیر سے بس دعا کرو میں نبھا بھی سکوں۔" میں نے خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑاتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا سگریٹ زمین پر پھینک کر مسل دیا اور اندر چلا آیا۔

فل اسپیڈ میں پنکھا آن کر کے میں نے سارے کمرے کا از سر نو جائزہ لیا۔ جہاں وہی وحشت ناک حقیقتیں دونوں بازو پھیلائے مجھے خود میں جکڑنے کو تیار تھیں، جن کی آغوش میں سر چھپا کر مجھے اپنی آئندہ زندگی گزارنا تھی۔ شکست خوردہ ہی سہی مگر میں اب ہر تبدیلی کو قبول کرنے کے لیے تیار تھا۔

سو لائٹ آف کر کے بیڈ کی طرف بڑھ آیا آنکھیں بند کرتے ہی وہ پھر سے میرے سامنے آکھڑی ہوئی تھی میں نے مسکرا کر کروٹ بدل لی کہ میں اس کے تصور کو جھٹکنا نہیں چاہتا تھا۔ میرا خیال ہے آج رات وہ میرے خواب میں ضرور آئے گی۔



نیہال شیرازی میری پھپھی زاد خاندان میں سب سے زیادہ پڑھی لکھی لڑکی حد سے زیادہ بولڈ، ہر ایک کی غمگسار، ہر کام میں ماہر، ایک متحرک شخصیت جو کبھی سکون سے نہیں بیٹھ سکتی ہر وقت کچھ نہ کچھ کرنے کا جنون، کچھ پانے کی جہد اور وہ خوب صورت بھی تو تھی خوب صورت تو خاندان کی ساری لڑکیاں ہی تھیں مگر ایک چیز جو اسے سب سے منفرد بناتی تھی اس کی خوب صورت چمکدار آنکھیں وہ اپنے خیالات و جذبات کے اظہار کا کام ان آنکھوں سے ہی تو لیا کرتی تھی۔

وہ میری ہم عمر ہی تھی بچپن میں سب سے زیادہ میں اس کے ساتھ کھیلا تھا اسی لیے تو میری ہر یاد میں موجود تھی۔ پھر جوں جوں بڑے ہوتے گئے وقت نے ہمارے درمیان فاصلوں کی دیواریں لا کھڑی کیں ہر کوئی اپنی اپنی زندگی میں پہلے سے زیادہ مصروف ہو گیا کبھی سال یا ڈیڑھ سال بعد ملاقات ہوتی وہ بھی چند گھنٹوں کی' ہاں یہ تھا کہ بے تکلفی آج بھی ہم سب میں وہی پہلے جیسی ہی تھی کوئی جھجک' کوئی عار نہ تھی وہی ہنستا بولنا وہی ہلا گلا اکٹھے ہوتے تو سر آسمان پر اٹھائے رکھتے۔

انہیں دنوں میں نے محسوس کیا ہمارے بڑوں کا خیال مجھے اور نیہال کو جیون ساتھی بنانے کا ہے تبھی میری نظروں کا انداز بدلا۔ اب وہ صرف میری پھپھی زاد نہیں رہی تھی اور بھی بہت کچھ بن گئی تھی۔ میرا خیال ہے آپ سمجھ سکتے ہیں۔ اب میں حق سمجھ کر اسے ڈانٹتا تھا بہانے بہانے اس سے اپنے کام کرواتا کبھی کبھی ترنگ میں ہوتا تو کوئی ایسا جملہ بھی بول دیتا جس سے وہ سرخ پڑ جائے مگر یا تو وہ نا سمجھ تھی یا پھر بہت چالاک کہ میری نظر کی گرفت میں اس کی کوئی لغزش نہیں آئی۔

ہنستے کھیلتے عمر کا وہ دور بھی بیتا رویوں میں سنجیدگی آئی اور کندھوں پر ذمہ داریوں کا بوجھ بڑھا وقت کی ضرورت کہ اچھے مستقبل کی خاطر اعلا تعلیم کے حصول کی غرض سے دوسرے شہر چلا آیا۔

یہاں آکر میں ایک نئی دنیا سے روشناس ہوا۔ یہ انسان نہیں روبوٹ تھے بھاگ دوڑ کر ایک ہی محور میں زندگی گزارنے والے۔ ایک خاص روٹین کے ساتھ' ان کے پاس کرنے کو اتنے کام تھے کہ ہنسنے تک کا وقت نہیں ملتا تھا۔ ہر ایک کے چہرے پر ایسی کرختگی جیسے کبھی مسکراہٹ نے ان ہونٹوں کو چھوا ہی نہ ہو کسی قسم کے جذبات و احساسات سے عاری ایک مشینی

زندگی، مادیت پرستی کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

پہلے پہل تو میں کافی حیران ہوا اس طرزِ زندگی پر مگر آہستہ آہستہ میں خود اسی رنگ میں رنگتا چلا گیا۔ مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ میری اپنی زندگی کی ترجیحات بدلنے لگیں۔ کسی اور کے لیے تو کیا میرے اپنے لیے میرے پاس کوئی وقت نہیں تھا۔

پڑھنے کے ساتھ ساتھ اپنی چھوٹی چھوٹی ضروریات (جو در حقیقت اتنی چھوٹی بالکل نہ تھیں) کو پورا کرنے کے لیے میں نے پارٹ ٹائم جاب شروع کر دی۔ جیسے جیسے حلقۂ احباب وسیع ہوا مشاغل میں تبدیلی آئی یوں میرا شیڈول ٹف ہوتا چلا گیا۔ اتنا کہ میں ایک دن میں بمشکل اڑھائی گھنٹے کی نیند لے پاتا۔ اور میں جو شروع شروع میں اس روٹین سے خائف تھا خود اسی روٹین کا حصہ بن گیا۔ یہ علیحدہ بات کہ اس کا احساس مجھے بہت بعد میں ہوا۔ تب تک میں انسومنیا کا شکار ہو چکا تھا۔



ضروریات بدلیں، ترجیحات بدلیں۔ تیزی، تیزی، تیزی میرے چاروں طرف صرف ایک ہی لفظ کی بازگشت تھی اور ہاں پھر میں ایک روایتی مرد ثابت ہوا۔

پنجاب یونیورسٹی کے انگلش ڈیپارٹمنٹ کی افشین بخاری سے میری ملاقات یونیورسٹی کے تقریری مقابلے میں ہوئی تھی۔ وہ غضب کی مقررہ تھی۔ کمپیٹیشن میں اس نے فرسٹ پرائز ون کیا تھا۔ میں جو میزبانی کے فرائض انجام دے رہا تھا ریفرشمنٹ کے وقت اسے اخلاقاً "وش" کر بیٹھا اور اگلے ہی لمحے وہ اس طرح مجھ سے گھل مل گئی جیسے ہم بچپن کے دوست ہوں۔

پھر آہستہ آہستہ بہت غیر محسوس انداز میں میں اس کی طرف بڑھنے لگا تھا۔ مجھے گوری رنگت، تیکھے نقوش والی افشین بخاری میں خاص قسم کی کشش محسوس ہوتی تھی، اس کی شہد رنگ آنکھیں مجھے اپنی اور متوجہ کرتی تھیں۔ جانے اسے مجھ میں کیا بات اچھی لگی کہ بہت جلد ہم دونوں میں گہری دوستی ہو گئی ہم اکثر ایک دوسرے کے ڈپارٹمنٹ میں پائے جانے لگے گھنٹوں کاریڈور کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر باتیں کیا کرتے۔ کئی دفعہ لان میں ٹہلتے ہوئے میری نظریں اس کے ہم قدم ہونے پر فخر کرتیں ایسے میں چمکدار آنکھوں والی نیہال شیرازی کہیں بہت پیچھے رہ جاتی وہ نیہال شیرازی جو کچھ عرصہ پہلے تک میری ہر سوچ پر قابض تھی۔ لاہور آتے ہوئے میں سب سے زیادہ اسی کے لیے اداس تھا۔ جس سے ملنے کے لیے میں آئے روز کسی نہ کسی بہانے پھپھو کے ہاں پہنچ جاتا تھا اور اب......

کبھی اس کا خیال بھی آتا تو میں سر جھٹک دیا کرتا تھا۔ مجھے لگنے لگا تھا کہ مجھے افشین بخاری سے محبت ہو گئی ہے (یہ الگ بات کہ یہ لگنا غلط ثابت ہوا) مجھے لگا تھا میں اس کے بغیر نہیں رہ پاؤں گا۔ آپ حیران تو ہوں گے مگر یہ حقیقت ہے کہ جب موسم بدلتے ہیں تو بہت سی چیزوں کی جگہ بدلتی ہے اور میرے اندر سے پیدا ہونے والی یہ تبدیلی بھی موسم کی دین تھی۔

ذیشان بھائی کی شادی پر میرا پکا ارادہ تھا امی سے افشین کے بارے میں بات کرنے کا اور میں کر بھی لیتا کہ نیہال شیرازی ایک مرتبہ پھر میرے سامنے آگئی بلو سوٹ میں لائٹ سے میک اپ کے ساتھ لمبے بالوں کی سادہ سی چوٹی بنائے سہج سہج چلتی وہ یک دم میرے سامنے آئی تھی۔ وہ بہت بدل گئی تھی ہمہ وقت اس کے چہرے پر سجی رہنے والی مسکراہٹ اب پل کے پل چھب دکھا کر معدوم ہو جاتی اور چمکدار آنکھوں میں خاص قسم کی سنجیدگی در آئی تھی جو مقابل کو گڑبڑانے کے لیے کافی تھی۔ چال میں بھی خاصا تناسب آگیا تھا اس کا رکھ رکھاؤ، بات کرنے کا انداز وہ ایک سوبر اور پراعتماد شخصیت میں ڈھل چکی تھی۔ تبھی تو میں پھر دوراہے پر آکھڑا ہوا تھا۔ اور کاش میں اس وقت سمجھ جاتا کہ میرے دل میں افشین نہیں نیہال بسی ہے تو

......

بہرحال شادی کے ہنگامے سرد پڑے تو امی نے خود ہی وہ ذکر چھیڑ دیا اب وہ میری شادی کرنا چاہتی تھیں ان

کا کہنا تھا کہ چھوٹے چاچو اور دادی اماں نیہال کے لیے کہہ رہے ہیں اور اگر میں اجازت دوں تو وہ بات آگے بڑھائیں۔ اور میں جو دو دن سے سوچے بیٹھا تھا صاف انکار کرنے کے بارے میں پتا نہیں کیوں سوچنے کا وقت مانگ بیٹھا۔

اور سوچنا بھی کیا تھا میں چاہے جیسے بھی سوچتا جس رخ پر بھی سوچتا اس سوال کا میرے پاس ایک ہی جواب تھا۔ "نہ" نیہال میں بظاہر کوئی کمی نہیں تھی وہ پڑھی لکھی، خوب صورت دولت مند تھی مگر اس کے پاؤں کی خرابی۔

بچپن میں اچانک نیہال کے دائیں ٹخنے کی ہڈی بڑھنے لگی تھی۔ جسے پہلے پہل تو خاص توجہ نہ دی گئی مگر جب اسے چلنے میں مسئلہ ہوا تو پھوڈاکٹر کی طرف بھاگیں۔ دو تین آپریشنز سے کچھ امپروومنٹ تو آئی مگر چال میں پہلے سا توازن نہ آسکا۔ البتہ یہ تھا کہ اس کا پاؤں پہلے سا بدوضع نہیں رہا تھا اور مجھے اب ہائی سوسائٹی میں موو کرنا تھا جس کے لیے ایک تیز رفتار ساتھی کی ضرورت تھی جو افشین بخاری تو ہو سکتی مگر نیہال شیرازی نہیں اور آخر میں نے امی کو یہ کہہ کر حتمی انکار کردیا کہ۔

"میں اپنی پسند کی شادی کرنا چاہتا ہوں۔" نہ جانے کیوں میں واضح طور پر امی سے یہ نہ کہہ سکا کہ میں نیہال کی معذوری کو نظرانداز نہیں کر سکتا مجھے لگتا ہے کہ وہ میرے ساتھ نہیں چل سکے گی۔ درحقیقت مجھ میں یہ حوصلہ ہی نہیں کہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے لوگوں کی طنزیہ نظروں کا سامنا کر سکوں۔ میں نے محسوس کیا تھا امی بھی میرے جواب پر مطمئن سی ہو گئی ہیں۔ البتہ ابو نے ایک دو دفعہ فون کر کے مجھے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن مجھے ماننا ہوتا تو پہلے انکار ہی کیوں کرتا۔



پھر میری جاب لگی تو مجھے لگا اب وہ موقع آگیا ہے کہ میں امی سے افشین کے بارے میں بات کروں لیکن میں امی سے بات کرنے سے پہلے افشین سے بات کرلینا چاہتا تھا اور اس کام کے لیے میں نے تیرہ فروری کا دن منتخب کیا تھا۔ صبح سے ہی ہواؤں میں تھوڑی خنکی تھی جس نے میرے موڈ کی خوشگواری میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

ٹھیک نو بجے نک سک سے تیار ہو کر اس سے ملنے جا رہا تھا۔ موقع کی مناسبت سے سرخ گلابوں کا بکے لے کر میں تقریباً" آدھے گھنٹے میں اس کے گیٹ پر تھا۔ اسے صبح ہی میں نے فون کر کے ڈنر ساتھ کرنے کے لیے کہہ دیا تھا اس لیے وہ تیار ہی تھی وہ فورا" باہر آگئی۔

اس نے پنک سوٹ پہن رکھا تھا جبکہ دوپٹہ ملٹی شیڈڈ تھا جو اس پر بے تحاشا سج رہا تھا اور مجھے یہ کلرز ذاتی طور پر بہت پسند بھی تھا۔ اسی لیے میرے ہونٹوں پر بے ساختہ سی مسکراہٹ ابھر آئی تھی جو چھپانے کی ضرورت میں نے قطعا" محسوس نہیں کی۔

سارا رستہ وہ ہی ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی جن کے جواب میں میں صرف مسکراتا رہا تھا سارے الفاظ تو میں نے کچھ دیر بعد کے لیے اٹھا رکھے تھے۔

اور جب ویٹر ہمارے سامنے کولڈ ڈرنکس رکھ کر چلا گیا تو میں نے اردگرد کے کیف آگیں ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے سرخ گلابوں کا بکے اس کی طرف بڑھا دیا۔

"افشین! جس طرح بہار اور خوب صورتی کا ساتھ یقینی ہے۔ پھول اور خوشبو کا رشتہ پیہم ہے اور زندگی کے لیے سانس کی ضرورت ہے اس طرح مجھے لگتا ہے کہ زندگی کے سفر میں مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ کیا تم میرا ساتھ دو گی؟" اپنی طرف سے میں نے اپنے جذبات کے اظہار کے لیے بہت خوب صورت الفاظ کا چناؤ کیا تھا مگر ان پر افشین کے چہرے پر جو تاثرات نمودار ہوئے تھے انہوں نے مجھے اپنے الفاظ کی کم مائیگی کا احساس بخوبی دلا دیا تھا۔

"سوری! زیاد میں کسی کے ساتھ کمٹڈ ہوں۔"
کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ گویا ہوئی پھر سر جھکا کر اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگی یہ جانے بغیر کہ اس کے

انکشاف نے مجھ پر کیا قیامت توڑی ہے۔ پورے اڑھائی سال ہو گئے تھے ہماری دوستی کو مگر اس نے ایک مرتبہ بھی تو اس بات کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ پھر میرا حیران ہونا تو فطری تھا۔



افشین کے انکار کے بعد میں نے امی سے کہہ دیا تھا کہ وہ جو چاہے کریں مجھے ان کا ہر فیصلہ منظور ہو گا۔ اور امی نے اس مہم پر بہت تیزی سے کام بھی شروع کر دیا تھا۔ اب جب کبھی میں گھر آتا امی کے پاس یہی موضوع ہوتا فلاں کے گھر گئے تھے لڑکی یہ کرتی تھی اس طرح کی تھی مگر کبھی لڑکی کا محلہ کبھی اس کا گھر اور کبھی اس کے گھر والے امی کو پسند نہ آتے اور بات لڑکی دیکھنے سے آگے نہ بڑھ پاتی۔

اس دفعہ جب میں ویک اینڈ پر آیا تو امی بے انتہا خوش تھیں انہوں نے میرے لیے لڑکی پسند کرلی تھی لڑکی نے میتھس میں ماسٹر کر رکھا تھا اس کا باپ بینک میں منیجر تھا شام میں حنا نے لڑکی کی تصویر بھی دکھا دی۔

نہ جانے کیوں اس میں مجھے نیہاں کا عکس نظر آیا تھا۔ شاید اس کی آنکھیں نیہاں جیسی تھیں یا پھر ناک یا کچھ اور مجھے کچھ خاص سمجھ نہیں آئی۔ ”ٹھیک ہے“ کہہ کر میں نے تصویر حنا کو واپس کر دی تھی کہ لڑکی بہر حال خوب صورت تھی۔ پھر بھی پتا نہیں کیا تھا کہ میں ساری رات بے چین رہا۔ نیند تو یوں بھی بہت کم تھی مگر تھی تو سہی لیکن وہ رات میں نے آنکھوں میں کاٹی تھی۔ سینے میں عجیب سا درد تھا۔

پھر وہ لوگ مجھ سے ملنے آئے اور پسند بھی کر لیا اب عالیہ آپی اور حنا وغیرہ کو جانا تھا ان لوگوں کے ہاں اور اس کے بعد منگنی کی تقریب ہوتی۔



”نیہاں کی منگنی ہو گئی ہے۔“ اس دفعہ ایک اور خبر میری منتظر تھی اور میرے دل پر جیسے آرے چل گئے تھے جو بھی ہوا غلط ہوا تھا۔ میرا دل ان دیکھے بے سمت طوفانوں کی زد میں تھا۔ حالانکہ میری اپنی منگنی آج کل میں متوقع تھی پھر کیا تھا کہ میں یوں پریشان ہو گیا تھا۔ ہر طرف نیہاں کی آواز تھی ’اس کا عکس تھا‘ ہر چہرے میں اس کا گمان تھا اور یہی وہ لمحہ تھا جب مجھ پر محبت کا راز کھلا۔ میں نے خود اپنے ہاتھوں اپنی خوشیوں کے چراغ گل کیے تھے خود بھٹک کر اپنی منزل گنوائی تھی پھر کسی کو کیا دوش دیتا۔ ایسا کرب ایسا درد تو میں نے افشین کے انکار پر بھی محسوس نہیں کیا تھا جس نے مجھے ٹھکرایا تھا جس سے میں سمجھتا تھا کہ مجھے محبت تھی۔ مگر وہ محبت نہیں ضرورت تھی یہ ادراک تو آج ہوا تھا مجھے۔ جب محبت نے اپنا شکنجہ کسا تھا اور میں بے بس تھا نہ رو سکتا تھا نہ کراہ سکتا تھا۔



زندگی میں بہت سے ایسے واقعات ہوتے ہیں کہ انسان حیران و پریشان رہ جاتا ہے آیا یہ بھی حقیقت ہے یوں بھی ہوتا ہے اور آخر ہمارے ساتھ ہی کیوں مگر یہ قسمت ہے جو انسان کو بے جان چیز سمجھ کر جو چاہتی ہے اس کے ساتھ کرتی ہے۔

کتنا حیران کن تھا کہ وہ لڑکی جو میری ماں نے میرے لیے پسند کی اس کی ایک ٹانگ چھوٹی تھی اس کے چال میں بھی لنگڑاہٹ تھی نیہاں کی طرح.....

جب سے حنا اور عالیہ آپی اسے دیکھ کر آئی تھیں انہوں نے واویلا مچایا ہوا تھا کہ کیا امی کو نظر نہیں آیا تھا یہ سب کچھ اور امی کا کہنا تھا کہ وہ جب کمرے میں آئی تو ہم لوگوں نے خاص توجہ نہیں دی پھر وہ سارا وقت ہمارے پاس ہی بیٹھی رہی چائے وغیرہ بھی ان کی نوکرانی نے سروکی تھی کچھ خفیف سی امی یہ نہیں سمجھ پا رہی تھیں کہ یہ تقدیر ہے جس کی پٹی ان کی آنکھوں پر بندھی تھی جس نے اس لڑکی کا ہر عیب چھپا لیا تھا۔

وہی تقدیر جس کے بارے میں ایک دفعہ نیہاں شیراز نے کہا تھا۔

”ہم تقدیر کا ہاتھ صرف ایک مرتبہ جھٹکتے ہیں اور وہ قدم قدم پر ہمیں جھکاتی چلی جاتی ہے۔ اس لیے اس کے ساتھ ہمیشہ دوست بن کر چلنا چاہیے تاکہ ایک کامیاب زندگی گزاری جاسکے۔“

جب ہم لوگوں کا ایف ایس ای کا رزلٹ آیا تو نیہال کے دو نمبر میرٹ سے کم ہونے کی وجہ سے اس کا ایڈمیشن اس کے پسندیدہ کالج میں نہیں ہو سکا تھا۔ اس کی افسردگی کے پیش نظر میں نے اسے کہا تھا کہ وہ تھوڑا انتظار کر لیتی تو شاید اگلی میرٹ لسٹ میں اس کا بھی نام آجاتا جس کے جواب میں یہ الفاظ کہہ کر اس نے مجھے خاموش کروادیا تھا۔

نیہال شیرازی کی وہی تقدیر آج مجھے پچھاڑ گئی تھی۔

عالیہ آپی اور حنا کے لاکھ برا منانے پر بھی میں نے امی کو کہہ دیا تھا کہ وہ ان لوگوں کو نہ نہیں کہیں گی کیونکہ لڑکی مجھے پسند ہے چاہے یہ صرف کہنے کی ہی بات تھی۔

نہ مجھے اس لڑکی سے اس قدر دلچسپی تھی کہ میں اس کے بغیر رہ پاتا (اگر میں نیہال کے بغیر رہ سکتا ہوں تو پھر وہ کیا تھی) اور نہ ہی اس میں کوئی ایسی بات تھی جو مجھے ڈٹے رہنے پر مجبور کرتی سوائے اس کی چال کے جس میں لنگڑاہٹ تھی نیہال کی طرح، وہی نیہال شیرازی جو میری محبت تھی اور جس کے لیے انکار کرتے ہوئے میں بھول گیا تھا کہ بچپن میں کبھی جب نیہال ذرا سا لڑکھڑا جاتی تو اسے سہارا دینے کے لیے سب سے پہلے بڑھنے والا ہاتھ میرا ہی ہوا کرتا تھا اور جب کسی کی تاسف بھری نظریں اس کے پاؤں کی طرف اٹھتیں تو میں جان بوجھ کر اس کے ساتھ چلنے لگتا تھا کہ لوگوں کی توجہ بٹ جائے۔ مجھے لوگوں کا اس پر ترس کھانا کسی طور قبول نہیں تھا میرا بس نہیں چلتا تھا کہ اس کی شخصیت کے ہر عیب پر پردہ بن کر چھا جاؤں۔ مگر یہ سب تو اب یاد آتا ہے اس وقت نہیں آیا جب میں نے خود اس کے عیب کی وجہ سے اس سے شادی کرنے سے انکار کر دیا۔

کہتے ہیں کہ قسمت انسان کی مٹھی میں ہوتی ہے کاش ایسا ہوتا بھی تو آج نیہال شیرازی کو کسی طرح اپنا بنا لیتا مگر حقیقت میں انسان قسمت کی مٹھی میں ہے وہ جیسے چاہتی ہے اسے چلاتی ہے جہاں چاہتی ہے اسے مات دیتی ہے جب چاہتی ہے اس کا تماشا دیکھتی ہے۔



"زیاد بھائی! امی کہہ رہی ہیں جلدی آئیں وہ لوگ رسم کے لیے کہہ رہے ہیں۔" حنا میرے کمرے کے باہر کھڑی پکار رہی تھی۔

"آرہا ہوں ہنی گڑیا بس پانچ منٹ" میں نے آئینے میں اپنا عکس دیکھتے ہوئے اسے جواب دیا اور پرفیوم اٹھا کر خود پر اسپرے کرنے لگا۔

آج منگنی ہے جس کی رسم کے لیے مجھے پکارا جارہا ہے اور میں قصداً "لیٹ ہو رہا ہوں شاید نیہال سے سامنے کا خود میں حوصلہ نہیں پاتا حالانکہ میرے اور اس کے درمیان اظہار کا مرحلہ کبھی نہیں آیا پھر بھی جیسے مجھے لگ رہا ہے وہ سب جانتی ہے جب میں اس کے سامنے جاؤں گا اس کی آنکھوں میں میرے لیے گلہ ہوگا۔ جبکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ کیونکہ اول تو اسے گلہ کرنے کی عادت نہیں دوسرا اسے اپنے ہر تاثر کو چھپانا بخوبی آتا ہے۔ ہے نا حیرت کی بات کہ میں اسے اتنی اچھی طرح جانتا ہوں جو دوسروں کو جاننے کے دعوے دار ہوتے ہیں وہ اکثر اپنے معاملے میں دھوکا کھا جاتے ہیں۔ بالکل میری طرح، میں نے سندس سے شادی کی ہامی تو صرف اس لیے بھری کہ اس میں نیہال شیرازی کی مشابہت تھی لیکن نیہال سے شادی کی ہامی نہ بھر سکا کیونکہ میں اپنے جذبوں سے ہی انجان تھا۔

شاید میں ساری عمر سندس میں نیہال کو ہی ڈھونڈتا رہوں گا یا شاید مجھے اس سے بھی محبت ہو جائے گی کہ یہ تو کہیں نہیں لکھا کہ محبت صرف ایک دفعہ ہی ہوتی ہے اور نہ ہی دوسری محبت پر کوئی حد نافذ ہوتی ہے۔ اسی لیے تو میں اپنے فیصلے سے مطمئن نہیں تو اداس بھی نہیں۔





اچھے حاکم کے لیے سچا وزیر

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "اللہ تعالیٰ جب کسی حاکم کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کو سچا وزیر عنایت فرمادیتا ہے حاکم اگر (کچھ) بھول جاتا ہے تو وہ (وزیر) اس کو یاد دلا دیتا ہے اور اگر یاد رکھتا ہے تو اس کی مدد کرتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کسی حاکم کے ساتھ اس کے برعکس معاملہ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو خراب وزیر دیتا ہے اگر وہ کچھ بھول جائے تو یاد نہیں دلاتا اور اگر یاد رکھے تو اس کی کوئی مدد نہیں کرتا۔" 1158 (سنن ابی داؤد شریف)

صغریٰ یاسین..... کراچی

عدل وانصاف

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عدل کی یہ حالت تھی کہ جب آپ رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو آپ کی سلطنت کے دور دراز علاقے کا ایک چرواہا بھاگتا ہوا آیا اور چیخ کر بولا۔ "لوگو! حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا ہے۔"

لوگوں نے حیرت سے پوچھا۔ "تم مدینہ سے ہزاروں میل دور جنگل میں ہو تمہیں اس سانحہ کی اطلاع کس نے دی؟"

چرواہا بولا۔ "جب تک عمر فاروق رضی اللہ عنہ زندہ تھے، میری بھیڑیں جنگل میں بے خوف پھرتی تھیں اور کوئی درندہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا لیکن آج پہلی بار بھیڑیا میری بھیڑ کا بچہ اٹھا کر لے گیا۔ میں نے بھیڑیے کی جرات سے جان لیا کہ آج دنیا میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ موجود نہیں ہیں۔"

کشور منیر..... کراچی

چودہ سو سال پہلے

دانشور تو کہتے ہیں کہ ہمیں چودہ سو سال پیچھے دھکیلا جا رہا ہے لیکن ہم تو اسے اپنی خوش قسمتی خیال کرتے ہیں کہ اگر کوئی ہمیں چودہ سو سال پہلے کا معاشرہ کہیں سے لا دے۔

ہم باز آئے میڈیا کی ترقی سے، ہماری توبہ اس جدید نظام سے، ہم ان ساری ایجادات سے محروم بھلے، ہم ان سے دستبردار ہوتے ہیں، تہذیب حاضر ہم سے اپنی بجلی چھین لے، گراموفون واپس لے لے، ہوائی جہاز ضبط کر لے، ایٹمی صلاحیت اپنے پاس رکھے، مواصلات کا نظام معطل کر دے۔ ہمیں یہ سب منظور ہے مگر ہمیں کسی طرح ہمارا کھویا ہوا سکون واپس مل جائے، بھائی چارہ دستیاب ہو جائے، اپنے پرائے کی پہچان نصیب ہو جائے، خوف خدا اور آخرت کا ڈر عطا ہو جائے، قناعت کی دولت اور سادگی کی لذت کہیں سے ہاتھ آ جائے اور اس کے لیے ظاہر ہے کہ ہمیں چودہ سو سال پیچھے جانا پڑے گا۔ ("فکر امروز" از صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی)

خالدہ پروین..... پھول نگر

چراغ زندگی

☆ اپنی عمر کے پہلے بیس سالوں کی اچھی طرح حفاظت کرو اور امید رکھو کہ آنے والے بیس سال تمہاری حفاظت کریں گے۔

☆ کسی کام کا آغاز اس کی نصف کامیابی ہے اور بغیر

مقصد کے زندگی پائیدار نہیں گزرتی سو کسی کام کا آغاز اور مقصد بہترین ہونا چاہیے۔

☆ شیریں الفاظ اگرچہ بہت ہی معمولی چیز ہیں لیکن ان کی مدد سے آپ بڑے بڑے کام سرانجام دے سکتے ہیں۔

☆ جو اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ انسانیت کی خدمت میں ہی اس کی فلاح ہے، کامیابی اس کے دروازے پر دستک دیتی رہتی ہے۔

☆ سر جھکانے کے لیے جگہ کی قید نہیں لیکن معبد جتنا عظیم الشان ہو گا، اتنا ہی جھکنے والے کے حواس پر اثر انداز ہو گا۔

حافظہ سمیرا۔ 157 این بی

لفظوں کے موتی

☆ وقت ہمارے پاس ایسے آتا ہے جیسے کوئی دوست بھیس بدل کر اور تحفے لے کر آتا ہے۔ اگر اس سے فائدہ نہ اٹھایا جائے تو چپ چاپ وہ اپنے تحفوں کے ساتھ واپس چلا جاتا ہے۔ اس دنیا میں اپنا ہر دن یہ سمجھ کر گزارو کہ یہ تمہارا آخری دن ہے۔

☆ علم انسان کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کنول کے پھول کے لیے پانی۔

☆ پانی کی ایک بوند میں نمک ملا دیا جائے تو وہ آنسو نہیں بن جاتا۔

☆ جو شخص نگاہ کی التجا کو نہ سمجھے اس کے سامنے زبان کو شرمندہ مت کرو۔

☆ اعتماد اس پرندے کی مانند ہے جو صبح کاذب میں ہی روشنی کے احساس سے چہچہانے لگتا ہے۔

☆ دنیا ہمیشہ اپنی حالت پر قائم رہے گی لیکن اس قفس کے اسیر بدلتے رہیں گے۔ قانون قدرت ہمیشہ کسی جاندار کو قید نہیں رکھتا۔

☆ اللہ کو گناہ گار توبہ کرنے والے کی آواز سے زیادہ پیاری اور کوئی آواز نہیں۔

نوشین اقبال نوشی گاؤں بدر مرجان

اذیت میں

اور کیا بتاؤں میں زندگی کی ظلمت میں
وہ چراغ روشن تھا آدمی کی صورت میں
شہر اور نگر بدلے، دشت اور گھر بدلے
فرق کچھ نہیں آیا آدمی کی حالت میں
اب نہ یاد ماضی ہے اور نہ فکر مستقبل
صرف ہوش اتنا ہے زندہ ہوں اذیت میں
(سلیم احمد)

روبی۔۔۔ کراچی

دس اشرفیاں

ایک رات کو جب اکبر بادشاہ اور بیربل بھیس بدل کر شہر کا گشت کر رہے تھے دونوں کا گزر ایک حجام کی جھونپڑی کے پاس سے ہوا۔ حجام جھونپڑی کے باہر چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ اکبر نے اس سے پوچھا "بھائی یہ بتاؤ کہ آج کل اکبر بادشاہ کے راج میں لوگوں کا کیا حال ہے۔۔۔" حجام نے فوراً جواب دیا "اجی کیا بات ہے ہمارے اکبر بادشاہ کی اس کے راج میں ہر طرف امن چین اور خوش حالی ہے لوگ عیش کر رہے ہیں ہر دن عید اور ہر رات دیوالی ہے۔"

اکبر اور بیربل حجام کی باتیں سن کر آگے بڑھ گئے اکبر نے بیربل سے فخریہ لہجے میں کہا "بیربل دیکھا تم نے ہماری سلطنت میں رعایا کتنی خوش ہے۔" بیربل نے عرض کیا "بے شک جہاں پناہ آپ کا اقبال بلند ہے۔" چند روز بعد پھر ایک رات دونوں کا گزر اسی مقام سے ہوا۔ اکبر نے حجام سے پوچھ لیا "کیسے ہو بھائی" حجام نے چھوٹتے ہی کہا۔ "اجی حال کیا پوچھتے ہو ہر طرف تباہی بربادی ہے، اس اکبر بادشاہ کی حکومت میں ہر آدمی دکھی ہے ستیاناس ہو، اس منحوس بادشاہ کا۔"

اکبر حیران رہ گیا کہ یہی آدمی کچھ دن پہلے بادشاہ کی اتنی تعریف کر رہا تھا اور اب ایسا کیا ہو گیا، جہاں تک اس کی معلومات کا سوال تھا، عوام کی بدحالی اور پریشانی کی اطلاع اسے نہیں تھی اکبر نے حجام سے پوچھنا چاہا لوگوں کی تباہی اور بربادی کی وجہ کیا ہوئی۔ حجام کوئی وجہ بتائے بغیر حکومت کو برا بھلا کہتا رہا اکبر اس کی بات سے

پریشان ہو گیا الگ جا کر بادشاہ نے بیربل سے پوچھا "آخر اس شخص نے یہ سب کیوں کہا"

بیربل نے جیب سے ایک تھیلی نکالی اور بادشاہ سے کہا "اس میں دس اشرفیاں ہیں دراصل میں نے دو دن پہلے اس کی جھونپڑی سے چوری کروالی تھیں' جب تک اس کی جھونپڑی میں مال تھا اسے بادشاہ' حکومت سب کچھ اچھا لگ رہا تھا اور اپنی طرح وہ سب کو خوش اور سکھی سمجھ رہا تھا' اب وہ اپنی دولت لٹ جانے سے غمگین ہے 'ساری دنیا اسے تباہی و بربادی میں مبتلا نظر آتی ہے۔ جہاں پناہ اس واقعے سے آپ کو یہ گوش گزار کرنا چاہ رہا تھا کہ ایک فرد اپنی خوش حالی کے تناظر میں دوسروں کو خوش دیکھتا ہے لیکن بادشاہوں اور حکمرانوں کو رعایا کا دکھ درد سمجھنے کے لیے اپنی ذات سے باہر نکل کر دور تک دیکھنا اور صورت حال کو سمجھنا چاہیے۔"

صابرہ یار محمد..... اسلام آباد

ہری مرچیں

○ ہر عورت خوب صورت ہوتی ہے سوائے گھر کی عورت کے۔

○ آپ سینما دیکھ کر اتنا خوش نہیں ہو سکتے۔ جتنا ایک عورت پڑوس کے گھر جھانک کر خوش ہوتی ہے۔

○ سمجھ دار جج پہلے عورت سے عمر دریافت کرتے ہیں۔ اور تب کہیں جا کر سچ بولنے کا حلف اٹھواتے ہیں

○ عورت کے نزدیک سب سے حسین عورت وہ ہے جو اسے آئینے کے سامنے دکھائی دے۔

○ عورت کو پہلے محبت سے پھر دولت سے اور آخر میں مرمت سے مطیع کیا جا سکتا ہے۔

فوزیہ ثمرہ..... گجرات

بیوی..... مفکرین کی نظر میں

☆ دوسری تمام چیزیں تو قسمت اور محنت سے ملتی ہیں لیکن بیوی آسمانی تحفہ ہے۔(پوپ)

☆ اگر جنت میں مجھے میری بیوی نہ ملے تو وہ میرے لیے جنت نہ ہو گی۔(جیکسن)

☆ ایک خوب صورت مگر غریب بیوی کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی عالیشان عمارت بغیر فرنیچر کے ہو۔ (فلر)

☆ لمبی عمر پانے کے لیے بیوی بے حد ضروری ہے' اس لیے کہ آدمی کی آدھی پریشانیاں اور اس کا دو تہائی غصہ تو وہ بے چاری بھگت لیتی ہے۔(چارلس ڈیو)

☆ میری زندگی کا ایک حسین پہلو یہ ہی کہ میرے گھر سے نکلتے اور گھر میں داخل ہوتے وقت میری بیوی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے۔(ولسن)

☆ دنیا میں قابل تعریف بیوی وہ نہیں' جس کی شادی کسی عظیم شخصیت سے ہو جائے بلکہ وہ ہے جس نے شوہر کو عظیم بنا دیا۔(رابرٹ)

اسینہ ملک..... کراچی

بے چارگی

کال بیل بجی۔ صاحب خانہ نے دروازہ کھولا تو انہوں نے دیکھا کہ غریبانہ سے حلیے کا ایک نوجوان دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ڈالے کھڑا تھا۔ وہ شائستہ اور عاجزانہ لہجے میں بولا۔

"سر! معاف کیجئے گا..... میں نے آپ کو زحمت دی۔ دراصل بہت سخت ضرورت کے تحت میں آپ سے ایک چیز مانگنے آیا ہوں۔"

وہ صاحب ذرا چڑ کر اس کی بات کاٹتے ہوئے بولے۔ "اگر کچھ مانگنے آئے ہو تو کم از کم تمیز سے تو کھڑے ہو جاؤ' تم تو دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ڈالے لاٹ صاحب کی طرح کھڑے ہو' انسان جب کسی سے کچھ مانگنے جائے تو اس کے رویے میں کچھ عاجزی ہونی چاہیے۔"

نوجوان نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "سر! پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کھڑے ہونا میری مجبوری ہے' اگر میں نے جیبوں سے ہاتھ باہر نکالے تو پتلون نیچے گر جائے گی۔ اس پتلون کے لیے بیلٹ مانگنے ہی تو میں آپ کے پاس آیا ہوں۔"

عمارہ ناصر..... کراچی

تروئی

نہ ہر سحر کا وہ جھگڑا نہ سب کی بے چینی
نہ چولہا جلتا ہے گھر میں نہ آنکھیں جلتی ہیں
میں کتنے امن سے گھر میں اداس رہتا ہوں
(گلزار)

فاخرہ۔۔۔ کراچی

ڈرائیور۔۔۔ڈرائیور

☆ ''ڈرائیور! لکشمی چوک کا کیا لو گے؟''
○ ''لکشمی چوک کیا میرے باپ کا ہے جو میں بیچوں گا۔''
☆ ''ڈرائیور! لکشمی چوک کا کیا لو گے؟''
○ ''باؤ جی! میں کوئی بھی چیز بڑے بھائی سے پوچھے بغیر نہیں بیچتا۔''
☆ ''ڈرائیور! لکشمی چوک کا کیا لو گے؟''
○ ''میرا ابھی بیچنے کا کوئی ارادہ نہیں۔''
☆ ''ڈرائیور! لکشمی چوک کا کیا لو گے؟''
○ ''باؤ جی صرف پوچھنا ہے یا لینا بھی ہے۔''
☆ ''ڈرائیور! لکشمی چوک چلو لیکن مجھے بہت جلدی ہے''
○ ''ٹھیک ہے! آپ میٹر پر بیٹھ جائیں۔''
☆ ''ڈرائیور! کیا تمہیں ٹریفک کے نشانات اور رنگوں کا بھی پتا ہے؟''
○ ''جی ہاں! سرخ بتی پر رکنا ہے پیلی پر تیار رہنا ہے سبز پر چلنا ہے اور جب سواری کا رنگ زرد ہو جائے تو رک جانا ہے۔''

گڑیا شاہ۔۔۔ کہروڑپکا

پنجابی زبان

جوش ملیح آبادی نے پنجابی کے اکھڑپن سے زچ ہو کر کنور مہندر سنگھ بیدی سے کہا۔
''کنور صاحب' کیا آپ جانتے ہیں کہ دوزخ کی سرکاری زبان بھی آپ کی پنجابی ہو گی؟''
کنور صاحب نے برجستہ جواب دیا۔
''تو پھر جوش صاحب! آپ کو پنجابی زبان ضرور سیکھ لینی چاہیے۔''

سیدہ نسبت زہرا۔۔۔ کہروڑپکا

دل جلا

ٹرین نہایت سست رفتاری سے چلی جا رہی تھی اس دوران گارڈ ایک کمپارٹمنٹ میں آیا اور بولا۔
''جو مسافر بھاگ پورہ جا رہے ہیں انہیں افسوس سے اطلاع دی جا رہی ہے کہ بھاگ پورہ کا اسٹیشن تباہ ہو گیا ہے وہاں آگ لگ گئی تھی۔''
ایک لمحے خاموشی رہی پھر ایک مسافر دوسروں کو تسلی دینے کے انداز میں بولا۔
''پریشانی کی کوئی بات نہیں جب تک ہم بھاگ پورہ پہنچیں گے' اسٹیشن دوبارہ تعمیر ہو چکا ہو گا۔''

سیدہ نسبت زہرا۔۔۔ کہروڑپکا

بجلی کے متعلق دلچسپ معلومات

☆ جاپان میں اسٹوڈنٹس کے لیے بجلی فری ہے۔
☆ اٹلی میں سب سے زیادہ بجلی پیدا ہوتی ہے۔
☆ امریکا میں لوگ بجلی بنا کر گورنمنٹ کو بیچتے ہیں۔
☆ سنگاپور میں 12 مہینے بارش ہونے کے باوجود 2 منٹ بھی بجلی نہیں جاتی۔
☆ انڈیا میں کوئلے سے 70 فیصد بجلی پیدا ہوتی ہے۔
☆ انگلینڈ میں لوگ اپنی ضروریات کی بجلی پیدا کر سکتے ہیں۔
☆ چین میں تمام گھروں کے لیے بجلی فری ہے۔
☆ ترکی اپنے علاوہ 3 ملکوں کو بجلی دیتا ہے۔
☆ سعودی عرب ضرورت کی 90 فیصد بجلی پیٹرول سے بناتا ہے۔ اور۔۔۔
☆ پاکستان میں صارفین کی اکثریت کو بجلی میڈیسن کی طرح دی جاتی ہے۔ 2 گھنٹے صبح۔۔۔ 2 گھنٹے دوپہر۔۔۔ 2 گھنٹے شام۔
خدا کرے کہ یہ مسئلہ جلد حل ہو جائے۔

میمونہ شمس۔۔۔ پشاور

بُشریٰ محمود



فوزیہ ثمر بٹ، کی ڈائری میں تحریر

پروین شاکر کی نظم

نئی رات کا

گہن کو اپنے تن کا نوشتہ جان کے میں نے
روشنیوں سے سارے ناتے توڑ لیے تھے
رات کو اپنی سکھی مان کے
اپنے سارے دُکھ بس اُس سے کہہ کے
جی ہلکا کر لیتی تھی
شام ڈھلے۔ تنہائی کے بازو پر سر رکھے سو جاتی
اور نیند کے بے آباد جزیروں میں تنہا
اک تھکی ہوئی خوشبو کی طرح بھٹکا کرتی
آج بھی تنہا ہوں سفر میں
لیکن خود سے پوچھ رہی ہوں
میرے وجود کے گرد یہ کیسا ہالہ ہے
یوں لگتا ہے
چادرِ شب شانوں سے سرکتی جاتی ہے
چاند مرے آنچل میں ستارے ٹانک رہا ہے

سیّدہ نسبت گیلانی، کی ڈائری میں تحریر

سعداللہ شاہ کی غزل

دیکھیں اس دیوار پہ اُتریں کیسے جا کر خواب
جب سے اُس کو دیکھا میں نے ہوئے کبوتر خواب

دل بھی کیسی شے ہے دیکھو پھر خالی کا خالی
گرچہ اس میں ڈالے میں نے آنکھیں بھر بھر خواب

ہو سکتا ہے راکھ بنوں یا راکھ سے اگلی صورت
میرے پر ہیں آنکھیں میری آنکھوں کے پر خواب

جانے کون سی حد پر دیکھوں سامنے عشق جزیرہ
آنکھیں جیسے کشتیاں میری اور سمندر خواب

اک تعبیر کی صورت سب نے تیری صورت مانگی
تیرے آنگن میں اُترے تو ہوئے گداگر خواب

جب میں سب کچھ جانتا ہوں تو کس سے جا کر پوچھوں
دل میں جتنے بنا رکھے ان کے ہزار خواب

بنجر بن تھا سعدؔ کے دل میں آنکھ میں گونگے جذبے
ایسا چاند اک اُترا دل میں بنے سخن ور خواب

نسرین ناز، کی ڈائری میں تحریر

نصیر ترابی کی غزل

ملنے کی طرح مجھ سے وہ پل بھر نہیں ملتا
دل اُس سے ملا جس سے مقدر نہیں ملتا

ہم رنگیٔ محرم کے طلب گار نہ ہوتا
سایہ بھی تو قامت کے برابر نہیں ملتا

کہنے کو غمِ عشق، بڑا دشمنِ جاں ہے
پر دوست بھی اُس دوست سے بہتر نہیں ملتا

وحشت، درو دیوار سے مانوس ہے اتنی
صحرا کوئی اب شہر سے باہر نہیں ملتا

یہ راہِ تمنّا ہے، یہاں دیکھ کے چلنا
اس راہ میں سر ملتے ہیں، پتھر نہیں ملتے

اب ہم سخنو! کم سخنی ختم ہے اُس پر
ہاں اُس کے سوا کوئی سخن ور نہیں ملتا

کچھ دن تو نصیر آؤ، چلو گھر میں رہا جائے
لوگوں کو یہ شکوہ ہے کہ گھر پر نہیں ملتا

صائمہ، کی ڈائری میں تحریر

منیر نیازی کی نظم

اب میں اسے یاد بنا دینا چاہتا ہوں

میں اُس کی آنکھوں میں دیکھتا رہتا ہوں
مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا
میں اُس کی باتوں کو سنتا رہتا ہوں
مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا
اب اگر وہ کبھی مجھ سے ملے
تو میں اُس سے بات نہیں کروں گا
میں اُس کی طرف دیکھوں گا بھی نہیں
میں کوشش کروں گا
میرا دل کہیں اور مبتلا ہو جائے
اب میں اسے یاد بنا دینا چاہتا ہوں

شازیہ گلزار، کی ڈائری میں تحریر

خالد شریف کی غزل

رخصت ہوا تو بات میری مان کر گیا
جو اُس کے پاس تھا وہ مجھے دان کر گیا

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

دلچسپ واقعہ ہے کہ کل اک عزیز دوست
اپنے مفاد پر مجھے قربان کر گیا

کتنی سُدھر گئی ہے جدائی میں زندگی
ہاں وہ جفا سے مجھ پہ تو احسان کر گیا

خالد میں بات بات پہ کہتا تھا جس کو جان
وہ شخص آخرش مجھے بے جان کر گیا

صدف مختار، کی ڈائری میں تحریر

محسن نقوی کی نظم

سفر تنہا نہیں کرتے
سُنو ایسا نہیں کرتے
جسے شفاف رکھنا ہو
اسے میلا نہیں کرتے
تیری آنکھیں اجازت دیں
تو ہم کیا کیا نہیں کرتے
بہت اُجڑے ہوئے گھر پر
بہت سوچا نہیں کرتے
سفر جس کا مقدّر ہو
اسے روکا نہیں کرتے
جو مل کر خود سے کھو جائے
اسے رُسوا نہیں کرتے
جو دھن ہو کر گزرنے کی
پھر سوچا نہیں کرتے
کبھی ہنسنے سے ڈرتے ہیں
کبھی رویا نہیں کرتے
سحر سے پوچھ لو محسنؔ
کہ ہم سویا نہیں کرتے

نزہت جاوید، کی ڈائری میں تحریر

صابر ظفر کی غزل

محبت ہو نہیں پائی، محبت ہو بھی سکتی تھی
یہ دل دیوانہ بن جاتا تو قربت ہو بھی سکتی تھی

میں تیرے دھیان کی شمعیں اگر رکھتا نہ ساتھ اپنے
تو اُس بارہ دری میں شام غارت ہو بھی سکتی تھی

میں ہارا اس لیے تھا، میں نے تجھ پر فیصلہ چھوڑا
مری منصف مرے دل کی عدالت ہو بھی سکتی تھی

خبر کرتا ہوا پہنچا محل کے ساتویں در تک
اچانک جا پہنچتا تو شکایت ہو بھی سکتی تھی

دریچے میں اُجالا اُس کے ہونے کا حوالہ تھا
دگرنہ رات کی تقدیر، ظلمت ہو بھی سکتی تھی

محل سے بھاگنا اور جھونپڑی میں آکے رُک جانا
اگر مجبور کرتا دل، یہ ہجرت ہو بھی سکتی تھی

فرحی ارمان، نین تارہ، کی ڈائری میں تحریر
حسن رضوی کی غزل

کبھی کتابوں میں پھول رکھنا، کبھی درختوں پہ نام لکھنا
ہمیں بھی ہے یاد آج تک وہ نظر سے سلام لکھنا

وہ چاند چہرے وہ بہکی باتیں سلگتے دن تھے مہکتی راتیں
وہ چھوٹے چھوٹے کاغذوں پہ محبتوں کے پیام لکھنا

گلاب چہروں سے دل لگانا، وہ چپکے چپکے نظر ملانا
وہ آرزوؤں کے خواب بننا، وہ قصہ ناتمام لکھنا

مرے نگر کی حسین فضاؤ کہیں جو ان کا نشان پاؤ
تو پوچھنا یہ کہاں بسے وہ، کہاں ہے ان کا قیام لکھنا

گئی رُتوں میں حسن ہمارا بس ایک ہی تو یہ مشغلہ تھا
کسی کے چہرے کو صبح کہنا، کسی کی زلفوں کو شام لکھنا

گڑیا شاہ، کی ڈائری میں تحریر
اک غزل

اک پشیمان سی حسرت سے مجھے سوچتا ہے
اب وہی شہر محبت سے مجھے سوچتا ہے

میں تو محدود سے لمحوں میں ملی تھی اسے
پھر بھی وہ کتنی وضاحت سے مجھے سوچتا ہے

جس نے سوچا ہی نہ تھا ہجر کا ممکن ہونا
دکھ میں ڈوبی ہوئی حیرت سے مجھے سوچتا ہے

میں تو مر جاؤں اگر سوچنے لگ جاؤں اسے
اور وہ کتنی سہولت سے مجھے سوچتا ہے

گرچہ اب ترکِ مراسم کو بہت دیر ہوئی
اب وہ بھی میری اجازت سے مجھے سوچتا ہے

کتنا خوش فہم ہے وہ شخص کہ ہر موسم میں
اک رُخ نئی صورت سے مجھے سوچتا ہے

شگفتہ سلیمان



نمرہ، اقراء ______ کراچی

بے سبب آنکھ میں اب اشک اُمڈ آتے ہیں
ہم کو بے وقت کی برسات سے ڈر لگتا ہے

آسیہ جاوید ______ علی پور چٹھہ

تیرے وعدوں نے ہمیں گھر سے نکلنے نہ دیا
لوگ موسم کا مزا لے گئے برساتوں میں

صائمہ شہزاد ______ اسلام آباد

مجھ پہ چھا جائے وہ برسات کی خوشبو کی طرح
انگ انگ اپنا اسی رُت میں مہکتا دیکھوں

عظمیٰ ______ کراچی

شبنم کے آنسو پھول پر یہ تو وہی قصہ ہوا
آنکھیں مری بھیگی ہوئی چہرہ میرا اُترا ہوا
برسات میں دیوار و در کی ساری تحریریں مٹیں
دھویا بہت مٹتا نہیں تقدیر کا لکھا ہوا

اسماء خان ______ کے جی ایم

سرِ راہ کچھ بھی کہا نہیں کبھی اس کے گھر میں گیا نہیں
میں جنم جنم سے اسی کا ہوں اسے آج تک یہ پتا نہیں
یہ خدا کی دین عجیب ہے کہ اسی کا نام نصیب ہے
جسے تو نے چاہا مل گیا جسے میں نے چاہا ملا نہیں

شازیہ گلزار ______ بھکر

نم ہیں پلکیں تری اے موج ہوا، رات کے ساتھ
کیا تجھے بھی کوئی یاد آتا ہے برسات کے ساتھ
روٹھنے اور منانے کی حدیں ملنے لگیں
چشم پوشی کے سلیقے تھے شکایات کے ساتھ

گیلانی سسٹرز ______ کہروڑ پکا

مندمل زخموں پہ گزرے ہوئے حالات کے دُکھ
اور اس پہ جہاں بھر کے سوالات کے دُکھ
رُت بدلنے پہ بھی سب زاویے ویسے ہی رہے
خشک سالی کے جو غم تھے وہی برسات کے دُکھ

ماہ نورعلی ______ کراچی

رہنے دو کہ اب تم بھی مجھے پڑھ نہ سکو گے
برسات میں کاغذ کی طرح بھیگ چکا ہوں

صائمہ جیمی ______ کراچی

وحشتیں بڑھ گئیں موسم کی عنایات کے بعد
ہم کبھی روئے کبھی ہنس دیے برسات کے بعد
اتنی مضبوطی سے ویرانے کے در بند ہوئے
دل میں اُتری نہ کوئی ذات تری ذات کے بعد

ثریا شاہ ______ کہروڑ پکا

محبتوں کے یہ دریا اُتر نہ جائیں کہیں!
جو دل گلاب ہیں زخموں سے بھر نہ جائیں کہیں
چھلک رہا ہے جن آنکھوں میں اب وجود میرا
یہ آنکھیں، ہلنے یہ آنکھیں مکر نہ جائیں کہیں

سیدہ نسبت زہرا ______ کہروڑ پکا

رہتا نہیں انسان تو ہوتا نہیں غم بھی
اک روز زمین اوڑھ کے سو جائیں گے ہم بھی
ہاں حلفِ وفا شوق سے اٹھوایئے لیکن
ہم لوگ وفادار ہیں بے قول و قسم بھی

فوزیہ ثمر بٹ ______ گجرات

بے حس ہیں یہاں لوگ بھلا سوچ کے کرنا
اس دور میں لوگوں سے وفا سوچ کے کرنا
ایک بار جو روٹھے تو منا تم نہ سکو گے
ہم سے وفاداروں کو خفا سوچ کے کرنا

صدف عمران ______ کراچی

گر میں نہ رہوں گا میرے اشعار رہیں گے
اور بعد میرے، میرے پرستار رہیں گے
بے سایہ درختوں کو ہے پیغام ہوا کا
جو دیں گے ثمر بس وہی اشجار رہیں گے

ندا فضہ ——— کراچی

لگی رہتی ہے اشکوں کی جھڑی گرمی ہو یا سردی
نہیں رُکتی کبھی برسات جب سے تم نہیں آئے

فلک جان ——— کراچی

اس کو ہے برسات کا موسم پسند
آج بارش کو برسنا چاہیے

نوشابہ منظور ——— بھریار روڈ

موم کی طرح پگھلتے ہوئے دیکھا اس کو
رُت جو بدلی تو بدلتے ہوئے دیکھا اس کو
جانے کس غم کو چھپانے کی تمنا ہے اسے
آج ہر بات پہ ہنستے ہوئے دیکھا اس کو

سعدیہ عرفان ——— گارڈن

وہ سمندر ہے تو ٹھہرا ہے ٹھہرا کیوں ہے
وہ ہوا ہے تو گزر جائے ہواؤں کی طرح

زبیدہ ریاض ——— حیدر آباد

وصل کی شب اور اتنی مختصر
دن گنے جاتے تھے اس دن کے لیے

ثمینہ تاج ——— لاہور

ہم کو انتظارِ سحر بھی قبول ہے
لیکن شب فراق ترا کیا اصول ہے

سدرہ ——— گوجرانوالہ

شب وصال ہے گل کر دو ان چراغوں کو
خوشی کی بزم میں کیا کام جلنے والوں کا

عاصمہ ندیم ——— کراچی

تمام عمر کی بے تابیوں کا حاصل تھی
وہ ایک شب جو آغوشِ یار میں گزری

شہلا خان ——— پشاور

تمام شب جہاں جلتا ہے اک اُداس دیا
ہوا کی راہ میں اک ایسا گھر بھی آتا ہے
وہ مجھ کو توڑ کر جا ہے گا چھوڑ جائے گا
مجھے خبر تھی اسے یہ ہنر بھی آتا ہے

اقصیٰ ناصر ——— کراچی

اس شہرِ بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
آاے شبِ فراق تجھے گھر ہی لے چلیں

عذرا ناصر ——— کراچی

آج آنسو بہانے سے نہیں روکیے
آج بارش تھمے ہم نہیں چاہتے
اس قدر پیار سے تو پکارا نہ کر
آگ دل میں لگے ہم نہیں چاہتے

عائشہ، تحریم ——— گوجرہ

عمر جلووں میں بسر ہو یہ ضروری تو نہیں
ہر شب غم کی سحر ہو یہ ضروری تو نہیں
نیند تو درد کے بستر پہ بھی آ سکتی ہے
ان کی آغوش میں سر ہو یہ ضروری تو نہیں

بینش شفیق ——— دبئی

پاؤں پھیلائے تو پھر دیکھی نہیں چادر ہم نے
تجھ کو چاہا تو پھر اوقات سے بڑھ کر چاہا
زیست آسان بھی ہو سکتی تھی لیکن ہم نے
تیری چاہت کو ہر اک بات سے بڑھ کر چاہا

سائرہ کرن صدیقی ——— کوٹ چھٹہ

میری نفرت کی حد تھی یہ کہ میں خاموش اُٹھ آیا
وگرنہ تھا کہاں بس میں، کسی کی بات کو سہنا
مقدر سعد کیا شے ہے، کوئی بھی تو نہیں سمجھا
کسی کی ہتھکڑی ہے یہ، کسی کے ہاتھ کا گہنا

سندس نذیاب ——— پنڈی گھیب

گیا تو شہرِ خواب کو غارت بھی کر گیا
پھر مسکرا کر تازہ شرارت بھی کر گیا
دل جس کے نام سے دھڑکتا تھا ہر پل
آج اُس کو بھولنے کی جسارت بھی کر گیا

سوریٹھ ساند ——— آردائی گاؤں

یوں بھی نہیں اُس شہر کو ویران چھوڑ آئے
لوگوں میں اُس کے عشق کے امکان چھوڑ آئے
لہجے کے بعد وہ اب بدلتا نگاہ بھی
لیکن راستہ بدل کر ہم اُسے حیران چھوڑ آئے

راشدہ مریم ——— جلال پور، ملتان

تھی اس قدر عجیب مسافت کہ کچھ نہ پوچھو
آنکھیں ابھی سفر میں تھیں اور خواب تھک گئے

حسن و صحت

ادارہ

پیروں کی حفاظت

باہر کی سیر و تفریح، کام کاج اور دھوپ اور آپ ایسے میں چاہتی ہیں کہ فل میک اپ کے ساتھ آپ گرم گرم ہوا میں باہر نکلیں اور اپنے سارے کام انجام دیں اور یہ بھی چاہتی ہیں کہ آپ اچھی بھی نظر آئیں۔ جلد کی حفاظت سے لے کر پروڈکٹس تک کے لیے ذیل کی گائیڈ لائن آپ کے لیے بہترین ہے اور موسم گرما میں آپ کی رہنمائی کرتی رہے گی۔

کچھ کار آمد باتیں

گرمیوں میں معاملات ہاتھوں سے نکلنے لگتے ہیں اور جیسے جیسے موسم گرم ہوتا جاتا ہے آپ کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ایسے جوتوں اور چپل سے دور ہو جائیں جو آپ کے پاؤں کے لیے نقصان دہ ہوتے ہیں۔ سردیوں کے بعد آپ خود بخود اپنے پیروں کے حوالے سے حساس ہو جاتی ہیں اور سینڈل کو زیادہ ترجیح دینے لگتی ہیں۔

ڈیڈ اسکن اور سردیوں کی سخت کھال

خلیے یعنی سیل ایک تسلسل کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور پرانے خلیوں کی جگہ نئے **خلیے** لیتے رہتے ہیں۔ یہ نئے **خلیے** آپ کی جلد کی گہرائی میں بنتے ہیں۔ نئے **خلیے** پرانی جلد کو اوپر کی طرف پش کرتے ہیں اور تب ان کو چھلکے کی طرح اتارنا یعنی ایکس فولیٹ کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ سردیوں میں ہمارے پاؤں خشک ہو کر سخت ہو جاتے ہیں اور ان کی پرانی کھال اس تیزی سے نہیں اترتی ۔ جس تیزی سے اترنی چاہیے۔ سالٹ اسکرب اور جھانواں اس معاملے میں جادو گر ثابت ہو سکتے ہیں اور ان کے کرنے کی بہترین جگہ شاور ہے یعنی باتھ روم۔۔۔!

پاؤں کے ناخن

سردیوں میں پاؤں کو ٹھنڈ سے بچانے کے لیے ہم گرم موزوں میں لپیٹ کر رکھتے ہیں۔ اس دوران ناخنوں میں میل بھر جاتا ہے اور اگر بروقت صفائی نہ کی جائے تو انفیکشن بھی ہو سکتا ہے۔ مجموعی صحت کو درست رکھنے کے لیے ناخنوں کی صفائی بھی ضروری ہے۔ ناخنوں کے نیچے کی صفائی کی جائے۔ میل موجود ہو تو صاف کیا جائے۔ اس کے لیے نوک دار کیوٹیکل اسٹک استعمال کی جائے۔ ہولے ہولے میل نکالیں، اس کے بعد نیل برش سے ناخنوں کی چاروں طرف سے صفائی کریں۔ ناخنوں پر موجود گوشت کو کیوٹیکل اسٹک کی نوک پر کپڑا لپیٹ کر اوپر کی طرف پش کریں۔

فنگل انفیکشن

اسے اردو میں اسفنجی ابھار کہا جاتا ہے کیونکہ جلد پر اسفنج کی طرح پھیلتا ہے۔ اس کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ ان کے گروپ کو ظاہر کرنے کے لیے "ڈرماٹو فائٹس" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ **اتھلیٹ** کے پاؤں میں یہ عموماً" ہو جاتا ہے اور جلد کو تکلیف دینے لگتا ہے۔ جس کا مطلب ہے آگے چل کر تکلیف میں مزید اضافہ ہوگا۔ ناخنوں میں ہو جائے تو ناخن کے رنگ تبدیل ہو جاتے ہیں اور یہ ٹیڑھے میڑھے نکلنے لگتے ہیں۔ کچھ معاملات میں یہ سخت بھی ہو جاتے ہیں

اور ناخن کی جڑوں کو کمزور کردیتے ہیں۔
ایسے لوگوں کو کیمی سل کریم استعمال کرنا چاہیے اور پورے ایک ماہ تک اور پول' لاکرز اور جم میں حفاظتی شوز پہننے چاہئیں۔ غسل کے بعد پاؤں کو خوب اچھی طرح صاف کرنا چاہیے اور اینٹی فنگل اسپرے باقاعدگی کے ساتھ جوتوں میں چپل وغیرہ پر کرنا چاہیے۔
نیل کا فنگس اور بھی مشکل ہوتا ہے اور اس سے نجات بڑی مشکل سے ملتی ہے۔ اس کا بہترین علاج اینٹی فنگل لوشن یا کریم ہے۔ ڈاکٹر سے مشورہ کرنے کے بعد یہ استعمال کیے جاسکتے ہیں۔

موئسچرائزر کا استعمال

سردیوں میں آپ کے پیروں کی نمی کم یا ختم ہوسکتی ہے اور ایسا محض موسم کی وجہ سے ہی نہیں ہوتا ہے۔ سردیوں میں ہم سب گرم پانی میں دیر تک غسل کرتے ہیں اور ہاٹ شاور کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ ایسا کرنے سے بھی جلد سے قدرتی نمی ختم ہوجاتی ہے۔ ہاٹ شاور میں زیادہ دیر نہیں رہنا چاہیے۔ اس طرح آپ جلد کی نمی کی حفاظت کرسکتی ہیں۔ پاؤں کو اچھی طرح دھونے اور خشک کرنے کے بعد کوئی بہت اچھی قسم کی موئسچرائزر لگائیں' تاکہ نمی کی کمی کو پورا کیا جاسکے اور پاؤں کی جلد نرم اور شگفتہ رہے۔

پیڈی کیور

آپ اپنے پیروں کو ظاہر ہے کہ ہر موسم میں خوب صورت دیکھنا چاہتی ہیں اور ساتھ ہی اپنے ناخنوں کو بھی.... آپ باقاعدگی سے پیڈی کیور بھی کرواتی ہیں' مگر آپ کو غیر محفوظ آلات سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اگر پیڈی کیور میں استعمال ہونے والے آلات حفظان صحت کے اصولوں کے مطابق صاف نہیں ہوں گے تو بکٹیریا اپنی جگہ بنا سکتے ہیں اور فنگل انفیکشن بھی ہوسکتا ہے اور صورت حال اور زیادہ خراب ہوجائے تو جلد کی کوئی بیماری بھی ہوسکتی ہے۔ ان سے بچنے کے لیے ذیل کی ہدایات پر عمل کریں۔

☆ ایسے سیلون سے دور رہیں جہاں آلات کو صاف کرنے کے لیے بڑے سائز کے ٹب استعمال کیے جاتے ہیں۔ ٹب میں آسانی سے بیکٹیریا گھر بنا لیتے ہیں اور انہیں مکمل طور پر ختم کرنا ممکن نہیں ہوتا ہے۔ ایسے سیلون میں جائیں جہاں اوزار آلات کی صفائی واش بیسن میں کی جاتی ہے۔ یہ زیادہ محفوظ ہوتے ہیں اور واش بیسن میں بیکٹیریا کا خاتمہ آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔

☆ اس بات کا یقین کرلیں کہ انسٹرومنٹس جو استعمال ہونے والے ہیں' انہیں اچھی طرح اسٹرلائز کرلیا گیا ہو۔

☆ اگر کسی طرح کا شبہ ہو تو آپ اس کا برملا اظہار کریں۔

بو اور نمی

گرمیوں میں پاؤں سے پسینہ زیادہ نکلتا ہے۔ جس سے پاؤں اور جوتے اور سینڈل میں بھی بو آجاتی ہے.... ان سے بچنے کے لیے مارکیٹ میں فریگرنٹ فوٹنگ ز دستیاب ہیں جنہیں جوتے اور سینڈل میں استعمال کرنے سے بو دور ہوجاتی ہے۔ یہ آسانی سے ہر طرح کے جوتے میں اسٹیکر کی طرح چپک جاتے ہیں۔ ان میں کئی طرح کے فلیور ہوتے ہیں۔ مثلاً "منٹ' یاسمین اور لیمن فلیور۔
آپ کے پاؤں کو خوشبو کے ساتھ ساتھ تازگی بھی ملتی ہے۔

☆

کرن کا دستر خوان

خالدہ جیلانی

بھنڈیاں بادام

اشیا :

بھنڈیاں	آدھا کلو
لہسن (کترا ہوا)	چار جوئے
ادرک (کترا ہوا)	ایک ٹکڑا چھوٹا
ثابت دھنیا (کوٹا ہوا)	ایک چائے کا چمچہ
لال مرچ کٹی ہوئی	حسب پسند
نمک	حسب ذائقہ
بادام (کوٹے ہوئے)	بیس عدد
سفید زیرہ (کوٹا ہوا)	ایک چائے کا چمچہ
کالی مرچ پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

ایک فرائی پین میں مکھن گرم کریں اور بادام تل لیں اور نکال کر جاذب کاغذ پر رکھ دیں۔ دوسرے فرائی پین میں تیل گرم کریں۔ اس میں بھنڈیاں ڈال کر گولڈن براؤن ہونے تک تل لیں۔ اس کے بعد اس میں لہسن، ادرک، ثابت دھنیا، سفید زیرہ، لال مرچ، کالی مرچ اور نمک ڈال کر اچھی طرح بھون لیں۔ آخر میں تلے ہوئے بادام ڈال کر پانچ منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔ بادامی بھنڈیاں تیار ہیں۔ چپاتیوں کے ساتھ سرو کریں۔

ویجی ٹیبل سینڈوچ

اشیا :

بند گوبھی	ایک عدد
شملہ مرچ	دو عدد
ٹماٹر	دو عدد
ہری مرچ	تین عدد
چکن	آدھا کلو
پیاز	آدھا کلو
نمک	حسب ذائقہ
لال مرچ پاؤڈر	حسب پسند
کالی مرچ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
تیل	دو کھانے کے چمچے
چاٹ مسالا	آدھا چائے کا چمچہ
ڈبل روٹی	ایک پیکٹ

ترکیب :

چکن ابال کر اس کے باریک ریشے کرلیں۔ اس کے بعد بند گوبھی، شملہ مرچ، پیاز، ٹماٹر، ہری مرچیں باریک باریک ٹکڑوں میں کاٹ لیں۔ فرائی پین میں تیل گرم کرکے اس میں یہ تمام سبزیاں اور چکن ڈال کر فرائی کرلیں۔ فرائی کرنے کے بعد اس کو ٹھنڈا ہونے دیں۔ جب سبزیاں ٹھنڈی ہوجائیں تو اس کو تھوڑا تھوڑا کرکے ڈبل روٹی کے سلائس پر رکھ دیں اور دوسرا سلائس اس کے اوپر رکھ دیں۔ اس کو سینڈوچ میکر میں رکھیں اور جب وہ تیار ہوجائے تو نکال لیں۔ مزے دار ویجی ٹیبل سینڈوچ تیار ہیں۔

پوٹیٹو چکن ٹوسٹ

اشیا :

ڈبل روٹی	بارہ عدد
ابلے آلو	چار عدد
مکھن	ایک چائے کا چمچہ
روسٹ چکن	ایک کپ

سبز مرچ	تین عدد کٹی ہوئی
سیاہ مرچ پاؤڈر	1/4 چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	تلنے کے لیے

پنیر کا کور:

کارن فلور	چار کھانے کے چمچے
پنیر	دو کھانے کے چمچے
بیکنگ پاؤڈر	دو چٹکی
دودھ	نصف کپ
مسٹرڈ پاؤڈر	ایک چائے کا چمچہ
سیاہ مرچ پاؤڈر	1/4 چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ

ابلے آلو مسل لیں، اب ان میں مکھن، دودھ، چکن، سبز مرچیں، نمک اور سیاہ مرچ پاؤڈر ملا لیں۔ پنیر کے کور والی اشیا ملا لیں۔ ڈبل روٹی کے سلائس پر کٹر یا گلاس رکھ کر گول شیپ میں کاٹ لیں۔ اب ہر توس پر پہلے چکن والا مرکب لگا دیں۔ درمیان میں چھوٹا سا سوراخ کر دیں۔ اب پنیر والی کورنگ کو ہر توس پر چکن والے مرکب پر پلیٹ دیں۔ تیل گرم کر کے تل لیں۔ ٹماٹو کیچپ کے ساتھ پیش کریں۔

برمیز چکن

اشیا:

چکن	ایک عدد
گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
ٹماٹر پیسٹ	ایک کپ
ادرک لہسن	دو کھانے کے چمچے
دہی	ایک کپ
سیاہ مرچ	چھ، سات عدد
چنے اور خشخاش (پسے ہوئے)	دو کھانے کے چمچے
پیاز	دو عدد
گھی یا تیل	تین کھانے کے چمچے

ترکیب:

ایک پتیلی میں تیل گرم کر لیں۔ اب اس میں کٹی ہوئی پیاز ڈال کر براؤن کریں۔ ساتھ ہی ثابت مرچیں بھی ڈال دیں۔ پیاز براؤن ہونے پر دونوں چیزوں کو باہر نکال کر ہاتھ سے کچل لیں، پھر اسی بچے ہوئے گھی میں چکن ڈال کر اچھی طرح فرائی کریں۔ پھر اس میں ادرک، لہسن بھی ڈال دیں، ساتھ ہی ٹماٹر پیسٹ، دہی، نمک، سیاہ مرچ ڈال کر بھون لیں۔ آخر میں گرم مسالا، پسے ہوئے چنے، خشخاش، براؤن کی ہوئی پیاز اور مرچ ڈال کر دم پر لگا دیں۔

نوٹ: اس میں پانی بالکل نہیں ڈالیں۔ چکن ہلکی آنچ پر دہی اور ٹماٹر پیسٹ میں گل جائے گی۔

پوٹیٹو ساسیجز

ابلے ہوئے مسلے آلو	دو کپ
ابلے مٹر	ایک کپ
باریک کٹا پیاز	ایک عدد
کارن فلاور	ایک کپ
ڈبل روٹی	چار سلائس
نمک اور سیاہ مرچ	حسب ذائقہ
تیل	تلنے کے لیے

آلوؤں میں مٹر اور پیاز ملا لیں۔ پانی میں سلائس بھگو لیں۔ ہتھیلیوں میں دبا دبا کر توس باہر نکال لیں۔ اچھی طرح پانی نکل جانا چاہیے۔ اچھی طرح ہاتھ سے چورا کر کے سلائس، آلو میں ملا لیں۔ نصف کپ کارن فلاور بھی ملا لیں اور نمک، مرچ بھی اس مرکب میں گوندھ لیں۔ اب مرکب میں بقیہ کارن فلاور بھی شامل کر دیں۔ چھوٹے چھوٹے پیڑے توڑ کر لمبے کباب بنا لیں جن کی شکل ساسیج جیسی ہو۔ گرم تیل میں سنہرے کر لیں۔ نکال کر ٹماٹو ساس کے ساتھ پیش کریں۔

اسٹرابری ٹاٹ

اشیا:

اسٹرابری	آدھا کلو
آئسنگ شوگر	150 گرام
میدہ	150 گرام

انڈے	دو عدد
مکھن	آدھا کلو
جیلاٹن	تھوڑا سا
کسٹرڈ	حسب ضرورت

ترکیب :

مکھن اور شکر کو اچھی طرح یکجان کرلیں' جب شکر کا دانہ باقی نہ رہے تو اس میں انڈے ڈالیں اور تھوڑی دیر تک پھینٹی رہیں۔ اس کے بعد اس میں میدہ ملا دیں۔ میدے کو اچھی طرح مکس کرلیں۔ اس کے بعد کسی چھوٹے سانچوں میں اس آمیزے کو ڈال کر پندرہ' بیس منٹ کے لیے اوون میں رکھ دیں۔ اس کے بعد اس کو نکال کر ٹھنڈا کرلیں۔ پھر اس پر کسٹرڈ ڈال دیں۔ اسٹرابری میں سے آدھی مقدار لے کر پیس لیں اور اس کو سانچے سے جو شاٹ پیس نکالا تھا' اس پر ڈال لیں' ساتھ ہی اس آمیزے پر ہلکا سا جیلاٹن لگا دیں' آخر میں ثابت اسٹرابری سے سجاوٹ کردیں۔

اروی کے کباب

اشیا :

اروی	ایک کلو
(بڑے سائز کی دھو کر چھلکے سمیت ابال لیں)	
اجوائن	چائے کا چوتھائی چمچہ
پسی ہوئی کھٹائی	دو کھانے کے چمچے
(یا ایک چائے کا چمچہ املی لے کر آدھی پیالی پانی میں بھگو دیں)	
لال مرچ پسی ہوئی	ایک چائے کا چمچہ
سفید زیرہ پسا ہوا	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
بیسن	ایک پیالی
پودینہ	ایک گڈی پتے الگ کرلیں
ہری مرچ	تین عدد باریک کٹی ہوئی
انڈا	ایک عدد
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

سب سے پہلے اروی کو دھو کر دیگچی میں ابالنے رکھ دیں' ڈھکن ڈھانپ دیں۔ جب اچھی طرح گل جائے تو نکال کر چھلکا اتار لیں' پھر ایک ایک اروی کو دونوں ہاتھوں کے درمیان رکھ کر کباب کی شکل بنالیں اور ایک برتن میں پھیلا کر رکھتی جائیں۔ اب ایک گہرے پیالے میں بیسن گھولیں۔ اس میں سارا مسالا ملا دیں۔ ایک ایک اروی کو بیسن میں ڈبو کر ہلکی آنچ میں ڈیپ فرائی کرلیں۔ جب گولڈن براؤن ہو جائیں تو نکال کر اخبار پر رکھ لیں' تاکہ چکنائی جذب ہو جائے۔ املی کی چٹنی اور گرم گرم نان یا چپاتی کے ساتھ سرو کریں۔

مچھلی کے کباب

اشیا :

مچھلی	آدھا کلو
انڈے	تین عدد
مکھن	چھ اونس
ہرا دھنیا	آدھی گڈی
پودینہ	آدھی گڈی
سبز مرچ	چار' پانچ عدد
سرخ مرچ	حسب ذائقہ
نمک	حسب ذائقہ
کالی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
لیموں	ایک عدد
ڈبل روٹی کا چورا	حسب ضرورت

ترکیب :

مچھلی کو ابلتے ہوئے پانی میں ڈال کر ابال لیں۔ کھال اور کانٹے علیحدہ کرکے ہاتھوں سے مسل لیں۔ اب اس میں تمام مسالے' ہرا مسالا' لیموں کا رس چھٹانک بھر مکھن ملا دیں۔ انڈوں کی زردی بھی ڈال کر اچھی طرح مکس کرکے کباب بنالیں۔ فرائی پین میں بقایا مکھن ڈالیں اور کبابوں کو انڈوں کی سفیدی لگانے کے بعد ڈبل روٹی کا چورا لگائیں اور تل لیں۔

محمود بابر فیصل نے یہ شگفتہ سلسلہ 1978ء میں شروع کیا تھا۔ ان کی یاد میں یہ سوال و جواب شائع کیے جا رہے ہیں۔



شیریں نذیر۔۔۔ راولپنڈی

س۔ بھیا! انگلی پکڑ کر ذرا راستہ بتا دو۔ میں انجان ہوں؟

ج۔ آنکھیں تو ہیں انگلی پکڑ کر راستہ بتانے کی کیا ضرورت۔

س۔ نین بھیا! یہ مرد حضرات شکی کیوں ہوتے ہیں۔ ذرا تصدیق تو کردیں؟

ج۔ عورتوں سے کم۔

ثروت ناصر۔۔۔ کراچی

س۔ ذوقی! بال سفید ہو جائیں تو خضاب لگایا جاتا ہے۔ اگر خون سفید ہو جائے تو کیا کیا جائے؟

ج۔ خون سفید ہی اچھا لگتا ہے۔ کم از کم زخم لگنے پر احساس تو نہ ہو گا کہ خون بہہ رہا ہے۔

خورشید جمال۔۔۔ کراچی

س۔ نادان مال کو، عقلمند کمال کو ڈھونڈتا ہے تو عام آدمی کیا ڈھونڈے گا؟

ج۔ ان دونوں کو۔

زبیدہ رانی۔۔۔ نامعلوم

س۔ ماں کے پیروں کے نیچے تو جنت ہوتی ہے ساس کے قدموں کے نیچے کیا ہوتا ہے؟

ج۔ وہاں مجازی خدا کی جنت۔

عارفہ ادریس۔۔۔ لاہور

س۔ نینو صاحب! پلیز مجھے بتایئے تو سہی! نکاح پر چھوہاروں کے بجائے بادام کیوں نہیں بانٹے جاتے؟

ج۔ کان قریب لاؤ۔ ہاں بھئی بڑی نادان ہو۔ بادام مہنگے جو ہوتے ہیں۔

شکیلہ جاوید۔۔۔ بہاول پور

ذوالقرنین



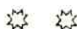
س۔ ہری اپ۔ اگر کسی امیر کو دولت مل جائے تو وہ اندھا ہو جاتا ہے۔ اگر کسی اندھے کو دولت مل جائے تو کیا ہو گا؟

ج۔ بھئی وہ تو پہلے سے ہی اندھا ہو گا۔

حسینہ نقوی۔۔۔ فیصل آباد

س۔ نین جی! شیطان اور انسان میں کیا فرق ہے؟

ج۔ جو مجھ میں اور شیطان میں۔



ریحانہ امجد بخاری



عزت کے ساتھ

ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا۔ "یار! وہ اپنا کلاس فیلو کبیر ہے نا... اس کے والد صاحب مشہور سوشل ورکر اور بے حد شریف آدمی تھے۔ ساری زندگی عزت کے ساتھ گزاری۔ عزت کے ساتھ کھایا۔ عزت کے ساتھ پیا۔ کہیں گئے تو عزت کے ساتھ اور آئے بھی تو عزت کے ساتھ، مگر اللہ انہیں بخشے، عزت کے ساتھ مر نہ سکے۔"

دوست نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اچھا... آخر کیا ہوا؟"

"کیونکہ کبیر کی امی ابھی زندہ ہیں اور ان کا نام عزت بیگم ہے۔" اس شخص نے جواب دیا۔

ثوبیہ اقبال... پسرور

چوکے پہ چھکا

رات کے تین بجے تھے، جب فراز صاحب کے ہاں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور بجتی ہی چلی گئی۔ آخر کار انہیں ریسیور اٹھانا پڑا۔ دوسری طرف سے ایک غصیلی آواز سنائی دی۔ "میں آپ کا پڑوسی ریاض بول رہا ہوں۔ آپ کا کتا کئی گھنٹوں سے بھونکے جا رہا ہے۔ اسی منحوس کی وجہ سے میں اب تک ایک لمحے کے لیے نہیں سو سکا۔ اگر آپ نے اسے چپ نہ کرایا تو میں آکر اسے گولی مار دوں گا۔"

دوسری رات عین اسی وقت ریاض صاحب کے گھر میں فون کی گھنٹی بجی اور بجتی ہی چلی گئی۔ وہ بہت گہری نیند سو رہے تھے لیکن مجبوراً انہیں ریسیور اٹھانا پڑا۔ دوسری طرف سے فراز صاحب خوشگوار لہجے میں بولے۔ "میں نے یہ بتانے کے لیے آپ کو فون کیا ہے کہ میرے ہاں کوئی کتا نہیں ہے۔"

شازیہ علیشہ خان... کراچی

جنرل نالج

محفل میں ایک صاحب نے حاضرین سے پوچھا۔ "آپ کسی ایسے جانور کا نام بتا سکتے ہیں، جس کی آنکھیں ہیں مگر وہ دیکھ نہیں سکتا... جس کی ٹانگیں ہیں مگر وہ چل نہیں سکتا... البتہ ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ جتنی اونچی چھلانگ لگا سکتا ہے؟"

سب نے بہت دماغ کھپایا مگر کوئی بھی صحیح جواب نہ دے سکا۔ آخر ان صاحب نے خود ہی بتایا۔ "وہ جانور لکڑی کا گھوڑا ہے... جس کی آنکھیں ہوتی ہیں مگر وہ دیکھ نہیں سکتا، جس کی ٹانگیں ہوتی ہیں مگر وہ دوڑ نہیں سکتا۔"

"لیکن وہ ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ جتنی اونچی چھلانگ کیسے لگا سکتا ہے؟" ایک صاحب نے اعتراض اٹھایا۔

"تو آپ سے کس نے کہا کہ ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ چھلانگ لگاتی ہے؟" پہلے صاحب نے معصومیت سے جواب دیا۔

نسرین خان... رحیم یار خان

بے چارگی

ماہر نفسیات کے کلینک کے باہر بڑا رش تھا۔ باہر نکلتے ہوئے ایک مریض کی اپنے واقف کار سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے پوچھا۔ "آپ آرہے ہیں یا جا رہے ہیں؟"

موصوف نے جواب دیا۔ "اگر مجھے یہ معلوم ہوتا ۔۔۔ تو میں یہاں کیا کرنے آتا؟"

صبا عفان۔۔۔ کراچی

ہونہار بروا۔۔۔۔

ایک صاحب بستر پر لیٹے لیٹے کسی کام سے بچوں کو آوازیں دے رہے تھے، مگر کوئی بچہ ان کی بات نہیں سن رہا تھا۔ بیگم بھی وہیں موجود تھیں۔ وہ بھی لاپروائی سے ایک طرف بیٹھی رہیں۔ شوہر کی برداشت سے باہر ہوا تو طنزیہ کہنے لگے۔

"بیگم! مجھے لگتا ہے کہ ہمارے بچے کسی ہوٹل کے بیرے بنیں گے۔ جب بھی انہیں بلاتا ہوں، حاضر ہی نہیں ہوتے۔"

"زبان سنبھال کر بات کرو۔" بیگم غضبناک ہو کر بولیں۔ "یہ دو ٹکے کی نوکریاں تم خود کرنا، میرے بچے سرکاری افسر بنیں گے۔ وہ کسی کی نہیں سنیں گے، خواہ ان کا باپ ہی کیوں نہ ہو۔"

سیما کنول۔۔۔ کمالیہ سٹی

سیمینار

ایک شخص نے دوسرے سے پوچھا۔ "یہ کیسا شور شرابہ ہے؟"

"میرے بھائی! سیمینار ہو رہا ہے۔" دوسرے شخص نے جواب دیا۔

"وہ کیا ہوتا ہے؟"

"جہاں سیانے اکٹھے ہوتے ہیں۔"

"اکٹھے ہو کر وہ کیا کرتے ہیں؟"

"باتیں کرتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں۔"

"پھر۔۔۔؟"

"پھر باتیں کرتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں۔ پھر باتیں کرتے ہیں۔۔۔ پھر کھاتے پیتے ہیں۔۔۔ حتیٰ کہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔"

عذرا ایمان۔۔۔ لاہور

تعمیل ارشاد

اخبار کے ایڈیٹر نے ایک بار فون پر ایک قصبے کے نامہ نگار کو جھاڑ پلائی۔ "بھئی آپ جو بھی رپورٹ بھیجتے ہیں، ان میں اکثر نام اور مقامات گول کر جاتے ہیں۔ اپنی ہر رپورٹ میں نام و مقامات ضرور لکھا کریں۔"

"جی بہت بہتر، آئندہ ایسا ہی ہو گا۔" نامہ نگار نے سعادت مندی سے کہا۔

نامہ نگار کی طرف سے آئندہ موصول ہونے والی رپورٹ کچھ یوں تھی۔ "گزشتہ رات آسمانی بجلی گرنے سے مقامی زمیندار فضل دین کا ڈیرہ جل کر تباہ ہو گیا۔ تین بھینسیں جل کر مر گئیں۔ جن کے نام بھوری، کالی اور گندمی تھے۔ ایک کتا بھی ہلاک ہوا، جسے ٹمی کہا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک گدھا اور پندرہ مرغیاں بھی ہلاک ہو گئیں، جن کے نام ابھی تک معلوم نہیں ہو سکے۔"

صنوبر رضوان۔۔۔ سرگودھا

افتاد

تعلیم بالغان کے ایک طالب علم کو اسکول کی انتظامیہ کی طرف سے نوٹس موصول ہوا، جس میں لکھا تھا۔ "تم گزشتہ تین راتوں سے اسکول نہیں آ رہے ہو، اپنی غیر حاضری کی وجہ پرنسپل کے سامنے بیان کرو۔"

طالب علم گھبرایا ہوا اسکول پہنچا اور اس نے کہا۔ "جناب والا! میری حاضری اچھی طرح چیک کی جائے۔ میں ایک رات بھی غیر حاضر نہیں رہا، پھر یہ تین راتوں کی غیر حاضری کا نوٹس میرے نام کیوں جاری کیا گیا ہے؟"

ریکارڈ کی جانچ پڑتال سے طالب علم کی حاضری ثابت ہو گئی۔ استاد نے کہا۔ "جناب! مجھے افسوس ہے کہ غلطی سے دوسرے طالب علم کو دیا جانے والا نوٹس آپ کے نام جاری ہو گیا۔ میں اس سلسلے میں پرنسپل صاحب سے بات کر کے اس غلطی کو دور کروا دوں گا۔"

طالب علم نے پریشان ہو کر کہا۔ "جناب مجھے پرنسپل صاحب کی کوئی فکر نہیں ہے لیکن ذرا یہ تو بتائیے کہ اب میری بیوی کو کون سمجھائے گا؟"

نمرہ ارشد۔۔۔ راجن پور

سبقت

ساجد صاحب اپنے برابر کے فلیٹ میں رہنے والی بیوہ رشیدہ سے شادی کی غرض سے تعلقات بڑھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایک دن تنہائی میں کچھ دیر گفتگو کا موقع ملا تو انہوں نے جرات کر کے رسمی باتوں سے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"میں جب صبح بیدار ہوتا ہوں تو میرے ذہن میں سب سے پہلا خیال آپ کا آتا ہے۔"

"یہ تو کوئی خاص بات نہیں ہے۔" رشیدہ ادائے بے نیازی سے بولیں۔ "اوپر کے فلیٹ میں رہنے والے افراز صاحب بھی یہی کہتے ہیں۔"

"لیکن آپ یہ بھی تو دیکھیں کہ میں فراز صاحب سے بہت پہلے بیدار ہوتا ہوں۔" ساجد صاحب نے متانت سے یاد دلایا۔

یاسمین ملک۔۔۔ کراچی

ڈاکٹر کا حکم

ایک خاتون ایک فقیر کو روزانہ کھانا کھلاتے تنگ آ گئیں تو ایک روز چڑ کر بولیں۔ "آخر تم کھانا کھانے میرے گھر ہی کیوں آجاتے ہو؟ اس گلی میں اور بھی تو اتنے گھر ہیں مگر میں نے تمہیں کسی دوسرے دروازے پر کھانا مانگتے نہیں دیکھا۔"

"میں ڈاکٹر کے حکم کی وجہ سے مجبور ہوں بیگم صاحبہ۔" فقیر نے سر جھکا کر کہا۔

"کیا تمہیں ڈاکٹر نے روزانہ میرے گھر سے کھانا کھانے کا حکم دیا ہے؟" خاتون نے حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب نے یہ بات اس طرح تو نہیں کہی تھی۔۔۔ لیکن ان کا مطلب یہی تھا بیگم صاحبہ!" فقیر نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "انہوں نے کہا تھا کہ جو خوراک تمہارے معدے کو موافق آجائے، زندگی بھر وہی کھاتے رہنا۔"

فرح بشیر۔۔۔ بھائی پھیرو

منفرد علاج

نازیہ ایک روز دفتر سے گھر پہنچی تو ایک کارٹن اٹھائے ہوئے تھی، جس میں گول گول سوراخ تھے۔ اس کی بہن نے پوچھا۔ "آج یہ کیا اٹھا لائی ہو؟"

نازیہ نے بتایا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ مجھے خواب میں چوہے نظر آتے ہیں، میں انہیں مارنے کے لیے بلی لائی ہوں۔"

بہن نے حیرت سے کہا۔ "لیکن خواب میں نظر آنے والے چوہے تو خیالی ہوتے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔۔۔ بلی بھی خیالی ہے۔" نازیہ نے اطمینان سے جواب دیا۔

عائشہ بشیر۔۔۔ پھول نگر

سہارا

شادی کو کافی عرصہ گزر گیا تھا مگر شوہر موصوف ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔ جب ان کے کسی طرح بھی کچھ کما کر لانے کے آثار دکھائی نہ دیے تو بیوی نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

"دیکھیے۔۔۔! صرف محبت کے سہارے تو زندگی نہیں گزر سکتی نا۔۔۔!"

"کون کہتا ہے کہ نہیں گزر سکتی۔۔۔؟" شوہر نے انگڑائی لے کر جواب دیا۔ "تمہارے ڈیڈی کافی دولت مند ہیں۔۔۔ اور انہیں تم سے بہت محبت بھی ہے۔"

ناہید روف۔۔۔ سرگودھا

دھوکا

اقبال صاحب نے ایک کتا پال رکھا تھا، جس کی سمجھ داری کے قصے دور دور تک مشہور تھے، اس کو جو

بھی کام کہا جاتا' وہ نہایت سعادت مندی سے انجام دیتا تھا۔ اقبال صاحب اسے پیار سے ٹونی کہتے تھے۔ ایک دن وہ اپنی بیوی کے ساتھ پارک میں بیٹھے تھے کہ ان کے سگریٹ ختم ہو گئے۔ انہوں نے سو کا نوٹ ٹونی کو دیتے ہوئے کہا۔ "جاؤ ایک پیکٹ سگریٹ لے آؤ اور ہاں..... باقی پیسے بھی واپس لے آنا۔"

ٹونی سو کا نوٹ لے گیا اور ایک گھنٹے تک واپس نہیں آیا تو اقبال صاحب اس کی تلاش میں نکلے۔ کافی دیر ادھر ادھر پھرنے کے بعد انہوں نے دیکھا کہ ٹونی ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھا چکن تکہ اور کولڈ ڈرنک کے مزے لے رہا ہے۔ اقبال صاحب نے غم زدہ لہجے میں اس سے کہا۔ "اس سے پہلے تو تم نے مجھے دھوکا نہیں دیا' میں نے جو کام بھی کہا' وہ تم نے نہایت ذمہ داری سے کیا' پھر یہ آج تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

ٹونی نے اطمینان سے کہا۔ "اس سے پہلے کبھی آپ نے پیسے میرے ہاتھ میں نہیں دیے تھے۔"

ہمایوں کس..... کراچی

گھر کا بھیدی

ایک بڑی فرم کے منیجر ایک دن بہت خوش خوش اپنے مکان میں داخل ہوئے اور انہوں نے اپنی بیگم سے کہا۔ "ڈیئر! جانتی ہو آج مجھے ایک بات سوجھی ہے' جس سے فرم کو ہر ماہ ڈھائی' تین لاکھ روپے کی بچت ہو گی۔"

"اجی رہنے بھی دو' میں سمجھ گئی....." بیگم نے بے نیازی سے کہا۔

"کیا سمجھ گئیں....؟" منیجر نے حیرت سے پوچھا۔

"یہی کہ تم استعفیٰ دینے والے ہو۔" بیگم نے اطمینان سے جواب دیا۔

افشاں شیخ..... گڈانی

تفریح

ایک سفری سیلزمین کاروباری دورے پر تھا۔ راستے میں اسے ایک گاؤں میں رکنا پڑا۔ کام سے فارغ ہو کر شام کو اس نے سوچا کہ کچھ تفریح کی جائے۔ اس نے ایک مقامی دیہاتی سے پوچھا۔

"یہاں کوئی سینما ہے؟"

"نہیں!" دیہاتی نے جواب دیا۔

"کوئی تھیٹر ہال وغیرہ..... جہاں جا کر آدمی کوئی ڈرامہ یا شو وغیرہ دیکھ سکے۔"

"نہیں جناب!" دیہاتی نے نفی میں سر ہلایا۔

"حیرت ہے.....! پھر تم لوگ تفریح کیسے کرتے ہو؟" شہری سیلزمین نے پوچھا۔

"بس جی..... وہ بازار میں ایک چائے خانہ ہے' ہم وہاں جا کر بیٹھ جاتے ہیں' وہاں کوئی نہ کوئی شہری بابو آکر بیٹھا ہوتا ہے' ہم اسے دیکھتے ہیں..... اور اس کے بارے میں سرگوشیوں میں باتیں کرتے ہیں۔ بس یہی ہماری تفریح ہے۔"

حسینہ مبارک..... لاہور

عافیت

میرا چھوٹا بھتیجا گاؤں میں اپنی خالہ کے ہاں ایک مہینے کی چھٹیاں گزارنے گیا لیکن دو ہفتے بعد ہی واپس آ گیا۔ وجہ پوچھی تو کہنے لگا۔ "جس روز میں خالہ کے ہاں پہنچا' اسی روز ان کا ایک بیل مر گیا۔ چنانچہ وہ پورے ایک ہفتہ تک ہمیں بیل کا گوشت کھلاتی رہیں۔ دوسرا ہفتہ شروع ہوتے ہی بھیڑ مر گئی لہٰذا تین دن تک بھیڑ کا گوشت استعمال ہوا۔ بھیڑ کا گوشت ختم نہیں ہوا تھا کہ بکری مر گئی۔ چار دن تک خالہ نے ہم سب کو بکری کا گوشت کھلایا۔ تیسرا ہفتہ شروع ہوا تو خالہ کا ایک ملازم مر گیا..... پس میں اسی وقت واپس آ گیا۔"

امن عامر..... اسلام آباد



مُدیرہ کرن



بنت حوا۔۔۔ جہلم

کرن 17 تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل اچھا لگا۔ ماڈل کی دھیمی سی مسکراہٹ بہت اچھی لگی۔ سب سے پہلے حمد و نعت سے ذہن و دل کو معطر کیا۔ پھر "نامے میرے نام" میں اپنا نام دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ مگر دکھ اس وقت ہوا جب دیکھا کہ میری اہم باتوں پر قینچی لگی ہوئی ہے۔

قندیل فاطمہ اور فاخرہ گل کے ناولٹ اچھے لگے۔ طوبیٰ احسن کا افسانہ "عید کا جوڑا" کچھ خاص تاثر قائم نہ کرسکا۔ "مجھے یہ شعر پسند ہے" میں فوزیہ ثمرہ بٹ اور صائمہ جیمی کا شعر اچھا لگا۔ ایک شعر میں بھی بھیج رہی ہوں، پلیز شائع کردیجیے گا اور پلیز FM 102 کے آر جے عارف ملک کا انٹرویو بھی لیا جائے۔ کرن یوں ہی ترقی کی منازل طے کرتا رہے۔ (آمین)

فوزیہ ثمرہ بٹ۔۔۔ گجرات

اگست کا شمارہ 14 کو ملا۔ سرورق دیکھ کر جشن آزادی کا مزا اور دوبالا ہوگیا۔ ماڈل صاحبہ کا فریش سا چہرہ، ہاتھوں میں خوب صورت مہندی اچھی لگی۔

ہمیشہ کی طرح حمد و نعت سے دل و ذہن کو شاد کیا۔ انٹرویوز اس بار بے دلی سے پڑھے۔ البتہ "مقابل ہے آئینہ" عفیرہ مظفر کی سچائی اور سادگی پسند آئی۔

مکمل ناول "دل اک شہر ملال" اس بار کی قسط بہت بورنگ لگی۔ عنیقہ ملک خاص متاثر نہ کرسکیں۔ اسی لیے سلسلہ وار ناولٹ "میرے دل میرے مسافر" کو چھوڑا کہ اب ایک بار ہی اس پر کچھ کہوں گی۔

افسانے سب ہی سبق آموز تھے۔ "گڑھی شاہو کی گڑیا" میں دادی بہت اچھی لگیں۔ راشدہ رفعت "اک پل فیصلے کا" میں ایک افسانے میں انہوں نے کتنوں کے گھر بسا دیے۔ اے کاش حقیقی زندگی میں ایسا ہونے لگے۔

ناولٹ "میں گلیاں دا روڑا" اچھی تحریر تھی وطن کے حوالے سے۔ اے کاش کہ ہم یاد رکھتے کہ اس پیارے وطن کو کتنی قربانیوں سے حاصل کیا۔ تو آج وطن کا یہ حال نہ ہوتا۔ ثنا یاسمین نے ٹھیک لکھا ہے کہ اولاد، ماں، باپ کی فصل ہوتی ہے۔ والدین جو اس میں بوئیں گے وہی کاٹے گئے جو والدین ماڈلزم کے نام پہ اولاد کو مذہب سے اللہ سے دور رکھے گئے، کہیں ہماری اولاد مولوی یا دقیانوسی نہ بن جائے۔ پھر ان والدین کو مرتے وقت کلمہ کیسے پڑھا سکتی ہے۔

"تم میری ہو" قندیل فاطمہ میں بھی یہ ہی کچھ تھا صد شکر رما اور اس کے والدین کو ایک حادثے نے اللہ کے قریب تر کردیا۔ بے شک ہدایت عطا کرنے والی وہی ذات ہے، جو کسی بھی حال میں اپنے بندے کو اکیلا نہیں چھوڑتی۔

"اناہیل" مکمل ناول اچھا لگا۔ غزالہ جلیل کسی مرد کی خوب صورت آواز کا بتا رہی تھیں۔ خوب صورت مرد لوڈشیڈنگ کی طرح ہوتا ہے۔ جس کا کوئی اعتبار نہیں کب ساتھ چھوڑ دے۔ ایسے مرد کی عورت کی ساری زندگی بس داؤ پہ گزرتی ہے۔

ارے ہاں راشدہ رفعت سے شکایت ہے اک عرصہ کے بعد کرن میں تشریف لائیں، نگران کی تحریر مزاح سے مفقود تھی۔ مزا نہیں آیا انہیں پڑھ کر اور سلسلہ وار ناول میری بھی ہمت نہیں ہوئی۔ صبر کا مجھ میں فقدان ہے۔ کون اتنا انتظار کرے۔

"مستقل سلسلے" اس بار مزا نہیں آیا۔

حرا قریشی۔۔۔ ملتان

دیگر باتیں ایک طرف۔۔۔ کرن سے بات چیت ایک طرف۔۔۔ مہمان ہو۔۔۔ پکن کا کام ہو۔۔۔ کوئی بھی کام ہو۔۔۔ کچھ وقت "کرن" کو دینا بھی تو ضروری ہے نا۔

ناولٹ میں محبت حقیقی کا پرچار کرتی حب الوطنی کے جذبوں کی چاشنی میں لبریز کاسہ ایثار لیے فاخرہ گل کی تحریر "میں گلیاں دا روڑا" یہ دراصل ان لوگوں کی کہانی تھی جو پاک سرزمین 'جداگانہ ریاست کی شیرازہ بندی میں پیش پیش تھے۔ خوب صورت اور دانائی والا صبر رکھتے تھے۔ عاجزی' انکساری' عزم مصمم' جذبہ تشبیہات اور استعاروں کا استعمال قابل دید تھا۔ کتنی سطروں پر دل چونکا' ڈرا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"انا بیل" غزالہ جلیل راؤ کا مکمل ناول خوب صورت' پیرائے میں شروع کیا گیا۔ جابجا انا بیل اور شنید کی کیفیت بیان کرتی سطریں طوالت کی وجہ سے بوریت کا بھی شکار کرتی رہیں۔ کبھی کبھی ایسے مرد جو شنید علی کی طرح یک دم پینترا بدل لیتے ہیں۔ قفس میں محبوس حسن پرست قیدی لگتے ہیں۔ واپس اسی در پر دستک دینے آن موجود ہوا۔ 5 سال کے فتنہ قیامت کے بعد بھی "انا بیل" جس کی حالت شدت گرمی سے ست اور تھکے ہوئے نڈھال نیم جاں ہرن جیسی تھی' پھر سے قلانچیں بھرتی جان محبوب کے آنے کی مسرت کو قطرہ قطرہ اس دل کے پہلو میں اتارنے لگی 'جوبن اس کے فقیر ہو گیا تھا' پھر محبوب کے آتے ہی کشکول محبت کا اتنا بھر گیا کہ سیر ہو کر بھی نہ تھکا۔ شہروز اور اس کے والدین کا کردار سویٹ تھا۔ نہایت ہی بے ضرر اور پرخلوص کردار لگے۔ بہرکیف معاشرے میں پھیلے ایک اچھے موضوع پر قلم کی گرفت کو مزید پائیدار بنایا گیا۔ "گڑھی شاہو کی گڑیا" رابعہ افتخار کی امید افزا تحریر تھی۔

دیر آید درست آید "عید کا جوڑا" فائزہ کے تلاش لباس پر مختلف دکانوں پر خواری تصور کی تو ان کی ذات پر جی بھر کر ترس آیا۔ "دائرہ" لاریب مصطفیٰ کی تمن سے

بی درگت پر سلام پیش کیا۔ صد شکر رتبہ دان محبت کو پذیرائی کی سند ملی۔ حقیقت یہی ہے کہ آج کل حق ملتا نہیں، بلکہ حق وصول کرنا پڑتا ہے۔ راشدہ رفعت کی تحریر "اک پل فیصلے کا" پڑھتے یوں لگا۔ سایہ شفقت میں آگئے۔ سادہ عام فہم زبان کے زمرد اٹریکٹ دل میں۔ اس ماہ کے افسانوں میں ہم نے اسے "ٹاپ" پر رکھا۔

"تم میری ہو" بلاشبہ اسلام ایک عالمگیر گریٹ مذہب ہے۔ اس میں موجود آسانیوں کو ہم نے پیچیدگیوں کا نام دے کر ان سے کنارہ کشی شروع کردی ہے۔ جانتے بوجھتے آنے والی نسل کو جو نوخیز پتیوں کی طرح بڑھتی ہے، پھوٹتی ہے اور پھیلتی ہے، تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا ہے اور اپنے اس فعل پر شرمندہ بھی نہیں، افسوس صد افسوس۔

"میرے دل میرے مسافر" شدہ شدہ تحریر کئی حصوں میں بڑھتی ہی جارہی ہے۔ رفاقت جی اس کشتی کو کنارے پر لانے کا سدباب کیجیے نا۔ "صدائے کن فیکون" اپنے معیاری اسم خاص کی طرح معیاری تحریر تھی۔ حنا جی کے تخلیقی جوہر کھل کر سامنے آرہے ہیں۔

"مقابل ہے آئینہ" میں عفیرہ کے سوال نمبر 8 کا جواب بہت اچھا لگا۔ "دیس میں نکلا ہوگا چاند" میں خیالات و عادات بس سو سو لگے۔ "نام میرے نام" میں کمی سی محسوس ہوئی۔

"مسکراتی کرنیں" میں ندا، فوزیہ اور سیدہ نسبت کا انتخاب اچھا لگا۔ "دستر خوان" میں جھانکنے کا وقت نہ مل سکا۔ اشعار میں آسیہ جاوید کا شعر کمال تھا۔ "یادوں کے دریچے" میں نمرہ اقرا کے انتخاب میں بہ درجہ بشاشت پائی۔ احمد فراز کے ملائم الفاظ نے قوم کے قابل ہیرو قائد کو سامنے لا کھڑا کیا۔ ہر ہر شعر پر درد و الم کی خاشاک اگتی دکھائی دی "کرن کرن خوشبو" میں جابجا بوئے سمن پھیلتی تھی "فرق" میں کیا خوب نصیحت تھی۔

گھڑی کی سوئی 10 کے گھنٹے سے آگے بڑھ رہی ہے اور میرا "ناشتا" مجھے شکوہ کناں نگاہوں سے بڑی معصومیت لیے تک رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ غصے میں آجائے ہم اجازت چاہتے ہیں۔

ایمن اسرار..... مردان

کرن میں پہلی دفعہ حاضری دے رہی ہوں۔ کیونکہ اس دفعہ کرن اچھا خاصا رہا۔ مگر عتیقہ ملک کے مکمل ناول کے صفحات کم تھے۔ نفیسہ سعید اچھا لکھتی ہیں۔ "ساگر ہے زندگی" میں زینب کی کہانی قابل گرفت ہے۔ دوسری طرف فرحانہ ناز ملک کا "شام آرزو" عقیدت کا کردار بہت پسند ہے۔ پہلی قسط سے ہی اس ناول نے گرفت میں لے لیا۔ کردار بہت سارے ہیں۔ مگر آہستہ آہستہ کھلیں گے۔ فرحانہ ناز پلیز عقیدت اور سنعان کی جوڑی ہونی چاہیے۔ حنا یاسمین کے مکمل ناول نے دل میں گھر کرلیا۔ مگر بہت جلدی میں لکھا گیا یوں ہی لگا۔ غزالہ جلیل کا "انابیل" بھی بہترین تھا، باقی کرن زیر مطالعہ ہے۔

جویریہ خان، ماریہ خان..... کراچی

سب سے پہلے شکریہ کہ ہمارا پہلا خط شائع ہوا۔ سب سے پہلے سرورق کی لڑکی کے ساتھ اس کی مہندی پسند آئی۔ آپ کو تو پتا ہے کہ مہندی میں لڑکیوں کی جان ہوتی ہے۔ خیر سرورق کے بعد سب سے پہلے فہرست میں "دل اک شہر ملال" کا صفحہ نمبر دیکھا اور پڑھا۔ بہت ہی اعلا۔ ساحر نے حمرہ کو --- جس طرح سنبھالا بہت اچھا لگا۔ کاش کوئی ایسا حقیقت میں بھی ہو۔ لیکن یہ صرف کاش ہی رہ سکتا ہے۔ اب اگلے ماہ کا انتظار کرو۔ اس کے بعد "شام آرزو" پڑھا۔ زکریا صاحب اتنے ظالم کیوں ہیں۔ اللہ پوچھے گا ان کو تو..... اور سنعان اور حبہ مل جائیں تو مزا آئے گا اور حارث تو پورا لڑکیوں پر گیا ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس نے لڑکیوں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ کریمیں لگاتا ہے۔

ہاہاہا۔۔۔ پڑھ کر مزا آیا۔ اس کے بعد "طیفور خان" کا انٹرویو پڑھا۔ اتنا پڑھنے کے بعد رہا نہ گیا تو خط لکھنے بیٹھ گئی۔ چونکہ پہلا خط شائع ہو گیا تھا۔ اس لیے تھوڑی ہمت کی اور اب دوسرا خط لکھ دیا۔ پہلے بھی ایک درخواست کی تھی۔ اب دوبارہ کر رہی ہوں۔ اگر پوری ہو گئی تو بہت زیادہ خوشی ہو گی کہ قارئین کی بات کو رد نہیں کیا جاتا۔ ایف ایم 105 کے پریزنٹر ہیں کراچی سے۔ آصف ملک ریاض ان کا انٹرویو ہم پڑھنا چاہتے ہیں۔ پلیز درخواست پر غور کیجیے گا۔ اب پتا نہیں پہلے کی طرح دوسرا خط شائع ہو گا کہ نہیں۔ بہت سوچ کر اس نتیجے پر پہنچی کہ بھیجنا چاہیے۔ ہمیں انتظار رہے گا۔ کیونکہ اتنی ٹف پڑھائی کے درمیان اپنے مشغلے کے لیے ٹائم نکالنا بہت مشکل کام ہے۔

روبینہ یاسمین۔۔۔ کراچی

اب کی دفعہ کرن کا ٹائٹل بس ٹھیک تھا۔ البتہ مہندی لگے ہاتھ نمبر لے گئے۔ حمد و نعت سے فیض یاب ہونے کے بعد انٹرویوز کی طرف آئے۔ "دیس میں نکلا ہو گا چاند" پڑھ کر دل کی کیفیت کچھ عجیب سی ہوئی۔ واقعی پردیس میں زندگی گزارنا بڑی ہمت کی بات ہے۔ طیفور خان اور نیلم منیر سے ملاقات کرتے ہوئے "مقابل ہے آئینہ" میں عفیرہ ظفر کو پڑھ کر بہت اچھا لگا۔

ناول میں "اک ساگر ہے زندگی" نفیسہ سعید اچھا لکھ رہی ہیں۔ جبکہ فرحانہ ناز ملک چھ اقساط ہو چکی ہیں۔ لیکن لگتا ہے فرحانہ جی خود سمجھ نہیں پا رہی ہیں کہ کیا لکھنا ہے۔

مکمل ناول میں نمبر لے گئیں حنا یاسمین "صدائے کن فیکون" ایک بہترین تحریر لگی۔ "انابیل" بھی غزالہ جی آپ نے بھی اچھا لکھا' اب دیکھتے ہیں عتیقہ ملک آگے کیا کرتی ہیں۔

ناولٹ میں "میں گلیاں دا روڑا" دل ڈن فاخرہ گل۔۔۔ "میرے دل میرے مسافر" رفاقت جاوید غیر ضروری طوالت ہے آپ کی تحریر میں۔ قندیل فاطمہ آپ سے معذرت آپ کی تحریر ابھی پڑھ نہیں سکی۔ چاروں افسانے اپنی اپنی جگہ خوب تھے۔

مستقل سلسلے بھی اچھے تھے۔ "کرن کا دسترخوان" میں انڈوں کا پلاؤ کی ترکیب پر عمل کر ڈالا' سب نے تعریف کی اور ہم نے کرن کو دعائیں دیں۔

نشانورین۔۔۔ بوتالہ جھنڈا سنگھ

کرن سے دوستی کو کم از کم بارہ سال ہو گئے ہیں اور کرن کو پڑھتے پڑھتے کب بڑے ہو گئے پتا ہی نہ چلا کہ اب میں نشانورین سے نشامدثر ہو گئی ہوں۔ منگنی کے اس بندھن میں بندھ کر احساس ہوا کہ کرن ہی ہے جس نے میری تنہائی بانٹی اور ہر جگہ میری رہنمائی کی اور ان شاء اللہ آگے بھی میرے ساتھ ہی ہو گا اور جو کہتے ہیں ڈائجسٹ پڑھنے سے لڑکی خراب ہو جاتی ہے۔ ان

لوگوں کو کہوں گی ایک دفعہ "کرن" سے دوستی کر کے دیکھیں جو خراب بھی ہوئیں وہ بھی ٹھیک ہو جائیں گی۔ اس ٹائم میں کھیتوں میں جامن کے درخت کے نیچے بیٹھ کے خط لکھ رہی ہوں۔

سب سے پہلے حمد اور نعت شریف پڑھی، پھر جلدی سے "میرے دل میرے مسافر" پر چھلانگ لگا دی۔ یہ کیا باقی آئندہ اب اس کو ختم کریں۔ "شام آرزو" ویلڈن فرحانہ! بہت اچھا ناول جا رہا ہے۔ "اک ساگر ہے زندگی" کو ابھی پڑھ نہیں پائی، لیکن نفیسہ سعدی نے اچھا ہی لکھا ہو گا۔ مکمل ناول تینوں ہی اے ون تھے۔ مگر ناولٹ میں "تم میری ہو" نے دل جیت لیا۔ افسانے بس سو سو۔ نیلم منیر سے ملاقات بہت اچھی لگی۔ کیونکہ یہ مجھے بہت پیاری لگتی ہیں۔

"یادوں کے دریچے" میں بینش مدثر کی نظم پیاری لگی اور میں نے جلدی سے اپنی ڈائری میں نوٹ کی اور دوسری فوزیہ ثمر کی غزل نے دل خوش کر دیا۔ "مجھے یہ شعر پسند" میں سب ہی اپنی اپنی جگہ اچھے تھے۔ "حسن و صحت" تو میرا فیورٹ سلسلہ ہے۔ "مسکراتی کرنیں" میں سب نے مسکرانے پر مجبور کر دیا۔

ثناء شہزاد۔۔۔ کراچی

کرن کی محفل میں آٹھ مہینے بعد حاضری دے رہی ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ میری سب سے پیاری خالہ اور میری بہت اچھی دوست فوزیہ عرف فوزی آٹھ مہینے سے کینسر جیسے موذی مرض کا شکار ہو کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔ آپ سب سے درخواست ہے کہ آپ لوگ ان کی مغفرت کے لیے دعا کیجیے گا۔

اگست کا شمارہ جشن آزادی سے ایک دن پہلے مطلب 13 اگست کو ملا اور آزادی کی خوشی کو دوبالا کر گیا۔ ہمیشہ کی طرح پہلے حمد و نعت پڑھی اور اس کے بعد اداریہ پر دستک دی اور محمود خاور صاحب کے لیے دعائے مغفرت کی۔ انٹرویوز ایک بھی نہیں پڑھے۔ ہاں البتہ "دیس میں نکلا ہو گا چاند" میں سب کے جوابات اچھے تھے اور اپنی فیملی کی کمی تقریباً سب ہی محسوس کرتے ہیں۔ یہ پڑھ کر دل تھوڑا دکھی ہوا کہ لوگ اپنے پیاروں سے دور کس طرح رہتے ہیں۔ "مقابل ہے آئینہ" میں عفیرہ مظفر کو پڑھ کر اچھا لگا۔ نئے سلسلے وار ناول میں سے ابھی تک کوئی سا بھی نہیں پڑھا۔ کیونکہ میں چھ، سات اقساط ایک ساتھ پڑھتی ہوں۔ اس لیے اس پر تبصرے سے معذرت۔ افسانوں میں "عید کا جوڑا" کچھ زیادہ متاثر نہ کر سکا۔ "گڑھی شاہو کی گڑیا" اور "ایک پل کا فیصلہ" بہترین کاوش تھی۔ کاش ہمارے اردگرد بھی لوگ ایسا سوچنے لگیں تو کتنی ہی لڑکیاں اپنے گھر کی ہو جائیں۔ واقعی میں کر بھلا تو ہو بھلا۔

ناولٹ "میں گلیاں دا روڑا کوڑا" بہت زیادہ اچھی لگی۔ اس میں آزادی کے بعد کے جو مناظر دکھائے گئے کہ مسلمانوں پر کتنا ظلم ہوا۔ انہوں نے کیسے اپنی آنکھوں سے اپنے پیاروں کو قتل ہوتے دیکھا۔ اس پر دل دکھ سے بھر گیا۔

مکمل ناول ویسے تو دونوں ہی اچھے تھے، مگر "انابیل" میں شنید کا کریکٹر بہت برا لگا۔ اگر لڑکیاں اسے کال کرتی تھیں تو وہ ان سے بات ہی نہ کرتا۔ وہ تو اپنی آواز سے ہی لڑکیوں کو اپنا دیوانہ بنا رہا تھا اور لڑکیاں بھی عقل کی اندھی تھیں جو اس کے پیچھے پاگل تھیں۔ اس کے علاوہ اس نے انابیل کے ساتھ اتنا برا کیا اور انابیل نے اسے اتنی آسانی سے معاف کر دیا۔ پانچ سال کی اذیت کچھ کم نہیں ہوتی، لیکن صحیح کہتے ہیں لوگ کہ محبت ایسی ہی ہوتی ہے، محبوب کی بڑی سے بڑی غلطی بھی انسان ایک پل میں معاف کر دیتا ہے۔

"نامے میرے نام" میں سب کے تبصرے پسند آئے۔ میرا خط ضرور شائع کیجیے گا۔ آٹھ مہینے بعد بھیجا ہے۔ امید ہے آپ مایوس نہیں کریں گی۔

